

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد-۲۳

راہِ نجات

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

تصحیح و تزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

راہِ نجات

تاریخ اشاعت.....................شعبان ۱۴۲۸ھ
ناشر.........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت.....................سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ...چوک فوارہ...ملتان
مکتبہ رشیدیہ.......راجہ بازار.......راولپنڈی
ادارہ اسلامیات.........انارکلی........لاہور
یونیورسٹی بک ایجنسی.....خیبر بازار.......پشاور
مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار.....لاہور
ادارۃ الانور.........نیوٹاؤن........کراچی نمبر 5
مکتبہ رحمانیہ........اردو بازار .... لاہور
مکتبہ المنظور الاسلامیہ....جامعہ حسینیہ...علی پور
مکتبہ المنظور الاسلامیہ..........بلاک زیڈ.........مدینہ ٹاؤن.........جھنگ موڑ.........فیصل آباد

ادارہ اشاعت الخیر - حضوری باغ روڈ - ملتان

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTERE
119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۲۳ ''راہِ نجات''
جدید اشاعت سے مزین آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
اللہ کے فضل وکرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔
بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے۔ ادارہ نے زر کثیر خرچ کر کے یہ کام محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا اور فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا کام حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔
اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ
شعبان ۱۴۲۸ھ بمطابق جون 2007ء

اجمالی فہرست

الاستغفار

يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ

آثار الحوبه
فی اسرار التوبه

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

استمرار التوبه

هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

تفصیل التوبه

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

ضرورة التوبه

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

اول الاعمال

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ

فمن تعجل في يومين فلا إثم عليه ومن تأخر فلا إثم عليه لمن اتقى واتقوا الله واعلموا أنكم إليه تحشرون ۝
ومن الناس من يعجبك قوله في الحيوة الدنيا ويشهد الله على ما في قلبه وهو ألد الخصام ۝ وإذا تولى سعى
في الأرض ليفسد فيها ويهلك الحرث والنسل والله لا يحب الفساد ۝ وإذا قيل له اتق الله أخذته العزة بالإثم
فحسبه جهنم ولبئس المهاد ۝ ومن الناس من يشري نفسه ابتغاء مرضات الله والله رءوف بالعباد ۝ يا أيها
الذين آمنوا ادخلوا في السلم كافة ولا تتبعوا خطوات الشيطن إنه لكم عدو مبين ۝

الافتضاح

يا أيها الإنسان ما غرك بربك الكريم ۝ الذي خلقك فسوىك

العبرة بذبح البقرة

وإذ قال موسى لقومه إن الله يأمركم أن تذبحوا بقرة قالوا أتتخذنا هزوا قال أعوذ بالله أن أكون من الجهلين ۝
قالوا ادع لنا ربك يبين لنا ما هي قال إنه يقول إنها بقرة لا فارض ولا بكر عوان بين ذلك فافعلوا ما تؤمرون ۝
قالوا ادع لنا ربك يبين لنا ما لونها قال إنه يقول إنها بقرة صفراء فاقع لونها تسر النظرين ۝ قالوا ادع لنا
ربك يبين لنا ما هي إن البقر تشبه علينا وإنا إن شاء الله لمهتدون ۝ قال إنه يقول إنها بقرة لا ذلول تثير الأرض
ولا تسقي الحرث مسلمة لا شية فيها قالوا الئن جئت بالحق فذبحوها وما كادوا يفعلون ۝ وإذ قتلتم نفسا
فادرءتم فيها والله مخرج ما كنتم تكتمون ۝

اطاعة الاحكام

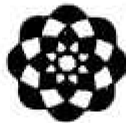
يا أيها الذين آمنوا أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم فإن تنازعتم في شيء فردوه
إلى الله والرسول إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر ذلك خير وأحسن تأويلا

الظلم

إنما السبيل على الذين يظلمون الناس ويبغون في الأرض بغير الحق أولئك لهم
عذاب أليم ۝ ولمن صبر وغفر إن ذلك لمن عزم الأمور ۝



فہرست عنوانات



الاستغفار

یہ وعظ

استغفار کی ضرورت کے متعلق ۱۱ صفر ۳۲ھ جامع مسجد سہارنپور میں بیٹھ کر ڈیڑھ گھنٹہ بیان فرمایا سامعین کی تعداد دو سوتھی مولانا محمد عبداللہ صاحب گنگوہیؒ نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارِكۡ وَسَلِّمۡ (دَائِمًا اَبَدًا كَمَا يُحِبُّ وَيَرۡضٰى ۱۲) اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ. بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ. هُوَ اَهۡلُ التَّقۡوٰى وَاَهۡلُ الۡمَغۡفِرَةِ (المدثر:۵۶)

وہی ہے جسکے عذاب سے ڈرنا چاہئے اور وہی ہے جو (بندوں کے) گناہوں کو معاف کرتا ہے۔

وَيٰقَوۡمِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ يُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا وَّيَزِدۡكُمۡ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمۡ وَلَا تَتَوَلَّوۡا مُجۡرِمِيۡنَ (هود:۴۴)

ترجمہ: اے میری قوم تم اپنے گناہ (کفر و شرک وغیرہ) اپنے رب سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ) پھر (ایمان لاکر) اس کی طرف متوجہ رہو وہ تم پر خوب بارش برساوے گا اور (ایمان وعمل کی برکت سے) تم کو اور قوت دے کر تمہاری (موجودہ) قوت میں ترقی کردے گا (پس ایمان لے آؤ) اور مجرم رہ کر (ایمان سے) اعراض مت کرو ۱۲)

تمام پریشانیوں کا علاج

اس آیت کریمہ کا مضمون ہود علیہ السلام کا خطاب ہے اپنی قوم کو حق تعالیٰ نے اس مقام پر اس کو نقل فرمایا ہے اس آیت کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ہر چند کہ ہماری ہر حالت ایک سے ایک زیادہ ایسی ہی ضروری ہے کہ اس کے متعلق بیان کیا جائے تاہم بعض حالت کا اقتضاً یہ ہوتا ہے کہ اس کے اشتراک اور عموم کی وجہ سے مناسب سمجھا جاتا ہے کہ اس کے متعلق اہم سمجھ کر بیان کیا جاوے اس وقت مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر کہ کم وبیش سب پریشانی میں مبتلا ہیں مناسب معلوم ہوا کہ اس مضمون کو اختیار کیا جائے کہ اس میں معالجہ ہے تمام پریشانیوں کا ترجمہ سے معلوم ہوگا کہ

وہ کیا مضمون ہے اور نیز معلوم ہو جائے گا کہ اس کی ضرورت ہے۔ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم سے فرماتے ہیں ۔ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ الخ (اے میری قوم اپنے گناہوں کی اپنے رب سے معافی مانگو) الخ

اُمّمِ سابقہ کو خطاباتِ اِلٰہی ہمارے لئے بھی حجّت ہیں

یہاں پر شبہ نہ کیا جائے کہ ہم لوگ تو امّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ہم کو ہود علیہ السّلام کا ارشاد سنانے سے کیا فائدہ اس لئے کہ یہ مسلم ہے کہ امم سابقہ کے احکام بلا انکار اگر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو سنا دیں تو وہ ہمارے لئے بھی حجت ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ اصول یعنی عقائد اور اخلاق حمیدہ کے مامور بہ ہونے میں سب انبیاء کا ایک مشرب ہے اس میں کسی نبی کا اختلاف نہیں مثلاً توحید رسالت کا اعتقاد ظلم کا بُرا ہونا، عدل کا مستحسن ہونا، سچ بولنا یہ بالاتفاق مسلم ہیں اسی فہرست میں سے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگنا بھی ہے جس کا اس آیت میں بیان ہے پس جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد کی نقل کے بعد انکار نہیں فرمایا اور نیز یہ ان اعمال سے ہے کہ جن کا مامور بہ ہمیں تمام شرائع میں یکساں رہا ہے تو لامحالہ ہم بھی اس کے ضرور مخاطب ہوں گے۔ رہی یہ بات کہ اگر اس مضمون کو بیان ہی کرنا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد نقل کر دیا جاتا۔ حضرت ہود علیہ السلام کا ارشاد کیوں نقل کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام کا ارشاد نقل کرنے میں ایک خاص مصلحت ہے وہ یہ کہ آپ صاحبوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ مضمون بہت ہی اہتمام کے قابل ہے اس لئے کہ قوم عاد بہت پرانی قوم ہے پس جبکہ وہ بھی اس مضمون کے مخاطب ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات کوئی نئی نہیں ہے بلکہ یہ وہ بات ہے کہ ہمیشہ سے انبیاء اپنی اپنی قوم کو کہتے آئے ہیں۔

اصلاح کے دو درجے

حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم کو ارشاد فرماتے ہیں اے میری قوم اپنے رب سے مغفرت مانگو پھر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ خلاصہ ارشاد کا اصلاح کے دو درجے ہیں اوّل اپنے گناہ معاف کرانا اس کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف طاعت کے ساتھ متوجہ ہونا اس پر کیا ثمرہ مرتب ہوگا۔ يُرْسِلِ السَّمَآءَ الخ یعنی استغفار اور رجوع الی اللہ کا ثمرہ دنیا میں تم کو یہ ملے گا کہ اللہ تعالیٰ تم پر بارش بھیجیں گے اور تمہاری قوت موجودہ کے اندر اور قوت بڑھا دیں گے قوم عاد قوت کے اندر مشہور ہیں ، آگے ارشاد ہے، اور خدا تعالیٰ کے حکم سے روگردانی مت کرو جرم کرتے ہوئے۔ یہ آیت کا ترجمہ

ہوا ترجمہ سے مضمون کی اجمالی تعیین ہوگئی ہوگی کہ اس کے دو جز ہیں اوّل مغفرت مانگنا دوسرے طاعت کی طرف رجوع کرنا۔ خلاصہ حاصل یہ ہے کہ آیت میں دو مامور بہ ہیں استغفار اور رجوع الی الطاعۃ اور دو اس کے ثمرے ہیں۔

اِصلاح کے دو ثمرات

اور دو اس کے ثمرے ہیں، بارش ہونا اور قوت بڑھ جانا اور کمزوری اور ضعف کا جاتا رہنا اور ایک منہی عنہ ہے وہ مجرم ہو کر اعراض کرنا ہے۔ ہود علیہ السلام نے جو اس میں فرمایا باعتبار مقصود ایراد کے، یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا ہم کو ارشاد ہے گویا اللہ تعالیٰ ہم کو ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تم کو کسی قسم کی شکایت قحط کی یا کمزوری یا ادبار یا تنزل کی ہو تو اس کی تدبیر اور اس کا علاج وہ ہے جو ہم نے بتلایا ہے، اور وہ نہیں ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔ یہ حاصل ہے اس مقام کا۔

استغفار کے بیان کی ضرورت

ترجمہ سے مضمون کی تعیین اور حاصل سے اس کی ضرورت کا علم ہو گیا ہوگا کہ اس مضمون کی کیا ضرورت ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مسلمانوں کو عموماً دیکھا جاتا ہے کہ پریشان ہیں اور یوں تو ہر شخص کو خاص خاص پریشانیاں ہیں مگر ایک عام پریشانی اور مشترک و مدید شکایت تو تنزل اور پستی کی ہے کہ یہ پرانی شکایت ہے دوسری جدید پریشانی قحط اور قلت باراں کی ہے۔ یہ دو پریشانیاں اس وقت ہم سب کو عام ہیں اس لئے ان کا انتظام ضروری ہے کیونکہ انسان کو جو مصیبت لاحق ہوتی ہے عقل اس کو مقتضی ہے کہ اس کی تدبیر کرے اور تدبیر بھی وہ جو صحیح تدبیر ہے۔

مصائب کی شکایت یا تذکرہ کافی نہیں

ہمارے بھائیوں کی یہ حالت ہے کہ بعضے تو ان میں سے ایسے جواں مرد ہیں کہ تدبیر کی پرواہ ہی نہیں کرتے اور بعضے جو کچھ کرتے بھی ہیں وہ الٹی تدبیر کرتے ہیں پس یہ کہنا صحیح ہے کہ بالکل تدبیر کرتے ہی نہیں چنانچہ بعضے تو صرف یہ کرتے ہیں کہ بس شکایت کرتے ہیں کوئی تو کہتا ہے کہ امسال ایسی خشکی ہوئی ہے کہ مویشیوں کو چارہ تک نہیں ملتا ہے بھوکے مر رہے ہیں کوئی کہتا ہے اس فصل میں بارش نہ ہوئی تو گرانی بہت زیادہ ہو جائے گی جو ذرا دیندار ہیں وہ کہتے ہیں کہ میاں یہ سب ہماری شامتِ اعمال ہے۔ مگر اصلاح وہ بھی نہیں کرتے جو اصطلاح جدید ذرا مہذب ہیں وہ

ترقی وتنزلی پر لیکچر دیتے ہیں۔کوئی بیماری کی شکایت کرتا ہے۔میرے پاس بھی خطوط آتے ہیں کہ بعض جگہ بیماری شروع ہوگئی ہے کوئی کہتا ہے کہ خیر بھائی ہمارے یہاں تو گویا بالکل بے فکر ہی ہو گئے یہ اور بھی غضب ہے یاد رکھو کہ جیسے تمہارے یہاں بیماری ہونا اندیشہ ناک ہے اسی طرح تمہارے آس پاس ہونا یہ بھی خوفناک ہے اللہ تعالیٰ نے کفار کو ان دونوں سے خوف دلایا ہے چنانچہ ارشاد ہے: وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ (اور یہ (مکہ کے) کافر تو ہمیشہ (آئے دن) اس حالت میں رہتے ہیں کہ ان کے (بد) کرداروں کے سبب ان پر کوئی حادثہ پڑتا رہتا ہے یا ان کی بستی کے قریب نازل ہوتا رہتا ہے)۔

پس ہمارے شہر میں بیماری کا جیسے خوفناک ہے اسی طرح ہمارے ضلع میں ہونا یا ہماری کمشنری میں ہونا یا ہمارے ملک میں ہونا بھی خطرناک اور فکر کی بات ہے غرض دو شکایتیں اس وقت غالب ہیں ایک بیماری وقحط وغیرہ کی اور دوسری قوم کے ذلیل اور روز بروز کمزور ہوتے جانے کی اور باقی خاص خاص شکایتیں یا خاص خاص بیماریوں کی شکایتیں وہ تو معمولی طور پر رہتی ہی ہیں مگر اس وقت غالب اور مشترک آفات کے متعلق عرض کرتا ہوں اور مجھ کو اس میں دو جماعتوں کی شکایت ہے اوّل شکایت تو عام لوگوں کی ہے اور دوسری مہذب لوگوں کی ہے جو کہ بیدار مغز کہلاتے ہیں۔

بلاؤں سے نجات کی صحیح تدبیر

میں کہتا ہوں کہ یہ پریشانیاں سب صحیح اور واقعی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی کوئی تدبیر بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو میں مطلق تدبیر کے متعلق پوچھتا ہوں کہ کس چیز کی ارجح وانفع تدبیر کون سی ہوتی ہے آیا وہ تدبیر جو عقلاء محض استدلال (دلیل لانا) سے تجویز کریں یا وہ جو کوئی تجربہ کار بعد تجربہ کے تجویز کرے سو بڑا فرق ہے عاقل کی تجویز اور تجربہ کار کی تجویز میں چنانچہ مثل ہے:

سَلِ الْمُجَرِّبَ وَلَاتَسْئَلِ الْحَكِيمَ (تجربہ کار سے دریافت کرو عاقل سے مت پوچھو) عاقل کی تجویز تو محض تخمینی (اندازے سے) رائے کی طرف مستند (سند یافتہ درست) ہوتی ہے اور تجربہ کار کی تجویز تکرار مشاہدہ سے ناشی ہوتی ہے اور ثانی کی ترجیح اوّل پر ظاہر ہے پس جب کہ تجربہ کار کا علم، حالانکہ وہ بھی استدلالی ہے حکیم کے علم پر ترجیح دیا جاتا ہے تو عالم الغیب والشہادۃ کا علم کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا اور اس سوال کے جواب میں یوں کیوں نہیں کہا جاتا کہ حق تعالیٰ سے اس کی تدبیر پوچھو خاص سرکار جو عالم اور حکیم سب کچھ ہیں اگر کسی مرض کا نسخہ عطا فرمادیں تو کیوں اس کو استعمال نہیں کیا جاتا اس دوا سے بڑھ کر اور کون سی دوا ہوگی جو مرض اور دوا کے خالق سے عطا ہو عقلاء

اوراہل الرائے تو محض تخمین اوررائے اور قیاس ہی سے کہتے ہیں کہ اس مرض کی یہ دوا ہے مثلاً طاعون ہی ہے اس کی دوائیں اور تدبیریں محض ظنی ہیں ان کی نافعیت کا اوران کے استعمال کرنے کا مخالف نہیں ہوں یہ اطباء کی ہی عادت ہے کہ جس طبیب کا علاج کرو دوسرا نسخہ پینا اس کے نزدیک جائز نہیں اور حق تعالیٰ کو یہ حق بدرجہ اولیٰ حاصل تھا کہ وہ یہ فرمادیتے کہ جو ہم نے دوا اور تدبیر بتلائی ہے اس کو ہی استعمال کرو خصوصاً اس صورت میں جبکہ تدبیر صحیح کا انحصار بھی اسی میں ہے لیکن ان کی یہ رحمت ہے کہ اور تدبیروں کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا اس لئے میں تدبیر ظنیہ مجوزہ عقلاء کا مخالف نہیں۔

سچی طب کی طرف توجہ کی ضرورت

بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ صرف تدابیر ظاہری اور طب کے ایسے پیچھے کیوں پڑے ہو کہ صحیح تدبیر اور سچی طب کو بالکل ہی بھول گئے۔

چند خوانی حکمت یونانیاں ‏ ‏ حکمت ایمانیاں راہم بداں
صحت ایں حس بجوئید از طبیب ‏ ‏ صحت آں حس بجوئید از حبیب
صحت ایں حس زمعموری تن ‏ ‏ صحت آں حس زتخریب بدن

(یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہو گے کچھ دن حکمت ایمانی یعنی معرفت کی تو پڑھو۔ حس جسمانی کو درست کرنا چاہتے ہو تو طبیب سے رجوع کرو اور اگر حس روحانی کو ترقی منظور ہو تو مرشدِ کامل سے رجوع کرو۔ حسِ جسمانی سے تو بدن کی درستی ہوتی ہے اور حسِ روحانی کی صحت بدن کی تخریب سے ہوتی ہے)

پس جو طب حکیم حقیقی نے ارشاد فرمائی ہے بالکل کافی ہے لیکن باوجود اس کے یہ بھی اجازت دے دی ہے کہ اور نسخہ بھی پیو تو حرج نہیں بلکہ ترغیب دی ہے تَدَاوَوْا عِبَادَ اللّٰہِ (مسند احمد ۴:۲۷۸۔ کنز العمال: ۲۸۰۷۵) (اللہ کے بندوں سے علاج کراؤ)۔

ترک اسباب علی الاطلاق جائز نہیں

جس کی حقیقت اہل اللہ و مربیانِ قلب نے سمجھی چنانچہ انہوں نے ترکِ اسباب کو علی الاطلاق جائز نہیں رکھا یہاں سے وہ شبہ بھی رفع ہو گیا جو کہ بہت لوگ ناتمام باتیں سُن کر کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ مولوی تو چاہتے ہیں کہ دنیا کے کاروبار ترک کر کے مسجد کے کونہ میں تسبیح لے کر بیٹھ جادیں حاشا و کلا مولویوں کا یہ مقصود ہرگز نہیں بلکہ تم اگر ایسا کرو بھی تو وہ تم کو روک دیں کیونکہ آدمی بالطبع اسباب

ظاہرہ کا خوگر بنایا گیا ہے پس اگر اسباب کو ترک کرے گا تو اس کی جمعیت وسکون میں ضرور فرق پڑے گا اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک طبیب کامل ہے اس کو مریض کے حال پر بہت عنایت اور شفقت ہے اس نے مریض کو نسخہ لکھ کر دیا لیکن وہ طبیب یہ بھی جانتا ہے کہ اس مریض کو ضعف اور تو ہم کی وجہ سے اس پر قناعت نہ ہوگی اور اس کو خیال رہے گا کہ فلاں دوا اگر پیتا تو جلدی کامیاب ہو جاتا اور یہ اس کی دُھن اور ادھیڑ بن ممکن ہے کہ اس حد تک ہو کہ اصلی دوا سے بھی اعراض کرے اس لئے وہ براہ عنایت اس کی تسلی کے واسطے کہہ دیتا ہے کہ دوا تو اس مرض کی یہی ہے جو بتلائی ہے لیکن اگر تم کوئی اور دوا بھی پیو تو تم کو اختیار ہے تو اس مریض کو اگرچہ شفا اور صحت تو اُسی باقاعدہ اور صحیح نسخہ سے ہوگی اور مریض خواہ کچھ سمجھے لیکن طبیب کو چوں کہ شفقت اور محبت ہے وہ اپنا نام بھی کرنا نہیں چاہتا۔ اس کو مقصود تو یہ ہے کہ اس کو صحت ہو جائے۔ وہی مثل ہے کہ کام تو کسی کا اور نام کسی کا۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے برآہوئے چیں بستہ اند

(مشک افشانی تیری زلفوں کا کام ہے لیکن مصلحتاً عشاق نے چین کے ہرنوں پر الزام لگا دیا ہے)

پس اسی طرح حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ ہمارے بندے کسی طرح اچھے ہو جائیں چاہے وہ حکیم جی ہی کا نام کر دیں اور ان کو پریشانی نہ ہو پس یہ وجہ ہے کہ ترک اسباب کو منع کر دیا ورنہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (اور کوئی (روزی کھانے والا) جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو) کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ سب اسباب ترک کر دیتے اور تجارت زراعت نوکری صنعت یک لخت چھوڑ دیتے ہاں اقویاء کو اجازت دی ہے کہ اگر تم ترک اسباب کرو تو جائز ہے اس لئے کہ ان کو ترک اسباب سے اپنی قوت توکل کی وجہ سے پریشانی لاحق نہ ہوگی باقی ضعفاء کو یہی حکم ہے کہ تدبیر کرو ایک صحابی کا قصہ ہے کہ ان سے تخلف تبوک لغزش ہو گئی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے میری توبہ قبول فرمائی ہے اس کے شکریہ میں مَیں چاہتا ہوں کہ اپنا سب مال تصدق کر دوں فرمایا نہیں۔ سب مت دو کچھ رکھ لو۔

اسلام نے جذبات طبعیہ کی بہت رعائت کی ہے

اس قصہ سے اور نیز شریعت کے ہر ہر حکم سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ شریعت نے جذبات طبعیہ کی بڑی رعایت کی ہے اور اسلام کے سب احکام فطرتِ سلیمہ کے موافق

ہیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ سے ایک بی بی نے عرض کیا کہ میں اپنی جائیداد وقف کرنا چاہتی ہوں حضرت نے فرمایا کہ نہیں نہیں ایسا نہ کرو کچھ رکھ لو نفس کو کبھی پریشانی ہو جایا کرتی ہے پھر وہ پریشانی دین تک مقتضی ہوتی ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ وہ زمانہ گیا کہ درہم و دینار رکھنا تقویٰ و توکل کے خلاف تھا اب تو اگر کسی کے پاس کچھ مال ہو تو اس کو حفاظت سے رکھنا چاہیئے کم ہمت انسان جب مفلس ہوتا ہے تو اوّل اس کا دین ہی برباد ہوتا ہے بعض بزرگوں نے رزق ملنے کی عجیب طریقہ سے دعائیں مانگی ہیں۔

ایک بزرگ کا قصّہ

چنانچہ ایک بزرگ نے دُعا کی تھی کہ اے اللہ جو کچھ میری قسمت میں لکھا ہے ایک دم سے دے دو ارشاد ہوا کہ کیا ہم پر اطمینان نہیں عرض کیا کہ اطمینان کیوں نہیں شیطان مجھ کو بہکاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ کہاں سے کھائے گا میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ دے گا وہ کہتا ہے کہ یہ تو یقینی ہے کہ دے گا مگر یہ تو خبر نہیں کہ کب دے گا اس سے میں پریشان ہوتا ہوں آپ مجھ کو اگر ایک دم سے دے دیں گے تو میں کوٹھڑی میں بند کر کے رکھ لوں گا جب شیطان کہے گا کہ کہاں سے کھائے گا میں کہہ دوں گا کہ اس کوٹھڑی میں سے کھاؤں گا وہ اس میں کوئی شبہ نہ ڈال سکے گا۔ اور پریشان نہ کر سکے گا۔

کیفیات مطلوب بالذت نہیں

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلوک میں خاص کیفیات مثلاً باوجود مال نہ ہونے کے پریشانی نہ ہو سو یہ مطلوب نہیں اگر مال رکھ کر جمعیت اور تسلی ہو تو رکھے اور اگر خرچ کر کے اطمینان حاصل ہو تو خرچ کر دے بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ان کی ملک میں بہت سی چیزیں ہوں تو ان کا دل گھبراتا ہے بہر حال اس باب میں سے دوا دارو کی بھی اجازت ہے لیکن دوا کو مؤثر بالذات نہ سمجھے کہ بغیر اس کے شفا ہی نہ ہوگی بہت لوگ ہم نے دیکھے ہیں کہ دوا بالکل نہیں کرتے ہیں۔

تدبیر حقیقی پر کفایت کرنا کافی ہے

جلال آباد کے ایک رئیس سنے گئے حکیم کو بلاتے گاڑی بھیجتے فیس دیتے اور حکیم جی سے کہتے کہ آپ بلا تامل جتنے کا چاہیں نسخہ لکھئے دس کا بیس کا پچاس کا چنانچہ حکیم جی نسخہ لکھ دیتے ملازم کو دیتے کہ جاؤ بھائی دکھلاؤ عطار کو کتنے کا ہے عطار کہتا کہ پچیس روپیہ کا ہے کہتے لاؤ صندوقچی سے

پچیس روپے گن کر دیتے کہ جاؤ خیرات کر دو مساکین کو میری یہی دوا ہے چنانچہ جب یہ عمل کرتے فوراً اچھے ہو جاتے ہمارے ایک دوست ہیں وہ بھی دوا نہیں کرتے اس مرتبہ وہ سخت بیمار ہوئے ہر چندان کو سمجھایا گیا کہ علاج کرو مگر ایک نہ سُنی آخر لوٹ پوٹ چندروز کے بعد اچھے خاصے ہو گئے، معلوم ہوا کہ تدبیر حقیقی پر کفایت کرنا بالکل کافی ہے اگر کوئی کہے کہ اگر تدبیر حقیقی یہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ بعضے لوگ نِری دوا سے اچھے ہو جاتے ہیں۔

صاحبو! تم سمجھتے ہو کہ وہ اچھے ہو گئے وہ اچھے نہیں ہیں ایک بخار تو چلا گیا اس کو ایک بخار اور ہے جو اس کے لئے روح فرسا بن رہا ہے جس کا انجام ہلاک جسمانی ہی نہیں بلکہ ہلاک ابدی ہے۔ اصلی تدبیر طاعت ہی ہے اس کے ہوتے ہوئے دوا کی اجازت ہے پس جمع کرنا جائز اور نری طبعی تدبیر پر اکتفا کرنا ناجائز۔ ہم لوگ اسی میں مبتلا ہیں کہ اور تدابیر سب کرتے ہیں اور اصلی تدبیر سے غافل ہیں۔

ازالۂ طاعون کے لئے تعویذات کو کافی سمجھنا غلطی ہے

سو طاعون کی تدبیر میں صفائی مکانات کی اور فنائل ہی کافی نہیں ہے بلکہ دوسری صفائی بھی ضروری ہے اور یہ دوسری صفائی وہ نہیں جو بعضے بدمذاق لوگ سمجھتے ہیں یعنی وہ تعویزوں کو کافی سمجھتے ہیں کہ تعویذ دروازہ پر چسپاں کر دو طاعون تعویذ سے ڈر کر بھاگ جائے گا۔ یہ ان سے بڑھ کر ہیں جو دوا پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ دوا کا کھانا اور استعمال کرنا بیماری زائل ہو جانے کی طبعی تدبیر تو ہے لیکن تعویذ کا چسپاں کرنا طاعون کے بھاگ جانے کے لئے تو اُس درجہ کی طبعی تدبیر بھی نہیں اور نہ باطنی و حقیقی جیسا کہ اصلاح حالت تدبیر حقیقی ہے پس اس پر اتنا اعتقاد رکھنا بہت ہی عجیب ہے جتنا وہ لوگ رکھتے ہیں جو کہ تعویذوں کے معتقد ہیں یعنی ان کو شک ہی نہیں ہوتا گویا ایک پٹہ لکھوالیا ہے صاحبو! طاعون تو جب بھاگے جبکہ باہر سے آتا ہو طاعون تو گھر کے اندر موجود ہے باہر تعویذ لگانے سے کیا ہوتا ہے وہ طاعون کیا ہے معصیت، کیونکہ طاعون ہو یا کوئی اور مصیبت ہو اس کا اصلی سبب تو معصیت ہے۔

ہر بلاء و مرض کا اصلی سبب

پس جب معصیت بحالہ رہے تو دشمن تو تمہارے گھر کے اندر ہے باہر کے انتظام سے کیا ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؂

در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود　　　حیلہ فرعون زیں افسانہ بود

(دروازہ بند کر لیا لیکن دشمن گھر کے اندر رہا۔ فرعون کا حیلہ محض افسانہ تھا ۱۲)

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ فرعون نے اپنے دشمن کو یعنی موسیٰ علیہ السلام کو گھر کے اندر رکھا اور ان کو پرورش کیا اور دشمنوں کا انتظام کرتا تھا صاحبو! لوگ باوجود اصلاح نہ کرنے کے جو تدبیر کر رہے، یہ فرعونی تدبیر ہے کہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی جو اصلی سبب ہے، پریشانیوں کا اس کو چھوڑتے نہیں اور بالائی تدبیریں کرتے ہیں یاد رکھو جب تک کہ مرض کے اصلی سبب کا استیصال نہ کیا جاوے مرض نہ جائے گا پس جب تک کہ معصیت نہ چھوڑیں گے ان بلاؤں سے خلاصی نہیں ہو سکتی سو اس سبب کی طرف کسی کو التفات تک بھی نہیں آپ ہی بتلایئے فیصدی کتنے ایسے لوگ ہیں جن کو اس کا احساس ہو اور وہ تدبیر کرتے ہوں ہاں ظاہری تدبیریں کرتے ہیں لیکن اصلی تدبیر سے غفلت ہے اور بعضے کوئی تدبیر بھی نہیں کرتے۔

امساک باراں کی تدبیر

دیکھئے آجکل بارش کی کمی ہے بتلایئے اس کے لئے کیا تدبیر کی ہے طاعون میں تو خیر کچھ کرتے بھی ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ تدبیر کو منحصر سمجھ لیا ہے اپنی وہمی اور ظنی تدبیروں اور اسباب میں اور طاعون کے کچھ ظاہری علاج بھی ہیں اس لئے اس کی تدبیر تو کر لی اور بارش برسنے کا کوئی طریقہ کسی کو یاد نہیں اس لئے اُس سے عاجز ہیں بڑے بڑے مدبر اور عقلاء موجود ہیں لیکن کسی کی قدرت میں یہ بات نہیں کہ واقعی بارش برسا دیں باقی ایک گندی بارش ایک تدبیر سے بھی ہو چکی ہے اس کی نفی نہیں کرتا چنانچہ ایک حکایت میں نے ایک کتاب میں دیکھی ہے کہ فرعون خدائی کا دعویٰ کیا کرتا تھا۔ ایک سال بارش نہ ہوئی قحط ہو گیا لوگوں نے آ کر شکایت کی کہ ہم لوگ قحط میں ہلاک ہو رہے ہیں تم کیسے خدا ہو بارش کیوں نہیں برساتے فرعون نے شیطان سے کہ کسی وقت اس سے دوستی ہو گئی تھی یہ سب قصہ کہا شیطان نے وعدہ کیا کہ کل بارش ہو گی چنانچہ اس نے سب شیطانوں کو جمع کر کے کہا کہ سب اوپر جا کر مُوتو چنانچہ بارش تو ہوئی لیکن بدبو کے مارے دماغ پھٹے پڑتے تھے۔ فرعون نے پوچھا کہ یہ کیسی بارش، شیطان نے کہا کہ احمق ہوا ہے جیسے تو خدائے باطل ہے ویسی ہی تیری بارش ہے اور جیسے وہ خدائے حقیقی ہیں اسی طرح کی ان کی بارش ہے۔

دجال کا استدراج اور اس کے بطلان کی کھلی علامتیں

اور یہ جو حدیثوں میں آیا ہے کہ دجال جہاں چاہے گا بارش ہو جائے گی تو یاد رکھو کہ اس سے بارش کا اس کے قبضہ میں ہونا لازم نہیں آتا یہ استدراج ہے اس کے چاہنے پر ابتلاء اللہ تعالیٰ

قدرت سے ہوگی اس کے معتقد سمجھیں گے کہ اس نے بارش کی ہے لیکن یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اس میں تو تلبیس ہو جاوے گی جواب یہ ہے کہ یہ دھوکہ کی بات نہیں ہے اس لئے کہ اس کے ماتھے پر کافر لکھا ہوگا جس کو پڑھا اَن پڑھا سب پڑھ لیں گے اور دوسرے یہ کہ وہ کانا ہوگا اور حق تعالیٰ سب عیوب سے پاک ہیں لیکن باوجود اس کے بھی بعضے لوگ گمراہ ہو جاویں گے اور ان دونوں علامتوں کی تاویلیں کرلیں گے میرے ایک استاد بیان فرماتے تھے کہ ایک مقام پر ایک اندھے نے خدائی کا دعوائی کیا تھا ساٹھ ستر آدمی اس کے ساتھ ہو گئے۔ ایک طالب علم نے اس سے کہا کہ اگر تم خدا ہو تو اپنی آنکھیں کیوں اچھی نہیں کر لیتے کہنے لگا کہ ہم اپنے بندوں کو (نعوذ باللہ) امتحان کرتے ہیں کہ دیکھیں کون ہماری تصدیق کرتا ہے اور تکذیب کرتا ہے غرضیکہ آنکھ پھوٹی ہوئی اور ماتھے پر کافر لکھا ہوا اس سے زیادہ اور کیا دلیل اس کے بطلان کی ہوگی یہ تو ایک موٹی بات ہے دوسرے ایک باریک بات اس کے بطلان کے شناخت کی حدیث میں آئی ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس ظاہر بینائی سے اس کو دنیا میں دیکھو گے اور حق تعالیٰ کو دنیا میں ان آنکھوں سے کوئی دیکھ نہیں سکتا اس سے صاف معلوم ہوا کہ وہ خدا نہ ہوگا۔

ان دلائل کے ہوتے ہوئے بھی کوئی بگڑے تو بگڑے بہر حال بارش کے متعلق کوئی تدبیر بھی نہیں کرتے اور البتہ خالی شکایتیں کیا کرتے ہیں، میاں کتنے دن ہو گئے بارش نہیں ہوئی قحط ہو گیا میں کہتا ہوں کہ اس کہنے سے کیا مقصود ہے کس کو سناتے ہو کیا یہ اللہ میاں پر اعتراض ہے یا اللہ میاں کو یا کسی آدمی کو صرف سُنا رہے ہو آدمیوں کو سنانا تو ظاہر ہے کہ مقصود نہیں اس لئے کہ آدمی کچھ کر ہی نہیں سکتے اور اللہ تعالیٰ کو بھی صرف سنانا اور خبر دینا ہرگز مقصود نہیں اس لئے کہ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے اب یہی شق (ٹکڑا ۔ طرف) رہی کہ یہ اعتراض ہے اور گویا، مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ امر خلاف حکمت ہے ایسا نہ کرنا چاہئے۔

حق تعالیٰ شانہٗ پر اعتراض کفر ہے

تو دیکھ لیجئے کہ حق تعالیٰ پر اعتراض کرنا کیا ہوتا ہے اگر قصداً ہی یہ اعتراض ہوتا تو میں اس کو کفر کہتا ہوں لیکن اب کہ قصد نہیں ہے سخت بے ادبی اور گستاخی ضرور کہوں گا مجھے تو واللہ ان کلمات سے سخت وحشت ہوتی ہے ہاں اگر اس جملہ خبریہ سے یہ مقصود ہو کہ دعا کرو کہ بارش ہو تو دوسری بات ہے لیکن قرائن حالیہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مقصود نہیں اگر کہو کہ ہمارا تو کچھ بھی مقصود نہیں ہوتا یوں ہی ہانک دیتے ہیں تو اس صورت میں یہ لغو ہوا اور لغو سے بھی احتراز کرنا چاہئے

حدیث میں ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَا لَا یَعْنِیْهِ (آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ لایعنی اور بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے) غرض ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ فضول اور لغو میں تو مشغول ہیں اور جو اصلی اور صحیح تدبیر ہے اس سے غفلت ہے۔

استغفار اور رجوع الی اللہ بارش کی اصل تدبیر ہے

اور وہ تدبیر وہ ہے جو اس آیت کریمہ میں مذکور ہے یعنی استغفار اور رجوع الی اللہ (اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا) اگر کوئی شبہ کرے کہ یہ تدبیر بھی کی جاتی ہے چنانچہ دعائیں کرتے ہیں گناہوں سے توبہ کرتے ہیں مگر اس سے بھی کچھ نہیں ہوا تو صاحبو! جواب یہ ہے کہ خود آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تدبیر کرنے والے بہت ہی کم ہیں تو یہ کیا تدبیر ہوئی کہ ایک نے تو تدبیر کی اور زیادہ اس کی ضد اور خلاف کریں یعنی ایسے اعمال کریں کہ الٹا اثر ہو اور اثر غالب ان ہی لوگوں کا ہوتا ہے جو زیادہ ہوں چنانچہ حدیث میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اَنُهْلِکُ وَفِیْنَا الصّٰلِحُوْنَ (کیا ہلاک کردو گے حالانکہ ہمارے درمیان نیک آدمی بھی ہیں) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا نعم اذا کثر الخبث (الصحیح لمسلم: ۱۰۲۷، سنن الترمذی: ۲۱۸۷) (ہاں جب خبیثوں کی کثرت ہو جائے) پس جب زیادہ سوء تدبیر کے مرتکب ہیں تو باوجود بعض قلیل کے تدبیر کرنے کے مصائب کا نزول کیا محل شبہ رہا باقی یہ بات کہ ان صلحاء پر تو وہ مصیبت نہ آنا چاہیے سو بعض حکمتوں سے عادۃ اللہ یہ ہے اس حالت میں دنیا میں جو مصیبت آتی ہے اس میں سب ہی شریک ہوتے ہیں ہاں آخرت میں اپنے اپنے اعمال کے موافق محشور ہوں گے اور دنیا میں بھی وہ شرکت ظاہری حقیقت میں رحمت ہی ہوتی ہے سو بعض صلحاء کے اعتبار سے تو یہ جواب ہے اور بعض صلحاء کے اعتبار سے دوسرا جواب ہے۔

اس زمانہ کے اکثر صلحاء مداہن ہیں

وہ یہ کہ اس زمانہ کے بعض صلحاء بھی منکرات کو دیکھتے دیکھتے مداہن (سستی کرنے والے) ہو گئے ہیں اب جو لوگ علماء اور اتقیاء اور صلحاء کہلاتے ہیں باستثنائے خواص اہل اللہ کے اکثر کی کیفیت یہ ہے کہ نافرمانی کرنے والوں سے ان کو انقباض نہیں ہوتا بے تکلف میل جول کھانا پینا شادی بیاہ مرنے جینے میں شرکت اہل معصیت کی کرتے ہیں میں نے سنا ہے کہ یہاں لوگ کوکین بہت کھاتے ہیں مگر کوئی ایک ہی شخص بتلا دیجئے کہ اس نے اپنے کسی عزیز کو صرف اس وجہ سے چھوڑ دیا ہو کہ وہ کوکین کھاتا ہے برابر ملتے جلتے ہیں۔ کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہوتی اسی طرح ہر معصیت کو سمجھ لیجئے۔

نہی عن المنکر سے چشم پوشی پر ایک عبرتناک واقعہ

حدیث شریف میں امم سابقہ کے قصوں میں ایک قصہ وارد ہوا کہ جبرائیل علیہ السلام کو ایک گاؤں کی نسبت حکم فرمایا کہ اس کو الٹ دو۔ عرض کیا کہ اے اللہ فِیھَا فُلَانٌ لَمْ یَعْصِ قَطُّ یعنی اس میں فلاں شخص ہے کہ اس نے کبھی گناہ نہیں کیا حکم ہوا کہ مع اس کے الٹ دو فَاِنَّهٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ وَجْهُهٗ فِیَّ قَطُّ یعنی وہ ہماری نافرمانی دیکھتا تھا اور کبھی اس کے چہرے پر تغیر تک نہیں ہوا۔ دیکھو جو شخص باغیوں سے ملتا ہے وہ بھی باغی ہی شمار ہوتا ہے۔ ایام غدر میں جس نے باغیوں کو پناہ دی سرکار کے نزدیک وہ بھی مجرم شمار ہوا جس کے ہم وفادار ہوں گے تو یہ وفاداری کی بات نہیں ہے کہ اس کے دشمنوں سے ملیں۔ پس اگر صلحاء کہیں ہیں بھی وہ بہت تھوڑے ہیں۔ زیادہ تعداد تو ایسے ہی لوگوں کی ہے جو نافرمانی میں مبتلا ہیں، ہاں کوئی یہ ثابت کرے کہ بستی صالح ہو اور پھر وہاں بلائیں اور امراض اور قحط ہو سو یہ بہت مشکل ہے صلاحیت اور تقویٰ تو بڑی چیز ہے اس کا تو اثر ہی دوسرا ہے برائے نام ہی کوئی تھوڑی دیر کے لئے حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر دیکھ لے کہ کیا رحمت ہوئی۔

صلوٰۃ استسقا کی برکت

دیکھو استسقاء کی دو ہی رکعت ہیں جو بہت سے بہت دس منٹ میں ہو جاتی ہیں لیکن باستثنائے (کبھی کبھار کے علاوہ) شاذ و نادر کے بہت کم ایسا ہوا ہے کہ مؤثر نہ ہوں۔ جب کبھی پڑھی گئی ہیں بارش ضرور ہوئی ہے کوئی رجوع ہو کر دیکھے تو۔

مقام سندیلہ کی نماز استسقا کا قصہ

سندیلہ ایک مقام ہے وہاں ایک مرتبہ امساک باراں ہوا قحط ہو گیا۔ مخلوق بہت پریشان ہوئی۔ استسقاء کی نماز کئی روز پڑھی گئی بارش نہ ہوئی وہاں کے رؤسا کے پاس بازاری عورتیں آئیں اور انہوں نے عرض کیا کہ صاحبو! یہ سب ہماری بداعمالی کے نتیجے ہیں ہم تباہ کار سیہ رو ہیں ہماری نحوست سے تم کو بھی یہ پریشانی ہوئی ہم کو اجازت دے دیجئے کہ ہم بھی میدان میں جمع ہو کر توبہ کریں لیکن جب ہم جمع ہوں تو ایسا انتظام کر دیجئے کہ وہاں جنگل میں کوئی شخص ہمارے پاس نہ آوے ایسا نہ ہو کہ بجائے رحمت کے اور زیادہ غضب نازل ہو۔ چنانچہ انتظام کر دیا گیا اور وہ سب وہاں گئیں اور سجدے میں پڑ کر رونا شروع کیا اور کہا کہ اے اللہ یہ ہماری نحوست ہے ہم بہت گنہگار ہیں ہم بہت سیہ رو ہیں ہماری وجہ سے مخلوق کو پریشان نہ کیجئے اور جو کچھ بن سکا حق تعالیٰ کی

جناب میں عرض کیا حق تعالیٰ کو عاجزی پسند ہے ناقل اس حکایت کے یوں کہتے تھے کہ انہوں نے سر نہیں اٹھایا تھا کہ بارش شروع ہوئی اور خوب ہوئی مولانا فرماتے ہیں ۔

ما بروں را ننگریم وقال را ما دروں را بنگریم وحال را

(ہم ظاہر اور قال کو نہیں دیکھتے ہم باطن اور حال کو دیکھتے ہیں)

یعنی ہم ظاہر کو اور الفاظ کو نہیں دیکھتے اگر الفاظ لمبے چوڑے باضابطہ ہوں لیکن خشک ہوں دل میں کچھ نہ ہوا حق تعالیٰ کے نزدیک ان کا کچھ مرتبہ نہیں ہم تو دل کو اور حال کو دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ تقویٰ طہارت پر کسی کو ناز نہ ہو ہمارے دربار میں تقویٰ طہارت جب ہی مقبول ہے جبکہ اس میں عبدیت اور خشوع خضوع ہو اور خشک تقویٰ ہمارے دربار میں قابل قدر نہیں ہے۔

موضع لوہاری کی صلوٰۃ استسقا کا قصہ

موضع لوہاری میں ایک مرتبہ اسی طرح امساک کی وجہ سے مسلمانوں نے استسقا کی نماز کی تیاری کی۔ بنئے دیکھ کر کہتے تھے کہ اب کے تو بارش ہے ہی نہیں یہ فضول کوشش کر رہے ہیں مسلمانوں نے دعا کی اے اللہ ہم کو ان کے سامنے ذلیل نہ کر۔ ابھی دعا ہی میں مشغول تھے کہ بارش شروع ہوئی۔ وہی بنئے کہنے لگے کہ یہ مُسلے (مسلمان) رام جی کو بہت جلدی راجی (راضی) کر لیں ہیں۔ پس جبکہ باوجود ہماری اتنی کوتاہیوں کے تھوڑی سی توجہ میں بھی رحمت ہو جاتی ہے تو اگر ہم پوری اپنی اصلاح کر لیں اور دل سے توبہ اور رجوع الی الحق کریں تو کیسے رحمت نہ ہوگی ۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

(کوئی شخص ایسا نہیں کہ عاشق ہوا ہو اور محبوب نے اس کے حال پر نظر نہ کی ہو، اے صاحب (تمہیں) درد ہی نہیں ہے ورنہ طبیب موجود ہے) پس یہ فرض محال ہے کہ ہم سب نیک ہوں اور بارش نہ ہو!

کامیابی کی حقیقت

اور بالفرض اگر نہ بھی ہو تب بھی یوں نہ کہیں گے کہ ناکامی ہوئی۔ اس کو ناکامی کہنا کامیابی کی حقیقت نہ جاننے سے ہوا ہے۔ میں کامیابی کی حقیقت بتلاتا ہوں اس سے ناکامی کا علم ہو جائے گا۔ صاحبو روپیہ مل جانا۔ ارزانی کا ہونا۔ روٹی کا ملنا۔ ہر شئے کا حسب دلخواہ ملنا لوگ اس کو کامیابی کہتے ہیں۔ یاد رکھو یہ کامیابی کی صرف صورت ہے کامیابی کی حقیقت نہیں چنانچہ میں ایک مثال عرض کرتا ہوں اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ چیزیں اپنی ماہیت (حقیقت) میں کامیابی نہیں ہیں۔ دو شخص

فرض کیے جاویں ایک شخص تو ایسا ہے کہ ایک لاکھ روپیہ اس کی مِلک میں ہے اور جائیداد ہے نوکر چاکر غرض سب سامان دنیا کا اس کو میسر ہے لیکن اس پر ایک مقدمہ فوجداری کا قائم ہو گیا اور اس میں پھانسی کا حکم ہو گیا۔ اور ایک دوسرا شخص ہے جو اسی کے پڑوس میں رہتا ہے جس کی اوقات یہ ہے کہ وہ ۸/ (آٹھ آنے کا) مزدور ہے۔ مزدوری کی اور کھا کر اپنے بیوی بچوں میں سو رہا۔ یہ امیر آدمی ہمیشہ اس کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اگر آج اس امیر کو یوں کہا جاوے کہ تم کو ایک صورت سے خلاصی ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم اپنا سارا سامان اس شخص کو دے دو بجائے تمہارے یہ اُس جرم کا اقرار کر لے گا اور اس کو پھانسی ہو جاوے گی اور تم بچ جاؤ گے مگر اس کے بعد ناداری سے تمہاری حالت ایسی ہو جائے گی جیسی اس شخص کی ہے تو وہ امیر یقیناً یہی کہے گا کہ اس سامان کی کیا حقیقت ہے اگر اس سے دونا بھی میرے پاس ہو اور وہ دے کر میری جان بچے تو میں راضی ہوں۔ اور اگر اس غریب کو کہا جائے کہ تم کو اتنا روپیہ اور سامان ملتا ہے لیکن تمہاری جان لی جاوے گی وہ کہے گا کہ جب میری جان ہی گئی تو میں اس سامان کو لے کر کیا کروں گا۔ سو صاحبو اگر یہ روپیہ اور جائیداد اور مکانات ہی کامیابی اور مقصود اصلی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ آج ان کو وہ شخص کامیابی کیوں نہیں سمجھتا اور ان کے دینے پر کیوں راضی ہے اور وہ غریب آدمی کیوں ان کے لینے پر راضی نہیں ہوتا۔

مال و جائیداد کامیابی کی صورت ہے

پس معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں کامیابی کی صورتیں ہیں حقیقت کامیابی کی اور شئے ہے وہ کیا ہے راحتِ قلب چونکہ مال سے راحت ہوتی ہے اس لئے وہ مقصود ہے بالذات مقصود نہیں ورنہ ہر حالت میں مقصود ہوتا۔ چنانچہ اس واقعہ نے ثابت کر دیا کہ خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم (جو کچھ ہم نے گمان کیا واقع میں غلطی تھی)

اصلی مقصود راحتِ قلب ہے

پس بڑی چیز اور اصلی مقصود راحتِ قلب ہے اسی واسطے وہ دو لاکھ روپیہ دینے پر بے تکلف اور دل سے راضی بلکہ مصر ہے اور وہ آٹھ آنے کا مزدور ان پر تھوکتا بھی نہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو اب ہم اس شبہ کا جواب دیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ راحت اور سکون حقیقی جو حقیقت ہے کامیابی کی صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے پس اس لئے میں نے کہا تھا کہ اصلاح وتقویٰ کے اختیار کرنے کے بعد اگر بارش وغیرہ بھی نہ ہو اور ظاہراً مصیبت بھی دور نہ ہو تب بھی یوں نہ کہیں گے کہ ناکامی

ہوئی۔اس حالت میں بھی کامیابی ہی ہے اس لئے کہ اس شخص کو اس مصیبت میں بھی پریشانی نہ ہوگی راحت اور سکون ہی ہوگا اور یہ نرا دعویٰ ہی نہیں ہے کہ راحت منحصر ہے اطاعت میں۔

اہل طاعت کی حالت کا مشاہدہ کر لیجئے کہ ان کو کوئی شئے پریشان نہیں کرتی ان کا قلب ہر وقت مطمئن ہے اور جو کچھ حق تعالیٰ کی جانب سے پیش آتا ہے وہ اس پر دل سے راضی ہیں خواہ وہ نعمت ہو یا نقمت (مصیبت) ہو۔ارزانی ہو یا گرانی، بارش ہو یا نہ ہو اور وہ اسی کو دل سے کامیابی سمجھتے ہیں۔پس یہ ثابت ہوگیا کہ اگر سب نیک ہوں اور پھر بھی بارش نہ ہو تب بھی اس کو ناکامی نہ کہیں گے بلکہ وہی عین کامیابی ہے اس لئے کہ قحط اور امساک باراں اسی وقت مصیبت ہے جبکہ اس سے پریشانی ہو اور جبکہ وہ ہر حالت میں راضی ہیں تو ان کے لئے یہ مصیبت ہی نہیں۔میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سب اگر اصلاح کر لیں تو اس کا کہنا ہی کیا ہے اگر ایک شخص بھی اپنی اصلاح کر لے تو وہی کامیاب ہو جاوے گا اس کو ہر گز پریشانی نہیں رہے گی کیونکہ خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری میں جو راحت ہے وہ کسی شئے میں بھی نہیں ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اہل اللہ کو حق تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی محبت کا اثر

اور محبت وہ شے ہے کہ تمام تلخیوں کو شیریں کر دیتی ہے اور حق تعالیٰ کی محبت میں یہ اثر کیسے نہ ہوگا۔مجازی عشق میں یہ اثر ہوتا ہے کہ تکلیف کو راحت بنا دیتا ہے مثلاً کسی پر عاشق ہو اور آپ چلے جا رہے ہوں کہ پیچھے سے کسی نے ایک گھونسہ بڑی زور سے ایسا رسید کیا کہ بڑی تکلیف واذیت ہوئی پیچھے پھر کر جو دیکھا تو دیکھتے کیا ہیں کہ وہ گھونسہ مارنے والا وہ شخص ہے جس کے دیکھنے کی برسوں سے تمنا تھی اور غیبت میں جس کا نام لے کر دل کو تسلی دیا کرتا تھا جیسے ایک حکایت ہے۔

دید مجنوں را یکے صحرانورد　　در بیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم　　می نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت ای مجنونِ شیدا چیست ایں　　می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلیٰ می کنم　　خاطرِ خود را تسلی می کنم

(کسی نے مجنوں کو جنگل میں تنہا دیکھا کہ غمگین بیٹھا ہوا ہے کہ ریت پر انگلی سے کسی کو خط لکھ رہا ہے پوچھا اے مجنوں کسے خط لکھ رہے ہو کہنے لگا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر کے اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں)۔

جس کا نام ہی بجائے مستّی کے تھا اب وہ سامنے جلوہ افروز ہے۔اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس حالت میں کیا اس گھونسہ کی اس کو تکلیف ہوگی۔اگر عشق میں سچا ہے تو یوں کہے گا کہ ایک

گھونسہ نہیں تم میرے دس گھونسے لگا کر مگر میرے سامنے رہو جسم کو تو اس کے تکلیف ضرور ہو گی لیکن قلب تو یہی کہے گا۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے)۔

اور یہ کہے گا۔

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من   دل فدائے یار دل رنجانِ من

(تیرا ناخوش ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے ایسے محبوب پر دل قربان ہے جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے)۔ اور یہ کیوں ہے محض اس لئے کہ یہ محبوب کی جانب سے ہے

ع از محبت تلخہا شیریں بود (محبت میں تلخیاں بھی شیریں ہیں)

جب مخلوق کی محبت میں یہ حالت ہے تو۔

عجب داری از سالکان طریق   کہ باشند در بحر معنی غریق

خوشا وقت شوریدگان غمش   اگر ریش بینند دگر مرہمش

گدایا نے از بادشاہی نفور   بامیدش اندر گدائی صبور

دمادم شراب الم درکشند   وگر تلخ بینند دم درکشند

(تو سالکانِ طریق سے جو کہ حقیقت کے دریا میں غریق ہیں تعجب کرتا ہے اس کے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر غم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے اور اس کی امید پر فقیری میں کرنے والے ہیں ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں جب اس میں رنج کی تلخی دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں)۔

جب کہ تمہارے جیسا آدمی جو تمہاری مثل خون اور کھال اور گوشت پوست سے بنا ہے تمہاری یہ حالت بنا دیتا ہے تو صاحبو! محبوب حقیقی کے عشق میں تو یہ اثر کیسے نہ ہوگا۔ پس کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ بعد اصلاح کے بھی ناکامی ہوتی ہے۔

اہل اللہ کے مصائب میں پریشان نہ ہونے کا سبب

رہی یہ بات کہ اگر محبوب ہی کی یہ مرضی ہو کہ مصیبت میں پھنسا رہے پھر تو کامیابی ہونا اور مصیبت سے نکلنا ممکن ہی نہیں تو پھر کامیابی کدھر سے ہوئی۔ بات یہ ہے کہ میرا مقصود صرف یہ ہے

کہ ان کو اطمینان اور چین اور سکون ہر وقت رہتا ہے اس کا نام میں نے باعتبار حقیقت کے کامیابی رکھا ہے۔ میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ مصائب ان پر نہیں آتے مصائب صوریہ آتے ہیں مگر اس سے وہ پریشان نہیں ہوتے از جارفتہ نہیں ہوتے اور کیوں ہوں اس لئے کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ بندہ کے واسطے وہی کرتے ہیں جو اس کے لئے بہتر ہو حق تعالیٰ کو ماں سے زیادہ شفقت ہے۔

طفل می لرزد زنیش اِحتجام　　　مادرِ مشفق ازاں غم شاد کام

(بچہ نشتر لگوانے سے لرزتا ہے مگر مشفق ماں اس سے مطمئن اور خوش ہوتی ہے)۔

خدا تعالیٰ ان کو مریض رکھیں یا تندرست مفلس رکھیں یا امیر مگر ان کو ذلیل اور پریشان نہیں کرتے اس کے خلاف کہیں بتلاؤ تب شبہ کی گنجائش ہے بہرحال ثابت ہوگیا کہ ان مصیبتوں سے بچنے کی تدبیر حقیقی صرف اطاعت کاملہ ہے پس اس تدبیر کو اختیار کرو اور دین کی طرف توجہ کرو اور اس کے طریقہ سے توجہ کرو۔

دین کی طرف صحیح طریق سے متوجہ ہونے کی ضرورت

بہت لوگ اس کے متعلق بھی غلطیوں میں مبتلا ہیں یعنی اگر دین کی طرف آتے ہیں تو نئے رنگ سے اور جو اس کا اصلی طریق ہے اس طریقہ پر نہیں چلتے۔ مثلاً کسی بزرگ سے کہتے ہیں کہ حضرت کوئی ایسی تدبیر کیجئے کہ گناہ مجھ سے نہ ہوں۔ گویا حضرت کے پاس کوئی زنجیر ہے کہ آپ کو اس میں جکڑ دیں گے تو گویا وہ نرے بزرگ ہی نہیں بلکہ کوتوال یا داروغہ جیل بھی ہیں۔

ایک معقولی مولوی صاحب تھے ان کے ملنے کے لئے ایک خان صاحب رئیس آئے اور وہ رئیس مستاجری پر گاؤں لیا کرتے تھے مولوی صاحب نے پوچھا خان صاحب گاؤں کا انتظام کس کے سپرد کر آئے خان صاحب نے فرمایا کہ بڑے پیر صاحب کے سپرد کر دیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا آہا ہم تو یہ سمجھا کرتے تھے کہ بڑے پیر صاحب نرے ولی ہیں معلوم ہوا کہ وہ گاؤں کے پدہان بھی ہیں۔ ظاہر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولوی صاحب بڑے گستاخ تھے اور واقع میں گستاخ وہ خان صاحب تھے کہ بڑے پیر صاحب کو انہوں نے ایسے لغو کام کا سمجھا تو ایسے ہی ہمارے بھائی اول تو دین کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اگر کچھ ضروری شوق ہوتا ہے تو ایسی بے ہودہ فرمائشیں کرتے ہیں۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی　　　تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

بعضے کہتے ہیں کہ حضرت اپنے سینہ میں سے کچھ دید یجئے گویا ان کے پاس کوئی پڑیہ ہے کہ وہ

اس میں سے تم کو بھی دیدیں گے۔ ایک بزرگ نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ جس کے سینہ میں سے تم مانگتے ہو یہ دیکھو کہ اس کے سینہ میں کیونکر آیا۔ برسوں مجاہدے کئے محنتیں کیں، خدمتیں کیں اپنے حظوظ نفسانیہ پر خاک ڈالی جب کچھ ملا سو تم بھی اسی طرح کرو۔

صوفی نشود صافی تا درنکشد جامے　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے، پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)۔

بڑے بڑے سفر سے مراد مجاہدے اور مشقتیں ہیں اتنے مجاہدے کے بعد خامی گئی ہے۔ غرض یہ نرا خبط ہے بعضے دانشمند ایسے لوگوں کا علاج بھی کر دیتے ہیں، جیسے ایک ظریف سیاح شاہ صاحب کی نسبت ایک خان صاحب کو خیال ہوگیا کہ یہ کیمیا جانتے ہیں، آئے اور بات شروع ہوئی ۔خان صاحب! السّلام علیکم ۔شاہ صاحب وعلیکم السّلام ۔خان صاحب، شاہ صاحب میں نے سنا ہے آپ کیمیا جانتے ہیں ۔شاہ صاحب ہاں جانتے ہیں ۔خان صاحب ۔ہم کو بھی بتلا دو۔ شاہ صاحب ۔نہیں بتلاتے تمہارے باوا کے نوکر ہیں ۔پھر تو خان صاحب کو اور بھی زیادہ اعتقاد بڑھا اور منت کرنے لگے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ خان صاحب جس طرح ہم نے سیکھی ہے اس طرح سیکھو خدمت کرو پاؤں دباؤ حقے بھرو جو ہم کھلاویں وہ کھاؤ اور جو ہم کہیں وہ کرو۔ اگر کبھی مزاج خوش ہوگا اور دل میں آجائے گا بتادیں گے۔

خان صاحب راضی ہوگئے۔ رات ہوئی شاہ صاحب نے کچھ گھاس پھونس اُبال کر خان صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ خان صاحب نے ایسا کھانا کب کھایا تھا ذرا ناک چڑھانے لگے۔ شاہ صاحب نے کہا ابھی تو اوّل ہی منزل ہے۔ جب خان صاحب نے یہ رنگ دیکھا تو کیمیا سے عمر بھر کے لیے توبہ کی۔

صاحبو! خدمتیں کرو۔ محنتیں کرو خدا تعالیٰ فضل فرمانے والے ہیں ۔طلب کا تو یہ حال پھر چاہتے ہو کہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے مل جائے یہ تو طریق بزرگی کے متعلق کلام تھا۔ اب اس کے ثمرات کے متعلق لیجئے کہ۔

خواب بزرگی کے ثمرات میں سے نہیں

بزرگی کے ثمرات اپنے ذہن میں کیا سمجھ رکھے ہیں مثلاً اگر کوئی اچھا خواب نظر آ گیا بس یہ بزرگی ہے اور اگر خواب بند ہوگئے سمجھ گئے کہ بزرگی ہماری جاتی رہی۔ میرے پاس بہت خطوط

خوابوں کے متعلق آتے ہیں میں تو جواب میں یہ شعر لکھ دیتا ہوں ۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　　چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(نہ شب ہوں نہ شب پرست جو خواب کی تعبیر بیان کروں محبوب حقیقی کا غلام ہوں اسی کی باتیں بیان کرتا ہوں)۔

جو دریافت کرو بیداری کی حالت پوچھو۔ خواب تو اگر یہ بھی دیکھ لو کہ سوار کا گوشت کھایا ہے واللہ ذرہ برابر تم کو بُعد نہیں ہوا اور اگر خواب میں یہ دیکھو کہ ہم جنت میں ہیں واللہ اس سے کچھ قرب نہیں ہوا۔ بہر حال کام کرو۔ کام کرنے سے کچھ ملتا ہے اور سینہ میں کیا دھرا ہے ہاں سینہ میں تو بلغم ہے وہ تم کو دے دیں گے۔

بزرگوں کی مجلس میں دنیا بھر کی خبریں سنانا لغو حرکت ہے

اور بعضے لوگ اس طرح دین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ دنیا لے کر بزرگوں کے پاس جاتے ہیں۔ کیا معنی کہ بزرگوں کے پاس جائیں گے اور ان کا وقت بھی ضائع کریں گے اور دنیا بھر کے قصے وہاں بیان کریں گے۔ حضرت بمبئی میں یہ ہو رہا ہے۔ روم میں یہ قصہ ہوا۔ روس میں واقعہ ہوا۔ صاحبو! تم کو روم روس کے قصوں سے کیا لینا ہے۔ خود تمہارے اندر ایک روم، روس ہے کہ ان میں روزانہ جنگ رہتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

اے برا در عقل یک دم با خود آر　　دمبدم در تو خزاں است و بہار

(ارے بھائی تھوڑی دیر کے لئے ذرا عقل درست کر کے دیکھ خود تیرے اندر دمبدم خزاں و بہار موجود ہے)۔

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ　　تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو)۔
حکیم سنائی کہتے ہیں ۔

آسماں ہاست در ولایت جاں　　کار فرمائے آسمانِ جہاں

در رہ روح پست وبالا ہاست　　کوہ ہائے بلند وصحرا ہاست

(ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو ظاہری آسمان میں کارفرما ہیں روح (باطن) کے راستہ میں پست و بالا (نشیب و فراز) کوہ و صحرا موجود ہیں)۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

وانت الکتاب المبین الذی با حرفہ یظھر المضمر

وتزعم انک جرم صغیر وفیک الظوی العالم الاکبر

(اور تو مثل ایسی روشن کتاب کے ہے جس کے حرفوں سے مضمر باتیں ظاہر ہوتی ہیں تو اپنے آپ کو جسم صغیر سمجھتا ہے حالانکہ تیرے اندر بڑا جہان لپٹا ہوا ہے)۔

صاحبو! تمہارے اندر سب کچھ ہے روم بھی ہے روس بھی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں مکان بنے ہوئے ہیں مقصود یہ ہے کہ جب تم روم روس کی لڑائی دیکھو یا سنو تو اپنے اندر روح و نفس کی لڑائی کے متعلق بھی غور کیا کرو کہ تم پر تمہارا نفس غالب ہے یا روح غالب ہے یہ کیا ظلم و ستم ہے کہ بیرونی لڑائیوں کے تو تذکرے کرو اور اپنے اندر جو لڑائی ہے اس سے غفلت ہو۔

ماقصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر و دارا کے قصے نہیں پڑھے ہیں ہم سے محبت اور عشق کی باتوں کے سوا کچھ نہ پوچھو)۔

یاد رکھو اگر اس سے غفلت میں رہے تو بہت پچھتاؤ گے۔ یہاں تو ناکامی ہو ہی رہی ہے وہاں بھی ناکام رہو گے۔ بہت جلدی اصلاح کرلو۔

اصلاح کا طریق

اس آیت میں اس کا طریقہ مذکور ہے اور وہ طریقہ مرکب ہے دو جزو سے اور ان دونوں میں ترتیب بھی ہے اوّل تو یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے معافی مانگو مگر معافی مانگنا یہ نہیں کہ صرف زبان سے استغفر اللہ استغفر اللہ کہہ لیا یہ تو نقل ہے معافی مانگنے کی جیسے کسی فارسی دیہاتی نے کسی واعظ سے سنا کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی تو آپ فرماتے ہیں۔

''بارہا کردیم وشد نماز'' (ایسا ہم نے بہت مرتبہ کیا اور نماز ہوگئی)

نام اٹھنے بیٹھنے کا سمجھے۔ ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ ایک عورت اور مرد میں یہ رشتہ ہے ان کا نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں۔ فرمایا کہ نہیں ہوسکتا۔ کہنے لگا کہ ہم نے تو کیا تھا ہوگیا۔ نہ ہونے کا مطلب یہ سمجھا کہ الفاظ ایجاب و قبول کے منہ سے نہ نکل سکیں گے بس جیسی یہ نماز اور نکاح ہوا تھا ایسے ہی ہم لوگوں کا استغفار بھی ہے۔ صاحبو ہر گناہ کے استغفار کا طریقہ جدا ہے گناہوں کو دیکھو کہ کیا ہیں۔

حقوق العباد کا استغفار

اگر حقوق العباد ہیں ان کی استغفار یہ ہے کہ ان کو ادا کرو ان کی معافی استغفار پڑھنے سے نہ ہوگی۔ اگر روزے نماز ذمہ پر ہیں ان کی استغفار یہ ہے کہ ان کی قضا کرو۔ اگر گناہ ہیں ان کی توبہ کا طریقہ استغفار مداومت سے پڑھنا ہے نیز توبہ واستغفار کے لوازم میں سے ہے معاصی کا ترک کرنا خواہ دیانات کے متعلق ہوں یا معاملات کے۔

آمد وخرچ کے خلافِ شرع ذرائع

مثلاً آج کل اکثر لوگ آمدنی وخرچ کے طریقوں میں حدود شریعت کا لحاظ نہیں رکھتے۔ اس زمانہ میں آمدنی کے بہت سے طریقے خلاف شرع شائع ہوئے ہیں کہ جوئے یا ربوٰا سے خالی نہیں۔ دیوالی کی رات میں جو جواء کھیلا جاتا ہے اس کو تو بُرا سمجھتے ہیں لیکن آج کل سٹہ جو چل رہا ہے اس سے پرہیز نہیں کرتے ان سٹہ والوں میں بہت لوگ ایسے ہیں کہ نمازی اور داڑھی لمبی ٹخنوں سے اوپر پاجامہ ہاتھ میں تسبیح بڑے متقی لیکن سٹہ سے ان کا تقویٰ نہیں ٹوٹتا۔ یاد رکھو یہ بالکل جوا ہے اسی طرح چٹھیاں جو پڑتی ہیں یہ بھی جوا ہے۔ اس سے بڑھ کر بیمہ کمپنیاں جو نکلی ہیں وہ بھی حرام ہیں۔ ان کے تو شروع ہی میں بیم آگیا ہے (یہ لطیفہ ہے ۱۲ جامع) اور شادی فنڈ اور جان بیمہ اور ایک قسم کے ٹکٹ کی تقسیم کا سلسلہ یہ سب حرام وقمار جواء اور ربوٰا ہیں اور ان میں سخت دھوکہ بھی ہے۔ شریعت میں کوئی معاملہ پیچیدہ نہیں اور ان طریقوں میں سخت پیچیدگی اور دھوکہ ہے۔ یہ تو آمدنی کے طریق ہیں اور خرچ کے اندر تو کچھ باک ہی نہیں جہاں چاہتے ہیں تنعّمات میں فضول سامان میں ناموری کے کاموں میں بے دھڑک خرچ کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں اپنی شئے ہے۔ جس طرح چاہیں صرف کریں۔

کوکین کھانے کی خرابیاں

اور سب سے زیادہ گندہ مصرف جو اس شہر میں کثرت سے ہے کوکین کھانا ہے۔ اس کوکین سے سینکڑوں گھر برباد ہو گئے ظاہر میں تو ذرا سی چیز ہے لیکن مفاسد اس کے کثیر ہیں شیطان کا شیرہ ہے۔ شیطان کو کسی نے کہا تھا کہ تو بڑا ملعون ہے گناہ کراتا ہے اس نے کہا میں کیا گناہ کراتا ہوں میں تو ذرا سی بات کرتا ہوں لوگ اس کو بڑھا دیتے ہیں دیکھو میں تم کو تماشا دکھلاتا ہوں۔ ایک دوکان پر پہنچے۔ ایک انگلی شیرہ کی بھر کر دیوار کو لگا دی اس پر ایک مکھی آ بیٹھی ایک چھپکلی اس پر جھپٹی اس پر دوکاندار کی بلی دوڑی اس پر ایک خریدار کا جو کہ فوجی سوار تھا کتا لپکا۔ دوکاندار نے اس کتے

کے ایک لکڑی ماری۔ سوار کو غصہ آیا اس نے دوکاندار کے ایک تلوار ماری بازار والوں نے انتقام میں سوار کو قتل کر ڈالا۔ فوج میں خبر ہوئی فوج والوں نے بازار کو گھیر کر قتلِ عام شروع کرا دیا۔ بادشاہ وقت نے دوسری فوج سے ان ظالموں کو سزا میں قتل شروع کر دیا۔ ایک گھنٹہ میں تمام شہر میں خون کے ندی نالے بہہ گئے۔ شیطان نے کہا دیکھا میں نے کیا کیا تھا اور لوگوں نے اس کو کہاں تک پہنچا دیا۔ اسی طرح یہ کوکین بھی شیطان کا شیرہ ہے جب تک اپنے پاس روپیہ رہتا ہے اس کو خرید کر کھاتے ہیں جب وہ ختم ہو جاتا ہے تو اثاث البیت بیچ کر کام چلاتے ہیں جب وہ بھی ختم ہو گیا تو بیوی کا زیور پھر جائیداد اور گھر غرض سب اڑا دیتے ہیں۔ جب اپنا سرمایہ ختم ہو لیا پھر پڑوسیوں پر صفایا شروع کر دیا۔ کسی کے برتن اٹھا لئے کسی کے یہاں نقب دے دی آخر جیل خانہ میں چلے جاتے ہیں وہاں مفت کی روٹیاں کھاتے ہیں، گھر رہنے میں تو کچھ فکر بھی تھی وہاں کچھ فکر ہی نہیں، بعضے ایسے بے حیا ہوتے ہیں کہ جیل خانہ سے جب چھوٹتے ہیں تو کہہ کر آتے ہیں کہ ہمارا چولہا باقی رکھنا ہم پھر آئیں گے۔ غرض یہ کوکین بڑی بلا کی شئے ہے اور ہزاروں اس میں مبتلا ہیں اور تعجب ہے کہ سب بلائیں اور مصیبتیں اٹھاتے ہیں لیکن چھوڑتے نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ چھوٹتی نہیں۔ صاحبو! جب ہمت قوی کر لی جائے تو سب چھوٹ جاتی ہے۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ کے باہمت مخلص مُرید کا قصّہ

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک گاؤں کا رہنے والا مرید ہونے کے لئے آیا۔ حضرت نے کلمات بیعت کے کہ جن کا کنہ حاصل معاصی سے توبہ ہے کہلا دیئے۔ جب توبہ کر لی تو کہتا ہے کہ مولوی جی افیم سے تو توبہ کرائی ہی نہیں، حضرت نے فرمایا مجھے کیا خبر کہ تو افیون کھاتا ہے۔ اچھا یہ بتلا کتنی کھاتا ہے، جس قدر رکھانا ہو میرے ہاتھ پر رکھ دے مگر اس نے جیب میں سے افیون کی ڈبیہ نکال کر دور پھینکی کہ مولوی جی جب توبہ ہی کر لی تو اب کیا کھائیں گے گھر گیا تو دست شروع ہوئے اس نے مولانا سے کہلا کر بھیجا کہ حضرت دعا کیجئے اچھا ہو جاؤں چندروز کے بعد تندرست ہو کر پھر آیا۔ دو روپیہ حضرت کی خدمت میں پیش کئے حضرت نے بعد انکار کے اس کے اصرار سے قبول فرمائے کہتا ہے حضرت جی یہ تو آپ نے پوچھا ہی نہیں کہ یہ روپیہ کیسے ہیں حضرت نے فرمایا بتلاؤ کیسے ہیں، کہا افیم کے ہیں پوچھا افیم کے کیسے کہنے لگا کہ میں دو روپیہ ماہوار کی افیون کھاتا تھا، جب میں نے افیون چھوڑی تو میرا نفس بہت خوش ہوا کہ دو روپیہ بچیں

گے۔ میں نے کہا کہ میں تیرے لئے نہیں بچاؤں گا۔ میں یہ دو روپیہ اپنے پیر کو دوں گا۔

بظاہر لوگ اس گنوار کو اس کی گفتگو سے غیر مہذب سمجھے ہوں گے۔ حضرت تہذیب نام لکھنؤ اور دہلی کے الفاظ کا نہیں ہے وہ تعذیب ہے تہذیب نام ہے۔ تہذیب نفس کا جس کا بڑا شعبہ خلوص ہے جو اس گنوار میں کمال کے ساتھ حاصل تھا سو آپ نے الفاظ کو تو دیکھا لیکن یہ نہ دیکھا کہ اس گنوار میں کس درجہ کا خلوص اور تکلف اور تصنع سے کتنا دور تھا کہ جو بات تھی بلا تکلف سب کہہ دی مولانا فرماتے ہیں ؎

ما بروں را ننگریم و قال را　　　ما دروں را بنگریم و حال را

(ہم ظاہر اور قال کو نہیں دیکھتے دل کو اور حال کو دیکھتے ہیں)۔

اور اس گنوار کی قوت علمی و عملی پر غور فرمایئے کہ کس درجہ تھی۔ قوت علمی تو فہم اس بات کا کہ نفس کے خلاف کرنا چاہیے اور عملی قوت یہ کہ ایک دم سے ایک مدت کی عادت کو جو سالہا سال کے مجاہدہ سے بھی نہیں چھوٹتی چھوڑ دی (اور پھر حضرت کی قوت فیضان کو بھی ملاحظہ فرمایئے کہ کس درجہ تھی ۱۲ جامع۔)۔ بہر حال یہ نفس کے حیلے حوالے ہیں جب آدمی دل سے ہمت کرتا ہے اور قصد کرتا ہے کسی کام کے چھوڑنے کا تو حق تعالیٰ ضرور امداد کرتے ہیں پس کوئین بھی ہمت کر کے چھوڑ دو۔ اسی طرح اور سب بیہودہ اخراجات ترک کر دو۔ خلاصہ یہ ہے کہ آمدنی اور خرچ کے طرق کی بھی اصلاح کیجئے نیز توبہ و استغفار کا ایک شعبہ اخلاق ذمیمہ کی بھی اصلاح ہے ایک مدلول آیت یعنی اصلاح کے دو جزو میں۔ سے ایک جزو میں تو کلام ہو چکا۔

توبہ کے لوازم

اب دوسرا جزو اصلاح کا جو آیت میں مذکور ہے یہ ہے: ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ یعنی پھر بعد استغفار کے حق تعالیٰ کی طرف طاعت کے ساتھ رجوع ہو جاؤ۔ یہ بھی توبہ کے لوازم سے ہے۔

اصلاح کا ثمر

آگے اس اصلاح کا ثمرہ بیان فرماتے ہیں، يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا یعنی تم پر بارش بہت برسنے والی بھیجیں گے۔ یہ بارش خواہ ظاہر میں ہو یا اگر ظاہر میں دیر بھی ہوگئی تو اس بارش کی روح تو ضرور ہی ہوگی اور اس کو باطن کی بارش کہنا چاہیئے یعنی قلب پر رحمت کی بارش ہوگی جس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے کہ کامیابی کی غایت طمانیتِ قلب و راحتِ روح ہے وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ یعنی دوسرا ثمرہ یہ ہوگا کہ تمہاری موجودہ قوت کو بڑھا دیں گے اس وقت تو قوت مالی و جاہی ہے

اصلاح کے بعد قوت قلب عطا فرماویں گے پھر جو بھی مصیبت آئے گی وہ صورت مصیبت ہوگی اور حقیقت میں یہ حالت ہوگی کہ اس مصیبت پر ہزار راحتیں قربان کروگے اور زبان حال سے کہو گے ۔

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست (جو کچھ محبوب کی جانب سے پیش آئے وہ خیر ہی ہوتا ہے)

آگے ارشاد ہے وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ یعنی اعراض مت کرو مجرم ہو کر مطلق وَلَا تَتَوَلَّوْا نہیں فرمایا۔

تولّی کی قسمیں

اس لئے کہ تولّی کی دو قسمیں ہیں ایک صورت تولّی ایک حقیقت تولّی ۔ صورۃً تو یہ کہ بشریت سے غلطی ہوگئی۔ ایسی غلطیوں سے انسان بچ نہیں سکتا۔ اور حقیقت تولّی ہوتی ہے مقابلانہ وباغیانہ تو فرماتے ہیں کہ باغیانہ تولی مت کرو یعنی باغی مت بنو اور گناہ سے تو کیسے پاک ہو سکتے ہیں لیکن اگر گناہ ہو جائے تو ساتھ کے ساتھ توبہ کرلو۔ حدیث شریف میں ہے كُلُّكُمْ خَطَّاءُ وْنَ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ (مسند احمد ۲: ۱۹۸، سنن الترمذی: ۲۴۹۹) یعنی تم سب خطاوار ہو اور بہتر خطاوار توبہ کرنے والے ہیں۔ یہ تعلیم ہے حق تعالیٰ کی اور یہ طریقہ وہ ہے کہ جس سے قومی مالی جسمی ، دینی دنیوی ترقی ہے اس کو پلے باندھو یا د رکھو کہ ہماری دینی دنیوی فلاح دین کے ساتھ وابستہ ہے جب کبھی اس کے خلاف ہوا ہے تنزل اور پستی اور ادبار اور قحط سب ہی بلائیں مساط ہو جاتی ہیں۔

اب حق تعالیٰ سے دعا کرو کہ حق تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں، آمین ثم آمین۔

آثار الحوبة
فی
اسرار التوبة

یہ وعظ

گناہ کے مفاسد اور توبہ کے دینی و دُنیاوی فوائد کے متعلق
یکم جمادی الاول ۱۳۵۰ھ بروز شنبہ حضرت حکیم الامت
تھانویؒ کے چھوٹے دولت خانہ پر بیٹھ کر تقریباً اڑھائی
گھنٹہ بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً سو مَرد اور خواتین
پَردہ میں اس کے علاوہ تھیں مولانا حمید حسن دیوبندیؒ نے
قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ (دَائِمًا اَبَدًا کَمَا یُحِبُّ وَیَرْضٰی ۱۲)

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

ترجمہ: اے ایمان والو اللہ کے سامنے سچی توبہ کرو امید ہے کہ تمہارا رب تمہارے گناہ معاف کردے گا اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور یہ اس روز ہوگا جس روز اللہ تعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور جو مسلمان ان کے ساتھ ہیں ان کو رسوا نہ کرے گا ان کا نور ان کے درمیان اور ان کے بائیں دوڑتا ہوگا کہتے ہیں اے ہمارے رب پوری کردے روشنی ہماری ہم کو اور معاف کر ہم کو بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

کچھ عرصہ وعظ نہ بیان فرمانے کا سبب

قبل اس کے کہ میں بیان کرنا شروع کروں ایک چھوٹا سا واقعہ عرض کردینا مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ کہ اس وقت آپ حضرات کو شاید اس کا انتظار ہوگا کہ اب بھی حسب طرز سابق وعظ بیان کیا جائے گا۔ اور میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر شاید تعجب بھی ہوا ہو کیونکہ وعظ کے وقت کتاب ہاتھ میں لینے کا میرا پہلے معمول نہ تھا۔ تو بات یہ ہے کہ مدت ہوئی وعظ کا اتفاق نہیں ہوا چنانچہ اس وقت بھی متعارف طریق سے وعظ نہ ہوگا بلکہ کتاب میں دیکھ کر احادیث کو ترجمہ ومطلب بیان کروں گا اور چونکہ وہ بیان احادیث سے ہوگا اور میں حافظ حدیث ہوں نہیں اس واسطے کتاب ہاتھ میں لی ہے اور وجہ اس تبدیل طرز کی یہ ہے کہ چندروز سے طبیعت میں ایک قسم کا تغیر (تبدیلی) ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے وعظ بالکل ترک ہوگیا ہے۔ مگر وہ ایسا تغیر ہے کہ میں اس کی پوری حقیقت تو نہیں بتا سکتا مگر اس کا

اثر یہ ہے کہ جو مضمون ذہن میں آتا ہے اس کے پھیلاؤ پر قدرت نہیں اور باوجود قصد کے وہ مضمون بڑھتا نہیں۔ یہ بات ایک مدت سے پیش آرہی ہے اسی وجہ سے وعظ ترک کردیا گیا۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ چونکہ آج کل وعظ کے لکھنے کا کوئی انتظام نہیں اس لئے طبیعت نہیں کھلتی سو یہ وجہ بھی نہیں کیوں کہ پہلے لکھنے والے موجود بھی تھے مگر میری طبیعت اسی وقت وعظ سے ہٹ گئی تھی غرض یہ کہ ایک حالت ہے جو مجھ کو ایک مدت سے پیش آرہی ہے اور جو حالت عبد (بندہ) کو بلا اختیار پیش آتی ہے وہ خیر ہی ہوتی ہے۔ اس لئے گو اس حالت موجودہ کی حقیقت معلوم نہیں مگر چونکہ مجھ کو بغیر میرے اختیار کے پیش آرہی ہے اس لئے امید ہے کہ خیر ہی ہوگی اسی واسطے اس کا قلق بھی نہیں اس عرصہ میں بعض احباب نے فرمائشیں بھی کیں مگر ان سے بھی یہی عذر کردیا گیا۔ لیکن احباب کی طرف سے یہ جواب ملا کہ آپ بیان کا ارادہ تو کیجئے اللہ تعالیٰ مدد فرمائے گا۔

مضمون بیان کرنے کے دو طریق

اور مجھ کو بھی یہ خیال ہوا کہ کسی مضمون کے بیان کرنے کے دو ہی طریقے ہیں ایک تو یہ کہ سوچ سوچ کر بیان کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ بلا تکلف جو ذہن میں آئے بیان کردیا جائے۔ تو گو سوچ کر بیان کرنے کا اتفاق پہلے بھی کم ہوتا تھا میرا پہلے بھی بیان کرنے کا یہی طرز رہا کہ بلا تکلف جو مضمون آیا بیان کردیا اور اس خیال کا مقتضا یہ تھا کہ اس عذر سے اثر نہ لیا جائے مگر پھر بھی اس وقت کی حالت اور موجودہ حالت میں تفاوت (فرق) معلوم ہوتا ہے وہ تفاوت یہ ہے کہ پہلے سوچنا گو تفصیلاً نہ تھا مگر اجمالاً تو تھا۔ اور اس وقت اس اجمال پر بھی قدرت نہیں۔ بس اس وقت تو اتنی ہی قدرت ہے اور یوں ہی دل چاہتا ہے کہ مختصر باتیں ہوتی رہیں جس میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کچھ وقفہ بھی ہوتا رہے۔ کچھ میں نے تقریر کی کچھ احباب نے اور اہل جلسہ نے گفتگو کی اور اس طرح سوال و جواب میں وقت پورا ہوگیا تو وہ تفاوت یہ ہے جس کو میں اپنے اندر ایک مدت سے محسوس کررہا ہوں۔

ایک وجدانی امر

اور وہ ایک وجدانی (دریافت کرنے کا) امر ہے جس کو میں پورے طور پر سمجھا نہیں سکتا کہ وہ کیا تفاوت ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ تو گو میری معذوری واقعی تھی مگر جب احباب فرمائش کرتے تھے تو ان کی فرمائش پوری نہ ہونے سے بھی قلق ہوتا تھا۔ چنانچہ اس وقت سب سے پہلے ایک دوست کے صاحبزادے نے فرمائش کی اور یہ ایک گونہ ان کا احسان تھا کہ وہ کام جو میرا تھا اس کی درخواست ان

کے دل میں پیدا ہوئی۔ مگر انہوں نے اس عنوان سے درخواست کی کہ آپ نے پہلے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب تمہارے والد صاحب آئیں گے اس وقت بیان کر دیا جائے گا۔ اور قصہ یہ ہے کہ یہ تو مجھ کو یاد ہے کہ انہوں نے پچھلے زمانہ میں مجھ سے وعظ کی درخواست کی تھی مگر یہ یاد نہیں رہا کہ میں نے ان کو کیا جواب دیا تھا مگر میں مسلمان کو سچا سمجھتا ہوں اور اگر مجھ کو اپنا وعدہ یاد ہوتا تو پھر میں خود ہی تحریک کرتا اور ایفاء وعدہ کے لیے وعظ کہتا۔ اس کے بعد خود ان دوست نے بھی وعظ کی درخواست کی تو ان وجوہ سے میرا بھی دل چاہا کہ بیان کی ہمت کر ہی لی جائے۔ مگر نہ تو کوئی مضمون ذہن میں تھا جس کو بیان کر دیا جائے۔ نہ کسی مضمون کے پھیلاؤ کی اور دیر تک بیان کرنے کی قدرت نہ تھی کہ دفعۃً یہ سمجھ میں آیا کہ کتاب میں دیکھ کر بیان کر دیا جائے۔ یہ بھی خدمت دین کی ایک صورت ہے اور پہلے بھی بعض بزرگوں کا معمول یہی تھا کہ وہ کتاب میں دیکھ کر بیان کیا کرتے تھے تو یہ رنگ بھی بزرگوں کے موافق ہے اور وہ رنگ بھی۔ غرض یہ کہ بحمد اللہ اس میں بھی بزرگوں کے دائرہ سے خروج نہ ہوا اس حالت میں وعظ کے اندر اب پہلے رنگ کا انتظار نہ کرنا چاہیئے اور بیان کا جو مقصود ہے وہ الحمد للہ اب بھی محفوظ ہے۔

حظ نفس میں غلو مذموم ہے

گو پہلا طرز نہ ہوا اور وہ طرز مقصود بھی نہیں۔ بلکہ پہلے رنگ کی خواہش کرنا یہ بھی ایک حظ نفس ہے گو وہ حظ نفس محمود ہو۔ مگر اس کے اندر غلو نہ ہونا چاہیئے جو کہ مذموم ہے، جیسے کھانا کھانا، کپڑا پہننا کہ ایک حاجت کی چیز ہے۔ لیکن اگر اس میں کوئی شخص غلو کرنے لگے تو ناپسندیدہ ہے۔ مثلاً کھانے کپڑے کی فکر میں اس قدر منہمک ہو جائے کہ ضروریات میں خلل پڑنے لگے تو انہماک مذموم ہوگا۔ ایسے ہی تقریر کا کوئی خاص طرز محمود ہے مگر مقصود نہیں۔ اور جو مقصود تھا بیان کا وہ اب بھی محفوظ ہے۔ اور جس کو میں نے غلو کہا ہے وہ تقریر کرنے والے کے لیے تو اس طرح ہے کہ اگر اس کو مضامین کی آمد نہ ہو تو تکلف کر کے گھیر گھار کے مضامین کو لائے اور بیان کرے۔

غلو فی البلاغت

اور میرے نزدیک یہی معنی ہیں اس حدیث کے اِنَّ اللّٰہَ یَبْغَضُ الْبَلِیْغَ مِنَ الرِّجَالِ الخ (سنن الترمذی: ۲۸۵۳، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۸۰۰) (بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس شخص سے بغض رکھتے ہیں جو جہان میں غلو فی البلاغت اختیار کرے) یعنی اس کا مصداق وہی درجہ ہے جس میں تکلف سے بلاغت کا جلب کرے تاکہ سننے والے سمجھیں کہ اس کو قوت ہے بیان میں یہی غلو فی البلاغت مبغوض

ہے باقی اگر یہ قصد نہ ہو اور تکلف بھی نہ ہو بلکہ تکلف کلام میں بلاغت آ جائے تو اس کا مضائقہ نہیں۔ اور ایک غلو ہے سننے والوں کے لیے وہ یہ ہے کہ اگر بیان میں کوئی خاص رنگ نہ ہو تو اس بیان سے وہ منتفع ہی نہ ہوں بلکہ منتظر رہیں دوسرے رنگ کے غرض اس وقت متعارف وعظ نہ ہو گا بلکہ چند حدیثوں کو ترجمہ کتاب دیکھ کر بیان کر دوں گا باقی یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے برکت کے لیے ہے اس کا بیان نہ ہو گا۔ اور یہ کتاب جو میرے ہاتھ میں ہے اس میں وہ احادیث موجود ہیں جن کے بیان کا ارادہ ہے اور ان احادیث کے بھی تمام اجزاء کا بیان نہ ہو گا۔ بلکہ صرف اس جز کا بیان کر دیا جائیگا۔ جو موقعہ کے لحاظ سے زیادہ مہتم بالشان ہو گا۔ اور ان احادیث کا صرف ترجمہ ہی پڑھا جائیگا (کیونکہ تمام سامعین تو ترجمہ ہی سمجھ سکتے ہیں ۱۲ جامع۔ اس کے بعد کتاب جمع الفوائد کھول کر ارشاد فرمایا) یہ ایک حدیث ہے جس کو حضرت عبداللہؓ نے روایت کیا ہے اور اصل میں یہ دو حدیثیں ہیں ایک میں گناہ کا ذکر ہے دوسری میں توبہ کا (اس کے بعد کتاب بند کر کے ارشاد فرمایا ۱۲ جامع)۔

گناہوں کا خاصّہ

اس وقت ایک بات اور یاد آئی جو قابل ذکر ہے کہ اس کا تعلق بھی اسی بیان سے ہے وہ یہ کہ جب میرا بیان کرنے کا خیال ہوا تو میں نے سوچا کہ کیا مضمون بیان کرنا چاہیئے۔ میں نے اپنے ذہن میں بہت الٹ پلٹ کی مگر کوئی مضمون ذہن میں ایسا نہ آیا جو اکثر عالمین (جاننے والے) کے اعتبار سے محتاج الیہ (بیان کی ضرورت) ہو اور جی یہ چاہتا تھا اور ہمیشہ سے یہی چاہا کرتا ہے کہ ایسا مضمون بیان کیا جائے جو حالتِ غالبہ کے اعتبار سے مفید اور جامع ہو مگر بحمد اللہ آج صبح ایک ایسا ہی مضمون ذہن میں آ گیا اور اسی کو بیان کے لئے اختیار کیا گیا اور وہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کی یہ حالت تو مشاہد ہے کہ ہم میں سے ہر شخص گناہوں کے اندر مبتلا ہے۔ مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس سے ہم کو کوئی ضرر بھی پہنچ رہا ہے یا نہیں۔ سو ایک ضرر تو ظاہر ہے اور وہ یہ کہ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ گناہوں پر عقوبت کا اندیشہ ہے یہ تو کھلا ضرر ہے اور ایک ضرر اس کے علاوہ اور ہے جو ذرا باریک ہے مگر ہے نہایت سخت۔ وہ یہ ہے کہ جس قدر نافرمانی ہوتی جاتی ہے حق سبحانہٗ تعالیٰ سے بندہ کا تعلق گھٹتا چلا جاتا ہے اور اس دوسرے ضرر کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اگر گناہوں پر عقوبت اور سزا کا اندیشہ نہ بھی ہوتا تب بھی گناہ نہ کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ گناہوں کا خاصہ ہے کہ اس سے بندہ کا حق تعالیٰ شانہٗ سے تعلق گھٹ جاتا ہے۔ اور ہر مسلمان کے پاس اصل دولت یہی تعلق ہے حق سبحانہٗ کا جس کا

دوسرا عنوان محبت ہے جو کہ فطرتاً ہر شخص کے اندر موجود ہے گو بعض کے اندر کچھ موانع ایسے عارض ہو جاتے ہیں جن کے سبب سے اس محبت کا ان کے اندر ظہور نہیں ہوتا۔ اور اس کا ظہور نہ ہونے کے سبب سے خود اس کے وجود میں شبہ پڑ جاتا ہے۔ مگر جس وقت وہ موانع مرتفع ہو جاتے ہیں اور اس محبت کا ظہور ہوتا ہے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو نئی بات ہمارے اندر ظاہر ہوئی ہے یہ کہیں باہر سے ہمارے اندر نہیں آئی بلکہ یہ چیز پہلے سے ہمارے اندر موجود تھی۔

ہر مسلمان کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طبعی و عقلی محبت

مومن اگر ٹٹولے تو معلوم ہوگا کہ وہ حدیث جس کے اندر محبت کو شرط ایمان قرار دیا گیا ہے جہاں اس حدیث سے محبت کا حکم کیا گیا ہے اسی طرح حق تعالیٰ کی طرف سے اس میں بندہ کی مدد بھی کی گئی ہے۔ یعنی اس محبت کو بندہ کے اندر پیدا بھی فرما دیا گیا ہے اور وہ حدیث یہ ہے۔ لایؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من نفسہ ووالدہ وولدہ والناس اجمعین او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام (مسند احمد ۳:۱۷۷، کنز العمال: ۷۰) (تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان والا نہ ہوگا جب تک میں اس کی جان، اسکے والدین، اس کی اولاد اور سب لوگوں سے (اس کے نزدیک) پیارا نہ ہو جاؤں جیسا کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ ایسی محبت کا وجود ہمارے اندر ہے بھی یا نہیں کیونکہ بعض واقعات ایسے ہیں جن سے انسان کو دھوکہ ہو جاتا ہے کہ میرے اندر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں۔ مثلاً اپنا بیٹا اپنے سے جدا ہو جائے تو اس کی جدائی اور مفارقت سے باپ کو کتنا رنج اور صدمہ ہوتا ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو ہم کو زیارت نصیب نہیں ہوتی۔ جو بظاہر مفارقت ہے اس سے اتنا رنج نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر باپ مر جائے تو کتنا رنج ہوتا ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ کا حال سن کر اتنا رنج نہیں ہوتا۔ اسی طرح اپنی اولاد کا فاقہ ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فاقہ کا حال جب ہم سنتے ہیں تو اتنا رنج نہیں ہوتا اور صحابہ کی سی حالت محبت میں ہماری نہیں معلوم ہوتی کیونکہ صحابہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طبعی اور عقلی دونوں قسم کا تعلق تھا اور گو عقلی تعلق اور محبت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر مومن کو ہے ہی مگر کبھی اس میں شبہ ہو جاتا ہے کہ طبعی تعلق بھی ہر مومن کو حاصل ہے یا نہیں۔ سو اس شبہ کو جواب میں میرا دعویٰ ہے کہ بحمد اللہ طبعی تعلق اور محبت بھی ہر مومن کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے گو صحابہ کے برابر نہ ہو۔ مگر ہے ضرور جس کا مشاہدہ

کرایا جا سکتا ہے مثلاً ایک مسلمان کو اپنی اولاد سے خواہ کتنی ہی محبت ہو لیکن اگر وہی اولاد خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی گستاخی کر بیٹھے تو پھر دیکھئے باپ کو کس قدر غصہ آئے گا کہ اتنا اپنی گستاخی کرنے پر ہرگز نہ آتا۔ تو دیکھئے اگر اس باپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طبعی محبت نہ تھی تو اتنا غصہ کیوں آیا۔ اور اس کے تن بدن میں آگ کیوں لگ گئی اور بعض واقعات حاضرہ میں تو اس طبعی محبت کے آثار کا خوب اچھی طرح مشاہدہ ہو گیا کہ جو لوگ نماز کے پابند نہ تھے۔ روزہ کے پابند نہ تھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف سے واقف نہ فضائل ان کو معلوم مگر ان کے اندر بھی اس طبعی محبت کے وہ آثار ظاہر ہوئے کہ لوگ حیران رہ گئے۔ دوسرے کی جان لینے اور اپنی جان دینے سے زیادہ کیا آثار ہوں گے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ان کو بہت تھوڑی سی حاصل تھی اور محبت پیدا ہوتی ہے معرفت سے تو جب تھوڑی معرفت پر اتنی محبت کا ظہور ہوا تو اگر کامل معرفت ہوتی تو خدا جانے کس قدر محبت کا اظہار ہوتا۔

اب یہاں ایک شبہ پیدا ہوا کرتا ہے کہ صاحب عوام تو سب کچھ کر گزرتے ہیں اور خواص دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں اس کی کیا وجہ، تو کیا ان کو ایسی محبت نہیں؟ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ عوام کی نظر میں تو صرف ایک ہی چیز ہوتی ہے یعنی محبت لہٰذا وہ اس کے مقتضا پر عمل کرنے لگ جاتے ہیں اور خواص کی نظر محبت کے ساتھ حکمت پر بھی ہوتی ہے۔ یعنی خواص کی نظر میں ایک ہی چیز نہیں ہوتی بلکہ دوسری چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ بعض مواقع پر دیکھتے ہیں کہ اگر مقتضائے محبت پر عمل کیا گیا تو اس سے مسلمانوں کو بمقابلہ نفع کے ضرر زیادہ پہنچ جائے گا۔ خواص کی نظر میں یہ چیزیں ہوتی ہیں جو عوام کی طرح جوش ظاہر کرنے سے ان کو روکتی ہیں کیونکہ تنہا جوش کافی نہیں بلکہ ہوش سے کام لینا بھی ضروری ہے۔ ورنہ ناگوار واقعات سے ہیجان ان کو بھی ہوتا ہے۔

معرفت سے محبت پیدا ہوتی ہے

غرض قاعدہ یہ ہے کہ معرفت سے محبت پیدا ہوتی ہے تو جب ناقص معرفت سے اتنی محبت پیدا ہوئی تو کامل معرفت سے کتنی ہوگی۔ پس جیسا عقلی محبت کا تحقق ہر مومن میں ہے اسی طرح واقعات سے یہ بھی ثابت ہے کہ طبعی محبت بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر مومن کو حاصل ہے۔ البتہ جہاں اس کا ظہور نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہاں دوسری چیز اس پر غالب آجاتی ہے اور یہ محبت گویا مغلوب ہو جاتی ہے جیسے راکھ کے اندر چنگاری دبی ہوئی ہو تو ظاہر میں آگ معلوم نہ ہوگی۔ مگر اس کا وجود ضرور ہے۔ تو ظہور اور چیز ہے اور وجود اور چیز۔

پس یہ غلط ہے کہ مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طبعی محبت نہیں ہاں ظہور بعض اوقات نہیں ہوتا۔ اب سمجھئے کہ یہ حدیث جس کے اندر محبت کو شرط ایمان قرار دیا گیا ہے اس سے اصل میں تو محبت کا امر کرنا مقصود ہے جس کی تحصیل ہمارے ذمہ واجب ہے مگر شانِ رحمت تو دیکھئے کہ جس بات کا ہم کو حکم دیا ہے اس کو ہمارے اندر پیدا بھی کر دیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ہم کو کتنی دشواری پیش آتی تو کیا انتہا ہے اس کی رحمت کی ۔

او بد لہا ہم نماید خویش را ہم بدوز و خرقہ درویش را

(وہ عشاق کے دلوں میں خود اپنے آپ کو ظاہر فرماتے ہیں وہی خرقہ درویش کو لیتے ہیں)۔

کہ جس بات کا ہم کو حکم دیتے ہیں اس کو خود ہی اپنی مدد سے پورا بھی کرا دیتے ہیں ۔ ممکن ہے کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی ہو، مگر صاحب میرا تو شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ جب وہ کسی کو کسی عمل کا حکم دیتے ہیں خواہ اعمال ظاہرہ ہوں یا اعمال باطنہ تو اس میں ہمارے عمل کا بالکل وہ حال ہوتا ہے جیسے باپ بچہ کو لکھنے کے لئے کہتا ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ بغیر میرے لکھائے نہیں لکھ سکتا تو خود بچہ کے ہاتھ میں قلم دے کر اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اول قلم میں روشنائی لگاتا ہے پھر اس کے ہاتھ سے گلستاں کی دو تین سطریں لکھوا دیتا پھر اس کو شاباشی دیتا ہے کہ ماشاء اللہ اب تو تمہیں لکھنا بھی آ گیا اس شاباشی سے وہ احمق خوشی کے مارے کودتا ہے پھاندتا ہے، کہ اب تو مجھے لکھنا آ گیا اس کے اندر اس بچہ کا کوئی کمال نہیں، اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۔

اے قلم بنگر گرا جلا لیستی درمیان اصبعین کیستی

(اے قلم تو دیکھ تجھے کس نے روشن کیا تو کس کی دو انگلیوں کے درمیان ہے)

اگر ایک کاتب نے قلم سے کچھ لکھا اور قلم ناز کرنے لگے کہ میں نے ایسی عمدہ تحریر لکھی تو قلم سے کوئی پوچھے کہ احمق ! یہ تو نے خود لکھا ہے یا تو کسی کے قبضہ میں ہے وہ کہتا ہے کہ میں ان انگلیوں کے قبضہ میں ہوں ۔ انگلیوں سے پوچھا تم کس کے قبضہ میں ہو کہا پہنچے کے قبضہ میں ۔ اس سے پوچھا گیا کہ تو کس کے قبضہ میں ہے کہا ہاتھ کے ہاتھ سے جو پوچھا وہ کہتا ہے میں کاتب کے قبضہ اور اختیار میں ہوں وہ جو کام چاہتا ہے مجھ سے لے لیتا ہے۔ اسی طرح آگے بڑھتے جائیے۔ کاتب ارادہ کے بعد کتابت کرتا ہے اور ارادہ اس کے قبضہ میں نہیں وہ خدا کے قبضہ میں ہے۔ ارادہ کے بعد طبیعت کا درست ہونا بیماری وغیرہ جملہ مواقع کا مرتفع ہونا یہ بھی کاتب کے اختیار سے باہر ہے۔ حکایت ہے کہ کوئی دیوار کے اندر میخ ٹھوک رہا تھا۔ دیوار نے میخ سے کہا کہ میں نے تیری ایسی کون سی خطا کی جس کی

سزا میں تو نے میرا جگر پارہ پارہ کر دیا اور مجھ میں سوراخ کر دیا۔ میخ نے جواب دیا کہ مجھ کو مت دیکھ بلکہ اس کی طرف دیکھ جو مجھ کو ٹھوک رہا ہے۔ میں اس کے بس میں ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خفتہ از احوالِ دنیا روز و شب　　چوں قلم در پنجۂ تقلیب رب

(دنیا کے احوال روز و شب پوشیدہ میں اسی طرح حوادث زمانہ کی گردش اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے)۔

کمال عبدیت

صاحبو! اگر ہم اپنے افعال پر ناز کریں تو ہمارا یہ ناز ایسا ہی ہوگا۔ جیسا اس بچہ کا ناز تھا جس کے باپ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کچھ لکھوا دیا تھا، جس میں بچہ کا کوئی کمال نہ تھا اگر باپ اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ نہ لیتا تو اس کی کیا مجال تھی جو ایک حرف بھی لکھ سکتا اسی طرح اگر ہم ناز کریں کہ نماز پڑھتے ہیں روزہ رکھتے ہیں دین کی خدمت کرتے ہیں تو محض نادانی ہے۔ کیونکہ تم نے کیا ہی کیا ہے۔ واللہ اگر اس طرف سے مدد نہ ہوتی تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ میں اختیار کی نفی نہیں کرتا۔ اختیار تو مسلم ہے مگر حضرت وہ اختیار بھی تو دوسرے طرف سے عطا ہوا ہے۔ اختیار کی نفی کیسے کی جا سکتی ہے قرآن شریف میں جگہ جگہ اَرَادَ اور شَآءَ موجود ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہے وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللہُ یعنی تمہاری غیر مستقل مشیت سے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک ان کی مشیت نہ ہو۔ بعض لوگ جبریہ کے اعتقاد کو عبدیت کے قریب سمجھتے ہوں گے مگر حقیقت یہ ہے کہ عبدیت اسی میں زیادہ ہے کہ اپنی مشیت کو تسلیم کر کے اس کو مشیت حق کا تابع سمجھے۔ اس میں عبدیت کچھ زیادہ نہیں ہے کہ اپنی مشیت کی بالکل نفی ہی کر دے اور جبر کا قائل ہو جائے۔ کمال تو یہ ہے کہ اپنے اختیار کا مشاہدہ کر رہا ہے پھر اس کو ضعیف سمجھ رہا ہے۔ جیسے کسی شخص کے پاس لاکھ روپیہ ہوں مگر وہ اپنے آپ کو چار لاکھ والے کے مقابلہ میں غریب سمجھ رہا ہے۔ بخلاف اس کے جو غریب ہو کر اپنے آپ کو غریب سمجھتا ہے یہ کیا کمال ہے۔ اسی طرح اپنے اختیار کی بالکل نفی کرنے میں کچھ عبدیت نہیں۔ بلکہ کمال یہ ہے کہ مشاہدہ ہوا اپنے اختیار کا پھر اپنے اختیار کو ماتحت سمجھے دوسرے کے اختیار کا یہ ہے کمال عبدیت۔ دوسری اس سے زیادہ واضح مثال یہ ہے کہ اگر کسی بادشاہ کے سامنے رعیت کا ایک معمولی آدمی اپنے کو بے اختیار سمجھے یہ زیادہ کمال نہیں اور اگر کوئی نواب حیدر آباد جیسا اپنے کو کسی قدر با اختیار سمجھتے ہوئے بھی اپنے اختیار کو بادشاہ کے اختیار کا تابع بنا دے یہ کمال عبدیت ہے۔ پس جبریہ کی مثال رعیت کی سی ہے اور اہل سنت کی مثال نواب جیسی ہے کہ وہ

انسان کو باوجود خلیفۃ اللہ اور فی الجملہ با اختیار نائب سلطنت سمجھنے کے پھر بھی اس کے اختیار کو اللہ تعالیٰ کے اختیار و ارادہ کا تابع مانتے ہیں اب انصاف کر لیجئے کہ عبدیت زیادہ کس میں ہے۔

عَبدیت منتہائے کمالات ہے

پس تصوف کے اصول سے بھی اہل سنت کا مذہب عبدیت کے قریب ہے کیونکہ صوفیہ کے نزدیک عبدیت منتہائے کمالات ہے اور عبدیت عقیدۂ اہل سنت میں اہل جبر سے زیادہ ہے۔ تو جناب یہ ہے ہماری حالت کہ دوسرے کے ہاتھ میں ہمارا ہاتھ ہے۔ جب تک وہ چاہ رہے ہیں ہم سے اعمال کا صدور ہو رہا ہے جیسے ہمارے ہاتھ میں قلم ہو کہ اگر ہم اس کو حرکت نہ دیں تو وہ ایک حرف بھی نہیں لکھ سکتا اور اسی کیفیت کی تحصیل کے لئے صوفیہ نے مسئلہ وحدۃ الوجود کی تعلیم کی ہے۔ پہلے چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا قرب تھا اس لئے یہی اعمال نماز روزہ وغیرہ ان کیفیات کے حصول کے لئے کافی ہو جاتے تھے بعد میں جب لوگوں کی استعداد میں ضعف واقع ہوا تو ان مراقبات و اشغال کی حاجت ہوئی۔ تو حضرت یہ ہے وحدۃ الوجود جس کا لوگوں نے ستیاناس کر دیا ہے اور کفر بنا دیا ہے عنایت اس مسئلہ کی صرف یہ ہے کہ سالک کی نظر میں اپنی اور ساری مخلوقات کی ہستی اور اس کی صفات و کمالات حق تعالیٰ کی ہستی وصفات و کمالات کے سامنے مضمحل ہو جائیں اور یہ حالت ہو جائے کہ ۔

موحد چہ بر پائے ریزی زرش ۔۔۔ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش بنا شد زکس ۔۔۔ ہمین ست بنیاد توحید بس

(موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ سونا بکھیریں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں، امید و خوف اس کو بجز خدا کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اس پر ہے)۔

اسی حقیقت کے متعلق سعدیؒ نے کہا ہے۔

دریں نوعے از شرک پوشیدہ ہست ۔۔۔ کہ زیدم بیازد و عمرم بخست

(اس قسم میں اس طرح کا شرک پوشیدہ ہے کہ زید نے مجھے تکلیف دی اور میری عمر ختم ہوگئی)۔

اہتمام مباح و منکر

مگر یہاں فاعل مجازی کی طرف جس نسبت کرنے کو شرک قرار دیا گیا ہے، اس سے مراد ایسی نسبت ہے، جس میں اس نسبت کے مقتضا کا اہتمام شدید ہونے لگے اور کوئی اس میں انہاک

کرنے لگے۔ جیسے کھانا ایک مباح فعل ہے۔ لذیذ چیز ہے اور جائز ہے لیکن اگر کوئی شخص شب وروز اسی فکر اور اہتمام وانتظام میں مشغول رہے کہ مجھ کو لذیذ کھانے میسر آئیں تو گو اتنا اہتمام اور انہماک مباح ہے مگر پسندیدہ نہیں۔ یہ تو اہتمام مباح کی مثال ہوئی اور ایک وہ اہتمام ہے جو منکر ہے اس کی مثال یہ ہے کہ کسی نے کسی کے ایک تھپڑ مارا تو اس کے بدلہ میں ایک تھپڑ مارنا یہ تو مباح ہے لیکن اگر وہ بجائے ایک کے دو تھپڑ مارے گا تو یہ فعل ناجائز ہے اور اس کا اہتمام بھی منکر (برا) ہے اور شب وروز اس کی فکر میں رہنا کہ اب موقع ملے اور میں اس کے دو تھپڑ ماروں یہ انہماک منکر ہے۔

اہتمام غیر اللہ میں منہمک ہونا ناپسندیدہ ہے

خلاصہ یہ ہے کہ غیر اللہ کے اہتمام میں لگ جانا اور اسی میں منہمک ہوجانا یہ ناپسندیدہ ہے اگرچہ وہ انہماک اور اہتمام مباح کا ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر اس نسبت کے اقتضا کا ایسا اہتمام شدید نہ ہو کہ اس کے اندر انہماک ہونے لگے تو اس سے محض متاثر ہونے کا مضائقہ نہیں۔ غرض مراقبات واشغال کی تعلیم صوفیہ نے ان کی کیفیات کی تحصیل کے لئے کی ہے تاکہ ان اشغال ومراقبات کے ذریعہ سے ان کیفیات میں درجہ رسوخ کا حاصل ہوجائے بتلایئے اس میں انہوں نے کون سا جرم کیا مگر علماء قشر مقصود کو نہیں دیکھتے صورت اشغال پر معترض ہوتے ہیں، حالانکہ صوفیہ کا ان اشغال کو تعلیم کرنا بالکل ایسا ہے جیسا طبیب مریض کے لئے بعض دفعہ خلوت وغیرہ تجویز کرتا ہے اس میں بدعت کی کیا بات ہے۔ پھر اس نسبت کے متاثر ہونے میں اہل طریق کے مدارج مختلف ہوتے ہیں کوئی مبتدی ہے کوئی متوسط کوئی منتہی اور اس کا امتیاز عوام کا کام نہیں۔ اصل معرفت تو اہل بصیرت کو ہے باقی عوام کبھی علامات سے کچھ پہچان لیتے ہیں اور علامات بھی وہ جن کو اہل بصیرت بتلادیں۔

مبتدی، متوسّط اور منتہی کی پہچان

جیسے ایک قصہ ہے کہ کسی مرید نے اپنے شیخ سے اہل طریق کے مدارج معلوم کرنے کی درخواست کی تو شیخ نے جواب دیا کہ فلاں مسجد میں تین شخص مراقب بیٹھے ہیں۔ ان تینوں کے پاس جاکر تم ہر شخص کے ایک ایک دھول مارو۔ وہ شخص مسجد میں پہنچا تو دیکھا کہ تین صاحب بزرگ صورت بیٹھے ذکر وشغل میں مصروف ہیں یہ دیکھ کر بہت شش وپنج میں پڑا کہ ان کے ساتھ یہ خلاف تہذیب حرکت کیسے کروں مگر چونکہ ضرورت تھی اس لئے مجبور ہوا اور آگے بڑھ کر ایک شخص کے ایک تھپڑ مارا۔ اس پر وہ صاحب اُٹھے اور اس کے بھی ایک تھپڑ مارا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوگئے اور اس سے

پوچھا تک نہیں کہ تو کون ہے اور کیوں ایسی حرکت کی انہوں نے پر عمل کیا۔اس ممتحن نے اپنے دل میں کہا کہ یہ تو اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے کہ ایک کا بدلہ ایک ہی سے لیا۔اس کے بعد یہ شخص دوسرے کی طرف بڑھا اور ان کے بھی ایک تھپڑ مارا۔مگر وہ بیٹھے ہوئے برابر اپنے شغل میں مصروف رہے۔اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔اس نے کہا کہ یہ ان پہلے سے بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔پھر اس شخص نے ان تیسرے بزرگ کے بھی جا کر ایک تھپڑ مارا تو وہ اٹھے مگر بجائے اس کے کہ بدلہ لیں الٹا اس شخص کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگے کہ تمہاری بڑی چوٹ لگی معاف کرنا۔خیر یہ سارا واقعہ شیخ سے جا کر عرض کیا تو شیخ نے جواب دیا کہ پہلا شخص تو مبتدی تھا۔دوسرا متوسط تھا جو بزبانِ حال کہہ رہا تھا کہ

ہرچہ از دوست میرسد نیکوست

(دوست (محبوب حقیقی) کی طرف سے جو پہنچتا ہے اس میں خیر ہے)

اس پر مراقبات کے اثر کا غلبہ تھا اور تیسرا شخص منتہی تھا اس نے عروج کے بعد نزول کیا تھا اور محقق تھا شفیق تھا۔توسط کی حالت میں غلبۂ احوال وکیفیات کی وجہ سے شفقت کا غلبہ نہیں ہوتا اسی لئے مبتدی ومتوسط سے اہل حقوق کے حقوق میں کوتاہی ہو جاتی ہے اگر پورا اہتمام نہ ہو۔

مشائخ کاملین کی علامت

ہم سے بہت لوگوں نے اپنے مشائخ کے اس فعل پر فخر کا اظہار کیا ہے کہ ہمارے شیخ چالیس برس تک خانقاہ سے باہر نہیں نکلے۔صاحبو! اگر یہ کوئی کمال کی بات ہوتی تو انبیاء علیہ السلام نے یہ طرز کیوں نہ اختیار کیا۔انبیاء کا تو وہ حال تھا جو قرآن شریف میں مذکور ہے خود ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کفار کا یہ طعن قرآن میں ذکر کیا گیا ہے۔ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَ سْوَاقِ (کہ اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ ہماری طرح کھانا بھی کھاتا ہے اور ضروریات معاش کے واسطے ہماری طرح بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے) تو انبیاء علیہ السلام تو بازاروں تک میں چلے پھریں اور یہ شیخ ۴۰ برس تک خانقاہ سے بھی باہر نہ نکلیں گو بظاہر عوام کے نزدیک یہ شیخ ہی زیادہ کامل معلوم ہوں گے اگر کسی غیر محقق عامی کے سامنے یہ دونوں فعل پیش کئے جائیں۔اور یہ نہ بتلایا جائے کہ کون سا فعل کس کا ہے تو وہ یہی کہے گا کہ وہ زیادہ کامل ہیں جو چالیس برس تک خانقاہ سے باہر نہیں نکلا۔مگر جو مبصر ہوگا وہ دوسرے کو زیادہ کامل کہے گا اور اس کا راز یہ ہے کہ ایک تو وہ شخص ہے جس کے پاس ایک آئینہ ہے جس میں سے اس کو اپنے محبوب کا چہرہ نظر آرہا ہے اور وہ اس کے اندر اپنے محبوب کے جمال جہاں آراء کا مشاہدہ کررہا ہے گویا کہ

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار　　　جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

وہ شخص کیسے یہ گوارا کرسکتا ہے کہ کسی اور چیز کی طرف دیکھے اور آئینہ کی طرف نہ دیکھے کیونکہ اگر وہ آئینہ کی طرف نہ دیکھے گا تو اپنے محبوب کے مشاہدہ سے محروم رہے گا۔ اور ایک دوسرا شخص ہے جس کا یہ حال ہے کہ سارا عالم کا جز جز اس کے لئے آئینہ جمال خداوندی بن رہا ہے تو پہلے شخص کو صرف آئینہ کے اندر مشاہدہ محبوب ہورہا تھا۔

محققین اور منتہین کی عجب شان

اور اس دوسرے کو ہر چیز کے اندر مشاہدہ محبوب حاصل ہے تو ظاہر ہے کہ یہ دوسرا شخص زیادہ کامل ہے اس میں بازار اور بیوی بچوں کا تعلق مشاہدۂ حق سے مانع نہیں ہوتا۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ (یہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے نہیں روکتی) تو محققین اور منتہین کی یہی شان ہوتی ہے کہ ان کے لئے ہر ہر چیز آئینہ جمال خداوندی بن جاتی ہے۔ غرض متوسط پر شفقت کا اتنا غلبہ نہیں ہوتا اس کو نہ رنج کے موقعہ پر زیادہ رنج ہوتا ہے نہ غصہ کے موقعہ پر زیادہ غصہ آتا ہے۔ اور منتہی کا حال یہ ہوتا ہے کہ جہاں زیادہ غصہ کا موقع ہوتا ہے زیادہ غصہ آتا ہے جہاں زیادہ رنج کا موقع ہوتا ہے زیادہ رنج کرتا ہے۔ غرض وہ جہاں جیسا محل ہوتا ہے ویسا ہی بن جاتا ہے یہی مطلب ہے اس مضمون کا جو اس حدیث میں آیا ہے **كنت سمعه الذى يسمع به وبصره الذى يبصربه ويده التى يبطش بهاورجله التى يمشى بها** (اتحاف السادۃ المتقین ۱:۴۰۳) یعنی میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں ہی اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے الخ۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ اس کا آلہ بن جاتے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے آلہ اور ذی آلہ میں اختلاف نہیں ہوتا اسی طرح وہ بھی بالکل امر حق کا تابع بن جاتا ہے اور اس کا کوئی قول و فعل امر حق کے مخالف نہیں ہوتا۔ یعنی وہ کوئی کام بطور خود مستقل ہو کر نہیں کرتا۔ پس غایت وحدۃ الوجود کی اپنی ہستی کا اضمحلال ہے اور اسی کیفیت کی تحصیل کے لئے وحدۃ الوجود کا مراقبہ کیا جاتا ہے جیسا اوپر مذکور ہوا، مگر پہلے قرب زمانہء نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب استعداد قوی تھی اس لئے اس شغل کی ضرورت نہ تھی بعد میں بیشک ان چیزوں کی ضرورت ہوئی مگر اب متاخرین اس سے منع فرماتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ شغل وحدۃ الوجود کے نافع ہونے کے لئے بعد صحت عقیدہ کے دو

چیزوں کی ضرورت ہے اگر کسی کے اندر ان میں سے ایک ہو دوسری نہ ہو تو یہ شغل اس کے لئے مانع طریق ہو جائے گا۔ ہاں اگر دونوں جمع ہوں تو پھر مفید ہو گا ان میں سے ایک تو اللہ تعالیٰ کی فاعلیت اور کمال وجود کا مشاہدہ ہے جس کا خاصہ یہ ہے کہ اسباب سے نظر اٹھ جاتی ہے۔ دوسرے محبت۔ اگر مشاہدہ حاصل ہے اور محبت نہیں تو اندیشہ ہے کہ کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔ مثلاً کسی کا باپ مرا اب چونکہ اس کو مشاہدہ حاصل ہے اس لئے وہ اس کو بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے سمجھے گا مگر چونکہ اس کو ابھی محبت حاصل نہیں ہوئی اس لئے اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے ناگواری پیدا ہو جائے گی۔

مصلح بننا مشکل ہے

یہ معلوم کرنا بڑے مبصر کا کام ہے کہ فلاں شخص کے لئے اس کی تعلیم مفید ہے یا مضر۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ صالح بننا آسان ہے مصلح بننا مشکل ہے۔ مرید بننا آسان ہے شیخ ہونا مشکل ہے۔ غیر محقق تو سب کو ایک لکڑی ہانکے گا وہ تو ہر شخص کو وحدۃ الوجود کی تعلیم دے گا۔ مگر محققین نے اس کے اندر غور کیا ہے اور سمجھا ہے کہ بعض لوگوں کو اس کی تعلیم مضر ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ہر شخص کو اس کی تعلیم نہیں کرتے۔ بلکہ ایسے شخص کے لئے ان کے نزدیک اسلم یہی ہے کہ وہ اسباب پر بھی نظر رکھے اور یہ سمجھے کہ میرا باپ دق میں مر گیا۔ سل میں مر گیا، ورنہ مشاہدہ سے ناگواری پیدا ہو گی اور اس سے حق تعالیٰ سے بغض پیدا ہو جائے گا۔ رہا سہا ایمان بھی جاتا رہے گا۔ خوب کہا ہے۔

نہ انجیر شد نام ہر میوۂ   نہ مثل زبیدہ ست ہر بیوۂ

(ہر میوہ کا نام انجیر نہیں اسی طرح ہر بیوہ زبیدہ کے مثل نہیں)۔

مولانا فرماتے ہیں۔

ہر سماع راست ہر تن چیز نیست   طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

(تو یہ انجیر ہے جو کسی کے لئے تو مناسب ہے اور کسی کے لئے نہیں۔ بلبل کے لئے مناسب ہے کوے کے لئے نہیں)۔

عمل اور جزاسب حق تعالیٰ شانہٗ کی عطا ہیں

اہل تحقیق اس فرق کو محسوس کرتے ہیں۔ مطلب میرا یہ ہے کہ حقیقت میں حق تعالیٰ خود ہی تمام کام بندہ سے لیتے ہیں۔ ورنہ اگر اس طرف سے توفیق نہ ہو تو بندہ کیا کر سکتا ہے ہماری نماز ہمارا

روزہ سب انہی کا کرایا ہوا ہے۔

کارزلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں ‏ ‏ مصلحت را تہمتے برآہوئے چین بستہ اند

(مشک افشانی تیری ہی زلفوں کا کام ہے لیکن مصلحت عشاق نے چین کے ہرنوں پر الزام لگادیا ہے)

اور کہا ہے۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل ‏ ‏ نسیم صبح تیری مہربانی

حقیقت میں سب اُدھر ہی سے ہے۔ انسان کیا کرسکتا ہے اگر توفیق نہ ہو۔ اور توفیق ادھر سے ہی ہے تو اب کس قدر عنایت ہے کہ ہم کو محبت کا امر بھی ہے اور اس کے اندر ہماری امداد بھی ہے جیسے باپ اوّل اپنے بچہ کو حکم دیتا ہے کہ لکھو مگر جانتا ہے کہ یہ کیا لکھے گا اس لئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے دو تین شعر کریما کے لکھوا دیتا ہے اور پھر اس لکھنے کی نسبت اس بچہ کی طرف کر دیتا ہے کہ شاباش تم خوب لکھتے ہو۔ اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ اوپر سے ایک روپیہ انعام کا بھی بچہ کو دیتا ہے کیا خوب کہا ہے۔

درد از یار ست درماں نیز ہم ‏ ‏ دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

(درد محبوب حقیقی کی طرف سے ہے اور علاج بھی انہی کی طرف سے ہے۔ میرا دل ان پر فدا ہوا اور جان بھی)۔

بیمار بھی کیا جا رہا ہے اور علاج بھی ہو رہا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا اور پھر اس کی توفیق بھی عنایت فرمائی روزہ کا حکم دیا۔ پھر اس کی توفیق بھی عنایت فرمائی۔ پھر ان سب اعمال کی نسبت بھی ہماری طرف کر دی کہ صلّی فلاں، تصدّق فلاں۔ اور اسی پر بس نہیں بلکہ اوپر سے ہم کو اس پر انعام بھی دیتے ہیں کہ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (یہ بدلہ اس کا جو وہ عمل کرتے تھے) حالانکہ اگر کوئی پوچھے کہ صاحب وہ نماز کس کی دی ہوئی تھی اور وہ روزہ کس کا دیا ہوا تھا تو ظاہر ہے کہ سب انہیں کا عطا کیا ہوا تھا۔ تو یہ عطا کے عوض میں عطا کیسی۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کوئی ہمیں ایک روپیہ دے ہم لے لیں، پھر اس ہمارے لے لینے پر وہ ہم کو ایک روپیہ اور دے کہ لو یہ ایک روپیہ انعام کا لو، کیا وہ پہلا روپیہ انعام نہ تھا۔ یہ تو انعام پر انعام اور عطا پر عطا ہوئی۔ سبحان اللہ کیا شفقت ہے کیا کوئی طبیب ایسا بھی ہے کہ مریض کو نسخہ بھی لکھ کر دے اور جب وہ نسخہ پئے تو پینے کے بعد ایک روپیہ انعام بھی دے کہ لو یہ تمہارے نسخہ پینے کا انعام ہے۔ مجھ کو یاد ہے کہ میں بچپن میں ایک بار مسہل پینے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ والد صاحب نے فرمایا کہ اگر تم پی لو گے تو ہم تمہیں ایک

روپیہ دیں گے۔ بس لالچ میں آ کر مسہل پی لیا اس وقت تو ان کے اس فعل کی زیادہ قدر نہ ہوئی تھی مگر اب خیال ہوتا ہے کہ واقعی ان کو ہم سے کس قدر محبت تھی کہ جس کام میں سراسر ہمارا ہی نفع تھا۔ اگر ہم مسہل نہ پیتے تو ان کا کیا نقصان تھا۔ اس پر بھی انعام دیا۔ اور انعام کا لالچ دے کر ایک نافع کام پر ہم کو لگا دیا۔ اس سے زیادہ حضرت حق کی عنایت ہے کہ ایک تو ہم کو عمل نافع کا امر فرمایا جس میں سراسر ہمارا ہی نفع ہے پھر عمل کی توفیق بھی دی پھر توفیق کے بعد اس کو ہمارا عمل فرمایا اور جب ہم کو عمل سے نفع پہنچا تو اوپر سے انعام بھی دیا۔ تو گویا عطا پر عطا ہوئی اگر غور کیا جائے تو درحقیقت وہ جزا جزا نہیں ہے بلکہ سراسر عطا ہی عطا ہے۔ مگر صورۃً جزا ہوتی ہے اس لئے نام اس کا جزا ہی رکھ دیا گیا۔

حُکم اور عطاء

اسی واسطے محققین نے لکھا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ،

(بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی ۱۲) اس ارشاد کو سن کر بعض لوگ تو مسرور ہوئے کہ ہمارے عمل پر جنت ملی اور بعض شرمندہ ہوئے اور یہ وہ ہیں جو جانتے ہیں کہ واقع میں تو نہ ہماری جان ہے نہ ہمارا مال جان بھی انہیں کی عطا کی ہوئی ہے مال بھی انہیں کا دیا ہوا ہے۔ مگر باوجود اس کے پھر اس کو ہماری جان اور مال فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے حق مشاہدہ ادا نہیں کیا اور جان و مال کو اپنا جان و مال سمجھا اس لئے انہوں نے بھی **اموالکم وانفسکم** (تمہارے مالوں اور تمہاری جانوں) فرمایا اور اس کے عوض میں جنت کا وعدہ کیا گیا گویا یوں فرمایا کہ اچھا اگر تم ہماری چیز کو اپنی سمجھتے ہو تو خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ تمہاری ہی جان ہے تمہارا ہی مال ہے مگر ہم سے بیع کا معاملہ کر لو اللہ اکبر گویا ہمارے جہل کی بھی رعایت فرماتے ہیں کہ تم ہمارے عطا کئے ہوئے جان و مال کو اپنا ہی سمجھو مگر ہم اس کو خریدتے ہیں ہمیں دے دو مولانا فرماتے ہیں۔

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد ۔۔۔ آنچہ در وہمت نیاید آں دہد
کے تو یابی ایں چنیں بازار را ۔۔۔ کہ بیک گل میخری گلزار را

ایک پھول کے بدلہ میں باغ دیتے ہیں اور پھول بھی ہمارے گھر کا نہیں وہ بھی انہیں کا ہے اور اسی باغ کا ہے جو بعد میں ہم کو دیا گیا۔ غرضیکہ عمل بھی ان کا عطا کیا ہوا ہے اور جزا بھی ان کی عطا ہے۔ ممکن ہے یہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ مگر صاحب میرا تو مشاہدہ ہے کہ جس چیز کا وہ حکم دیتے ہیں

اس کوخود ہی عطا بھی فرمادیتے ہیں۔ مثلاً یہ جو حدیث میں ہے کہ لا یومن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین (تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان والا نہ ہوگا جب تک میں اس کے نزدیک اسکے والدین اسکی الاد اور سب لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں) (مسند احمد ۳:۱۷۷، کنز العمال: ۷۰) اس میں محبت کا امر بھی فرمایا گیا ہے اور مدد بھی کی گئی ہے کہ خود ہی ہم کو ایسی محبت عطا بھی فرمادی۔ مگر اس طرح عطا فرمائی کہ بعض اوقات اس محبت کا اس وقت ظہور نہیں ہوتا۔ بلکہ ظہور چندروز کے بعد ہوگا اس میں یہ بھی حکمت ہے کہ جب چندروز کے بعد اس کا ظہور ہوگا تو بندہ اس کو اپنے اکتساب کا نتیجہ سمجھ کر اس سے خوش ہوگا۔ گویا یہ خوشی اللہ میاں نے ہم کو دینا چاہی تھی اس لیئے اس کا ظہور جلدی نہیں فرمایا۔

سبب اور مسبب کے ارتباط نہ ہونے کی مثال

چنانچہ جولوگ طریق میں محنت وشفقت کرتے ہیں اوران کو کچھ حاصل ہوتا ہے تو ابتداء میں وہ اس کو اپنے مجاہدہ کا ثمرہ سمجھ کر خوش ہوتے ہیں حالانکہ یہ سب انہیں کا عطا کیا ہوا ہے لیکن غور کی ضرورت ہے اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہاں صرف اتنا ہوا ہے کہ سبب اور مسبب میں بدون تاثیر حقیقی کے اقتران عادی ہوگیا ہے اور سبب واقع میں بھی خود ان کا عطا کیا ہوا ہے اور مسبب بھی باقی رہا۔ سبب اور مسبب میں ارتباط (تعلق کرنا) لازم سو یہ کچھ بھی نہیں۔ بس سبب ایک جھنڈی کی طرح ہے کہ جیسے سرخ جھنڈی دکھلائی جاتی ہے تو ریل رُک جاتی ہے۔ اب اگر اتفاق سے اس وقت کوئی گنوار کھڑا ہواس نے جو دیکھا تو بڑا تعجب کیا کہ اس سرخ جھنڈی میں بھی کیا تاثیر ہے کہ اس نے اتنی بھاری چیز کو روک دیا اب اس نے ایک سرخ جھنڈی بنا کر اپنے ساتھ رکھ لی کہ جس چیز کو روکنا چاہوں گا جھنڈی سے روک دیا کروں گا۔

ایک بار آپ چلے جارہے تھے سامنے سے ایک بیل آرہا تھا آپ اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور سرخ جھنڈی دکھانے لگے کہ جب اس جھنڈی سے اتنی بھاری چیز رک گئی تو بھلا بیل کیوں نہ رکے گا۔ مگر بیل کیوں رکتا۔ بیل نے آکران حضرت کے ایک سینگ مارا چاروں شانے چت ہو گئے اس گنوار کی مثال وہی ہوگئی جیسے ایک احمق کی حکایت مشہور ہے کہ کوئی شخص تالاب پر بھینس کو کنارہ پر لایا مگر وہ نہ آئی۔ وہ اس کے بچے کو اس کے سامنے لے گیا۔ بچہ کو دیکھ کر بھینس باہر نکل آئی۔ ایک احمق نے یہ منظر دیکھا اتفاق سے ایک مرتبہ اس احمق کی چار پائی تالاب میں بہہ گئی تو

آپ نے کیا کیا کہ دوڑے دوڑے گھر گئے اور پیڑھی (یعنی چھوٹا کھٹولا) اٹھالائے اور اس کو سامنے کر کے پکار رہے ہیں۔مگر بھلا اس سے کیا ہوتا۔کسی نے کہا میاں یہ کیا حرکت کر رہے ہو کہنے لگے اجی ایک مرتبہ ہم نے دیکھا تھا کہ ایک شخص کی بھینس کنارہ پر نہیں آتی تھی تو اس نے اس کو بچہ دکھایا تھا کہ وہ آ گئی تھی۔تو میں نے سمجھا کہ اسی طرح پیڑھی دکھانے سے چارپائی آ جائے گی کہ یہ اس کا بچہ ہے۔یہ تو ہنسی کی بات تھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ درحقیقت اس جھنڈی نے ریل کو نہ روکا تھا بلکہ روکنے کوئی اور تھا جس کو اس گنور نے نہ دیکھا تھا مولانا فرماتے ہیں۔

عشق من پیداوُ معشو قم نہاں یار بیروں فتنۂ او در جہاں

(میرا عشق ظاہر ہے اور میرا معشوق پوشیدہ ہے، دوست باہر اور فتنہ جہاں کا اندر ہے)۔

اور کہتے ہیں۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

تو کچھ خبر بھی ہے۔دیکھو وہ ریل کے ایک ڈبہ میں ڈرائیور بیٹھا ہوا ہے اس نے ریل کو روکا ہے مگر

عشق من پیداوُ معشو قم نہاں یار بیروں فتنۂ او در جہاں

(میرا عشق ظاہر ہے اور معشوق ظاہر ہے اور معشوق پوشیدہ ہے دوست باہر مگر فتنہ دنیا ہے)۔

ریل کے رکنے کو تو سب نے دیکھ لیا مگر روکنے والے کا پتہ نہیں۔مولانا فرماتے ہیں۔

انت کالریح و نحن کا لغبار یختفی الریح وغبارهٗ جهار

(تو ہوا کی طرح اور ہم غبار کی طرح ہیں، ہوا پوشیدہ رہتی ہے اور اس کا غبار ظاہر ہے)۔

ہوا تو نظر نہیں آتی جو غبار کو اڑائے لئے جارہی ہے مگر غبار نظر آ رہا ہے کہ یہ اُڑ رہا ہے اور وہ اڑ رہا ہے۔اسی طرح اس گنوار نے سمجھا تھا کہ سرخ جھنڈی میں یہ تاثیر ہے کہ وہ ریل تو روک دے۔

سبب اور مسبب میں ارتباط لازم نہیں

اسی طرح فلسفی صاحب سمجھے ہیں کہ سبب اور مسبب میں ارتباط لازم ہے تو واقع میں یہ لزوم محض ظاہر میں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک قاعدہ مقرر فرمادیا ہے مگر مقرر کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسباب کو مؤثر مان لیا جائے ورنہ ریلوے کے قاعدہ مقرر کرنے سے سرخ اور سبز جھنڈی کو بھی مؤثر کہنا چاہیئے ہرگز نہیں، اگر مشیت نہ ہو تو یہاں دَھرا ہی کیا ہے۔سوائے اس کے کہ سبب اور مسبب میں اقتران ہو گیا ہے۔تم نے صرف آگ جلادی ہے باقی کھانا قدرت نے پکایا ہے آگ

نے نہیں پکایا۔ اگر آگ نہ ہوتی تب بھی کھانا پک سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں مگر چونکہ ہم کو معلوم نہیں ہے کہ مشیت کس وقت ہوگی کس وقت نہ ہوگی۔ اور ہم وقت پر کھانا پکانا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے مشیت کا وقت معلوم کرنے کا طریقہ ہم کو بتلا دیا۔ کہ تم چولہے پر ہانڈی رکھ کر آگ جلا دیا کرو ہماری مشیت متعلق ہوجایا کرے گی ورنہ آگ کے اندر بھلا یہ قدرت کہاں کہ وہ کھانے کو پکا سکے۔ چنانچہ بعض دفعہ اپنی مشیت وقدرت ظاہر کرنے کو اللہ تعالیٰ اسباب کو معطل بھی کر دیتے ہیں اسی طرح ہماری ریاضت ومجاہدہ بھی کیا چیز ہے جس پر کوئی ثمرہ مرتب ہو۔ یہ سب کچھ ان کی عطا ہے جیسے کسی سخی نے رائی کا دانہ لے کر کسی کو ایک گاؤں دے دیا۔ تو اب کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ رائی کا دانہ اس قابل تھا کہ اس کے عوض ایک گاؤں دیا جائے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل سے جنت میں نہ جائے گا بلکہ سب رحمت سے جائیں گے۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بھی؟ واقعی یہ بڑا ضروری سوال تھا۔ خدا تعالیٰ جزائے خیر دے۔

عمل دخول جنت کی علّت تامّہ نہیں

حضرت عائشہؓ نے ایسے ایسے سوالات کر کے ہمارے لئے راستہ صاف کر دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا **و لا انا** (**المعجم الکبیر للطبرانی ۷: ۳۰۷**) کہ ہاں میں بھی عمل سے جنت میں نہ جاؤں گا بلکہ محض فضل ورحمت سے جاؤں گا۔ اور یہ جواب بڑی علامت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا ہونے کی کہ باوجود یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کیا کیا فضائل ہیں کیسے کیسے کمالات ہیں مگر اس پر بھی صاف صاف فرماتے ہیں و لا انا جھوٹا مدعی ہرگز یہ جواب نہیں دے سکتا۔ معنی حدیث کے یہ ہیں کہ عمل علّت تامہ نہیں دخول جنت کی اور ہو بھی کیسے سکتی ہے اس لئے کہ جتنی بڑی جزا ہے اتنا ہی بڑا عمل تھوڑا ہی ہے۔ ہماری اعمال تو اس نوکر کے کام کے برابر بھی نہیں جو چار روپے ماہوار پر آپ کا کام کرتا ہے۔ وہ مہینہ بھر تک صبح سے شام تک محبت ومشقت کرتا ہے تو آپ اس کو چار روپے دیتے ہیں اگر حق تعالیٰ بھی ہمارے ساتھ اسی طرح برتاؤ فرماتے تو شاید ہمارے عمر بھر کے اعمال کی قیمت چار (۴) آنے بھی نہ ہوتی۔ پھر اس پر غیر متناہی نعمتیں عطا فرمانا جو ختم ہی نہیں ہوں گی اور جن کے متعلق ارشاد ہے کہ **وما لاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر** (جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی دل میں اس کا وسوسہ ہوا) (مسند احمد ۲: ۴۳۸، الترغیب والترہیب ۴: ۵۲۱) تو کیا یہ نعمتیں ہمارے

اس عمل کا عوض ہو سکتی ہیں ہرگز نہیں اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے آپ ترازو کے ایک پلے میں تو رائی کا دانہ رکھیں اور دوسرے میں چکی کا پاٹ ۔ بھلا ان دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے؟ اور یہ مثال بھی پوری مثال نہیں کیونکہ چکی کا پاٹ پھر متناہی ہے حساب کر کے رائی کے دانہ سے اس کی نسبت معلوم ہو سکتی ہے اور نعمائے آخرت غیر متناہی ہیں جس سے عمل متناہی کو کچھ بھی نسبت نہیں ۔ مگر حق تعالیٰ ہمارے اس رائی کے دانہ کو بھی اتنا وزنی فرما دیتے ہیں جتنا وہ چکی کا پاٹ ہے تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھ جائیں کہ ان کے پاس اتنے اعمال ہیں ۔

فضیلت صدقہ

حدیث میں آیا ہے کہ جب کوئی راہ خدا میں ایک چھوارا صدقہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کو اپنے داہنے ہاتھ میں لے کر بڑھاتے ہیں ۔ یہاں تک کہ وہ احد پہاڑ سے بھی بڑھ جاتا ہے ۔ بھلا احد پہاڑ کے برابر چھوارے کے ٹکڑے کر کے تو دیکھئے کتنے ہوں گے ۔ خواہ حجم میں کیجئے یا وزن میں ۔ اگر وزن میں کئے جائیں گے تو اور بھی زیادہ ٹکڑے ہوں گے مگر چھوارے کے اس قدر بڑھنے کے بعد بھی جزا اس سے ایسی ہی بڑھی ہوئی ہے جیسے اس وقت تھی جب کہ چھوارا اپنی اصلی حالت پر تھا کیونکہ جزا غیر متناہی ہے مگر خیر عمل کے بڑھانے سے فی الجملہ جزا و عمل میں تقارب تو ہو گیا ۔ تو علت تامہ دخول جنت کی رحمت تامہ ہے اللہ تعالیٰ چاہتے ہی ہیں کہ ہم جنت میں جائیں اس لئے عمل کا حکم دیتے ہیں اور پھر اس عمل کی توفیق بھی مرحمت فرماتے ہیں تو محض ان کی رحمت ہی سبب ہے دخول کا ۔ ورنہ ہمارے اعمال تو جو کچھ ہیں سب انہی کے عطا کئے ہوئے ہیں ۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ انہوں نے ہی ہم کو اپنی اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت عطا فرمائی ہے ۔ اور یہ محبت انہی کی پیدا کی ہوئی ہے مگر اس کا ظہور اب ہوا ہے ۔ ہمارے اکتساب کے بعد تاکہ ہمارا جی خوش ہو کہ یہ ہماری کمائی ہے ۔ اور حکمت اس میں یہ ہے کہ ہم اس کی قدر کریں اور اس کو نعمت سمجھیں ۔ قاعدہ ہے کہ جو چیز مفت حاصل ہوتی ہے اس کی قدر نہیں ہوتی ۔

مفت کی قدر نہیں ہوتی

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صاحب سے جنہوں نے ایک کتاب طبع کرائی تھی فرمایا تھا کہ بھائی اس کو بلا قیمت کسی کو مت دینا ورنہ لوگ اس کو ردی میں ڈال دیں گے ۔ مشہور ہے کہ ایک شخص اوہوڑی کا جوتہ دوشالہ سے جھاڑ رہا تھا کسی نے وجہ پوچھی تو کہا جوتہ میری کمائی کا

ہے اور دو شالہ ابا جان کی کمائی کا۔ تو یہ حکمت ہے اکتساب کے بعد ظاہر ہونے میں اور سچ تو یہ ہے کہ میرا یہ کہنا بھی بے ادبی ہے کہ اس میں یہ حکمت ہے کیونکہ تمام حکمتوں کا احاطہ کسی نے تھوڑا ہی کرلیا ہے۔ تو اصل میں اور کیا کیا حکمتیں ہوں گی مگر تقریب فہم کے لئے ایک آدھ مثال دے دی گئی ہے۔ تو اصل محبت تو ان ہی کی عطا ہے اور وہی اس کی حفاظت فرماتے ہیں پھر بھی چونکہ یہ نعمت نہایت قابلِ قدر ہے اس لئے ہم کو بھی جو چیزیں اس کو ضعیف کرنے والی ہیں ان سے ہم کو بھی بچنا چاہیئے اسی کو میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں یہی آج کے بیان کا مقصود ہے۔ اب ذرا سنئے کہ وہ چیز کیا ہے جو اس محبت کو ضعیف کرتی ہے۔

گناہوں سے اللہ تعالیٰ سے دُوری ہوتی ہے

سو وہ بُعد عن الحق (اللہ تعالیٰ سے دوری) ہے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ بعد کس چیز سے ہوتا ہے تو یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ مصائب سے بعد نہیں ہوتا۔ بلکہ بعد صرف گناہ سے ہوتا ہے جس کی طرف کبھی نظر بھی نہیں جاتی۔ جسمانی اور مالی و آفاقی بلاؤں سے تو قرب بڑھتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے مؤمن کو عین بلاء کے وقت حق تعالیٰ کی طرف توجہ پہلے سے زیادہ ہو جاتی ہے مگر بلا سے مراد وہ ہے جو غیر اختیاری ہو۔ اور اگر کوئی شخص اپنے ہاتھوں مصیبت مول لے تو وہ گناہ ہے اس سے بعد ہوتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے **لاینبغی للمؤمن ان یذل نفسہ** (مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۰۳، کنز العمال: ۵۳۰۴) صحابہ نے اس کی تفسیر دریافت فرمائی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **یتحمّل من البلاء لمالا یطیقہ** یعنی اپنے نفس کو ذلیل کرنا یہ ہے کہ انسان اپنے ہاتھوں ناقابل برداشت مصیبت میں پڑے سو یہ حقیقت میں معصیت ہے قرب نہیں۔

مصائب سے حق تعالیٰ شانہ کا قرب بڑھتا ہے

مگر جو مصیبت غیر اختیاری ہو اس سے کچھ بُعد نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں تو اس کی ہر قسم کی مدد بھی کی جاتی ہے اور وہ حال ہوتا ہے کہ ۔

درد از یار ست و درماں نیز ہم　　　دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

(درد محبوب حقیقی کی طرف سے ہے اور علاج بھی ان کی طرف سے ہے تو میرا دل بھی ان پر قربان اور جان بھی)۔

اس سے تو قرب بھی بڑھتا ہے اور محبت بھی بڑھتی ہے۔ چنانچہ ایام مصیبت کی حالت کو یاد

کر کے دیکھ لیجئے اور خیر ہم لوگ تو جیسے مصائب میں مبتلا ہیں اسی طرح گناہوں میں بھی پھنسے ہوئے ہیں۔مگر جو حضرات ہم سے پہلے گزر چکے ہیں مثلاً انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام ان کے حالات میں غور کیجئے کہ ان پر کیسی کیسی شدتیں ہوئی ہیں، ہائے۔مولانا فرماتے ہیں ؎

زاں بلا ہا کا نبیاء برداشتند سر بچرخ ہفتمیں برداشتند

(یہ مصائب حضرات انبیاء علیہم السلام نے برداشت کئے بلکہ ساتویں آسمان کے سر تک برداشت کئے)۔

یعنی انبیاء علیہم السلام پر کیسی کیسی ایذائیں امت کی طرف سے ہوئی اور وہ بلائیں ان کی ترقی کا سبب بنیں اور حدیث میں بھی آیا ہے کہ بعض امتوں کے لوگ آروں سے چیرے گئے ہیں مگر ان لوگوں کے استقلال میں فرق نہ آیا۔تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر کس چیز نے ان کو مستقل بنائے رکھا وہ کیا چیز تھی وہ محبت تھی کیونکہ ؎

از محبت تلخہا شیریں بود (محبت کے باعث تلخیاں میٹھی (خوشگوار) ہوجاتی ہیں)۔

بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست تو تیز برسر بام آکہ خوش تماشائیست

یعنی عاشق اپنے محبوب سے کہہ رہا ہے کہ ذرا آپ بھی آکر یہ تماشا دیکھ جاتے تو اچھا تھا کہ مجھے صرف آپ کی محبت کے جرم میں قتل کیا جارہا ہے اس کے سوا اور کوئی جرم میں نے نہیں کیا وَمَا وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ اور عاشق کی اس درخواست کا منشا یہ ہے کہ جب تم اپنی آنکھوں سے مجھ کو دیکھو گے تو تمہارے دیکھنے سے مصیبت مجھ پر آسان ہوجائے گی۔خصوص جب تم مجھ کو دیکھو گے اور میں تم کو دیکھوں گا تو عشق کی آگ اور بڑھے گی۔کیونکہ پھر دونوں طرف سے علاقہ ہوجائے گا اور لذت عشق میں مصائب کا تحمل آسان ہوجاتا ہے۔

مراقبہ کی تعلیم

اور میرے خیال میں قرآن شریف میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فاصبر (پس صبر کیجئے) کے ساتھ **فانک باعیننا** (بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں) سُنایا گیا ہے وہ درحقیقت ایک مراقبہ کی تعلیم ہے کہ مصیبت کے وقت یہ بات پیش نظر رکھئے کہ خدا دیکھ رہا ہے اس کا بھی یہی حاصل ہے کہ اس مراقبہ سے بلا کا تحمل آسان ہوجائے گا۔میرا ذوق بھی کہتا ہے کہ **فانک باعیننا** علت ہے فاصبر کی اور علیت کا تحقق جب ہی ہوسکتا ہے جب کہ

اس مضمون کو صبر میں دخل ہواب آیت کا حاصل یہ ہوا کہ محبوب کا مصیبت کے وقت عاشق کو دیکھنا اوراس کا یہ سمجھ لینا کہ محبوب دیکھ رہا ہے۔عاشق کے لئے موجب لذت ومزیل کلفت ہوتا ہے۔ بہر حال محبت وہ چیز ہے کہ اس سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بعض لوگ آروں سے چیرے گئے مگران کے استقلال میں فرق نہ آیا اور خیر یہ حضرات تو تھے ہی مگر اللہ کے بندے اب بھی موجود ہیں کیا وہ مصائب نہیں اٹھاتے۔

بلاؤں میں لذّت کی عجیب مثال

بحمد اللہ وہ بھی عین بلاؤں کے ہجوم کے وقت اپنے قلب میں ایک خاص ذوق اورایک خاص لذّت پاتے ہیں اوراس پر کسی کو تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ بلاتوایک تلخ چیز ہے تلخی میں کیا ذوق؟ تلخی میں کیا لذّت؟ محسوسات میں اس کی نظیر دیکھئے کہ مرچوں میں کیسی لذت ہے جولوگ مرچیں کھاتے ہیں ان سے دریافت کیجئے حالانکہ اس وقت حالت یہ ہوتی ہے کہ آنکھوں سے بھی پانی آرہا ہے منہ سے بھی سی سی کررہے ہیں۔مگر کھاتے چلے جارہے ہیں کوئی پوچھتا ہے ارے بھائی کیا ہو گیا خیر تو ہے؟ کہتے ہیں کچھ نہیں آج سالن میں مرچیں بہت ہو گئیں اب اگر وہ یہ کہے کہ پھر سالن نہ کھایا ہوتا تو وہ یہی کہے گا کہ واہ مرچ بھی کوئی چھوڑنے کی چیز ہے۔جولوگ تمبا کو کھاتے ہیں وہ اس کی تلاش میں ہر وقت رہتے ہیں کہ کہیں سے تیز تمبا کو ملے۔اگر کسی دوکان میں مل جاتا ہے تو کہتا ہے کہ بھائی اس سے بھی زیادہ کڑوا ہوتو وہ دو۔ذرا آپ تو تمبا کو کھا کر دیکھئے ذرا پتی ہی سے پت اچھلنے لگیں گے ورنہ چکراور متلی تو ضرور ہو جائے گی اور جو عادی ہیں ابتداء میں ان کو بھی سب کچھ ہوا تھا۔مگراب ان کو تمبا کو میں کیسی لذت آتی ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ اب یہاں تلخی اور لذت کیسے جمع ہو گئے۔مگر حیرت ہے کہ آپ یہاں تعجب نہیں کرتے اور اللہ کے بندوں پر آپ کو تعجب ہوتا ہے اور آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ حق تعالیٰ کی محبت میں یہ خاصیت ہے کہ تلخ کو شیریں کر دیتی ہے۔دشواریوں کو آسان کر دیتی ہے اب اگر کوئی کہے کہ صاحب اگر یہ بات ہے تو پھر اولاد کے مرنے کے وقت انبیاء علیہم السلام کے آنسو کیوں نکلے تو وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کے اندر مختلف طبائع رکھے ہیں،ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔تو وہ آنسو نا گواری سے نہیں نکلے بلکہ ترحم سے نکلے ہیں وہ اپنی آنکھوں سے اپنے بچہ کی اس حالت کو دیکھ نہ سکے اگر آنسو نہ نکلتے تو بچہ کا حق ادا نہ ہوتا۔کیونکہ ترحم بچہ کا حق ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ سے پوچھتا ہوں کہ آخر مرچوں سے آنسو کیوں نکلتے ہیں تو تم یہی کہو گے ناں کہ صاحب مرچ کی تو خاصیت ہی یہ ہے کہ اس سے آنکھوں سے اور ناک سے پانی

نکلا کرتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اسی طرح بعض بلا میں بھی یہ خاصیت ہے کہ اس سے آنسو نکلا کرتے ہیں ۔اور باوجود آنسو نکلنے کے وہ دل سے ناراض نہ ہوگا جیسا مرچ کھانے والا دل سے ناراض نہیں ہوتا گو آنکھیں رو رہی ہیں، رضاء والم جمع ہو سکتے ہیں دیکھئے ایک شخص ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے کہ میرا پھوڑا نکلا ہے اس میں آپریشن کر دیجئے ڈاکٹر نشتر لگاتا ہے تو مریض ایک چیخ مارتا ہے۔ پھر جب آپریشن ہو چکتا اور مرہم پٹی کر کے ڈاکٹر فارغ ہو جاتا ہے تو یہ مریض صاحب جیب سے پچاس روپے نکال کر ڈاکٹر کے نذر کرتے ہیں کہ یہ آپ کا انعام ہے اس موقعہ پر کسی کو تعجب نہیں ہوتا کہ اگر اس مریض کو ڈاکٹر کے فعل سے ناگواری تھی تو پچاس روپے کیسے دیئے اگر راضی تھا تو چیخ کیسے نکلی۔ یہاں ہر شخص عاقل بن جاتا ہے اور یہی کہتا ہے کہ نشتر کی خاصیت ہے کہ چیخ نکلے رونا آجائے اس لئے یہ فعل عدم رضا کی دلیل نہیں۔طبعاً الم تھا اس وجہ سے چیخ ماری۔اور عقلاً اس فعل پر راضی تھا اس لئے خوش ہو کر انعام دیا۔ بلکہ دراصل وہ طبعاً بھی راضی تھا صرف اتنی بات تھی کہ طبیعت اس وقت نشتر کی خاصیت سے مغلوب ہو گئی تھی جو کہ اب بعد میں غالب آئی ہے اب تو آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ رضا والم محبت اور صورت غم دونوں جمع ہو سکتے ہیں پس خوب سمجھ لیجئے کہ محبت ایسی ہی چیز ہے جو تلخ کو شیریں کر دیتی ہے۔ تو یہ دعویٰ ثابت رہا کہ بلاؤں سے نہ بُعد ہوتا ہے اور نہ حجاب بلکہ بلاؤں سے تو اور حجاب اٹھ جاتا ہے حجاب کی چیز تو صرف ایک ہے جو حظ نفس کی ایک فرد ہے اور وہ گناہ ہے اور یہ گناہ وہ چیز ہے کہ بعض مرتبہ اس کے اثر سے ذکر تک سے محرومی ہو جاتی ہے بلکہ بعض دفعہ ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

حجاب کے سات درجات

چنانچہ صوفیہ نے حجاب کے سات درجہ بیان کئے ہیں ۔اوّل اعراض، دوسرے حجاب، تیسرے تفاصل، چوتھے سلب مزید، پانچویں سلب قدیم، چھٹے تسلی، ساتویں عداوت یعنی اول اعراض ہوتا ہے اگر معذرت اور توبہ نہ کی حجاب ہو گیا اگر اس کے بعد بھی اصرار رہا تفاصل ہو گیا۔ اگر اب بھی استغفار نہ کیا تو عبادت میں جو ایک زائد کیفیت ذوق وشوق کی تھی وہ سلب ہو گئی یہ سلب مزید ہے اگر اب بھی اپنی بیہودگی نہ چھوڑی تو جو راحت وحلاوت کیفیات زائدہ سے پہلے اصل عبادت میں تھی وہ بھی سلب ہو گئی اس کو سلب قدیم کہتے ہیں اگر پھر بھی توبہ میں تقصیر کی تو جدائی کو دل گوارا کرنے لگا یہ تسلی ہے۔ اگر اب بھی وہی غفلت رہی تو محبت مبدل بہ بغض وعداوت ہو گئی یہ آخری حجاب ہے جو سب سے اشد ہے وہاں پہنچ کر بندہ کو حق جل شانہٗ سے بغض پیدا ہو جاتا ہے

اور کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ دنیا میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جب دو طرف سے آپس میں تکدر ہو جاتا ہے تو یہی سات حالتیں یکے بعد دیگرے وہاں بھی پیش آتی ہیں۔ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

احب مناجات الحبیب باوجہٍ ولکن لسان المذ نبین کلیل

کہ ہم گنہگاروں کی زبان جو ہے وہ درماندہ ہے کہ اٹھانے سے اٹھتی ہی نہیں چنانچہ مشاہدہ ہے کہ انسان جس سے شرمندہ ہوتا ہے اس کے سامنے اتنے کہنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی کہ میرا قصور معاف کردو۔ یہ ہے تو ایک حال لیکن اگر اس کے مقتضیٰ پر عمل کرلیا گیا تو سخت مضر ہے ایک عذاب ہے وبال ہے۔ خیر یہ بزرگ تو صاحب حال تھے اور اس کے مقتضےٰ پر عمل سے بچے ہوئے تھے۔ مگر بعض لوگ تو اس حال کے مقتضیٰ پر عمل بھی کرتے ہیں۔

محققین کے علوم انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہوتے ہیں

ابن القیم نے الدواء الکافی میں ایسی حکایتیں لکھی ہیں۔ چنانچہ ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ جب اس کا آخری وقت ہوا تو اس سے توبہ کے لئے کہا گیا تو کہنے لگا کہ اتنے گناہوں میں توبہ کیا کام دے گی۔ اور اسی حالت میں بغیر توبہ کے مرگیا یہ حقیقت میں جہل ہے۔ محققین نے اسی کو ایک مثال سے بالکل سمجھا دیا ہے۔ محققین کے علوم بھی انبیاء علیہم السلام کے علوم کے مشابہ ہوتے ہیں۔ جیسے انبیاء علیہم السلام کا یہ طرز ہے کہ وہ معقولات کو محسوسات بنا کر بیان فرماتے ہیں۔ اسی طرح ان محققین کی بھی وہی شان (بفضلہٖ تعالیٰ اس شان کا ظہور جیسا کہ اس وعظ میں متعدد جگہ ہوا ہے اسی طرح شیخ المشائخ قطب الاقطاب حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی قدس سرہ کی دیگر تقریروں اور تصانیف میں سینکڑوں اور ہزاروں جگہ ہوا جس کا جی چاہے مشاہدہ کرلے ۱۲۔حمید حسن دیوبندی) ہوتی ہے تو ایک بزرگ ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ تم کو اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے میں کسی گناہ کی وجہ سے دیر نہ کرنا چاہیئے تمہاری ایسی مثال ہے جیسے ایک گندا ناپاک شخص دریا کے پاس گیا تو دریا نے کہا تو میرے پاس آ پاک ہوجائے گا اس نے جواب دیا کہ تو پاک اور صاف وشفاف اور میں پلید وناپاک تیرے پاس ایسی حالت میں کیونکر آؤں۔ دریا نے کہا اچھا مت آ مگر بچہ جی ساری عمر یوں ہی ناپاک رہوگے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی چیز پانی کے سوا نہیں جو ناپاک کو پاک کردے اگر ناپاک آدمی پاک ہونا چاہے تو اس کو چاہیئے کہ اسی ناپاکی اور گندگی کی حالت ہی میں دریا کے اندر چلا جائے۔ محققین فرماتے ہیں کہ خواہ تم کیسے ہی گنہگار ہو اور اپنے گناہوں سے تم کتنے ہی شرمندہ ہو مگر تم اسی حالت میں اللہ کے دربار میں جا کھڑے ہو اور آنکھیں بند کرکے یہ کہنا شروع

کردو کہ اے اللہ توبہ ہے اے اللہ توبہ ہے اور اس قدر کہو کہ وہ حجاب جو تمہارے اور حق تعالیٰ کے درمیان واقع ہوگیا ہے۔ وہ بالکل اٹھ جائے یہی حجاب وہ چیز ہے جو توبہ کی توفیق حاصل کرنے کا طریقہ ہے اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک دفعہ ہمت کر کے زبان سے توبہ شروع کردو اور کرتے رہو یہاں تک کہ دل سے توبہ نکلنے لگے۔

صاحبو! اس وقت کو غنیمت سمجھو کہ زبان سے توبہ کا لفظ نکالنے پر تم کو قدرت حاصل ہے کبھی یہ بھی سلب نہ ہو جائے۔

گناہ ایک عظیم بلا ہے

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ایک دن وہ ذکر کرنے بیٹھے اور انہوں نے زبان سے اللہ کا نام نکالنا چاہا تو نہ نکلا بہت حیران ہوئے کہ کیا بات ہے اور باتیں تو زبان سے نکلتی ہیں، مگر اللہ کا نام زبان سے نہیں نکلتا۔ آخر جب مجبور ہو گئے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سجدے میں گر کر دل سے دعا کرنے لگے اور بہت گڑگڑائے کہ اے اللہ یہ کیا قہر نازل ہوا الہام ہوا کہ فلاں دن ہنسی میں ایک کلمہ تمہاری زبان سے ایسا نکلا تھا کہ جس میں دین کا استخفاف تھا۔ آج اس کی یہ سزا دی گئی ہے کہ تم کو ہمارا نام لینے کی توفیق نہیں ہوئی کیونکہ تم نے اس کلمہ سے توبہ نہ کی تھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زبان بند کر دی جاتی ہے اس وقت سنبھلنا ہر ایک کا کام نہیں، یہ خاص لوگوں کا کام ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے تو ہم کو زبانی توبہ کی قدر کرنی چاہیئے مگر ایک بار دوبارہ پر تو کفایت نہ کرنا چاہیئے بلکہ اتنی کثرت کی جائے کہ دل سے توبہ نکلنے لگے۔

اس حکایت سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ گناہ کتنی بڑی بلا ہے کہ ذکر سے بھی محروم کر دیتا ہے اور اگر کسی کو ایسا ہی اتفاق ہو جائے تو وہی کرے جو ان بزرگ نے کیا بہر حال توبہ کرنے سے پھر گناہ کا یہ اثر نہیں رہتا وہ تو بڑے غفور رحیم ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۔ (اللہ تعالیٰ تم کو سزا دے کر کیا کریں گے اگر تم شکر گزاری کرو اور ایمان لے آؤ۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے قدر کرنے والے اور جاننے والے ہیں ۱۲) اور یہاں شکر سے مراد عمل ہے ای عملتم صالحاً مثلاً توبہ ہی ہے کہ یہ بھی عمل صالح ہے تو ان کو تم سے ضد تھوڑا ہی ہے کہ تم توبہ کر رہے ہو اور وہ پھر بھی تم کو عذاب دیں۔ غرض جتنے حجابات ہیں وہ سب اوپر ہی سے ہیں۔ ہمارے ماموں صاحب کا ایک شعر ہے فرماتے ہیں۔

شد ہفت پردہ بر چشم ایں ہفت پردۂ چشم　　　بے پردہ ورنہ ما ہے چوں آفتاب دارم

یعنی حجابات جو ہیں وہ ہماری آنکھ پر ہیں۔ جنہوں نے ہمارے ادراک کو روک دیا ہے محجوب پر کوئی حجاب تھوڑا ہی ہے۔ بھلا اُنہیں کون چیز روک سکتی ہے، البتہ ہمارے ادراک کو بعض چیزیں روکنے والی ہیں۔ اب دیکھئے نا اگر آپ آفتاب کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوں اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیں جس سے آفتاب نظر نہ آئے تو یہ حجاب آفتاب پر ہوا؟ نہیں بلکہ آپ کی آنکھ پر ہوا آفتاب کو وہ چیز محجوب کر سکتی ہے جو آفتاب سے بھی بڑی ہو پس حق تعالیٰ کو محجوب کرنے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اسی واسطے فرماتے ہیں کہ۔

شد ہفت پردہ بر چشم این ہفت پردہ چشم　　　بے پردہ درنہ ماہے چوں آفتاب وارم

تو جتنے حجاب ہیں وہ سب بندہ ہی کی طرف سے ہیں ورنہ اس طرف سے رحمت میں کوئی کمی نہیں مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ (اللہ تعالیٰ تم کو سزا دے کر کیا کریں گے اگر تم شکر گزاری کرو اور ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ بڑے بڑے قدردان اور جاننے والے ہیں) تو اب بندہ کو چاہیئے کہ فوراً ہر حجاب کو رفع کرے۔ اب رہی یہ بات کہ کیونکر رفع کرے؟ تو اس کے لئے جو طریقے ہیں (یعنی حجابات کے) رفع کرنے کے ان حضرات سے پوچھ کر ان کو اختیار کرے۔ پھر انشاء اللہ تعالیٰ سب حجابات آسانی سے مرتفع ہو جائیں گے اہل طریق کو بھی یہ بلائیں بہت پیش آتی ہیں بلکہ ان کو دوسروں سے زیادہ خطرناک حالتیں پیش آتی ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں **انتم تخافون المعاصی ونحن نخاف الکفر**۔ (تم گناہوں سے ڈرتے ہو اور ہم کفر سے ڈرتے ہیں)

کسب معصیت میں حکمت بیان کرنا کفر کے قریب ہے

اہل طریق سے طریق کے دھوکہ میں بعض ایسی دقیق غلطی ہو جاتی ہے کہ وہ کفر تک پہنچتی ہے۔ ایک صاحب مجھ کو سفر میں ملے کہنے لگے کہ صاحب اگر کبھی نفس میں گناہ کا تقاضا پیدا ہو اور تقاضہ کے روکنے سے اس میں اور زیادتی ہو تو ایسی صورت میں اگر ایک بار اس معصیت کا ارتکاب کر لیا جائے تاکہ قلب فارغ ہو جائے اور یکسوئی کے ساتھ ذکر و شغل میں لگ سکے تو اس میں کیا مضائقہ ہے کیونکہ جب تک وہ تقاضا قلب میں رہے گا اس وقت تک قلب ادھر ہی مشغول رہے گا۔ اور جب تقاضا جاتا رہے گا تو پھر آئندہ معصیت کا بھی اندیشہ نہ رہے گا۔ اس وقت اس معصیت سے استغفار کر لے۔ میں نے کہا تو بہ کرو تم قریب بکفر ہو معاصی میں حکمتیں بیان کرتے ہو۔ اگر کوئی کہے کہ معصیت بھی ایک واقعہ ہے اور ہر واقعہ میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہر فعل کے اندر دو مرتبے ہوتے ہیں، خواہ وہ فعل طاعت ہو یا معصیت ایک

مرتبہ خلق کا اور ایک کسب کا تو خلق معصیت میں حکمت بیان کرنا تو فعل حق میں حکمت بیان کرنا ہے یہ تو محمود ہے باقی کسب معصیت میں حکمت بیان کرنا تو یہ قریب بکفر ہے۔ اور در حقیقت یہ بھی شیطان کا ایک دھوکہ ہے کہ گناہ کر لینے سے تقاضا کم ہو جائے گا کیونکہ ارتکاب معصیت سے فی الحال کچھ دیر کو تقاضا کم ہو جائے گا مگر اس کا یہ اثر ہوگا کہ آئندہ کے لئے مادہ معصیت قوی ہو جائے گا اور جڑ پکڑ جائے گا۔ پھر اس کا ازالہ قدرت سے باہر ہو جائے گا کیونکہ انسان جب تک کوئی گناہ نہیں کرتا اس وقت تک گناہ اس کی نظر میں پہاڑ کی طرح بھاری اور خطرناک ہوتا ہے اور جب ایک دفعہ کر لیا اب ایسا خطرناک نہیں دکھلائی دیتا ہے معمولی بات ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ ارتکاب کے بعد پھر بچنا آسان نہیں۔ اسی کو شیخ سعدیؒ نے بیان فرمایا ہے۔

شکم صوفئے رازبوں کر دو فرج — دو دینار بر ہر دو آں کرد خرج
یکے گفتش از دوستاں در نہفت — چہ کر دی بدیں ہر دو دینار گفت
بدینارے از پشت راندم نشاط — بد یگر شکم را کشیدم سماط
فرو مائیگی کردم وابلہی — کہ ایں ہمچناں پر شدو اں تہی

(صوفی کے شکم اور فرج نے خراب کر دیا دونوں دیناران دو پر خرچ کر دیئے دوستوں میں سے ایک نے اس سے چھپ کر کہا کہ تم نے دونوں دینار کا کیا کیا تو اس نے کہا کہ ایک دینار میں نے خوشی پر خرچ کیا اور دوسرے سے پیٹ کو موٹا کیا۔ میں نے گھٹیا کام کیا کہ یہ اس سے پُر کیا اور وہ خالی ہے)۔

یعنی جس چیز کو بھر لیا تھا۔ یعنی شکم کو وہ تو پھر خالی ہوگئی اور جس کو خالی کیا تھا۔ یعنی شرم گاہ کو وہ پھر بھر گئی دونوں فعل بے نتیجہ ہوئے۔ اور بالفرض اگر تقاضا نہ بھی رہا تو پھر اس پر خوش نہ ہونا چاہیئے کیونکہ وہ تقاضا جاتا رہنا مسبب ہے گناہ (یہ تحقیق آپ زر سے لکھنے کی ہے، فللّٰہ درہ ثم للّٰہ درہ ۱۲) سے اور تقاضا کا باقی رہنا، مسبب تھا طاعت سے اس لئے میں جزم کے ساتھ کہوں گا کہ طاعات کے ساتھ تقاضائے معصیت موجب قرب ہے اور معصیت کے ساتھ عدم تقاضا موجب قرب نہیں ہوسکتا بلکہ ارتکاب سے پہلے جو اس تقاضے کی وہ مخالفت کر رہا تھا یہ مقاومت نفس اور مجاہدہ کی ایک فرد تھی جو موجب قرب ہے۔

موافق سنت عنداللہ محبوب ہے

جیسے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا کہ بعضے لوگ کہتے ہیں کہ نماز میں جب تک روح نہ ہو خالی اٹھک بیٹھک کرنے سے کیا فائدہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نے ارشاد فرمایا کہ اس اٹھک بیٹھک کی قدر وہاں پہنچ کر معلوم ہوگی اور ترک نماز تو بڑی سخت چیز ہے اگر اس کی کوئی سنت بھی ترک ہو جائے تو نماز کا نور کم ہو جاتا ہے۔ گو باطنی ادب محفوظ ہے اور ادائے سنت کے ساتھ اگر باطنی کمی ہو جائے تب بھی نور میں اتنی کمی نہیں ہوتی مثلاً اگر ہم مسجد میں آ کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں تو گو اس میں ہم کو ہزاروں وساوس آئیں مگر وہ زیادہ قیمتی ہوگی۔ اس یکسوئی سے جو بلا جماعت کی نماز میں ہم کو حاصل ہو۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ایک بزرگ تھے۔ مولوی محبّ الدین صاحبؒ بڑے صاحب کشف تھے انہوں نے ایک بار ارادہ کیا کہ ایک دفعہ دو رکعتیں ایسی پڑھیں جن میں کوئی وسوسہ نہ آئے۔ چنانچہ وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی جس میں تمام ظاہری و باطنی شرائط کا لحاظ رکھا اور شروع سے آخر تک کوئی وسوسہ نہ آیا پوری طرح کامیاب ہو گئے جب نماز سے فارغ ہوئے تو عالم مثال کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھے کہ دیکھوں اس کی وہاں کیا صورت ہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے ایک نوجوان پری پیکر حور کھڑی ہے جو حُسن میں لاثانی۔ سر سے پیر تک زیورات سے مرصع ہے ہر ہر عضو خوبصورت ہے مگر آنکھوں سے اندھی ہے۔ یعنی آنکھیں تو موجود ہیں اور نہایت خوبصورت ہیں مگر روشنی نہیں۔ انہوں نے حضرت حاجی صاحبؒ سے اس کا مجملاً تذکرہ کیا۔ حضرت نے فی البدیہہ فرمایا کہ شاید آپ نے یکسوئی کے لئے آنکھیں بند کر لی ہوں گی۔ کہا جی ہاں فرمایا کہ بس اتنی ہی کمی رہی۔ اگر نماز سنت کے موافق ہو تو گو اس میں لاکھوں وساوس آئیں وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے اس سے جو مسنون طریقہ کے خلاف پڑھی جائے کیونکہ پہلی نماز اوفق بالسنۃ (سنت کے مطابق) ہو گی اور یہ ابعد عن السنۃ (سنت سے بعید) ہے پہلی صورت میں گو حسن اور زیورات میں کمی ہوتی مگر آنکھوں سے تو اندھی نہ ہوتی۔ دوسری صورت میں حسن زیادہ حاصل ہوا مگر اندھی رہی اور ظاہر ہے کہ اندھی عورت سے گو کیسی ہی حسین ہو سوانکھی عورت افضل ہے گو حسن زیادہ نہ ہو پس خوب سمجھ لو کہ بندہ کی ساری عمر اگر اسی کشتم کشتہ میں گزر جائے اور مقاومت (مقابلہ) نفس میں مشغول رہے اور تقاضائے معاصی اس کو پریشان کرتے رہیں یکسوئی بھی حاصل نہ ہو تو یہ موجب قرب ہے کیونکہ یہ عمل ہے اور گناہ کے تقاضے پر عمل کر لینے کے بعد جو ایک قسم کا سکون محسوس ہوتا ہے وہ ہرگز قابلِ قدر نہیں کیونکہ وہ کیفیت ہے عمل نہیں اور کیفیت موجب قرب نہیں ہے پس گناہ سے بچنا بہت ضروری ہے۔

فوراً توبہ کی ضرورت

اور جو مبتلا ہو گیا ہو اس کو ہمت کے ساتھ جلد توبہ کرنا چاہیئے۔ گناہ کے بعد اگر بندہ اس وجہ

سے توبہ نہ کرے کہ میرے گناہ اس درجہ ہیں کہ توبہ سے کچھ فائدہ نہ ہوگی یہ بھی حماقت اور شیطان کا جال ہے اور حقیقت میں یہ کبر ہے کہ اپنے کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ گویا اس نے اللہ تعالیٰ کا کچھ ایسا نقصان کر دیا ہے کہ اب وہ اس کو معاف نہیں کر سکتے کیا اللہ میاں سے بھی مساوات کا دعوٰی ہے۔ یاد رکھو یہ برتاؤ تو بالکل برابر کا سا ہے حالانکہ خدا تعالیٰ اور اس کی صفات کاملہ کے سامنے تمہاری اور تمہارے افعال کی ہستی ہی کیا ہے؟ سارا عالم بھی نافرمان بن جائے تو ان کا ذرہ برابر کچھ نقصان نہیں ہوسکتا نہ ان کو عفو و کرم سے کوئی امر مانع ہوسکتا ہے۔

اپنے گناہوں کو بہت زیادہ سمجھنا تکبر ہے

مشہور ہے کہ ایک مچھر بیل کے سینگ پر جا بیٹھا تھا جب وہاں سے اڑنے لگا تو بیل سے معذرت چاہی کہ معاف کیجئے گا آپ کو میرے بیٹھنے سے بہت تکلیف ہوئی ہوگی، بیل نے کہا ارے بھائی مجھ کو تو خبر بھی نہیں کہ تو کب بیٹھا تھا اور کب اڑا تو جیسے وہ مچھر سمجھا تھا کہ مجھ میں اتنا وزن ہے کہ جس سے بیل بھی دب گیا ہوگا۔ اسی طرح یہ شخص بھی اپنے گناہوں کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ جس سے اسباب کا اندیشہ ہوگیا کہ حق تعالیٰ میرے ان گناہوں سے متاثر ہوگئے ہوں گے۔ حالانکہ حق تعالیٰ پر کسی چیز کا بھی کچھ اثر نہیں ہوتا۔ تو اپنے گناہوں کو اتنا بڑا سمجھنا کہ توبہ کافی نہ ہو یہ درحقیقت تکبر ہے گو صورۃً شرمندگی ہے۔

پھر صاحب ہمارا تو نصوص پر ایمان ہے۔ نصوص میں یہ کہیں نہیں وارد ہوا کہ فلاں گناہ میں توبہ نہیں۔ سب سے بڑا گناہ کفر ہے مگر توبہ اس کے لئے بھی ہے۔ ابوجہل تک کو بھی توبہ کا حکم ہے اگرچہ اس کے متعلق خبر دے دی گئی کہ وہ ایمان نہیں لائے گا مگر پھر بھی حکم ہے کہ توبہ کر۔ تو حضرت اس سے بڑھ کر کس کا کفر شدید ہوگا۔ اور اس کا کفر ظاہراً ممتنع (یہ علم بھی عجیب و غریب ہے جس کی علماء ظاہر کو غالباً ہوا بھی نہیں لگی ۱۲) الزوال بھی تھا کیونکہ نص کے اندر خبر دے دی گئی تھی مگر اس کو بھی حکم ہے کہ آمن وتب الیہ۔

انقباض بھی گناہ کا اثر ہے

تو اگرچہ صوفی کی یہ شرمندگی جس کی وجہ سے اس کی زبان نہیں اٹھتی بوجہ افتقار وانکسار (محتاج ہونا) کے ہے لیکن اس کو حکم ہے کہ توبہ کرو۔ لہٰذا اس پر توبہ واجب ہے مگر چونکہ اس میں ایک قسم کا جہل بھی ہے اس لئے توبہ کرنے میں اس کو انقباض (بھیج جانا) ہے اور دل رُکتا ہے اور یہ انقباض بھی گناہ کا اثر ہے اس کے اندر ایک ساتھ دو کیفیتیں جمع ہو جاتی ہیں ایک تو عزم توبہ اور ایک توبہ سے رکاوٹ ایسے ہی مواقع پر پہنچ کر کوئی ناقص چیخ اٹھتا ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندہ کردہ　　بازمیگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(دریا میں تختہ باندھ کر ڈال دیا ہے پھر کہتے ہو خبردار دامن تر نہ ہو)۔

یہ دراصل عربی کے اس شعر کا ترجمہ ہے۔

القاہ فی الیم مکتوفاً و قال لہ　　ایاک ایاک ان تبتل با لماء

(اس کو دریا میں باندھ کر ڈال دیا ہے اور کہتا ہے دیکھئے پانی میں نہ بھیگنا)۔

وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہاں جمع بین الضدین کا حکم کیا گیا ہے اس جہل میں مبتلا ہوجاتا مگر یہ پورا جہل ہے۔ خدا کی قسم بالکل باطل ہے غلط ہے اور یہ اول تو کسی جاہل کا قول ہے۔ اور اگر کسی صاحبِ حال کا ہے تو اس وقت اس پر جہل غالب تھا اس لئے کہ کوئی اس سے پوچھے کہ انقباض زبان پر ہے یا نفس پر تو اس سے کلام سے کہ لسان کو کلیل کہا ظاہر یہ ہے کہ زبان پر ہے تو تم یہ تو کر سکتے ہو کہ ہاتھ پھیلا کر دل سے توبہ کرنے لگو یا سجدہ میں گر کر رونے لگو یا رونے کی صورت بنالو اور دل سے توبہ کرلو۔ اور اگر نفس پر ہے کہ دل بوجہ غلبۂ جہل کے توبہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو زبان پر قدرت موجود ہے۔ اگر اس کو چلاؤ گے تو وہ ضرور چلے گی جب زبان پر قدرت ہے تو زبان سے توبہ کرسکتے ہو دل سے توبہ نہیں نکلتی تو زبان ہی چلاؤ مگر تم نے تو ہمت ہی ہار دی اور خواہ مخواہ اپنے کو مجبور اور توبہ کو دشوار سمجھ لیا۔

حالتِ انقباض میں توبہ کا حکم

بفرض محال اگر کسی کو زبان پر بھی قدرت نہ رہے کہ زبان ہلانا چاہتا ہے مگر چلتی نہیں تو چلانے کا قصد ہی کرے کہ یہ عزم بھی بجائے چلانے کے ہے۔ بس اگر تم نے زبان ہلانے کا عزم کرلیا خواہ وہ نہ چلے تو توبہ ہوگئی اگر اب بھی انقباض باقی رہے تو پھر اسی طرح توبہ کرو اگر پھر بھی انقباض باقی رہے تو پھر توبہ کرو اسی طرح چار پانچ بار کرنے سے وہ انقباض رفع ہوجائے گا۔ صاحبو یہاں ملفوظات کے یاد کرنے سے کام نہیں چلتا بلکہ معالجات کو یاد کرنا چاہیئے۔ یہ سب شیطان کے فریب ہیں وہ ایسی باتوں سے لوگوں کو اعمال سے باز رکھنا چاہتا ہے غرض باطن کو کتنا ہی ضرر گناہوں سے پہنچا ہو توبہ سے اس کا علاج کرو۔ اگر کہو کہ صاحب توبہ کے بعد بھی اندیشہ ہے کہ پھر گناہ ہوجائے گا۔ کہاں تک توبہ کریں تو میں کہتا ہوں کیا علاج کرانے کے بعد تم پھر کبھی بیمار نہیں پڑتے اور کیا ایک بار علاج کرانے کے بعد پھر علاج نہیں کراتے بھادوں کی فصل میں بخار جاڑہ آتا ہے تو تم علاج کراتے ہو اور اگر کوئی کہے کہ بھائی کیوں علاج کراتے ہو پھر بھادوں آنے والا ہے تو کیا تم علاج سے رک جاؤ گے یہ جواب دو گے کہ اگر بھادوں آئے گا تو آنے دو اگر بیمار پڑیں گے پھر علاج کرالیں گے اسی طرح

یہاں کہا جاتا ہے کہ اگر پھر گناہ ہو جائے پھر توبہ کر لیجئے توبہ کرنے میں پھاوڑے تو چلانے نہیں پڑتے۔ اگر کہو صاحب یہ توبہ کیا ہوئی ایک کھیل ہو گیا تو صاحب کھیل ہی سہی مگر یہ وہ کھیل ہے جسے کہا کرتے ہیں کہ کھیلتے ہی کھیلتے گھر بس جائے گا۔ توبہ حقیقی نہ سہی تشبہ تو ہے تائبین کے ساتھ۔

ساحرین کے ایمان لانے کا سبب

آپ نے سنا ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت ایمان دی مگر وہ ایمان نہ لایا اور وہ ساحر جو موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرنے کے لئے آئے تھے مشرف بایمان ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب باری سے اس کی وجہ دریافت کرنا چاہی ارشاد ہوا کہ ساحر تمہاری وضع بنا کر آئے تھے ،لہٰذا ہم نے نہ چاہا کہ جو ہمارے محبوب کی شکل اختیار کرے اس کو محروم چھوڑ دیں اور محبوب نہ بنائیں۔

ایک نظر میں کامل کر دینے کا مفہوم

حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ اپنے شیخ کے ہمراہ تشریف لئے جا رہے تھے راستہ میں ویرانہ میں ایک مسجد ملی وہاں چند مکار مراقب بنے بیٹھے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کو توجہ دے رہے تھے۔ شیخ نے فرمایا کہ اے مرزا اگر تم نے مکاروں کو نہ دیکھا ہو تو ان کو دیکھ لو۔ خیر بات ختم ہوئی تھوڑی دیر کے بعد مرزا صاحب کو اتفاقاً پھر پکارا وہ اس وقت موجود نہ تھے۔ جب تشریف لائے تو شیخ نے فرمایا کہاں گئے تھے کہا حضرت آپ کے ارشاد کے بعد مجھ کو خیال ہوا کہ ان پر حضرت کی نظر تو پڑ ہی گئی ہے میں نے گوارا نہ کیا کہ جس پر حضرت کی نظر پڑے وہ محروم رہے لہٰذا میں ان کے قلب میں القائے نسبت کر رہا تھا۔ چنانچہ مرزا صاحب نے سب کو ایک نظر میں کامل کر دیا۔ اب یہاں ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ ایک نظر میں کامل کیسے ہو گئے تو یہ غور کرنے کی بات ہے۔ ایک نظر میں کامل کر دینے کے یہ معنی ہیں کہ استعداد کمال کی پیدا ہو گئی یوں شاذ و نادر کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ ایک نظر میں کمال حاصل ہو جائے جب پہلے سے استعداد ہو اسی واسطے کہا گیا ہے۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(پلک جھپکنے کے برابر اس شہنشاہ حقیقی سے غافل مت ہو، شاید اس کی نگاہ لطف تجھ پر پڑتی ہو اور مجھ کو خبر نہ ہو)۔

متشبہ صوفی بھی قابلِ قدر ہے

تو جناب زبان تو آپ کے قابو میں ہے اس کو چلایئے اس لئے کہ اہل تشبہ پر بھی نظر ہو

جاتی ہے من تشبہ بقوم فھو منھم (جس نے جس قوم کی مشابہت اختیار کی پس وہ اُنہی میں سے ہے) (سنن ابی داؤد: ۴۰۳۱، مسند احمد ۲: ۵۰) اہل حق کے لئے بھی عام ہے بدلیل قولہ صلی اللہ علیہ وسلم اَلْمَرْءُ مع من احب (انسان قیامت کے دن اس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہے) (الصحیح للبخاری ۸: ۴۸، سنن الترمذی: ۲۳۸۶) بزرگوں نے لکھا ہے کہ صوفی قابل قدر ہے ہی متشبہ بالصوفی بھی قابل قدر ہے گوریا کی نیت سے صوفیوں کی شکل بنانا فی نفسہٖ محمود نہیں، مگر اس تشبہ سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ اس کے دل میں عظمت ہے اہل اللہ کی ورنہ کوئی شکل بھنگی کی شکل نہ بنالے تو حضرت اس عظمت پر بھی فضل ہو جاتا ہے۔ وہاں تو فضل وکرم کے لئے بہانا ڈھونڈھتے ہیں یہی معنی ہیں، مولانا رومی کے اس شعر کے ۔

بانگ می آید کہ اے طالب بیا ۔ جود محتاج گدایاں چوں گدا

(آواز آئی کہ اے طالب آ، سخاوت بھی فقیر کی مانند فقیروں کی محتاج ہے)۔

گو اس کو اگر حضرت الٰہیہ کے معاملہ کے متعلق کہا جائے جیسا مولانا کی عادت ہے کہ مجازی پردہ میں حقیقت کو بیان کرتے ہیں اس صورت میں الفاظ ذرا تیز ہو گئے ہیں مگر اسی مضمون کو حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے الفاظ میں ادا کیا ہے، وہ فرماتے ہیں ۔

سایۂ معشوق گر افتاد بر عاشق چہ شد ۔ ما با ومحتاج بودیم او بما مشتاق بود

(اشتیاق بمعنی محبت صفت کمال ہے۔ بخلاف احتیاج کے۔ مگر مراد اس سے بھی مجازاً اشتیاق ہی ہے)۔

پس حافظ صاحب نے حقیقت کو استعمال فرمایا ہے اور مولانا نے مجاز کو استعمال فرمایا ہے۔ لازم بول کر ملزوم مراد لے لیا ہے۔ مطلب مولانا کا یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی طلب کرے اور ڈھونڈھتا ہوا آئے فرماتے ہیں ۔

آب کم جو تشنگی آور بدست ۔ تا بجوشد آیت از بالاؤ پست

کیونکہ ۔

تشنگاں گر آب جویند از جہاں ۔ آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پیاسے تو پانی ڈھونڈتے ہی ہیں پانی بھی خود ان کی طلب میں ہے کہ پیاسے کہاں ہیں پیاسے کہاں ہیں)۔

آگے اس کی شرح فرماتے ہیں ۔

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں ۔ کو بہ نسبت ہست ہم این وہم آں

مگر فرق یہ ہے کہ ؎

عشق معشوقاں نہاں است وستیر عشق عاشق باد وصد طبل ونفیر
لیک عشق عاشقاں تن زہ کند عشق معشوقاں خوش وفربہ کند

(معشوقوں کا عشق پوشیدہ اور چھپا ہوا ہے اور عاشق کا عشق دوسو ڈھول اور آواز کے ساتھ ہے لیکن عاشق کا عشق اس کے بدن کے ٹکڑے کرتا ہے جب کہ معشوقوں کا عشق خوش اور موٹا کرتا ہے)۔

یعنی وہاں اور آثار ہیں محبت کے اور یہاں اور مگر محبت وہاں بھی ہے اس لئے کہ ؎

اگر از جانب معشوق نہ باشد کششے طلب عاشق بیجا رہ بجائے نرسد

مغفرت کی خاصیت بارود کی مانند ہے

اور جب یہ ہے کہ ان کو بھی تم سے محبت ہے تو پھر تو ذرا بہانہ چاہیئے رحمت کے لئے مگر یہ آثار اسی وقت ظاہر ہوتے ہیں جب ادھر سے بھی طلب ہو یعنی تم بھی ارادہ کرو۔ ورنہ ارشاد ہے کہ۔ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ (کیا ہم تمہیں (اپنی رحمت) چپکا دیں گے جبکہ تم اس سے نفرت کرتے ہو) ان کے اندر استغنا بھی ہے۔ اور معشوقوں میں ہوتا ہی ہے اور وہ تو استغنا سے کام بھی نہیں لیتے مگر تمہاری بے رخی اور اعراض علاج کرنے کی مصلحت سے کبھی کبھی کھڑ کھڑا بھی دیتے ہیں جیسے کوئی معشوق اپنے عاشق کے پاس آیا۔ دیکھا تو عاشق پڑا سو رہا ہے اس نے ایک ٹھوکر مار کر جگا دیا یہ تو شان استغنا ہے مگر یہاں یہ ہے کہ معشوق نے رحم کھا کر اٹھا دیا اور ملامت کر کے اس کی بغل میں بیٹھ گئے یہ تو بہت ہی عجیب ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بیچارہ معذور ہے انسان کو نیند سے چارہ نہیں اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو جو تہجد کے عادی ہیں وقت پر جگا کر اپنے ساتھ ہم کلام ہونے کا شرف دے دیتے ہیں اور یہ شان تو انہیں کی ہے کہ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند) حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اخیر شب میں آسمان اول پر نزول فرماتے اور یہ ندا دی جاتی ہے کوئی طالب مغفرت ہے کہ میں اس کی مغفرت کردوں کوئی طالب رزق ہے کہ اس کو رزق دے دوں۔ اس وقت بہت لوگ غافل پڑے سوتے ہیں اس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بانگ می آید کہ اے طالب بیا جود محتاج گدایاں چوں گدا

(آواز آئی کہ اے طالب آ سخاوت خود محتاج کی مانند فقیروں کو تلاش کرتی ہے)۔

جب یہ بات ہے تو کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ وہ توبہ قبول نہ کریں گے بھلا ان کے متعلق یہ

گمان کیسے ہوسکتا ہے۔ اس جہل کو نکالو اور توبہ سے مت رکو کہ صاحب ہمارے تو گناہ بہت بڑے ہیں، ارے صاحب تمہارے گناہ تو کیا بڑے ہوتے تم ہی کہاں کے بڑے ہو وہ گناہ تو تمہاری صفت ہے جب موصوف ہی بڑا نہیں تو صفت کیسے بڑی ہو جائے گی، بخلاف ان کے کہ ان کا ہر فعل چھوٹے سے چھوٹا بھی بڑا ہے یہی معنی ہی اس کے جو حدیث میں آیا ہے کہ اگر ساری زمین گناہوں سے بھر جائے تو توبہ سب کو مٹا دیتی ہے۔ دیکھئے بارود ذرا سی ہوتی ہے مگر بڑے بڑے پہاڑوں کو اڑا دیتی ہے بفرض محال اگر مغفرت چھوٹی بھی ہوتی تو اس کی خاصیت بارود کی سی ہے۔ اگر بندوں کو رحمت حق کا مشاہدہ ہونے لگے تو گناہوں کو بڑا سمجھنے پر شرمندگی ہوگی نا امیدی تو کیا ہوتی۔ مگر اس شرمندگی کے مقتضیٰ پر عمل نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ گناہ اگرچہ رحمت کے مقابلہ میں چھوٹے ہیں مگر تمہارے لئے تو بڑے ہی ہیں۔ تولہ بھر سنکھیا اگرچہ من بھر تریاق کے سامنے چھوٹا ہے مگر معدہ کے مقابلہ میں بڑا ہے تو گو تریاق کے مقابلہ میں سنکھیا اپنا اثر نہیں کرتا مگر بغیر تریاق استعمال کئے تریاق کا اثر کب ظاہر ہوسکتا ہے بس اس تریاق کا استعمال یہی ہے کہ زبان سے کہو اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے اللہ مجھے بخش دے اے اللہ مجھے بخش دے) وہ تمہاری مغفرت کے لیے ہر وقت تیار ہیں مگر تم مغفرت تو مانگو اس تریاق کا اثر ظاہر تو کریں گے وہی مگر تم اس تریاق کا استعمال تو کرو۔ دیکھو اگر وہ تریاق تمہارے سامنے رکھ دیتے اور ترکیب کھانے کی نہ بتلاتے تو تم کیا کرتے پس کتنی بڑی عنایت ہے کہ زہر گناہ کے لئے تریاق بھی بنایا اور اس کی ترکیب بھی ہم کو بتلا دی صرف استعمال کی دیر ہے۔

حکایت آصف الدّولہ

اس مضمون پر مجھے ایک حکایت یاد آ گئی۔ آصف الدولہ لکھنو کے بادشاہ کا وزیر تھا۔ اور بہت سخی تھا عوام میں بطور مثل مشہور تھا کہ یہ ایسا خوش نصیب ہے کہ اگر پتھر سے اس کے گھوڑے کی ٹاپ لگ جائے تو وہ سونا بن جائے۔ ایک بڑی بی نے جو سنا تو ایک بیل لے کر اصطبل میں پہنچیں اور اس کے گھوڑے کے سم سے اس کو ملنے لگیں۔ اتفاق سے آصف الدولہ ادھر آ نکلا پوچھا بڑی بی کیا کر رہی ہو۔ بڑی بی نے جو سنا تھا بیان کر دیا۔ آصف الدولہ نے کہا مائی تم نے سچ سنا مگر اس کی ترکیب تم سے نہیں آتی اس کو ہم جانتے ہیں۔ تم اپنی سل یہیں چھوڑ جاؤ۔ کل آ کر لے جانا وہ چھوڑ گئی آصف الدولہ نے فوراً حکم دیا کہ ایک سل اتنی ہی بڑی ٹھوس سونے کی بنائی جائے چنانچہ وہ بن گئی۔ اور بڑی بی بھی پہنچیں تو کہا لو مائی اپنی سل دیکھو اب وہ سونے کی بن گئی ہے دیکھئے اس شخص نے احسان بھی نہ جتلایا اور اس کو مالا مال کر دیا۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی بے انتہا عطاء وسخا

کیا خدا کی سخاوت ورحمت آصف الدولہ سے بھی کم ہو جائے گی ہرگز نہیں، ہرگز نہیں ان کی عطاء وسخا کے سامنے کسی کی کیا ہستی ہے جنت کے خزانے جب سامنے آئیں گے آنکھیں کھل جائیں گی جن کے حاصل کرنے کا طریقہ سب کو اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا ہے۔ غرض وہ جانتے ہیں کہ اس تریاق سے کیونکر علاج ہوسکتا ہے۔ بس اس کا طریقہ یہی ہے کہ اے اللہ ہم کو مغفرت دے دیجئے انشاء اللہ وہ گناہ بھی بخش دیں گے اور انعام میں جنت کے خزانے بھی دے دیں گے۔ افسوس ہے کہ آپ سے اتنا کام بھی نہیں ہوسکتا۔ ایسے تنگ مزاج ہو گئے۔ اب اس پر بھی اگر ادھر سے کمی رہے تو بتلایئے کس پر الزام ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ گناہ بڑی چیز تھی جو بُعد کا سبب ہو رہی تھی۔ جس کے رفع کرنے کی ضرورت تھی۔ اس لئے یہ مضمون ضرورت توبہ کا ذہن میں آیا۔ اسی واسطے اس کتاب میں سے وہ حدیثیں میں نے نکالیں جن میں یہ مضمون ہے (یعنی توبہ کا) پھر حاضرین میں سے ایک صاحب سے دریافت فرمایا کہ کیا وقت ہو گیا عرض کیا گیا کہ ابھی تو ایک گھنٹہ ہوا ہے اس پر احقر نے عرض کیا کہ حضرت ابھی تو تمہید ہی ہوئی ہے (اصلی مضمون ابھی باقی ہے) تو حضرت نے فرمایا کہ مشہور ہے کہ مور کی دُم مور سے بڑی ہوتی ہے۔ اس پر احقر نے عرض کیا کہ ابھی وہ خود مور بھی تو موجود نہیں ہوا۔ الغرض حاضرین کے اصرار پر حضرت نے کتاب کھول کر ارشاد فرمایا۔

توبہ سے متعلق دو احادیث

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے دو حدیثیں بیان کی ہیں جن میں سے ایک اپنی طرف سے روایت کی ہے مگر یہ ان کا اپنی طرف سے بیان کرنا بھی ایسا ہی ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہی بیان کی گئی ہے۔ اس لئے کہ صحابہ کی شان وہ ہے جیسے کسی نے کہا ہے ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

''آئینہ کے پس پردہ مجھے بٹھا رکھا ہے جو کچھ استاد ازل نے کہا وہی میں کہتا ہوں''

تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مثال مومن کی جو ڈرتا ہے اپنے گناہوں سے ایسی ہے جیسے ایک شخص پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں گر نہ پڑے (پھر حضرت حکیم الامت مجدد الملۃ قطب الاقطاب رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا) کہ مجھ کو یاد ہے کہ ایک بار میرا کوئٹہ کا سفر ہوا تھا۔ وہاں ہم سیر کرتے چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک پہاڑ دیکھا جس کا ایک

بہت بڑا حصہ آگے کو جھکا ہوا ایک بہت تھوڑی جگہ پر لٹکا ہوا ہے۔ اور صدیوں سے اسی صورت سے موجود ہے تو جب ہم اس کے نیچے پہنچے تو بڑا ہی ڈر معلوم ہوا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گرا۔ اسی طرح مومن بھی اپنے گناہوں سے ڈرتا ہے۔ گوادنیٰ ہی گناہ ہوا اس سے بھی ڈرتا ہے۔ بخلاف فاجر کے کہ وہ گناہ کو مثل مکھی کے سمجھتا ہے کہ آئی اور اڑا دیا۔ تو معلوم ہوا کہ گناہ کو سخت سمجھ کر توبہ کرنا علامت ہے ایمان کی اور اس کو ہلکا سمجھنا علامت ہے بے ایمانی کی اور اوپر جو آیا ہے کہ جو گناہ کو بڑا نہ سمجھے اس کو مطلب یہ ہے کہ اتنا بڑا نہ سمجھے کہ توبہ سے مانع ہو جائے اور یہاں بڑا سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنا چھوٹا نہ سمجھے کہ توبہ کی ضرورت نہ سمجھے غرض اصل چیز تو یہ ہے جو اعتقاد توبہ سے مانع ہو وہ مذموم ہے خواہ بڑے ہونے کا اعتقاد خواہ چھوٹا ہونے کا اعتقاد۔

دوسری حدیث وہ ہے جو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے یعنی اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندے کے توبہ کرنے سے اتنا خوش ہوتے ہیں جیسا ایک شخص اونٹنی پر سوار ہو کر سفر کے لئے روانہ ہوا چلتے چلتے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جو چٹیل میدان ہے نہ وہاں کوئی چیز کھانے کی نہ پینے کی نہ کوئی درخت ہے جس کے سایہ کے نیچے آدمی قیام کر سکے۔ غرض کہ تمام سامان ہلاکت کے موجود ہیں اور اس کے پاس جو اونٹنی ہے اسی پر تمام سامان کھانے پینے کا لدا ہوا ہے یہ گویا ایک مثال فرض کی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ بس وہ شخص اس جنگل میں جا کر اُتر پڑا اور سر رکھ کر سو گیا۔ سوتے سوتے آنکھ کھلی تو اونٹنی ندارد اب وہ بڑا حیران و پریشان ہوا۔ ہر طرف تلاش کیا مگر کہیں پتہ نہ چلا بے سروسامانی سے یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ اپنی زندگی سے بھی ناامید ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ مرنا تو ہے ہی پھر پریشانی میں کیوں مروں۔ مرتا بھی سکون ہی کے ساتھ اچھا (پھر حضرت حکیم الامۃ نے ارشاد فرمایا کہ) جیسے ایک بخیل کی حکایت مشہور ہے۔ کہ ایک بار وہ بیمار ہو گیا اس کے لڑکے نے کہا ابا جان علاج کرائیے! کہنے لگا کہ اگر علاج نہ کرایا تو کیا ہوگا۔ کہا ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ کہنے لگا اچھا حساب لگاؤ کہ علاج میں کیا خرچ ہوگا۔ چنانچہ اندازے سے حساب لگا کر بتایا گیا۔ پھر کہا اچھا اس کا بھی حساب کرو کہ اگر ہم علاج نہ کرائیں اور مرجائیں تو مرنے میں کیا خرچ ہوگا بتلایا گیا کہ مرنے میں اتنا خرچ ہوگا۔ جو علاج کے خرچ سے کم تھا، کہنے لگا کہ بس اب ہماری رائے مرنے ہی کی ہوگئی ہے کیوں کہ اس میں خرچ کم ہے۔ بخل ہو تو ایسا تو ہو۔ تو اس نے حساب اسی لئے لگایا کہ یکسوئی کے ساتھ مروں۔ خیر میں یہ بیان کر رہا تھا کہ جب وہ شخص ناامید ہو گیا تو اس نے اونٹنی کا تلاش کرنا چھوڑ

دیا اور مرنے کے لئے تیار ہو گیا کلائی پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں گویا مرنا اختیار میں نہ تھا۔ تو مرنے کی شکل بنانا تو اختیار میں تھا۔ اسی حالت میں وہ سو گیا۔ اب آنکھ جو کھلی تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹنی سامنے کھڑی ہے اور سارا سامان جو اس کے اوپر لدا ہوا تھا موجود ہے اب اس کی خوشی کی کچھ انتہا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ تو زندگی سے مایوس ہو کر مرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ تو دیکھتا ہے کہ خلاف امید اونٹنی کھڑی ہے اور اس پر اس کا سامان بھی جوں کا توں رکھا ہوا ہے تو اب وہ کیسا خوش ہوگا آگے حدیث میں اس کے خوشی کے بعض آثار بھی مذکور ہیں جو بھی آتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جتنا یہ شخص خوش ہوگا۔ اس سے زیادہ اللہ میاں خوش ہوتے ہیں۔ جب بندہ توبہ کرتا ہے۔ بھلا انہیں کیا ضرورت تھی خوش ہونے کی ان کا اس میں کیا نفع تھا۔ مگر وہ اپنے بندہ کو بہت ہی چاہتے ہیں، عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آیت **لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ** سے بہت کچھ امید رحمت کی ہوتی ہے میں کہتا ہوں کہ اس آیت کی شان نزول پر نظر کر کے کہ نومسلموں کے باب میں ہے۔ حدیث میں اس سے بھی زیادہ رحمت حق پر دلالت ہے تو گو توبہ سے بندہ کا ہی بھلا ہوتا ہے مگر دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مرتبہ اتنا اپنی صحت سے جی خوش نہیں ہوتا جتنا اپنے پیارے کی صحت سے ہوتا ہے۔ مثلاً کہا کرتے ہیں کہ تیری بیماری مجھے لگ جائے۔ گو امتحان پر بہت کم لوگ پورے اترتے ہیں۔ مگر خیر زبان سے تو کہتے ہیں۔ جو ایک درجہ میں علامت ہے غایت محبت کی جب ہی تو اس کی بھلائی سے اپنا جی خوش ہوا۔ پھر انسان کو اپنی غرض بھی مطلوب رہتی ہے اور اگر کوئی بالکل ہی بے غرض ہو تو کم از کم اپنے پیارے کی راحت سے قلب کو راحت تو ضرور ہو گی یہ بھی ایک غرض ہی ہے کیونکہ انفعال خاصہ بشری ہے تو انسان کے اندر اس کا بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ کام اپنی راحت قلب کی وجہ سے کیا ہوگا۔ لیکن حق تعالیٰ تو انفعال سے بھی پاک ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ　　　در گراں جانی و چالاکی ہمہ

(ہم تو ایسے مقدس ہیں کہ پاکی سے بھی پاک ہیں، پاکی سے پاک ہونے کی معنی یہ ہیں کہ جیسی پاکی تم سمجھتے ہو ہم اس سے پاک ہیں)۔

من نگردم پاک از تسبیح شان　　　پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں

(یعنی لوگوں کی تسبیح و تقدیس سے ہم پاک نہیں ہوں گے بلکہ اس سے وہی پاک ہو گئے)۔
یعنی حق تعالیٰ جل جلالہ، تو اتنے پاک ہیں کہ تمہاری سمجھی ہوئی پاکی سے بھی پاک ہیں ان کی

تو وہ شان ہے کہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء تو انسان کا تو انسان کی بیماری سے دل دکھتا ہے اسی لئے اس کی صحت چاہتا ہے۔ حق تعالیٰ تو اس سے بھی پاک ہیں بس حق تعالیٰ کو جو بندہ سے محبت ہے وہ بالکل بے علت و بے غرض محبت ہے۔ غرض وہ تمہارے ساتھ اس درجہ کے رحیم و شفیق ہیں اب عادت مصلحین کی یہ ہے کہ توبہ کی ضرورت ثابت کرنے کے لئے عذاب کو یاد دلاتے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ طبائع ضعیف ہوگئی ہیں اس واسطے عذاب کے یاد دلانے سے اندیشہ ہے کہ ان کو حضرت حق سے وحشت نہ ہو جائے بلکہ بجا اس کے میرے نزدیک ان کے اندر حق تعالیٰ شانہٗ کی محبت پیدا کرنا چاہیئے، یا ان کو اللہ تعالیٰ کی محبت یاد دلانا چاہیئے کہ تم سے حق تعالیٰ کو ایسی محبت ہے۔ بہرحال میری رائے یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے محبت پیدا کرنا چاہیئے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس خوشی کا درجہ جو اس شخص کو اونٹنی کے مل جانے پر ہوئی ہمارے سمجھانے کے لئے بیان فرماتے ہیں۔ کہ جب اس شخص کی آنکھ کھلی اور اس نے اپنی اونٹنی کو اپنے پاس کھڑا دیکھا تو بڑا خوش ہوا اور فوراً اٹھ کر اونٹنی کی لگام پکڑ لی۔ اب خوشی چھلکتی ہے تو آپ فرماتے ہیں اے اللہ آپ میرے بندہ ہیں اور میں آپ کا رب ہوں۔ کہنا تو چاہتا تھا کہ میں آپ کا بندہ ہوں، آپ میرے رب ہیں مگر مارے خوشی کے زبان پلٹی جاتی ہے اس لئے کچھ کا کچھ نکل گیا۔ مگر حق تعالیٰ جل جلالہٗ اس پر کچھ نہیں فرماتے ان کے نزدیک یہ خطا بھی نہیں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خونِ شہید راز آب اولیٰ ترست ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست

حکایت شبان موسیٰ علیہ السلام

مولانا نے مثنوی میں شبان موسیٰ علیہ السلام کا قصہ لکھا ہے کہ ایک چرواہا تھا۔ وہ ایک بار جنگل میں بکریوں کو چرا رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ اے اللہ میاں تو اگر مجھے مل جائے تو میں تجھ کو روغنی روٹیاں کھلا دوں، تیرے منّے منّے ہاتھ چوما کروں، تیرے پیر دبایا کروں۔ اس طرح وہ محبت کے جوش میں بھرا ہوا جو جی میں آتا تھا کہہ رہا تھا اتفاق سے اسی طرف موسیٰ علیہ السلام بھی آ نکلے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

زیں نمط بیہودہ میگفت آں شباں گفت موسیٰ با کیستت اے فلاں

(یعنی موسیٰ علیہ السلام نے جو اس کو یہ گفتگو کرتے ہوئے سُنا تو فوراً اس پر فتویٰ نہیں لگا دیا کہ تو کافر ہو گیا بلکہ فتویٰ میں احتیاط سے کام لیا۔ پہلے دریافت کیا کہ کس سے کہہ رہا ہے)۔

جیسے دہلی کا قصہ ہے کہ وہاں ایک فقیر بازار میں کھڑا کہہ رہا تھا کہ نہ تو میرا خدا نہ میں تیرا

بندہ۔ اور لوگ اس کے چاروں طرف جمع تھے اور کافر کافر کہہ رہے تھے۔ اتفاق سے ایک سمجھ دار شخص کا بھی ادھر گزر ہوا تو اس نے فقیر سے دریافت کیا کہ یہ خطاب کس سے کر رہے ہو۔ وہ کہنے لگا خدا کا شکر ہے کہ دہلی میں ایک شخص تو سمجھ دار ملا۔ بات یہ ہے کہ میرے نفس نے آج کھیر کی خواہش کی تھی میں نے نفس کی اس خواہش کو پورا نہیں کیا اس نے پھر تقاضا کیا تو میں نے کہا کہ نہ تو میرا خدا نہ میں تیرا بندہ جو میں تیرا کہنا مانوں۔ توبہ توبہ میں خدا تعالیٰ کو کیوں کہتا۔ تو اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا۔

گفت با آنکس کہ مارا آ فرید　　　　ایں زمیں چرخ از و آمد پدید

اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ میرا پیدا کرنے والا کوئی ہے اور وہ وہی ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا کیونکہ یہ امور فطری ہیں اس میں کسی عالم یا جاہل کی تخصیص نہیں۔

گفت موسیٰ ہائے خیرہ سر شدی　　　　خود مسلماں ناشدہ کافر شدی

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیرا تو ایمان جاتا رہا تو خدا کی طرف ایسی باتوں کی نسبت کرتا ہے حالانکہ خدا تعالیٰ ان چیزوں سے پاک ہیں بس پھر کیا تھا یہ سنتے ہی اس کے ہوش وحواس جاتے رہے اور کہا۔

گفت اے موسیٰ دہانم　　　　دوختیدز پشیمانی تو جانم سوختی

کہ آپ کی تنبیہ سے میرا تو منہ بند ہو گیا اور پشیمانی نے میری جان کو پھونک دیا۔ خیر حسب عادت جب موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے تو وہاں اس پر سوال ہوا کہ آپ نے ہمارے بندے کا منہ بند کیوں کر دیا، مولانا فرماتے ہیں۔

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا　　　　بندۂ مارا چرا کر دی جدا

تو برائے وصل کر دن آمدی　　　　نے برائے فصل کر دن آمدی

کہ آپ لوگوں کو ہم سے چھڑانے آئے ہیں یا ملانے۔

ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم　　　　ہر کسے راسیرتے بنہادہ ایم

موسیا آداب داناں دیگرند　　　　سوختہ جان و رواناں دیگرند

یعنی ہر شخص کا جدا جدا حال ہے۔ عارفوں کے لئے آداب الگ ہیں اور ناواقفوں کے آداب الگ ہیں اسی پر مولانا فرماتے ہیں۔

خون شہیداں راز آب اولیٰ تر ست　　　　این خطا از صد صواب اولیٰ تر ست

(شہیدوں کا خون آب سے افضل ہے اور یہ غلطی سو صواب سے بہتر ہے)۔

اسی طرح یہ شخص جب اونٹنی مل گئی تو شدت فرح میں کہنے لگا کہ میں تیرا رب ہوں مگر حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ اس سخت کلمہ سے بھی ناراض نہیں ہوئے بلکہ معاف فرماتے ہیں۔ اس جملہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے بیان فرمایا کہ اس جملہ سے اس شخص کی انتہا درجہ کی خوشی معلوم ہوئی۔

ایک تیسری حدیث ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک شخص تھا جس نے ننانوے قتل کئے تھے جب اس کو تنبہ ہوا تو اوّل ایک راہب کے پاس گیا جو کہ گویا اس وقت کی اصطلاح کے اعتبار سے شاہ صاحب تھے ان سے جا کر اپنا حال بیان کیا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں اب میں توبہ کرنا چاہتا ہوں کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ میری توبہ قبول ہو جائے۔ راہب نے جواب دیا کہ نہیں تیری توبہ قبول نہیں ہو سکتی اس نے تلوار سونت کر ان کے بھی ایک ہاتھ دیا جس سے راہب کا کام تمام ہو گیا کہ جب توبہ بھی نہیں تو کسر ہی کیوں رکھی پورے سو ہی کیوں نہ کر دوں اس کے بعد پھر اس شخص کو توبہ کی فکر ہوئی۔ راہب کا فتویٰ اس کے جی کو نہ لگا اور واقعی غلط بات کو مومن کا دل قبول نہیں کرتا۔ اب وہ ایک عالم کے پاس گیا۔ حدیث میں اس جگہ عالم کا لفظ آیا ہے اور وہاں راہب کا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم ہمیشہ سے محقق ہوتے آئے ہیں۔ ورنہ اگر وہ بھی شاہ صاحب ہوتے تو ایسا جواب ہرگز نہ دے سکتے۔ مگر عالم کا ترجمہ مولوی نہیں کیونکہ مولوی تو ایسے بھی ہوتے ہیں۔

ایها القوم الذی فی المدرسه　　　　کل ماحصلتموه الوسوسه
علم چه بود آنکه ره بنمایدت　　　　زنگ گمراهی زدل بزدایدت
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند　　　　خوف و خشیت در دلت افزوں کند
تو ندانی جز یجوز ولا یجوز　　　　خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز
علم چوں برتن زنی مارے بود　　　　علم چوں بر دل زنی یارے بود
بینی اندر خود علوم انبیاء　　　　بے کتاب وبے معید و اوستا

(اے وہ لوگو! جو مدرسہ میں علم حاصل کرتے ہو جو کچھ تم نے حاصل کیا محض وسوسہ ہے علم وہ ہے جو تجھے راستہ دکھلائے اور تیرے دل سے گمراہی کے زنگ کو دور کرے یہ علم تمام خواہشات نفسانی کو باہر نکال دیتا ہے اور خوف و عاجزی کو تیرے دل کے اندر زیادہ کر دیتا ہے تو سوائے جائز اور ناجائز کے کچھ نہیں جانتا اور تو نہیں جانتا کہ دوشیزہ ہے یا بوڑھی۔ علم اگر بدن پر مارو تو سانپ بن

جاتا ہےاور دل میں ڈالو تو دوست بن جاتا ہے۔تم اپنے اندر انبیاء کے علوم بغیر کتاب،بغیر معید اور بغیر استاد کے پاؤ گے)۔

جب اطاعت میں انسان کمال پیدا کرتا ہے تو یہ ثمرہ حاصل ہوتا ہے کہ بے کتاب کے اس کو علم حاصل ہوتے ہیں پس حدیث میں یہ علم اور ایسا عالم مراد ہے۔شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جس شخص کے اندر تین باتیں ہوں اس کی صحبت کو غنیمت سمجھو۔ایک یہ کہ وہ فقیہہ ہو۔دوسرے محدث ہو۔تیسرے صوفی ہو۔تو وہ راہب کوئی محقق نہ تھا بلکہ شاہ صاحب تھے جس کی نظر نا تمام تھی۔اس پر ایک حکایت یاد آئی جس سے محقق اور غیر محقق کا فرق معلوم ہو جائے گا۔مگر غیر محقق کا میں نام نہ لوں گا۔

ایک غیر محقق شیخ کی حکایت

ایک مولوی صاحب نے جو رامپور کے رہنے والے اور میرے ساتھ موجز میں شریک تھے۔ یہ حکایت بیان کی کہ رامپور میں ایک صاحب قبض میں مبتلا ہو گئے ان کو اپنے متعلق خیال ہو گیا کہ میں مردود شیطان ہو گیا ہوں۔اس زمانہ میں رامپور میں ایک مولوی صاحب تھے جو کہ صاحب ارشاد بھی تھے۔وہ شخص اتفاقاً ان کے پاس گیا مولوی صاحب نے پوچھا تم کون ہو وہ بولا شیطان ہوں۔مولوی صاحب نے جواب دیا اگر شیطان ہے تو لا حول و لا قوۃ الا باللہ اس جواب سے اس شخص پر ایسی مایوسی طاری ہوئی کہ اس نے خودکشی کر لی۔سچ ہے کہ۔

ذوقے چناں ندارد بے دوست زندگانی   بے دوست زندگانی ذوقے چناں ندارد

(بغیر دوست کے زندگی ایسی نہیں رہتی اور دوست کے بغیر ذوق ایسا نہیں رہتا)۔

یہ حکایت انہوں نے موجز کے سبق میں ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے بیان کی تھی مولانا نے فرمایا کہ ہم تو سمجھے تھے کہ وہ واقعی شیخ ہوں گے۔مگر اس جواب سے معلوم ہوا کہ ہمارا گمان غلط تھا۔ان کو یہ جواب دینا تھا کہ اگر شیطان ہو تو کیا ہوا۔شیطان بھی تو اسی کا ہے۔نسبت اب بھی باقی ہے۔اس سے اس شخص کا قبض بالکل کھل جاتا اور خودکشی سے بھی محفوظ رہتا۔اب یہاں پر ایک اشکال علمی ہے جو حل طلب ہے کہ اس سے اس شخص کو شفا کیسے ہو جاتی اور قبض کیسے کھل جاتا۔اس لئے کہ جو نسبت حق تعالیٰ کے ساتھ مطلوب ہے وہ تو وہ نسبت ہے جو قرب کی نسبت ہو اور شیطان کی نسبت تو بُعد کی نسبت تھی،جب بعد کی نسبت ہے تو بعد موجب تسکین کیسے ہو سکتا ہے۔اس کا حل یہ ہے کہ طبیب کو کبھی مقصود صرف معالجہ ہوتا ہے تحقیق مقصود نہیں ہوتی۔جیسے ایک طبیب کے پاس کوئی شخص آئے۔جس کو ہچکی لگ رہی ہے اب ایک تو تحقیق ہے کہ اس سے

تمہاری ہچکی جاتی رہے گی۔ مگر وہ طبیب جانتا ہے کہ کسی کام میں لگ جانے یا سوچنے سے کوئی فکر شدید پیدا نہ ہوگی بلکہ یہ ایسا ہی کوئی بھی شغل اختیار کرے گا۔ لہٰذا اس نے بجائے اس کے ایک دوسری تدبیر اختیار کی جو کہ تحقیق نہ تھی بلکہ معالجہ تھا۔ جس کی حقیقت ایک حکایت سے معلوم ہوگی۔

ہچکی بند کرنے کی عملی تدبیر

وہ حکایت ایک طبیب کی ہے جو اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ ایک شخص میرے پاس آیا کہ صاحب فلاں شخص کو ہچکیاں آ رہی ہیں، بند ہی نہیں ہوتیں۔ میں نے اس شخص کا حال سنا اور سن کر کہا۔ کہ اس کا تو آخری وقت ہے اب یہ بچے گا نہیں ہچکیوں ہی میں اس کا کام تمام ہوگا۔ اس کو جب اس جواب کی اطلاع ہوئی فوراً ہچکی بند ہوگئی۔ مجھ سے آ کر تیماردار نے اطلاع کی میں نے کہا کہ بھائی خدا کا شکر کرو اب وہ بچ گیا۔ اس نے جا کر بیمار سے یہ میرا قول نقل کیا۔ یہ سننا تھا کہ اس کو ہچکیاں پھر جاری ہوگئیں، پھر میرے پاس آیا میں نے کہا کہ بھائی تمہاری خاطر سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ بچ گیا۔ ورنہ میری تو وہی رائے ہے جو پہلے تھی۔ اس شخص نے جا کر پھر اس سے یہ کہہ دیا۔ یہ سنتے ہی پھر ہچکیاں بند ہوگئیں۔

ایسے ہی حکایت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی ہے کہ ایک بار آپ تراویح پڑھا رہے تھے پیچھے ایک منشی صاحب تھے ان کو ہچکیاں آنے لگیں، بند ہی نہ ہوں۔ مولانا نے سلام پھیرا تو ان منشی صاحب سے فرمایا کہ منشی جی کچھ خبر بھی ہے کہ ہچکی سے وضو رہتا ہے یا ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ کہہ کر نیت باندھ لی۔ اب منشی جی کو اپنی نماز کی فکر ہوگئی بس ہچکیاں بند ہوگئیں۔ جب مولانا نے سلام پھیرا تو انہوں نے مولانا سے یہ مسئلہ دریافت کیا تو مولانا نے فرمایا کہ اب ہچکیاں کہاں ہیں۔

تو مشائخ محققین کے یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک علمی تحقیق دوسرے عملی تدبیر تو مولانا محمد یعقوب صاحب نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ شیطان بھی اسی کا ہے۔ یہ جواب تحقیق نہ تھا بلکہ ایک تدبیر تھی معالجہ تھا۔ طبیب اپنے ذوق اختیاری سے سمجھتا ہے کہ یہ عنوان ہی نافع ہو جائے گا۔ معنوں کی کاوش کی طرف التفات نہ کیا جائے گا۔ اسی واسطے اہل فن پر ردوقدح نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بہت سے افعال ان مشائخ کے محض تحقیق ہی پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ بطور معالجہ کے ہوتے ہیں۔

ایک قسم کا دوام

اسی طرح ایک دوسرا قصہ مولانا یعقوب صاحبؒ کا ہے کہ ایک شخص نے مولانا سے شکایت

کی کہ حضرت کیا کروں چاہتا ہوں کہ معمول ناغہ نہ ہو مگر بعض اوقات ناغہ ہو ہی جاتی ہے۔ اور معمول پر دوام حاصل نہیں ہوتا۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ بھی ایک قسم کا دوام ہی ہے کہ کبھی معمول ادا ہوا کبھی نہ ہوا اسی طرح یہاں بھی اشکال ہوتا ہے۔ کہ دوام مطلوب تو یہ نہیں ہے، پھر مولانا نے اس کو دوام میں کیسے داخل فرمایا۔ اس کا حل بھی یہی ہے کہ مولانا کا مقصود اس وقت تحقیق بیان کرنا نہ تھا۔ بلکہ اس شخص کا علاج کرنا مقصود تھا۔ مولانا ذوقاً سمجھ گئے کہ اگر میں نے اس کے سامنے تحقیق کو بیان کیا تو اس کا مرض بڑھ جائے گا۔ یعنی اس کی ہمت گھٹ جائے گی۔ اور جو کچھ ذکر کی توفیق اب ہوتی ہے وہ بھی نہ ہوگی۔ بالکل ہی ذکر چھوڑ بیٹھے گا۔ اور اگر اس صورت کو بھی دوام میں داخل کردوں گا۔ اس کا جی بڑھ جائے گا پھر رفتہ رفتہ اس کو حقیقی دوام کی بھی توفیق ہو جائے گی۔ اب سینکڑوں ملفوظات حل ہو گئے (اور ہزاروں اشکال کا جواب ہو گیا)۔

نیک صحبت کی برکت

اب آپ کو محقق و غیر محقق کا فرق معلوم ہو گیا تو سمجھئے کہ راہب بزرگ تھا مگر غیر محقق تھا اور وہ عالم محقق تھا۔ عالم سے جب اس نے دریافت کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ ہاں تیری توبہ قبول ہوسکتی ہے۔ تجھ میں اور توبہ میں کون سی چیز حائل ہے۔ پھر فرمایا انطلق الی ارض کذا و کذا یعنی مگر توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ تو اپنے ملک کو چھوڑ دے (یعنی اپنے وطن کو) کیونکہ یہ سرزمین اس قابل نہیں کہ یہاں سکونت اختیار کی جائے۔ اور فلاں زمین میں جا کر بودو باش اختیار کر۔ وہاں ایسے لوگ رہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں تو بھی جا کر ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کر۔ گویا ان عالم صاحب کے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ صحبت بد کو چھوڑ کر صحبت نیک اختیار کر کیونکہ صحبت نیک وہ چیز ہے ؎

گر تو سنگِ خارہٗ مرمر شوی   چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

(اگر تم سخت پتھر اور سنگِ مرمر بھی ہوں گے جب اہل اللہ کے پاس پہنچو گے تو موتی ہو جاؤ گے)۔

اور بُری صحبت کے متعلق فرماتے ہیں ؎

تاتوانی شواز یار بد   یار بد بدتر بود از مار بد

مار بد تنہا ہمیں برجاں زند   یار بد برجاں و برایماں زند

(حتی الوسع برے ساتھی سے دور رہو، برا یار سانپ سے بھی بدتر ہے۔ برا سانپ صرف

جان سے محروم کر دیتا ہے، بُرا دوست جان اور ایمان دونوں سے محروم کر دیتا ہے)۔

آج کل ایسے بہت لوگ پھر رہے ہیں جو مسلمانوں کا مال بھی لیتے ہیں اور ایمان بھی اور فتنہ وفساد پیدا کر کے مسلمانوں کی جانیں بھی ضائع کراتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں۔ جو اپنی نذر و نیاز کے لئے پیری مریدی پھیلانے کے لئے محققین کو برا بھلا کہتے پھرتے ہیں، اس پر مجھ کو ایک قصہ یاد آیا۔ جب نواب صاحب ڈھاکہ نے مجھ کو بلایا تو میں نے اول ان سے چند شرطیں کیں۔ خیر اس کے بعد جب میں وہاں پہنچا اور بدعات کی مذمتیں بیان میں آئیں تو ایک گفتگو کے سلسلہ میں نواب صاحب کہنے لگے کہ صاحب یہاں تو جو آتے تھے ہم سے سجدہ کراتے تھے اور یہ بھی کہا کہ صاحب یہاں پر جو لوگ آتے ہیں ہمارا مال بھی لے جاتے ہیں۔ ایمان بھی لے جاتے ہیں یہ ہیں، یار بد بر جان وبر ایمان زند کے مصداق۔ بہرحال وہ عالم محقق تھے۔ ان عالم صاحب نے اس وقت اس کو طریق توبہ کی تعلیم دی۔ اس کی تفصیل نہیں بتلائی۔ اب یہ تو معلوم نہیں کہ اس زمانہ میں توبہ کے کیا کیا شرائط تھے۔ بہرحال انہوں نے تفصیل نہیں بتلائی۔ انہوں نے یہ سوچا کہ پہلے اس کے اندر توبہ کی استعداد پیدا کرنی چاہیئے اور طاعات بجالانے اور مشقتوں کے تحمل کرنے کا اس کو عادی بنانا چاہیئے پھر تفصیل توبہ کی خود ہی معلوم کرے گا۔ اس محقق کا مذاق یہی تھا کہ پہلے محبت پیدا کرو پھر کام کی تفصیل بتلاؤ۔

شبہات کا شافی علاج

ایک بار میں چھتاری گیا۔ نواب صاحب چھتاری نے بلایا تھا وہاں میرا بیان ہوا جس میں بہت سے علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ بھی جمع تھے۔ میں نے بیان میں یہ بھی کہا کہ آپ لوگوں نے جو یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ جہاں کسی عالم سے ملاقات ہوئی اور آپ نے اپنے شبہات کا دفتر اس کے سامنے کھول دیا۔ یہ طریقہ کامیابی کا نہیں اس سے آپ کے مرض کو شفا نہیں ہو سکتی۔ میں بتلاتا ہوں شفا کا طریقہ کیا ہے۔ آپ اپنے قلب کے اندر محبت پیدا کریں۔ محبت وہ چیز ہے کہ اگر ایک کسی عورت کسی فلسفی سے یہ کہے کہ لنگوٹا باندھ کر بازار کے اس سرے سے اس سرے تک گشت لگاؤ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر وہ کسی کا سچا عاشق ہے تو کبھی بھی پس و پیش نہیں کرے گا۔ بھلا وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ بی بی تمہاری اس میں کوئی منفعت نہیں اور میری اس میں ذلت ہے بلکہ اگر کوئی دوسرا بھی اس سے وجہ دریافت کرے گا تو یہ فلسفی اس سے بھی یہ کہے گا اجی پوچھو مت کہیں اس کی رائے نہ بدل جائے اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ اس نے ایک تدبیر تو بتلا دی ہے اپنے ملنے کی۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود　　　گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

تو دیکھئے اس کسی کے امر وعمل میں اس عمل میں اس شخص کو وسوسہ تک نہیں ہوا کہ اس میں کیا حکمت ہے؟ کیا فائدہ ہے؟ نہ خود اس سے حکمت پوچھتا ہے نہ کسی دوسرے کو پوچھنے دیتا ہے۔ نہ کسی کے اعتراض پر توجہ کرتا ہے تو یہاں کون سی چیز تھی جس کی وجہ سے وسوسہ تک بھی نہ آیا۔ یہ محبت تھی اور کچھ نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کی آسان تدبیر

اب رہا یہ سوال کہ محبت حق پیدا کیونکر ہو تو میں نے کہا میں تم کو ایسی آسان بات بتلاتا ہوں کہ سارے علی گڑھ کی تعلیم میں ایسا آسان سبق آج تک تم کو نہ ملا ہوگا۔ وہ یہ کہ محبت والوں کے پاس بیٹھنا شروع کردو غدر سے پہلے ہمارے ضلع میں ایک ڈپٹی نصر اللہ خان صاحب تھے جو کہ خود مستقل شیخ تھے اور ہمارے حضرات کو دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنی بیاض میں جس کا نام دل کشا ہے، ان ہمارے حضرات کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ ؎

آہن کہ بپارس آشنا شد   فی الحال بصورتِ طلا شد

تو صحبت عجیب چیز ہے غرض اس عالم کے کہنے کے موافق وہ بیچارہ اپنی بستی کو چھوڑ کر دوسری بستی کی طرف چلا اور آدھے ہی راستہ پر پہنچا کہ موت کا وقت آگیا ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند   دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

اب وہ بیچارہ کیا کرتا مجبور تھا۔ اور کچھ تو اس سے ہو نہ سکا۔ بس اپنے سینہ کو اس دوسری زمین کی طرف بڑھا دیا چونکہ اس نے توبہ کا سامان شروع کر دیا تھا مگر ظاہراً ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی اس لئے رحمت کے فرشتے بھی آئے اور عذاب کے بھی، ملائکہ رحمت تو کہتے تھے کہ اس کی روح کو ہم لے جائیں گے کیونکہ اس نے توبہ کا سامان کرنا شروع کر دیا ہے اور ملائکہ عذاب کہتے تھے کہ اس کی روح کو ہم لے جائیں گے کیونکہ ابھی توبہ مکمل نہیں ہوئی۔

ملائکہ بھی اجتہاد کرتے ہیں

اب یہاں سے میں نے ایک مسئلہ علمی مستنبط کیا ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ ملائکہ کو بھی احکام بطور کلیات کے ملتے ہیں اور ان کو اختیار دیا جاتا ہے کہ جزئیات کو ان پر منطبق کرلو۔ پس اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کبھی ملائکہ بھی اجتہاد کرتے ہیں کیونکہ اگر حکم جزئی ہوتا تو ایک جماعت آتی۔ دو جماعتیں کوئی لڑنے کے واسطے تھوڑا ہی آئی تھیں۔ خیر اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ فیصلہ کے لئے آیا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اچھا زمین کو دونوں طرف سے ناپا جائے۔ اگر یہ اپنی زمین سے زیادہ قریب

ہے تب تو ملائکہ عذاب اس کی روح کو لے جائیں۔ اور اگر دوسری زمین سے زیادہ قرب ہے تو ملائکہ رحمت لے جائیں اور وہ واقع میں قریب تھا اپنی ہی زمین کے روایات میں آیا ہے کہ اس کی زمین کو حکم دیا گیا دور ہو جا اور دوسری زمین کو حکم دیا گیا کہ قریب ہو جا چنانچہ ناپا گیا تو ایک بالشت اس دوسری زمین سے قریب تھا۔ یہ برکت تھی اس کے عمل کی کہ اس نے اپنے سینے کو مرتے وقت دوسری زمین کی طرف قریب کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس وقت اس کو اتنی ہی قدرت تھی۔

تو بندہ کو چاہئے ہمت کرے پھر اس کی تکمیل اللہ تعالیٰ خود کر لیتے ہیں۔ جیسے باپ دیکھ لیتا ہے کہ بچہ دس قدم چلا اور گر گیا تو خود ہی رحم کھا کر اس کی مدد کرتا اور اس کو گود میں اٹھا لیتا ہے تو جیسے باپ یہ چاہتا ہے کہ بچہ اپنی طرف سے کوشش کرے چلنے کی اسی طرح حق تعالیٰ ہماری طلب کو دیکھنا چاہتے ہیں مگر ہم تو سرکتے ہی نہیں اپنی جگہ سے۔ اور حق تعالیٰ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ چل کر گرا بھی ہے یا نہیں وہ صرف طلب کو دیکھتے ہیں پھر خود ہی امداد فرماتے ہیں ورنہ بغیر ان کی امداد کے بندہ کیا کر سکتا ہے۔

ما بداں مقصد عالی نتو انیم رسید ہاں مگر لطف شا پیش نہد گامے چند

نہ گردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

تو یہ طریق تو انہیں کے قطع کرنے سے قطع ہو سکتا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ، صرف طلب دیکھتے ہیں

حدیث شریف میں آیا ہے من تقرب الیّ شبراً تقربت الیه ذراعاً (مسند احمد ۲:۴۱۳، کنز العمال: ۱۱۷۹) چنانچہ اس شخص کا ایسا ہی قصہ ہوا کہ اس نے صرف اپنا سینہ بڑھا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو سچ مچ دوسری زمین کی طرف ایک بالشت بھر قریب کر دیا۔ اگر چاہتے تو اور قریب کر دیتے مگر پھر رحمت کیسے ظاہر ہوتی۔ کہ اتنے تفاوت سے بھی رحمت کو غلبہ ہوتا ہے۔ اب اگر کسی مولوی کو شبہ ہو کہ توبہ سے حقوق العباد کیسے معاف ہو گئے کیونکہ مولویوں کو شبہات بہت ہوتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے قیامت کے دن مقتولین کو اتنا خوش کر دیا جاوے کہ وہ خوش ہو کر خود ہی معاف کر دیں۔

چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے غالباً اپنے رسالہ حقوق الاسلام میں لکھا ہے کہ قیامت کے روز لوگوں کو بڑے بڑے عالی شان محل دکھلائے جائیں گے اور ندا کی جائے گی کہ کوئی ان کو خریدتا ہے اہل محشر عرض کریں گے کہ ان کی قیمت کون دے سکتا ہے۔ حکم ہو گا کہ نہیں ان کا لینا بہت آسان ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی پر کسی کا حق رہ گیا ہو وہ معاف کر دے اگر کسی نے کسی کی غیبت کی ہو وہ معاف کر

دے بس محل مل جائے گا۔ بھلا جب حاکم راضی نامہ دلوانا چاہے تو مجال ہے فریقین کی راضی نامہ نہ دیں مگر اللہ تعالیٰ ہم کو راضی کر کے راضی نامہ دلوانا چاہیں گے جبراً نہیں دلوائیں گے تو اس طرح اس اشکال کا جواب بھی ہوگا تو آجکل تو اتنا گنہگار کوئی بھی نہیں جتنا یہ شخص تھا جس کا قصہ حدیث شریف سے ابھی معلوم ہوا۔ جب اس کی توبہ بھی قبول ہوگئی تو کون ایسا ہے جس کی توبہ قبول نہ ہو۔

چوتھی حدیث جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک شخص نے گناہ کیا اس کے بعد پھر توبہ کی اور کہا **اللّٰھم اغفرلی** تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کیا میرا بندہ جانتا ہے اس کا کوئی رب ہے جو گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ سبحان اللہ کیا لطف اور رحمت ہے کہ اتنی بات پر مغفرت فرمادیتے ہیں جیسے کسی ممتحن نے ایک طالب علم سے سوال کیا کہ بتلاؤ حروف جارہ کون کون سے ہیں اس طالب علم نے بجائے حروف جارہ کے حروف ناصبہ بتلادیئے اس پر ممتحن نے اس کو تنبیہ کی تو ایک صاحب نے طالب علم کی حمایت کی کہ صاحب آخر جس فن کا سوال تھا اسی فن کا مسئلہ تو بتلایا ہے کوئی سکندرنامہ کا شعر تو نہیں پڑھ دیا۔ اسی طرح ایک بادشاہ کے لڑکے کا شرح جامی میں امتحان لیا گیا۔ پوچھا گیا بتلاؤ **والحمد لولید** میں واؤ کیسا ہے شہزادہ کہتا ہے کہ یہ واؤ عاطفہ ہے۔ بادشاہ نے جو یہ سنا تو لاکھوں روپیہ خیرات کیا کہ میرا لڑکا یہ تو جانتا ہے کہ واؤ عاطفہ بھی کوئی چیز ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس بادشاہ پر بھی رحمت کا کوئی چھینٹا پڑ گیا تھا۔ اسی طرح حق تعالیٰ اس پر بھی خوش ہوتے ہیں کہ میرا بندہ تو یہ جانتا ہے کہ میرا بخشنے والا بھی کوئی ہے ارشاد ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ بندہ پھر گناہ کرتا ہے اور اس کے بعد پھر توبہ کرتا ہے پھر حق تعالیٰ خوش ہو کر یہی فرماتے ہیں کہ میرا بندہ جانتا ہے کہ میرا بخشنے والا کوئی ہے۔

پانچویں حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک شخص نے قسم کھا کر کہا فلاں شخص کی بخشش نہ ہوگی۔ حق تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ تو کون ہوتا ہے جو تو نے میرے متعلق قسم کھا کر کہا کہ میں اس شخص کو نہ بخشوں گا، جا میں نے اس کو بخش دیا اور تیرے اعمال حبط کر دیئے۔

حکایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام

جیسے بوستان میں ایک قصہ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک عابد جا رہا تھا ایک گنہگار شخص نے دیکھا وہ بھی ساتھ ہوگیا اور دعا کی مجھ کو بخش دیجئو۔ عابد نے نفرت ظاہر کی اور دعا کی کہ اے اللہ اس کو اور مجھ کو ایک جگہ جمع نہ کیجئو۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی گئی کہ ان سے کہہ دو کہ ہم نے دونوں کی دعائیں قبول کیں اس گنہگار کو بخش دیا اور جنت دی اور اس عابد کو اس کے ساتھ جمع نہ کریں گے اس لئے اس کے لئے جہنم تجویز کر دیا۔

چھٹی حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک شخص تھا گنہگار جب وہ مرنے لگا تو اس نے اپنے بیٹوں سے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو مجھ کو جلا دینا۔ اب چاہے اس کے مذہب میں جلانا جائز نہ ہو مگر اس پر حال کا غلبہ تھا اس نے کہا مجھ کو جلا دیا جائے تو اچھا ہے پھر جلا کر میری راکھ پسوائیں اس کے بعد راکھ کو ہوا میں اڑا دیں یا تو اس طرح بچ گیا اور اگر پھر بھی ہاتھ آ گیا تو ایسی سزا ہوگی جو کسی کو نہ ہوئی ہوگی۔ اس کے بیٹوں نے ایسا ہی کیا، جب وہ مرا اس کو جلا کر ہوا میں اڑا دیا۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا تو حق تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ اس کے بدن کے تمام ذرات جمع کرو چنانچہ پھر وہ شخص زندہ ہو گیا پوچھا گیا بتلاؤ تم نے ایسا کیوں کیا۔ کہا اے اللہ تیرے خوف سے کیا۔ حکم ہوا جاؤ ہم نے بخش دیا۔ اب یہاں پر شبہ ہوتا ہے کہ کیا وہ عموم قدرت کا قائل نہ تھا اگر نہیں تھا تو مومن کیسے ہوا پھر اس کی مغفرت کیسے ہوگئی۔ تو جواب یہ ہے کہ اس کے اندر اتنی عقل نہ تھی جو وہ یہ سمجھتا کہ عموم قدرت کسے کہتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس کا مکلّف ہی نہ تھا جیسے یہاں کا قصہ ہے کہ یہاں ایک بڑی بی تھیں ایک مرتبہ وہ مجھ سے دریافت کرنے لگیں کہ مولوی جی تمہیں تو اللہ کی گھر کی سب خبر ہے بھلا میں یہ پوچھوں ہوں کہ اللہ میاں زندہ ہیں (توبہ توبہ)۔

دوسری بیبیاں اس بات کو سن کر ہنسنے لگیں۔ میں نے کہا ہنسو مت اس کو سمجھاؤ۔ میں نے کہا بڑی بی یہ تو بتلاؤ کہ بارش کون کرتا ہے کہا اللہ میاں میں نے کہا اور رزق کون دیتا ہے کہا اللہ میاں، میں نے کہا اولاد کون دیتا ہے کہنے لگیں اللہ میاں۔ صاحبو یہ سب امور فطری ہیں ان سب سوالات کے جواب میں ہر جاہل سے جاہل یہی کہے گا کہ یہ کام خدا کے ہیں تو میں نے کہا بڑی بی کیا مرنے کے بعد بھی کوئی کچھ کام کیا کرتا ہے۔ کہنے لگیں ہاں اب سمجھ گئی۔ اسی طرح یہاں ایک اور بڑی بی تھیں ان کو فقر و فاقہ رہتا تھا۔ ایک بار وہ مجھ سے اپنے فقر و فاقہ کا حال بیان کرنے لگیں جب سب کچھ کہہ چکیں تو کیا کہتی ہیں کہ میں زیادہ کہتی بھی نہیں کبھی اللہ میاں کہیں میرے عیب کھولتی پھرتی ہے (توبہ توبہ)۔

اسی طرح قصبہ بَنَت کا ایک قصہ ہے ایک بی بی تھیں انہوں نے وعظ میں سُنا کہ صور پھونکا جائے گا اور سب چیزیں فنا ہو جائیں گی تو وہ کیا کہتی ہے ہائے اللہ میاں اکیلے رہ جائیں گے ان کا جی نہ گھبرائے گا (توبہ توبہ)

تو صاحبو! یہ لوگ بیوقوف ضرور ہیں مگر ایسے بیوقوف ہیں کہ کودتے پھاندتے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ اور بڑے بڑے محققین دیکھتے ہی رہ جائیں گے اور تمنا کریں گے کاش ہم بھی ایسے ہی بیوقوف ہوتے تو ایسوں کو عقلیات کا مکلّف کہنا درحقیقت تکلیف مالایطاق کے جواز کا قائل ہونا

ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک لونڈی کو اس کے آقا نے بہت مارا تھا پھر نادم ہو کر اس کو آزاد کرنا چاہا۔ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کہ این اللّٰہ اللہ تعالیٰ کہاں ہیں اس نے جواب دیا فی السّمآء آسمان میں ہیں، پھر آپ نے ارشاد فرمایا میں کون ہوں کہا آپ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو آزاد کردو یہ مومنہ ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کیا اس نے آسمان کے وہی معنی لئے تھے جو ہم لیتے ہیں، اجی وہ بیچاری کیا جانے تھی۔ بس سیدھی بات یہ ہے کہ اس میں عقل اتنی ہی تھی اسی طرح اس واقعہ میں سمجھ لیا جائے کہ اس شخص کو عموم قدرت کی سمجھ نہ تھی اس لئے اس کے ایمان میں خلل نہ تھا بلکہ خدا کا خوف اس کے دل میں تھا جو ایمان کی علامت ہے اس خوف کی وجہ سے جو صورت عذاب سے بچنے کی اس کی عقل میں آئی اس نے وہی اختیار کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان اور خوف وخشیت کی برکت سے اپنی رحمت سے بخش دیا۔

گناہوں سے بچنے کا سب سے عمدہ آسان طریقہ

ان احادیث سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کس قدر وسیع ہے اور وہ کیسے قدردان ہیں حتیٰ کہ جب بندہ اللھم اغفرلی کہتا ہے تو اتنی بات سے خوش ہو جاتے ہیں کہ میرے بندہ کو خبر ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہوں کا بخشنے والا ہے تو صاحبو! اللھم اغفرلی کہنے میں کیا محنت پڑتی ہے کچھ بھی نہیں تو کیا اب بھی گناہوں سے پاک ہونے کو دل نہیں چاہتا یہ تو بڑا آسان نسخہ ہے لہٰذا میں سب کو خطاب کر کے کہتا ہوں کہ سب لوگ اپنے گناہوں کو توبہ استغفار کر کے بخشواتے رہیں اس سے بُعد گھٹے گا پھر اس سے محبت بڑھے گی پھر اس محبت کا اثر یہ ہوگا کہ گناہ ہی نہ ہوں گے تو گناہ سے بچنے کا سب سے عمدہ اور آسان طریقہ یہ ہے کہ توبہ کرتے رہو۔ اب دعا کرو اللہ میاں توفیق عمل عطا فرمائیں۔

استمرار التوبہ
علیٰ
تکرار الحوبہ

یہ وعظ

حق تعالیٰ کی شانِ جلالی اور جمالی پر جمادی الثانیہ ۱۳۴۵ھ بعد نمازِ جمعہ مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر دو گھنٹہ پینتالیس منٹ بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً پچاس تھی۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ (دَائِمًا اَبَدًا كَمَا يُحِبُّ وَيَرْضٰى ١٢) اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

ترجمہ: وہی ہے جس کے عذاب سے ڈرنا چاہئے اور (وہی ہے) جو بندوں کے گناہ معاف کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی دو شانیں:

جس جملہ کی میں نے تلاوت کی ہے یہ ایک سورت کا خاتمہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی دو شانیں بیان فرمائی ہیں اور اُن کا عقیدہ تو سب کو حاصل ہے کوئی اس میں کلام نہیں کرتا نہ ایسی مخفی بات ہے جس پر لوگوں کو اطلاع نہ ہو مگر اس وقت مرا مقصود بیان سے یہ ہے کہ اطلاع کی جو غایت ہے اس میں کوتاہی دیکھی جاتی ہے اس کوتاہی پر متنبہ کرنا مقصود ہے اور آج کے بیان کی وجہ ظاہر میں کوئی خاص داعی نہیں ہے۔ یعنی کسی نے مجھ سے درخواست نہیں کی اور مجھے اس کا کبھی انتظار بھی نہیں ہوتا میں نے تو یہاں بہت بیانات از خود بھی ضرورت کو دیکھ کر کئے ہیں اتنا فرق ضرور ہے کہ پہلے ایسا اتفاق کثرت سے ہوتا تھا اب کم ہوتا ہے لیکن میں نے از خود بھی بہت بیان کئے ہیں اور کبھی کسی کی درخواست کا منتظر نہیں ہوا۔ چنانچہ اس وقت کا بیان بھی ایسا ہی ہے کہ ظاہر میں کسی کی درخواست اس کا سبب نہیں مگر قلب سے باطنی داعی موجود تھا یعنی بعض احباب کو باطناً تقاضا تھا کہ بیان ہو جو مجھ کو قرائن سے معلوم ہو گیا مگر کسی وجہ سے وہ زبان سے اس تقاضا وشوق کو ظاہر نہ کر سکے لیکن جب وہ میرے پاس یہ تقاضا دل میں لے کر آئے تو گو زبان سے ظاہر نہیں کیا مگر مجھ پر اس کا اثر ہوا۔

باطنی تقاضے کا اثر

اور مجھ پر واقعی اس باطنی تقاضا کا اثر زیادہ ہوتا ہے کہ زبان سے تو کچھ نہ کہے اور دل میں تقاضا ہو۔ مجھے شب و روز مولانا کے اس قول کا مشاہدہ ہوتا ہے

گرچہ تفسیر زباں روشن گراست ۔۔۔۔۔ لیک عشقِ بے زباں روشن تراست

(اگرچہ بیان زبانی اکثر اشیاء کی حقیقت کو زیادہ منکشف و ظاہر کرتا ہے اس بناء پر عشق کا حال بھی زبان سے زیادہ معلوم ہونا چاہئے لیکن واقع میں بے زبان کا عشق زیادہ روشن ہے کیونکہ وہ ذوقی امر ہے)۔

بوئے آں دلبر چو پراں می شود ۔۔۔۔۔ ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

(اس محبوب کی خوشبو جب اڑنے والی ہوتی ہے تو یہ تمام زبانیں حیران ہو جاتی ہیں)

اُن کے باطنی تقاضا کو دیکھ کر میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ اگر کوئی مضمون بے ساختہ قلب میں آ گیا تو بیان کر دوں گا اور اس ارادہ کو احباب سے ظاہر بھی کر دیا تھا اس کے بعد میں قرآن شریف پڑھتا رہا مگر دیر تک کوئی مضمون ذہن میں نہ آیا پھر میں جنگل کی طرف چلا گیا اور قرآن کی تلاوت میں مشغول رہا وہاں اس آیت کے متعلق ایک ضروری مضمون بے ساختہ وارد ہوا اور مجھے تجربہ ہوا ہے کہ ایسے مضمون کا ورود جنگل میں ہوتا ہے یا یہ کہ وہاں معاصی کا صدور کم ہوتا ہے چونکہ جنگل کی زمین بستی کی زمین سے زیادہ پاک ہے اس لئے وہاں قلب پر علوم کا ورود زیادہ ہوتا ہے۔ اب میں مقصود کا بیان شروع کرتا ہوں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی دو شانیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک اہل تقویٰ دوسری اہل المغفرۃ ان میں سے ایک کو جلالی اور ایک کو جمالی کہا جائے تو بجا ہے، اب ان دونوں کی تفسیر سنیئے اور کیا اچھا ہو کہ خود متکلم ہی کے بیان سے تفسیر کر دی جائے۔

چنانچہ ایک حدیث قدسی میں خود حق تعالیٰ نے اس کی تفسیر بیان فرمائی ہے۔ حدیث قدسی وہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ سے صراحۃً روایت فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے گو وہ وحی متلو (وہ وحی جس کی تلاوت کی جائے) نہیں ہے مگر وحی ضرور ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وحی غیر متلو کے الفاظ منزل نہ ہوں بلکہ ممکن ہے کہ الفاظ بھی منزل من اللہ ہوں اب رہا یہ سوال کہ جب الفاظ منزل من اللہ ہیں تو وہ متلو کیوں نہیں اور اُن میں اعجاز بھی ہے یا نہیں تو اس میں گفتگو کی ہمیں ضرورت نہیں ممکن ہے کہ ان میں بھی صفت اعجاز موجود ہو اور پھر بھی وہ وحی متلو کی طرح تلاوت میں داخل نہ کی گئی ہوں اور اُس کے وجود و اسباب میں گفتگو کرنے سے ہمارے اکابر نے ہم کو منع فرمایا ہے اور وہ ایسے اکابر تھے جو اہل اسرار بھی تھے اَلنَّاسُ اَعْدَاءٌ مَّا جَهِلُوْا (لوگ جس چیز سے ناواقف ہیں اس کے دشمن ہیں) کا مصداق نہ تھے اس سے معلوم ہوا کہ ان حضرات پر جو اسرار منکشف ہوئے ہیں وہ بے ساختہ ہوئے ہیں جو اسرار خود بخود منکشف ہو گئے وہ

انہوں نے بیان فرما دیئے اور جو منکشف نہ ہوئے اُن کے وہ درپے نہ تھے بلکہ اسرار کے درپے ہونے سے منع فرماتے تھے۔

اسرار کی مثال

اسرار کی مثال ایسی ہے جیسے بادشاہ کا محل سرائے اور زنان خانہ اور خاص خزانہ ہوتا ہے بادشاہ اگر کسی کو خود اپنے محل سرائے اور زنان خانہ کی سیر کرادے تو اس کی عنایت ورحمت ہے خود کسی کو اس درخواست کا حق نہیں ہے کہ حضور مجھے اپنے زنان خانہ یا خزانہ پر مطلع فرما دیجئے اور اگر کوئی ایسی درخواست کرے گا تو وہ شاہی عتاب میں گرفتار ہوگا اور اس پر دوسرے جرائم کی نسبت عتاب زیادہ ہوگا کیونکہ اور جرائم کا منشا کبر نہیں بلکہ شہوت ہے اور اس جرم کا منشا کبر ہے اور کبر سے بدتر کوئی جرم نہیں کیونکہ متکبر ایسی صفت کا مدعی ہے جو سلطان کے ساتھ خاص ہے یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ کبریا کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَاءِ ىْ وَالْعَظْمَةُ اِزَارِىْ فَمَنْ نَازَ عَنِيْهِمَا قَصَمْتُهٗ (مسند احمد ۲:۴۱۴) کبریائی میری چادر اور عظمت میری ازار ہے یعنی میری صفات مخصوصہ سے ہیں تو جو شخص ان میں مجھ سے منازعت (تکرار) کرے گا یعنی شرکت کا قصد کرے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا، ایسی وعید کسی اور جرم کی نسبت وارد نہیں ہے۔

طلب اسرار کا منشاء کبر ہے

اور طلب اسرار کا منشا کبر اس لئے ہے کہ یہ شخص اپنی شان ایسی سمجھتا ہے کہ اپنے کو اسرار سلطنت ومخفیات سلطانیہ پر مطلع ہونے کا اہل سمجھتا ہے اور یہ شرکتِ سلطنت کا دعویٰ ہے اور اس سے بڑھ کر سلاطین کے یہاں کوئی جرم نہیں خصوصاً اگر وہ اسرار محلِ غیرت بھی ہوں تو ان پر مطلع ہونے کی طلب ودرخواست سلطان کو اور بھی زیادہ ناگوار ہوتی ہے اس لئے طلب اسرار کے درپے ہرگز نہ ہو۔ اگر اسرار کا مخفی ہونا حکمت نہ ہوتا تو حق تعالیٰ کو بخل نہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بے دریغ سب کو ظاہر فرما دیتے۔

اخفاء اسرار میں حکمت

اب جو مخفی رکھے گئے ہیں تو ان میں خفا ہی حکمت ہے اور ان میں سے کسی کو مطلع فرما دیں تو ان میں بھی حکمت ہے اور اگر کسی کو بھی نہ بتلائیں تو بھی حکمت ہے اور کسی کو بتلائیں کسی کو نہ بتلائیں

تو یہ بھی حکمت ہے پس جس کو اسرار پر مطلع نہیں کیا گیا وہ ان کے درپے نہ ہو اسی کو حضرت عارف فرماتے ہیں۔

حدیث مطرب و مئے گو درازِ دہر کمتر جو کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمہ را

(مطرب و مئے کی باتیں کرو اسرار دہر کی جستجو ترک کرو کہ کسی نے بھی اس معمہ کو حکمت سے حل نہ کیا اور نہ کریں گے)

انہوں نے تو اسرار دہر میں بھی گفتگو سے منع فرمایا ہے پھر اسرار الوہیت و اسرار احکام تو اس سے بدرجہا اعلیٰ ہیں اُن کی طلب اور ان میں گفتگو تو بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگی۔ چنانچہ ایک بزرگ سے کسی نے معراج کے اسرار سے سوال کیا کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ نے کیا کیا باتیں کیں، انہوں نے بے ساختہ جواب دیا۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

(اب کس کا حوصلہ و ہمت ہے کہ باغباں سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا)

پھر اگر کسی کو اسرار کی طلب ہی ہو تو اس کا طریق بھی ترک طلب ہی ہے کیونکہ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ جو لوگ اسرار کے درپے ہوتے ہیں اُن کو نہیں بتلائے جاتے اور جو درپے نہ ہو اس کو بتلا دیئے جاتے ہیں پس معلوم ہوا کہ جن حضرات پر اسرار کا انکشاف نہیں ہوتا پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ واسطہ انکشاف ہمارے پاس کیسا ہے یعنی وہ عینک کیسی ہے جس سے ہم کو اسرار کا انکشاف ہوتا ہے تو سمجھئے کہ ایک عینک تو وحی ہے اس میں تو کچھ شک و شبہ نہیں ہوتا وہ سچی عینک ہے جس میں کبھی خطا نہیں ہوتی اور غیر انبیاء کو جو عینک ملی ہے اس میں قطع نہیں ہے بلکہ شک رہ جاتا ہے کہ حقیقت صحیحہ کا انکشاف ہوا یا غلط ہو گیا۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ بعض عینکیں تو ایسی ہوتی ہیں جن سے اشیاء اپنے مآل پر صاف طور سے نظر آتی ہیں اور بعض عینکیں ایسی ہیں جن سے چھوٹی چیز بڑی اور سفید چیز رنگین نظر آتی ہے۔ اس حالت میں ہم کو اپنے انکشاف پر اطمینان و اعتماد کرنا چاہئے۔

الہام سے متعلق جمہور امت کا عقیدہ

گو بعض کا قول ہے کہ الہام بھی قطعی ہے مگر ان حضرات نے اپنے اقناع (یقین دلانا) کو

یقین سے تعبیر کر دیا ہے ورنہ عقیدہ ان کا بھی وہی ہے جو جمہور امت نے کہا ہے کہ الہام قطعی نہیں ہے پھر اس حالت میں اسرار کے درپے ہونا فضول ہے کہ اول تو درپے ہونے سے وہ حاصل ہی نہیں ہوتے اور حاصل ہو بھی گئے تو ظن واحتمال سے متلبس ہو کر حاصل ہوں گے اس لئے سوال اسرار سے میرا جی کبھی خوش نہیں ہوتا۔

سوال عن الحکمت میں کیا حکمت ہے

مثلاً یہ سوال کہ حدیث وقرآن میں یہ حکم کس لئے فرمایا گیا اس میں کیا حکمت ہے کیا بھید ہے؟ میں اس قسم کے سوال کرنے والوں کو جواب بھی ایسا ہی دیتا ہوں جس سے اُن کو اپنی غلطی پر تنبیہ ہو جائے اب بعض تو سمجھ جاتے ہیں اور بعض الٹا مجھ ہی کو بدنام کرتے ہیں مگر میں اس بدنامی سے خوش ہوں جو نافہم کی طرف سے ہو۔

واذا اتتک مذمتی من ناقص فھی الشھادۃ لی بانی کامل

(اور جب میری مذمت تمہارے پاس کسی نافہم سے آئے تو سمجھ لو کہ یہ میرے لئے کامل ہونے کی شہادت ہے)

چنانچہ ایک صاحب نے کسی خاص مسئلہ کی نسبت پوچھا کہ اس حکم میں کیا حکمت ہے میں نے کہا پہلے آپ یہ بتلائیے کہ آپ کے سوال عن الحکمت میں کیا حکمت ہے؟ اس پر وہ خاموش ہو گئے لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ اگر یہ کچھ حکمت بیان کریں گے تو میں اس پر اعتراض کر کے آخیر میں ان کو عاجز کر دوں گا وہ اپنا عجز تسلیم نہ کرتے مگر طلبہ اور اہل فہم اُن کا عجز سمجھ جاتے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا ادب

صاحبو! حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب میں بھی بعض امور ایسے بیان فرمائے ہیں جن کی حقیقت پر صحابہ کو مطلع نہیں کیا گیا اور حضرات صحابہ ایسے مؤدب ومہذب تھے کہ انہوں نے کبھی اُن کی حقیقت سے سوال نہیں کیا چنانچہ اوائل سورۃ میں حروف مقطعات ایسے ہی ہیں اور اس کے علاوہ بہت سی آیات متشابہات ہیں جن کی حقیقت میں صحابہ نے بالکل کلام نہیں کیا نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اسرار ہیں ان کا تعلق ہماری ذات سے نہیں ہے اگر ہم سے تعلق ہوتا تو حق تعالیٰ ضرور ان کو واضح فرما دیتے اور ایسے اسرار بادشاہ کے یہاں ہوتے ہیں جن کو عوام سے بلکہ خواص سے بھی مخفی رکھا جاتا ہے۔

غالباً حروف مقطعات کی مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھی

چنانچہ کانپور میں جلالین کا درس میرے پاس ہورہا تھا اور ایک کورٹ انسپکٹر بھی اس وقت میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے میں نے الٓـمّ کے متعلق یہی بیان کیا کہ غالباً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کی مراد پر اطلاع تھی مگر صحابہؓ کو اطلاع نہ تھی اور سلاطین کا قاعدہ ہے کہ بعض اسرار کو وہ وزیر ہی تک محدود رکھتے ہیں عام رعایا کو ان پر مطلع نہیں کرتے اسی طرح یہ بھی اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اسرار ہیں اس تقریر کو سُن کر وہ کورٹ انسپکٹر کہنے لگے کہ واقعی یہ بالکل صحیح ہے میں نے کہا کہ آپ تو اس کی ایسی تصدیق کررہے ہیں جیسے آپ کو اس کا مشاہدہ ہورہا ہو آپ نے اس قوت کے ساتھ کیونکر اس کی تصدیق کی کہنے لگے کہ میں ابھی اناؤ سے آرہا ہوں ایک ضرورت کی وجہ سے میں کلکٹر سے ملنے گیا تو اُن کی میز پر ایک کتاب رکھی ہوئی تھی میں اُس کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ کلکٹر نے مجھے اس کے دیکھنے سے منع کیا اور کہا اس کو بند کر کے رکھ دیجئے یہ آپ کے دیکھنے کی چیز نہیں میں نے وجہ پوچھی تو کہا کہ اس میں محکمہ سی آئی ڈی کی اصطلاحات ہیں اور اس کا محکمہ آپ کے محکمہ سے الگ ہے آپ اس کو نہ دیکھیں۔

تو معلوم ہوا کہ سلاطین کے بعض اسرار ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر سب عہدہ داروں کو مطلع نہیں کیا جاتا بلکہ ہر محکمہ کے جدا احکام اور اسرار ہیں ایک محکمہ والے کو دوسرے محکمہ کے اسرار معلوم کرنے کا حق نہیں تو دیکھئے اس شخص پر چونکہ یہ حالت گذر چکی تھی اس لئے اس نے میری تقریر کو سن کر سب سے پہلے تصدیق کی اور اس طرح تائید کی جیسے اس کو حقیقت کا مشاہدہ ہورہا ہے پس جن اسرار پر اطلاع سے ہم کو روک دیا جائے ان کو اپنے حق میں منہی عنہ سمجھنا چاہئے اور ان کے درپے نہ ہونا چاہئے اور اس میں راز یہ ہے کہ اسرار میں غموض زیادہ ہوتا ہے اگر ان کو بیان بھی کردیا جائے تو سب لوگ ان کو سمجھ نہیں سکتے۔ پھر حقیقت تک تو بیان کے بعد بھی نہ پہنچیں گے بس یہ ہوگا غیر حقیقت کو حقیقت سمجھ کر دھوکے میں پڑ جائیں گے اسی لئے صوفیہ نے اہل ظاہر کو مخاطب کر کے فرمایا ہے اَنْتُمْ تَخَافُوْنَ الْمَعَاصِیَ وَنَحْنُ نَخَافُ الْکُفْرَ کہ تم کو تو صرف گناہ ہی کا خطرہ رہتا ہے اور ہم کو قدم قدم پر کفر کا خطرہ رہتا ہے کیونکہ ان کے سامنے جن اسرار کا انکشاف ہورہا ہے وہ نہایت عالی ہیں ان میں اگر کبھی دھوکا پڑ گیا تو کفر تک نوبت پہنچے گی۔

حکایت حضرت شیخ یحییٰ منیریؒ

چنانچہ شیخ یحییٰ منیریؒ ایک بڑے صاحب کشف واسرار کا قول نقل فرماتے ہیں کہ مجھ پر ایک

مرتبہ حقیقت روح کا انکشاف ہوا (تجلی ہوئی) تو میں نے اس کو غلطی سے تجلی حق سمجھ لیا پھر تیس برس تک روح ہی کی عبادت کرتا رہا اور دھوکہ اس لئے ہوا کہ روح کی تجلی کو تجلی حق سے مشابہت بہت زیادہ ہے کیونکہ صوفیہ کے نزدیک روح مجرد ہے گو متکلمین اس کے منکر ہیں مگر صوفیہ نے اس مسئلہ میں اپنے کشف سے فلاسفہ کے قول کو صرف تجرد کے دعویٰ میں صحیح سمجھا ہے مگر مَعَ اِعْتِقَادِ الْحُدُوْثِ الزَّمَانِیِّ (حدوث زمانی کا اعتقاد کرنے کے باوجود) تو وہ بھی تجرد کے قائل ہو گئے اسی لئے شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ فلاسفہ کے تمام اقوال کو رد نہ کرو کیونکہ ان کے بعض اقوال صحیح بھی ہیں یہ فلاسفہ کی حمایت نہیں بلکہ ہم کو تنبیہ ہے کہ پارٹی نہ بناؤ کہ مخالف جو بات بھی کہے اس کی تردید ہی کرو بلکہ اس پر غور کرو کیونکہ اَلْکَذُوْبُ قَدْ یَصْدُقُ کبھی جھوٹا آدمی بھی سچ بات کہہ دیتا ہے اسی طرح اَلْمُبْطِلُ قَدْ یَقُوْلُ الْحَقَّ کہ مبطل بھی کبھی حق بات کہہ دیتا ہے پس مخالف کی بات کو یہ سمجھ کر فوراً رد نہ کرو کہ یہ تو ہمارا مخالف ہے بلکہ غور کر کے سمجھ سے کام لو اگر اس کی بات رد کے قابل ہو رد کرو اگر قابل تسلیم ہو مان لو۔

بہشتی زیور پر اعتراضات کی عجیب مثال

ورنہ وہ مثال ہوگی ایک طالب علم نے اپنے حقیقی بھائی کو ماں کی گالی دی تھی۔ لوگوں نے کہا ارے کمبخت وہ تیری بھی تو ماں ہے کہنے لگا کہ اُس میں دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت سے کہ وہ میری ماں ہے معظمہ مکرمہ ہے اور اس حیثیت سے کہ اس کی ماں ہے وہ ایسی ہے اور تیسی ہے تو کیا تم بھی حق بات میں دو حیثیتیں نکالو گے کہ اس حیثیت سے کہ وہ مخالف کی زبان سے نکلی ہے غلط ہے اور دوسری حیثیت سے صحیح ہے جیسا کہ آجکل "بہشتی زیور" کے مسائل پر اعتراضات کی بنا اسی فرق اعتباری پر ہے حالانکہ اس میں جس قدر مسائل ہیں وہ سب درمختار و شامی و عالمگیری وغیرہ سے ماخوذ ہیں مگر اس حیثیت سے کہ وہ مسائل شامی وغیرہ میں ہیں صحیح ہیں اور اسی حیثیت سے کہ "بہشتی زیور" میں لکھے ہوئے ہیں محل اعتراض ہیں۔ بھلا اس جہالت وعناد کی بھی کچھ حد ہے۔ بعض نادانوں کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ اس میں شرمناک مسائل ہیں۔ اس کا بھی وہی جواب ہے کہ یہ اعتراض تو شامی و عالمگیری وغیرہ پر بھی ہے کیونکہ انہیں سے یہ مسائل لئے گئے ہیں یہ کیا کہ عربی میں گالی دیں تو گالی نہ ہوا اور اردو میں گالی ہو جائے گو یہ اعتراض محض جہالت کا اعتراض تھا۔

مگر اب طبع جدید میں اس کا بھی اہتمام کر دیا گیا ہے کہ ایسے مسائل کو انتخاب کر کے علیحدہ لکھ دیا گیا اور اس پر جلی قلم سے سرخی لکھ دی گئی کہ ان مسائل کو کس طرح پڑھانا چاہئے، غرض یہ

ضروری نہیں کہ مخالف کی ہر بات ہی غلط ہو اس لئے صوفیہ نے مسئلہ تجرد روح میں فلاسفہ کے قول سے موافقت کر لی کیونکہ کشف سے ان کو اس قول کی صحت واضح ہو گئی ہے کہ روح مجرد ہے اور تجرد کا انکار متکلمین نے اس بنا پر کیا ہے کہ اس کو اخص صفات باری تعالیٰ سے سمجھا ہے تجرد اخص صفات حق سے نہیں ہے بلکہ اخص صفات وجوب وقدیم ہیں اور صوفیہ کے نزدیک ارواح باوجود تجرد کے حادث بالذات وبالزمان ہیں اس جگہ وہ فلاسفہ سے مخالف ہو گئے کیوں کہ فلاسفہ ارواح کو مجرد مان کر قدیم بھی کہتے ہیں صوفیہ ان کو قدیم نہیں کہتے نیز روح کے علاوہ انسان میں چند اور چیزیں بھی ہیں جن کو صوفیہ نے مجرد مانا ہے اور وہ لطائف خمسہ ہیں جو ان حضرات کے نزدیک غیر مادی ہیں اور انسان کے اندر موجود ہیں اور نفس کو جو لطائف میں شمار کیا ہے۔

لطائف ستہ کا ذکر متقدمین صوفیاؒ کے کلام میں نہیں

اور لطائف ستہ سے ملقب کیا ہے یہ تغلیباً ہے جیسے بھنگی بھی مدرسہ والوں کے ساتھ مٹھائی کے حصہ میں شریک ہو جاتا ہے ورنہ نفس مجرد نہیں بلکہ مادی ہے بقیہ لطائف کے تجرد پر صوفیہ کا اتفاق ہے یعنی جب سے اس مسئلہ لطائف کا ظہور ہوا ہے اس وقت سے سب کا اتفاق ہے یہ اس واسطے کہہ دیا گیا کہ صوفیہ متقدمین کے کلام میں لطائف کا ذکر غالباً نہ ملے گا کیونکہ اس کی تحقیق متاخرین کو ہوئی ہے اور یہ جو میں نے اوپر کہا ہے کہ فلاسفہ کی ہر بات قبل رد غور کرو سو یہ حکم خواص کے لئے ہے عوام کے لئے نہیں ہے عوام کو ان اقوال میں غور کرنے کی اجازت نہیں بلکہ ان کو توقف کرنا چاہئے نہ رد کریں نہ غور کریں نہ تسلیم کریں بلکہ علماء سے پوچھ کر اعتقاد رکھیں، بہر حال چونکہ روح مجرد ہے تو اس کو اور اشیاء کی نسبت سے ذات حق کے ساتھ مناسبت وقرب زیادہ ہے اسی لئے جب روح کی تجلی ہوتی ہے تو اُسی شان سے ہوتی ہے جس شان سے حق تعالیٰ کی تجلی ہوتی ہے کہ تمام عالم اس کے سامنے سربسجود نظر آتا ہے مگر یہ سجدہ عبادت کا سجدہ نہیں ہوتا بلکہ یہ صورت مثالیہ ہے اس تسخیر کی جس کو قرآن میں حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً کہ حق تعالیٰ نے سموات وارض اور اُن کی درمیانی چیزوں کو سب کو تمہارے واسطے مسخر کر دیا ہے (اور تم پر اپنی ظاہری وباطنی نعمتوں کو پورا کر دیا)

تسخیر کا مفہوم

اور تسخیر کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو تمہاری مصالح انجام دینے کے لئے کام

میں لگا دیا ہے یہ مطلب نہیں کہ تم بلا واسطہ ان پر حاکم ہو لیکن چونکہ وہ تمہارے ہی کام میں لگے ہوئے ہیں اس لئے من وجہ وہ تمہارے تابع ہیں پس تجلی روح کے وقت یہ تسخیر اسی صورت سے ظاہر ہوتی ہے کہ تمام عالم روح کے آگے سربسجود نظر آتا ہے جس سے صاحب کشف کو تجلی حق کا شبہ ہو جاتا ہے یہی دھوکہ حضرت یحییٰ منیریؒ کے ذکر کئے ہوئے بزرگ کو ہوا جو تیس سال کے بعد زائل ہوا اور معلوم ہوا کہ تجلی حق نہ تھی بلکہ تجلی روح تھی تیس سال کے بعد اس پر تنبہ ہوا اور اس تجلی میں علامات حدوث نظر آئیں اس کے بعد حضرت یحییٰ منیریؒ نے کچھ علامات لکھی ہیں جن سے تجلی روح و تجلی حق کے فرق کو واضح کیا ہے مگر وہ علامات بھی ظنی ہیں ممکن ہے کہ ان میں بھی دھوکہ ہو لیکن جتنی علامات انہوں نے لکھی ہیں چونکہ ان کے علوم ہمارے علوم سے پھر اچھے ہیں اس لئے ان کو بیان کرتا ہوں۔

تجلی حق کی علامات

وہ فرماتے ہیں کہ تجلی روح کے وقت سالک کے اندر عجب و پندار پیدا ہوتا ہے اور تجلی حق کے وقت فنا و عجز طاری ہوتا ہے یعنی تجلی روح کے وقت اور سب اشیاء پر تو فنا و عجز کا مشاہدہ ہوتا ہے مگر خود سالک پر فنا و عجز کا ورود نہیں ہوتا کیونکہ یہ تجلی تو اسی کی روح کی ہے جس کے سامنے تمام عالم سربسجود نظر آتا ہے پھر اس پر فنا و عجز کیوں کر طاری ہوگا اور تجلی حق کے وقت خود اس کی روح پر بھی فنا و عجز کا ورود ہوتا ہے اور تمام عالم کے ساتھ خود اس کی روح بھی سربسجود ہوتی ہے اس وقت سالک پر فنا و عجز کا غلبہ ہوتا ہے علامت تو بہت عمدہ ہے اور جی کو لگتی ہے مگر اس پر بھی قناعت نہ کرو شاید دھوکہ ہو۔

انوار و تجلیات سے متعلق حضرت حاجی صاحبؒ کا مذاق

بس ہمارے حاجی صاحب کی تحقیقات کو ان سب کے بعد دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعی وہ امام وقت تھے حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ ان تجلیات و انوار میں سے کسی پر بھی التفات نہ کرو۔ حضرت کا مذاق بالکل سلف کے مطابق تھا۔ سلف کا فیصلہ اس باب میں یہ ہے کُلُّ مَاخَطَرَ بِبَالِکَ فَھُوَ ھَالِکٌ وَاللّٰہُ اَجَلُّ مِنْ ذٰلِکَ کہ تمہارے دل میں جو کچھ بھی خطرہ آئے (جس میں تجلیات و انوارات داخل ہیں) وہ سب فانی ہیں اور اللہ تعالیٰ سب سے اجل و منزہ (پاک وصاف) ہیں جس شخص کا یہ مذاق ہوگا وہ کبھی دھوکہ میں نہ پڑے گا وہ کسی تجلی کی عبادت میں مشغول نہ ہوگا اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جب قلب کو بھی حق تعالیٰ کا ادراک نہیں ہو سکتا جو الطف من البصر (بینائی سے زیادہ لطیف) ہے تو بصر کو تو اور ادراک کہاں ہوگا۔

دنیا میں رویت باری تعالیٰ ممکن نہیں

یہاں سے ان جاہلوں کی غلطی واضح ہوگئی جو دنیا میں رویت حق کے وقوع یا امکان عادی کے قائل ہیں (اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معراج میں رویت حق ہوئی ہے اس سے استدلال نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ رویت دنیا میں نہ تھی بلکہ آخرت میں تھی کیونکہ عرش وسموات مکان آخرت سے ہیں) ہاں قیامت میں البتہ ادراک ہوگا قلب کو بھی اور بصر کو بھی اور وہاں بھی تمہاری قابلیت کی وجہ سے ادراک نہ ہوگا بلکہ وہ مرئی ہونا چاہیں گے اس وقت قابلیت عطا کردیں گے ؎

داد او را قابلیت شرط نیست　　بلکہ شرط قابلیت داد اوست

(اس کی عطا کے لئے قابلیت کی شرط نہیں بلکہ قابلیت کی شرط اس کی عطا ہے)

بس سب سے بے التفات رہو اور ان اسرار وغیرہ کے درپے نہ ہو تمہارے درپے ہونے سے کچھ نہ ہوگا بلکہ جب بھی کچھ ہوگا ان کی عنایت سے ہوگا ؎

خود بخود آں شہ ابرار بہ برے آمد　　نہ بہ زور ونہ بہ زاری نہ بہ زرے آید

(وہ محبوب خود بخود پہلو میں آتا ہے نہ زور سے نہ گریہ وزاری سے نہ زر سے آتا ہے)

شاعر نے تو بت عیار کہا تھا میں نے ادباً اس کو بدل دیا ہے۔

حجب نورانیہ حجب ظلمانیہ سے اشد ہیں

ہمارے حضرت حاجی صاحب میں اتباع سنت نقشبندیہ سے بھی زیادہ تھا نقشبندیہ شغل لطائف کی تعلیم بہت اہتمام سے کرتے ہیں مگر حاجی صاحب فرماتے تھے کہ لطائف بھی حجب ہیں اور یہ حجب نورانیہ ہیں جو حجب ظلمانیہ سے اشد ہیں پھر فرمایا البتہ لطیفۂ قلب کی طرف توجہ رکھنا چاہئے کیونکہ حدیث میں قلب کا ذکر ہے اور اس کی طرف توجہ کا امر بھی ہے **مَنْ صَلّٰی رَکْعَتَیْنِ مُقْبِلاً عَلَیْھِمَا بِقَلْبِہٖ** الخ (جس شخص نے حضور قلب سے دو رکعت نماز پڑھی) سبحان اللہ حدیث کا کتنا ادب ہے کیا آج کوئی شیخ نقشبندی بھی ایسا ہے؟ غرض سالک کو حضرت عارف کے قول پر عمل کرنا چاہئے ؎

حدیث مطرب ومئے گو درازِ دہر کمتر جو　　کہ کس نکشود ونکشاید بہ حکمت ایں معمہ را

(مطرب اور مئے کی باتیں کرو اسرار دہر کی جستجو میں مت پڑو اس لئے کہ اس معمہ کو کسی نے حکمت سے حل نہ کیا اور نہ کرسکے)

یہی بعینہٖ حاجی صاحب کا مذاق ہے اور جب اسرار دہر کی طرف بھی التفات سے ممانعت

ہے تو اسرار احکام وصفات تو اور بھی صعب ہیں۔

بطون قرآن کثیر ہیں

کیونکہ حدیث میں ہے اِنَّ لِلْقُرْاٰنِ ظَاهِرًا وَّبَاطِنًا اَخْرَجَهٗ ابْنُ حَبَّانٍ فِیْ صَحِیْحِهٖ مِنْ حَدِیْثِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ کَذَا فِی التَّسرُّفِ (المغنی عن حمل الاسفار للعراقی ۱:۹۹) (یقیناً قرآن کے لئے ظاہر اور باطن ہے ابن حبان نے اپنی صحیح میں ابن مسعودؓ کی حدیث سے اس کو بیان کیا ہے) اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ بطون کثیر ہیں اور اس کا شب وروز مشاہدہ ہو رہا ہے کہ بعض بطون قرآن ایسے ہیں جن کا ہم کو ادراک ہو گیا ہے عوام کو نہیں ہوا اور بعض بطون ایسے ہیں جن کا ہمارے اساتذہ کو ادراک ہو گیا ہے ہم کو نہیں ہوا اور بعض بطون پر ائمہ مجتہدین کو اطلاع ہوئی ہے۔ غیر مجتہدین کو نہیں ہوئی جیسے لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ (یعنی صدقات فقراء مہاجرین کے لئے ہیں جو اپنے شہروں اور مالوں سے نکالے گئے ہیں) سے استیلاء کفار کا مسئلہ استنباط کرنا مجتہدین ہی کا کام تھا غیر مجتہدین کا ذہن یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا اور بعضے بطون ایسے ہیں کہ جہاں ائمہ مجتہدین بھی نہیں پہنچے ان کا علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

چیست قرآں اے کلام حق شناس ۔۔۔ رونمائے رب ناس آمد بہ ناس

(اے کلام حق کے پہچاننے والے قرآن پاک کیا ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کے رب کا رونما ہے)

حرف حرفش راست او برم معنئے ۔۔۔ معنئے در معنئے در معنئے

(اس کا حرف حرف معنی اندر معنی اندر معنی میں ہے)

پھر ایسے اسرار میں گفتگو کرنا کیونکر جائز ہوگا جو اسرار دہر سے بھی زیادہ غامض واصعب ہیں۔

شیطان کا جرم حق تعالیٰ شانہٗ کے حکم کو خلافِ حکمت سمجھنا تھا

اس جگہ میں ایک اور بات کام کی بتلاتا ہوں جو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے میں نے سنی ہے فرماتے تھے کہ شیطان کا جرم انکار صانع وانکار توحید نہ تھا بلکہ موحد تو وہ ایسا تھا کہ نالائق کو توحید کا ہیضہ ہو گیا تھا اس لئے غیر حق کو سجدہ نہ کیا بلکہ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے حق تعالیٰ کے حکم کو خلاف حکمت سمجھا چنانچہ جب سوال ہوا مَا مَنَعَکَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُکَ (تجھ کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا جبکہ میں نے تجھ کو حکم دیا) تو جواب میں کہتا ہے اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ

خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ (میں آدم سے افضل ہوں مجھے آپ نے آگ سے بنایا ہے اور اس کو مٹی سے) یہاں ایک مقدمہ مطوی ہے۔ اَیْ وَالنَّارُ اَفْضَلُ مِنَ الطِّیْنِ (یعنی اور آگ مٹی سے افضل ہے)۔

آجکل ایک کوڑھ مغز نے رد منطق میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں دعویٰ کیا ہے کہ انتاج کے لئے دو مقدموں کی ضرورت نہیں بلکہ ایک مقدمہ بھی منتج ہوسکتا ہے پھر اس نے ایسے ہی نظائر پیش کئے ہیں جن میں بظاہر ایک مقدمہ مذکور ہے اور دوسرا مقدمہ مطوی ہے وہ عقلمند مطویہ کو نہیں مانتا مگر یہ بداہتاً غلط ہے دوسرا مقدمہ سامع کے ذہن میں ضرور آتا ہے اور اُسی سے مل کر نتیجہ نکلتا ہے مگر چونکہ بعض دفعہ دوسرا مقدمہ ظاہر ہوتا ہے اس لئے اس کو حذف کر دیتے ہیں۔ ایک مقدمہ کا انتاج کے لئے کافی ہونا جب مسلم ہوسکتا ہے جبکہ سامع کے ذہن میں بھی دوسرا مقدمہ نہ آتا اور بدون اس کے نتیجہ نکل آتا حالانکہ ایسا کبھی نہ ہوتا اور اس کا انکار مکابرہ ہے۔

حکم خداوندی کو خلاف حکمت سمجھنا سنگین جرم ہے

بہرحال شیطان نے ان مقدمات سے اپنا افضل ہونا ظاہر کیا جس میں درپردہ حق تعالیٰ کے حکم پر اعتراض تھا کہ یہ حکم خلاف حکمت ہے بلکہ حکمت کا مقتضا یہ ہے کہ مفضول سے افضل کو سجدہ کرایا جائے جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو کہ طلب اسرار سے بھی مرض ابلیس پیدا ہوتا ہے جو شخص اسرار کے درپے ہوتا ہے جب اس کی سمجھ میں کسی حکم کی کچھ حکمت نہیں آتی تو اس کے دل میں اس حکم پر خلاف حکمت ہونے کا اعتراض پیدا ہوتا ہے اور یہ سنگین جرم ہے اور یہیں سے ایک اور غلطی پر متنبہ کرتا ہوں اس کو بھی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ہی نے ظاہر فرمایا ہے۔

بزرگوں کی خدمت میں رہنے کا نفع

اور بزرگوں کی خدمت میں رہنے کا یہی تو نفع ہے کہ اس سے انسان کو غلطیوں پر تنبہ ہوتا اور نفس وشیطان کے مکائد کا علم ہوتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک زمانہ میں جبکہ میں دیوبند میں پڑھتا تھا بعض مدعیان خیر خواہی قوم کے مسئلہ وقف علی الاولاد کی تحریک شروع کی تھی یہ لمبا عنوان مدعیان خیر خواہی قوم میں نے اس لئے اختیار کیا ہے تاکہ توضیح کامل ہوجائے ورنہ اجمالی عنوان (خیر خواہاں قوم وغیرہ) سے ایہام ہوتا اب آئندہ چاہے مختصر عنوان اختیار کروں مگر مراد وہی لوگ ہیں جو بزعم خود قوم کے خیر خواہ ہیں مگر واقع میں خیر خواہ نہیں کیونکہ ان کی دوستی ریچھ کی سی دوستی ہے غرض ان لوگوں نے

مسئلہ وقف علی الاولاد کی تحریک اٹھائی تھی تو اس زمانہ میں نواب محمود خان صاحب رئیس چھتاری نے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے دریافت کیا تھا کہ اس تحریک کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، مولانا نے جواب دیا کہ ایسا خیال حرام ہے بلکہ سلب ایمان کا اندیشہ ہے کیونکہ اس شخص کے اس خیال کا منشأ صرف یہ ہے کہ مسئلہ میراث کو جو منصوص قطعی ہے مضر قوم اور خلاف حکمت سمجھا جاتا ہے چنانچہ اس وقت خیر خواہان قوم نے وقف علی الاولاد کے پاس کرانے کے لئے جن وجوہ کو پیش کیا تھا ان میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس طرح جائیداد حصے بخرے ہونے سے محفوظ رہتی ہے اور میراث کے سہام جاری ہونے سے جائداد کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔

مولانا کا یہ قول میرے ذہن میں تھا اسی لئے جب پریوی کونسل نے وقف علی الاولاد کو رد کیا اور خیر خواہان قوم پھر اٹھے اور علماء سے دستخط لئے تو سب نے اس درخواست پر دستخط کر دیئے سوائے میرے کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ اس وقت بھی وہی لوگ اٹھے ہیں جو پہلے اس تحریک کو لے کر کھڑے ہوئے تھے اور ان کا منشاء وہی ہے کہ یہ لوگ مسئلہ میراث کو مضر قوم اور خلاف حکمت سمجھتے تھے وہ محض اس واسطے اس مسئلہ کو پاس کرانے نہیں اٹھے تھے کہ وقف علی الاولاد شرعاً جائز ہے پھر گورنمنٹ اس کو ناجائز کیوں قرار دیتی ہے بلکہ ان کا منشاء صرف یہ تھا کہ وہ اس کو اقتصادی حیثیت سے قوم کیلئے مفید سمجھتے تھے کہ اس مسئلہ کے پاس ہو جانے سے مسلمانوں کی جائدادیں محفوظ ہو جائیں گی اور حصے بخرے ہونے سے بچ جائیں گی۔

حرمانِ اناث کا قانون خلافِ شریعت ہے

اگر ان کو محض دست اندازی مذہبی پر جوش ہوتا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ پنجاب میں دولڑکیوں اور بہنوں کو قانوناً میراث دلانے کی کوشش نہیں کرتے اور گورنمنٹ نے جو وہاں کے رواج کو دیکھ کر حرمان اناث کا قانون کر دیا ہے اس کو منسوخ نہیں کراتے حالانکہ اس قانون میں بھی شریعت میں دست اندازی ہے مگر یہاں وہ اس واسطے نہیں بولتے کہ حرمان اناث کا قانون ان کے نزدیک اقتصادی حیثیت سے قوم کے لئے مفید ہے کیونکہ اس صورت میں جائیداد ایک خاندان سے دوسرے خاندان کی طرف منتقل نہیں ہوتی صرف میت کے عصبات ہی کو ملتی ہے اور عورتوں کو حصہ دینے میں داماد اور بہنوئی وغیرہ بھی حقدار بن جاتے ہیں جو اکثر دوسرے خاندان کے ہوتے ہیں۔

تحریک وقف علی الاولاد کا منشأ اور حکم

غرض میں نے ان کی منشاء کو دیکھ کر ان کے ساتھ اتفاق نہیں کیا اور نہ مسئلہ وقف علی الاولاد کے

محضر نامے پر دستخط کئے گو یہ مسئلہ فقہ کا ہے مگر ان لوگوں کا منشأ دوسرا تھا اس واسطے حکم بدل گیا۔ چنانچہ منافقین کے بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (جب آپ کے پاس منافقین آئے تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتے ہیں کہ بے شک یہ منافقین (اپنی گواہی میں) جھوٹے ہیں) یعنی ظاہر میں منافقین کی بات غلط نہ تھی وہ تو مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہی کہتے تھے جو عین حق اور عین صدق ہے لیکن اس عین صدق کے تکلم کرنے والے منافقین کو حق تعالیٰ نے کاذبون فرمایا ہے کیوں کہ ان کا منشاء اظہارِ حق نہ تھا بلکہ وہ تو مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہتے تھے معلوم ہوا کہ بعض دفعہ ایک بات فی نفسہٖ سچی ہوتی ہے مگر اس کا متکلم صادق نہیں ہوتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ منشاء گو فی نفسہ حق تھا مگر جس منشاء کو لے کر خیر خواہانِ قوم اس میں سعی کر رہے تھے اُس کے اعتبار سے یہ شرعی مسئلہ نہ رہا تھا بلکہ سیاسی مسئلہ ہو گیا تھا جس میں شرکت کرنے اور اس پر عمل کرنے سے معصیت بلکہ اس سے بڑھ کر سلب ایمان کا اندیشہ تھا اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

کفر گیرد کاملے ملت شود ہرچہ گیرد علتی علت شود

(کامل اگر کفر کرے تو ملت ہو جائے اور علتی جو کچھ اختیار کرے علت ہو جائے)

(اس کی توجیہ میں حاجی صاحب نے فرمایا کہ پہلے مصرع کا مصداق منافق ہے کہ کلمہ توحید پڑھنا اس کے لئے سب کے نیچے درجہ نار یعنی (اَلدَّرْكُ الْاَسْفَلُ مِنَ النَّارِ تک پہنچنے کا سبب ہو گیا اس کی مثال جیسے عمار بن یاسر جنہوں نے کفار کے مجبور کرنے سے کلمہ کفر جاری کر لیا اس کے بعد آیت قرآنی سے ان کا فعل قانون شریعت بن گیا کیونکہ اس واقعہ کے بعد آیت کا نزول ہو گیا کہ جو شخص خوف کے وقت کلمہ کفر جاری کرے تو جائز ہے)

اس پر ظاہر میں اشکال ہوتا ہے کہ کامل کا کفر ملت کیسے بن جاتا ہے۔

حضرت حاجی صاحبؒ حل مثنوی کے امام تھے

مگر ہمارے حضرتؒ حل مثنوی کے امام تھے جب یہ شعر درس میں آیا تو اس کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت عمارؓ نے حالت اکراہ میں کلمہ کفر کا تلفظ کر لیا تھا پھر روتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو فوراً وحی الٰہی میں قانون اکراہ نازل ہو گیا مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ

اِیْمَانِہٖٓ اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ وَلٰکِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْکُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْہِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰہِ وَلَہُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ
جو شخص ایمان لائے پیچھے اللہ کے کفر کرے مگر جس شخص پر زبردستی کی جائے بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو لیکن ہاں جو جی کھول کر کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہوگا اور ان کو عذاب بڑا) یہ تو کفر گیرد کاملے ملت شود (کفر اختیار کرے کامل ملت ہو جائے) کی مثال ہے کہ حضرت عمار چونکہ کامل تھے ان کا اجراء کلمہ کفر بھی قانون دائمی کا سبب ہو گیا کہ ہمیشہ کو کفر اکراہ کے متعلق قانون جواز مقرر ہو گیا اور منافقین نے محمد رسول اللہ کہا تھا جو مفتاح قرب وسبب فوز بالجنت (جنت کی کامیابی کا) ہے مگر چونکہ وہ علتی تھے اُن کا کلمۂ شہادت بھی علتی ہو گیا جس سے وہ درک اسفل نار میں پہنچے جس پر اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ بلا شبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں جائیں گے) نازل ہوا اور (اور اللہ وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافقین اس کہنے میں جھوٹے ہیں) میں ان کو کذاب کا خطاب ملا یہ ہے ؎

ہر چہ گیرد علتی علت شود

(جو کچھ علتی اختیار کرے علت ہو جائے) کی مثال۔

سبحان اللہ حضرت نے ایسی شرح فرمائی کہ علماء ظاہر کو بھی ماننا ہی پڑے گا ہمارے حضرت کو مثنوی سے خاص مناسبت تھی فرمایا کرتے تھے کہ مجھے تو سب اشکالات طریق مثنوی ہی سے حل ہو جاتے ہیں واقعات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت کی روح مولانا رومی قدس سرہ کی روحانیت سے مستفید تھی ایک دفعہ کسی شعر کی تفسیر میں ایک متبحر عالم نے حضرت سے اختلاف کیا رات کو حضرت نے مولانا رومی کو خواب میں دیکھا اور اس شعر کا مطلب دریافت کیا تو وہی فرمایا جو حاجی صاحب کہتے تھے، یہ مضمون درمیان میں استطراداً عرض کر رہا تھا۔

طلبِ اسرار کا نتیجہ

کہ طلب اسرار کا نتیجہ بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ جس حکم کی حکمت سمجھ میں نہیں آتی اُس کو یہ شخص خلاف حکمت سمجھنے لگتا ہے جیسا کہ خیر خواہان قوم نے مسئلہ میراث کو مضر قوم اور خلاف حکمت سمجھا جس کی وجہ سے حضرت مولانا الاستاذ نے یہ فتویٰ دیا کہ اس خیال سے سلب ایمان کا اندیشہ ہے پس اسرار کے درپے ہرگز نہ ہونا چاہئے احکام الٰہیہ کے اسرار یہاں قطعی طور پر معلوم نہیں ہو سکتے اگر ہوں گے تو حشر میں ہوں گے وہاں اللہ تعالیٰ سے یہ لوگ پوچھ لیں کہ مسئلہ میراث میں کیا حکمت تھی وہاں فیصلہ ہو جائے گا اور فیصلہ بھی کیسا؟ جیسا ہمارے مولانا فرماتے ہیں ؎

اَلْوَ عْظُ يَنفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحِكَمِ وَالسَّيفُ اَبْلَغُ وُعَّاظٌ عَلَى الْقُمَمِ
(نصیحت اگر علم وحکمت کے ساتھ ہوتو نفع پہنچاتی ہے اور تلوار سروں پر پڑنی نصیحت گروں میں سب سے زیادہ بلیغ نصیحت گر ہے)

ہمارے مولانا فرماتے ہیں کہ آسمان سے پانچ چیزیں نازل ہوئی ہیں چار کتابیں اور پانچویں نعلدار جوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیت اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (ہم نے ان کے ساتھ کتاب نازل کی) میں جس طرح کتابوں کے متعلق اَنْزَلْنَا (ہم نے نازل کیا) فرمایا ہے اسی طرح اس کے متصل ہی حدید کے متعلق بھی انزلنا فرمایا ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (اور ہم نے لوہے کا پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے) جس کی تفسیر مولونا نعلدار جوتے سے فرمایا کرتے تھے اور اس کا نام مولانا نے روشن دماغ بھی رکھا تھا کیونکہ نعلدار جوتا سر پر پڑنے سے دماغ درست وروشن ہو جاتا ہے جس شخص کا دماغ کتاب اللہ سے درست نہ ہو اس کا دماغ نعلدار جوتے سے درست ہو جاتا ہے۔ یہ عقل کے پورے مسئلہ میراث کو محض اس لئے خلاف حکمت کہتے ہیں کہ اس سے جائیداد کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں ارے عقل مند اگر حق تعالیٰ کو یہی مقصود ہو کہ مسلمان زمیندار نہ بنیں اور ان کے پاس مال و دولت جمع نہ ہو اور جہاں کچھ سرمایہ اور جائیداد جمع ہو جائے اس کو ٹکڑے کر کے متفرق کر دیا جائے تاکہ مال و دولت کی کثرت سے مسلمان آخرت سے غافل نہ ہوں تو تم اس کو حصے بخرے ہونے سے بچانے والے کون ہوتے ہو؟ حق تعالیٰ تو یوں چاہتے ہیں کہ مسلمان ہمیشہ یوں سمجھتے رہیں۔ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (اور آخرت بدرجہا بہتر اور پائیدار ہے)

حکایت حضرت شیخ عبدالقدوس قدس سرہ

اور اس پر نظر کر کے دنیا کے زیادہ جمع کرنے کی فکر نہ کریں اور یہ وہی چیز ہے جس سے شیخ عبدالقدوس قدس اللہ سرہ کی بیوی تنگدستی میں راضی رہتی تھیں۔ حضرت شیخ متوکل تھے اور فتوحات زیادہ نہ تھیں بعض دفعہ فقر وفاقہ کی بھی نوبت آتی تھی کبھی بی بی صاحبہ عرض کرتیں کہ حضرت آجکل تو بہت تنگی ہے تو آپ فرماتے گھبراؤ نہیں ہمارے واسطے جنت میں عمدہ عمدہ کھانے تیار ہو رہے ہیں بس تھوڑے دنوں کی بات ہے اب وہاں جا کر خوب راحت و آرام سے دن گذاریں گے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (تیرے پروردگار کا رزق بدرجہا بہتر اور پائیدار ہے)۔

مسلمان کے لئے حکومت بھی مطلقاً مطلوب نہیں

صاحبو! متاع دنیا کا مسلمان کے پاس جمع ہونا شرعاً مقصود نہیں بلکہ بمقابلہ اس کے حکومت

البتہ کسی درجہ میں مقصود ہے مگراس کے لئے بھی حدود ہیں حکومت بھی مطلقاً مقصود نہیں کہیں تم اس سے سوراج کی تائید سمجھ لو وہ تو سوراج ہے یا سورراج۔ بلکہ خاص طرح کی حکومت مطلوب ہے جس کی تعریف خود حق تعالیٰ نے اس طرح فرمائی ہے اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور دوسروں کو نیک کام کرنے کو کہیں اور بُرے کاموں سے منع کریں) یعنی سلطنت وہ مقصود ہے جس کی یہ شان ہو کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں میں نماز اور زکوٰۃ کی پابندی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا چرچا ہو سب کو دینداری کی تعلیم ہو بد دینی کا انسداد ہو بدعات و رسوم و شرک کا قلع و قمع ہو گویا سلطنت اس لئے مقصود ہے کہ سب کو ملاّ نا بنا دیا جائے۔ اور جو لوگ سوراج کے لئے کوشاں ہیں اگر ان کو حکومت مل گئی تو یہ تو دو دن میں دین کا خاتمہ کر دیں گے۔ چنانچہ آج کل ایک اللہ کا بندہ حرمین پر حاکم ہو گیا ہے اور اس نے اسی شان کی حکومت کرنا چاہی تھی جیسی قرآن میں مذکور ہے کہ لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے لگا بدعات و رسوم شرک کو مٹانے لگا لوگوں کو نماز وغیرہ کی تاکید کرنے لگا اس سے یہ خیر خواہان قوم بگڑ گئے اور اس کی سلطنت مٹانے کے درپے ہیں اسی سے سمجھ لو کہ یہ لوگ کس قسم کی حکومت چاہتے ہیں یہ تو ایسی حکومت چاہتے ہیں جس میں ہر شخص دین سے آزاد رہے شیعہ بھی خوش رہیں اور قادیانی بھی اور قبروں کو پوجنے والے بھی پس میں ایسی حکومت کو مقصود نہیں کہتا بلکہ اس کے تو ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے (مثل مشہور ہے کہ خدا گنجے کو ناخن نہ دے ۱۲)

کسبِ معاش کا کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہور نبوت سے پہلے کیا

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ حکومت تو مسلمانوں کے لئے خاص حدود کے ساتھ مطلوب بھی ہے مگر مال و متاع کا جمع ہونا تو کسی درجہ میں بھی مقصود نہیں اسی لئے اسباب جمع مال کا ترک کرنا بلا عذر بھی جائز ہے چنانچہ جملہ انبیاء علیہم السلام اور خود ہمارے حضور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے کسبِ معاش کا کبھی کوئی سلسلہ نہیں کیا۔ ظہور نبوت سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ بکریاں چرانے کا کام اختیار فرمایا ہے اور کچھ تجارت کا شغل بھی فرمایا ہے تو یہ نبوت سے پہلے کا ایک فعل مباح ہے اور نبی تو علم حق میں آپ اس وقت بھی تھے مگر کام نبوت کا سپرد نہ ہوا تھا اس لئے میں نے کہا تھا ظہور نبوت سے پہلے الخ ظہور کی قید بڑھانے کی یہی سبب تھا تا کہ معلوم ہو جائے کہ آپ نبی تو اُس وقت بھی تھے صرف ظہور نبوت بعد میں ہوا کیونکہ حدیث میں ہے کُنْتُ نَبِیًّا وَ اٰدَمُ

بَیْنَ الرُّوحِ وَالْجَسَدِ اَخْرَجَهُ اَحْمَدُ وَ الْبُخَارِیُّ فِیْ تَارِیْخِهٖ وَصَحَّحَهُ الْحَاکِمُ وَکَذَا هُوَ بِهٰذَا لِلَّفْظِ عِنْدَ التِّرْمِذِیُّ وَغَیْرُهٗ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ التِّرْمِذِی اِنَّهٗ حَسَنٌ صَحِیْحٌ کَذَا فِی الْمَقَاصِدِ (المستدرک للحاکم ۲: ۶۰۹، کنز العمال: ۳۱۹۱۷) میں نبی ہو چکا تھا حالانکہ آدم علیہ السلام ابھی جسم وروح کے درمیان تھے اس کو احمدؒ نے اور بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے ایسے وجدن الفاظ کے ساتھ ترمذیؒ کے نزدیک ہے اوران کے غیر نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے ترمذی نے حسن صحیح کہا ہےؒ) یعنی آپ خلقت آدم علیہ السلام سے بھی پہلے نبی ہو چکے تھے اور یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص تحصیلداری میں نامزد ہوگیا مگر ابھی تحصیل سپرد نہ ہوئی ہو تو یہ شخص تحصیلدار تو نامزدگی کے بعد ہی سے کہلا سکے گا۔ البتہ کام اُس وقت سے شروع ہوگا جب تحصیل سپرد ہو جائے۔ غرض قبل ظہور نبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دنوں کسب معاش کا سلسلہ فرمایا جس سے بہت سے بہت آپ کا مباح ہونا ثابت ہوا لیکن بعد نبوت کے آپ نے کوئی سلسلہ نہیں فرمایا اور نہ مال جمع کیا۔

نبوت کے بعد آپؐ کا طرزِ عمل

بلکہ بعد نبوت کے آپؐ کا طرز عمل مال کے متعلق اگر آیا ہے تو یہ آیا ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز کا سلام پھیرا اور سلام کے بعد نہایت سرعت سے گھر میں تشریف لے گئے جس پر صحابہ کو تعجب ہوا کہ کیا بات ہے آپ اس قدر سرعت سے کیوں تشریف لے گئے آپ نے واپس تشریف لا کر فرمایا کہ میرے گھر میں کچھ سونا رکھا ہوا تھا جو تقسیم نہ ہوا تھا میں نے اُس کو جا کر تقسیم کر دیا کیوں کہ نبی کے لئے مناسب نہیں کہ اس پر اس حالت میں رات گذرے کہ اس کے گھر میں چاندی سونا رکھا ہوا ہو اور ترک سلطنت کی کسی حال میں اجازت نہیں الا بعذر رو اضطرار۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے حکومت تو شرعاً مطلوب ہے مگر مالدار ہونا مطلوب نہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے مسئلہ میراث کو اسی واسطے مشروع کیا ہو تا کہ مسلمان جمعدار اور مالدار نہ ہوں کیوں کہ شریعت نے مقصوداً مال جمع کرنے سے منع کیا ہے اور اس کو مسلمانوں کے لئے مضر بتلایا ہے اِلَّا مَنْ قَالَ هٰکَذَا وَهٰکَذَا مگر جو ادھر اُدھر تقسیم کرتا رہے اس کو مضر نہیں یہ تو اس کا اصل حکم ہے لیکن ضعفاء کو عذر کی وجہ سے جمع مال کی بھی اجازت ہے جبکہ وہ زکوٰۃ ادا کرتے رہیں۔

اطمینان قلب کے لئے مال جمع کرنا جائز ہے

علماءؒ نے لکھا ہے کہ اطمینان قلب کے لئے بھی مال جمع کرنا جائز ہے مگر جواز سے اس کا

مطلوب ومقصود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اصل مقصود تو آخرت کی طرف مسلمانوں کا متوجہ ہونا ہے اگر کسی کو بدون مال جمع کئے اطمینان نہ ہو تو اس وقت دین ہی کی مصلحت سے جمع مال کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ بدون اطمینان کے دین کا کام بھی نہیں ہوسکتا لیکن اتنی جمع تو قسمت میراث کے بعد بھی ہوسکتی ہے جس سے کسی قدر دلجمعی رہے کیونکہ میراث میں کچھ نہ کچھ تو سب ورثہ کو ملتا ہی ہے گو مجموعہ کی صورت نہ رہے بلکہ اگر سارا مجموعہ ایک گھر میں رہتا ہو تو اس صورت میں صرف اسی گھر کو اطمینان اور دلجمعی حاصل ہوتی اور جب جائیداد تقسیم ہوکر دس گھروں میں پہنچے گی تو دس آدمیوں کو اطمینان نصیب ہوگا جن میں بعضے ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے عمر بھر اطمینان کی صورت ہی نہ دیکھی ہوگی اب بتلاؤ مسئلہ میراث خلافِ حکمت کیوں کر ہوا؟

چوتھی پشت میں حالت بدلنے کی کہاوت

اور یہ جو مشہور ہے کہ چوتھی پشت میں حالت بدل جاتی ہے کہ اگر پہلے فقیر تھا تو چوتھی پشت میں غنا ہو جائے گا اگر پہلے غنا تھا فقر آجائے گا غالباً اس کا منشأ بھی یہی ہے کہ چوتھی پشت میں جا کر جائیداد وغیرہ کے حصے بخرے زیادہ ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے مالدار اور جمعدار گھر کی وہ حالت نہیں رہتی جو پہلے تھی اور ان حصوں کی وجہ سے بعضے غریب مالدار ہو جاتے ہیں کہ ان کے پاس ایک بیگہ زمین بھی نہ تھی تیسری چوتھی پشت میں میراث کے ذریعے سے ان کے پاس کچھ زمین پہنچ جاتی ہے اس واسطے یہ قول مشہور ہو گیا کہ چوتھی پشت میں حالت بدل جاتی ہے یہ اہل تجربہ کا قول ہے جس کے متعلق ایک ملکی کا لطیفہ بھی مشہور ہے ملکی کو چوتھی پشت میں ایسا ہی تنزل ہو جاتا ہے جیسا کہ خود لفظ ملکی کے حروف میں تنزل ہے کہ ہر حرف لاحق کے عدد حرف سابق سے دس دس کم ہیں کیونکہ اس لفظ میں چار حرف ہیں اول میم جس کے عدد چالیس ہیں پھر لام جس کے عدد تیس ہیں پھر کاف جس کے عدد بیس ہیں پھر یاء جس کے عدد دس ہیں گویا لفظ ملکی میں خود اس کے تنزل کی طرف اشارہ ہے کہ چوتھے درجہ میں چالیس کے دس رہ جائیں گے۔

خلفائے راشدین کا بطور لطیفہ ثبوت

یہ بہت عمدہ لطیفہ ہے اسی قسم کا لطیفہ ایک طالب علم نے لفظ قرنی میں بیان کیا ہے کہ اس لفظ میں خلفاء اربعہ کی ترتیب خلافت کی طرف اشارہ ہے اور ان کے زمانہ کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہی زمانہ بتلایا ہے اور اشارہ اس طرح ہے کہ لفظ قرنی میں ہر خلیفہ کے نام کا اخیر حرف موجود

ہے حضرت ابوبکر صدیق کا ق ہے اور حضرت عمر کی راء اور حضرت عثمان کا ن اور حضرت علی کی یاء اور اسی قسم کا ایک لطیفہ میں نے بچپن میں سنا تھا وہ سب سے زیادہ لطیف ہے۔ ایک شاعر نے کہا ؎

ابوبکرؓ یک سو علیؓ ایک جانب ۔۔۔ خلافت کو گھیرے ہیں باصد صفائی
الف اور یاء کی طرح ان کو جانو ۔۔۔ کہ محصور ہے جن میں ساری خدائی
یہ تشبیہ ہے واقعی تو جگہ بھی ۔۔۔ الف اور یاء نے بہ ترتیب پائی
وہ اول خلیفہ کے اوّل میں آیا ۔۔۔ یہ آخر خلیفہ کے آخر میں آئی

یعنی جیسے الف اور یاء تمام حروف کو گھیرے ہوئے ہیں اسی طرح حضرت ابوبکر اور علی رضی اللہ عنہما تمام خدائی کو محیط ہیں اور یہ تشبیہ واقعی ہے اس لئے الف اور یاء نے دونوں کے ناموں میں جگہ بھی بہ ترتیب پائی کہ الف اوّل خلیفہ کے نام کے اوّل میں آیا اور یا آخر خلیفہ کے نام کے آخر میں آئی اور یہ محض ایک لطیفہ ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہمارا مدعا ان لطائف ہی پر موقوف ہے۔

حضرات خلفاءؓ کے دلائل محض لطائف پر مبنی نہیں

بلکہ اہل سنت کے پاس حضرات خلفاء ثلاثہ کی حقیقت خلافت پر دلائل صحیحہ تو یہ موجود ہیں جس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جس ترتیب سے ان حضرات کی خلافت وقوع میں آئی وہی حق ہے پھر دلائل سے مقصود ثابت ہو جانے کے بعد تفریح طبع کے لئے لطائف کے بیان کا بھی مضائقہ نہیں باقی ان سے استدلال مقصود نہیں گو دوسرے فرقوں کے یہاں دلائل بھی اکثر اسی قسم کے ہیں وہ لطائف ہی کو دلائل کے موقع میں بیان کرتے ہیں اور بیچارے ایسا نہ کریں تو کیا کریں کیوں کہ باطل کے لئے دلیل صحیح کہاں سے آئے چنانچہ ایک شیعی نے حضرت علیؓ کی تعریف اور فضیلت میں یہ شعر کہا ہے ؎

علی کا نام بھی نام خدا کیا راحت جاں ہے ۔۔۔ عصائے پیر ہے تیغ جواں ہے حرزِ طفلاں ہے

اس میں لطیفہ یہ ہے کہ عین کی شکل اوپر سے مثل عصا کے ہے اور عدد اس کا ستر ہے جو بوڑھے شخص کی عمر ہے اور ل کی خم ارشکل تلوار کی سی ہے اور عدد اس کا تیس ہے جو جوان کی عمر ہے اور ی کی شکل تعویذ کی سی ہے اور عدد اس کا دس ہے جو بچہ کی عمر ہے لطیفہ بہت عمدہ ہے مگر اس کو دلیل بنانا جیسے بعض اہل غلو کی عادت ہے غلط ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فضیلت کا کس کو انکار ہے مگر اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ تم خلفاء ثلاثہ کی مفضولیت کو ان لطائف سے ثابت کرنے لگو ہمارا مذہب تو یہ

ہے کہ حضرت علیؓ کے لئے بہت فضائل ہیں جو ان لطائف سے اقویٰ ہیں مگر حضرات خلفاء ثلاثہ کا درجہ ان سے بڑھا ہوا ہے۔

کیا شیعہ قرآن پاک کا حافظ ہوسکتا ہے؟

اسی طرح کانپور میں ایک شخص نے مجھ سے ایک شیعی کا قول نقل کیا کہ اس نے اپنی جماعت پر سے قرآن کے حفظ نہ کر سکنے کا الزام اس طرح اتارا کہ سُنی جو قرآن حفظ کرتے ہیں وہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کی برابری کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی حافظ قرآن ہیں تو یہ لوگ حفظ کر کے اس صفت میں خدا کی برابری کرتے ہیں اور شیعی ایسی گستاخی نہیں کرتے ہیں۔ کہا کہ اس شیعی سے یہ بھی کہہ دینا کہ تمہارا خدا کیسا ہے کہ سنیوں کا بچہ بچہ بھی اس کی برابری کرسکتا ہے بس جس سُنی کا دل چاہے وہ قرآن حفظ کر کے اس کی برابری کر لے اور ہمارا خدا ایسا ہے جس کی برابری تمام دنیا بھی مل کر کرنا چاہے تو کسی بات میں بھی برابری نہ کر سکے۔ غرض یہ ہے ان فرقوں کے دلائل جن پر جاہل سے جاہل آدمی بھی ہنستا ہے چونکہ اس جگہ شیعوں کے حفظ قرآن کا ذکر آ گیا اس لئے استطراداً ایک اور بات کہتا ہوں وہ یہ کہ آج کل مسلمانوں میں یہ بات زیر غور ہے کہ شیعہ کو قرآن حفظ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اور بہت لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ شیعہ ہرگز حفظ نہیں کر سکتے اور اس دعوے کے بہت زور کے ساتھ شیعہ کے مقابلہ میں ان کو عاجز کرنے کے لئے بیان کرتے ہیں اور واقعی شیعہ نے آج تک ایسے مواقع میں اپنا کوئی حافظ پیش نہیں کیا اور اس بات سے وہ بہت عاجز اور نادم ہو جاتے ہیں لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں اس کی بنا محض تجربہ غالبہ پر ہے اس لئے ہم زبان سے اس کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ شیعہ سے حفظ قرآن محال یا متعذر (مشکل) ہے اب رہی بات کہ ان میں حافظ کیوں نہیں ہوتے؟ آیا اس کا منشأ حضرات خلفاء ثلاثہ کی شان میں گستاخی ہے جس کی نحوست سے اُن کو حفظ نہیں ہوسکتا یا کچھ اور بات ہے تو میرا خیال یہ ہے کہ اس میں گو اس گستاخی کی نحوست کو بھی دخل ہو مگر اس کا اصل منشاء ان لوگوں کی بے توجہی ہے کہ ان کو قرآن کے ساتھ لگاؤ اور دلچسپی نہیں اس لئے ان کو اس کے پڑھنے پڑھانے اور حفظ کرانے کا اہتمام بھی نہیں اور ممکن ہے کہ اس عدم اہتمام اور عدم تعلق کا سبب اس کے محرف (تحریف) ہونے کا اعتقاد ہو بہرحال عدم حفظ کا سبب قریب تو عدم اہتمام ہی ہے اب عدم اہتمام کا سبب جو بھی چاہے ہو اگر یہ لوگ بھی سنیوں کی طرح قرآن کے پڑھنے پڑھانے کی اہتمام کرتے تو غالباً ان کو بھی قرآن حفظ ہوسکتا تھا محال یا متعذر ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔

تراویح میں قرآن سنانا بقائے حفظ کا سامان ہے

چنانچہ پانی پت میں شیعہ کے بعضے بچے حافظ ہو جاتے ہیں مگر رہتے نہیں اور حفظ نہ رہنے کا سبب بھی وہی عدم اہتمام ہے۔ایک شیعی لڑکا غلام سردار نام میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ حافظ ہو گیا تھا مگر بعد میں سُنی ہو گیا کیوں کہ جب وہ حافظ ہو گیا تو رمضان کے موقع پر اس نے اپنی جماعت سے کہا کہ تراویح میں میرا قرآن سنو انہوں نے کہا کہ ہمارے یہاں تو نہ جماعت ہے نہ تراویح ہے، اس نے کہا کہ جب تراویح میں میرا قرآن نہ سنا جائے گا تو مجھے محفوظ کیونکر رہے گا۔شیعوں نے کہا کہ جو کچھ بھی ہو ہم تیری وجہ سے تراویح تو نہیں پڑھ سکتے اس نے کہا پھر میں سُنی ہوتا ہوں تا کہ میرا حفظ باقی رہے چنانچہ وہ سُنی ہو گیا۔تو اس لڑکے کو دیکھ کر میرا خیال یہی ہے کہ شیعہ کے عدم تحفظ کا سبب ان کا عدم اہتمام ہے اگر وہ تحفظ کا اہتمام کریں تو حافظ ہو سکتے ہیں مگر حافظ رہیں گے نہیں کیونکہ بقاء حفظ کا سامان ان کے نہیں اور تنہا پڑھنے سے حفظ باقی نہیں رہتا اس میں کچھ تراویح[1] میں

---

[1] میں کہتا ہوں کہ غالباً اسی بات کو دیکھ کر حضرات فقہاء نے تراویح میں ختم قرآن کو ایک بار سنت موکدہ کہا ہے اور کسل قوم سے بھی اس کے ترک کی اجازت نہیں دی اگر اس حکم کو بدلا گیا اور ختم واحد کو بھی لازم نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ شیعہ کی طرح سنیوں میں سے بھی حفظ قرآن کا سلسلہ جاتا رہے، وَلَيْسَتِ التَّرَاوِيْحُ بِاٰكَدَ مِنْ حِفْظِ الْقُرْاٰنِ فَلَمَّا انْحَصَرَ طَرِيْقُ بَقَاءِ هٖ فِي الْخَتْمِ مَرَّةً فِي التَّرَاوِيْحِ بِالْتَّجْرِبَةِ لَزِمَ الْقَوْلُ بِتَاكُّدِهٖ (لَا فِيْ نَفْسِهٖ بِالْغَيْرِ ۱۲) وَلِهٰذَا اَذْهَبَ بَعْضُ فُقَهَآءِ نَااِلٰى عَدْمِ تَاكُّدِ التَّرَاوِيْحِ بَعْدَ حُصُوْلِ الْخَتْمِ فِيْهَا مَرَّةً وَّلَا يَلْزَمُ مِنْ وَّعْدِاللّٰهِ بِحِفْظِهٖ عَدْمُ لُزُوْمِ الْاِهْتِمَامِ بِاَسْبَابِهٖ كَيْفَ وَقَدْ حَرَّمْنَا كِتَابَةَ تَرْجَمَةِ الْقُرْاٰنِ مُجَرَّدَةً عَنِ الْمَتْنِ وَاشَاعَتِهَا كَذٰلِكَ لِاِخْلَالِ ذٰلِكَ فِيْ حِفْظِ الْقُرْاٰنِ وَاِفْضَآئِهٖ اِلٰى اِنْعِلَامِهٖ ظَاهِرًا فَكَذَا هٰذَا فَلَعَمْرِيْ اِنَّ قَوْلَ الْفُقَهَآءِ بِتَاكُّدِ الْخَتْمِ مَرَّةً فِيْ رَمَضَانَ وَاِنْ لَّمْ يَظْهَرْ لَنَا دَلِيْلُهٗ نَصًّا لَا يُحْتَاجُ بَعْدَ مَشَاهَدَةِ هٰذِهِ الْحَالِ اِلٰى دَلِيْلٍ هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ. ۱۲ ظ.

(تراویح حفظ قرآن سے زیادہ موکد نہیں ہیں جبکہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ حفظ قرآن کے باقی رہنے کا طریق تراویح میں ایک مرتبہ ختم کرنے میں منحصر ہے تو تراویح کے موکد ہونے کا قائل ہونا لازم ہو گیا نہ فی نفسہ بلکہ بغیرہ اسی بنا پر ہمارے بعض فقہاء ایک مرتبہ تراویح میں ختم قرآن ہونے پر تراویح کے موکد نہ ہونے کی طرف گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اس کی حفاظت کرنے کا وعدہ کرنے پر یہ لازم نہیں کہ اس کی حفاظت کے اسباب کا اہتمام نہ کیا جائے اس کے اسباب کے اہتمام کرنے کی وجہ سے ہم نے قرآن کی عبادت کو چھوڑ کر محض ترجمہ کی طباعت اور اس کی اشاعت کو ہم نے حرام کر دیا ہے تا کہ وہ ظاہراً حفاظت قرآن میں مخل اور اس کے انعدام کی طرف مفضی نہ ہو اپنی جان کی قسم فقہاء کا رمضان میں ایک مرتبہ ختم قرآن کے موکد ہونے کا قول اگر چہ نص میں اس کی دلیل ہم کو نہیں ملی اس حالت کے مشاہدہ کے بعد کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے یہ میرے نزدیک ہے۔ (واللہ اعلم)

سنانے کو خاص دخل ہے مگر میں نے اپنا یہ خیال اپنی جماعت کے سامنے بیان کر دیا ہے کہ یہاں سب اپنے ہی ہیں اور اس ضرورت سے بیان کیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ شیعہ کا حافظ نہ ہونا کوئی شرعی مسئلہ نہیں جیسا کہ بہت سے عوام کا خیال ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے اس خیال کو شیعہ میں مشتہر کیا جائے۔ ایک صاحب نے غضب کیا کہ ضلع مظفر نگر میں ایک مقام پر شیعوں اور سُنیوں کی اس بات پر گفتگو ہو رہی تھی کہ شیعہ حافظ قرآن نہیں ہوتے اور اس بات سے وہ لوگ بہت شرمندہ ہو رہے تھے اس مجلس میں اس بھلے مانس نے میرا یہ قول بیان کر دیا کہ میں نے فلاں شخص کی تحقیق اس مسئلہ میں یہ سنی ہے کہ شیعہ اس لئے حافظ نہیں ہوتے کہ اس کا وہ اہتمام نہیں کرتے اگر اہتمام کریں تو حافظ ہو سکتے ہیں اس کو سن کر شیعہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے واقعی اس شخص نے دماغ حکیمانہ پایا ہے سبحان اللہ کیا سچا فیصلہ کیا۔ میں کہتا ہوں کہ جب تم کو میرے حکیمانہ دماغ کا اقرار ہے تو پھر میرا مذہب کیوں نہیں اختیار کر لیتے کیونکہ جس کا حکیمانہ دماغ ہوگا وہ مذہب بھی صحیح اختیار کرے گا یہ یا کہ اس بات میں تو میرا دماغ حکیمانہ ہو گیا جو اُن کے موافق مطلب تھی اور باقی باتوں میں حکیمانہ دماغ نہ رہا۔ اس کی مناسبت سے ایک اور واقعہ یاد آ گیا کہ میں ایک دفعہ سادات کے ایک گاؤں میں گیا جہاں ایک سُنی نے مجھے وعظ کیلئے بلایا تھا تو اس موقع پر یہ لوگ ایسی خاطر سے پیش آئے کہ میں شرما گیا کیونکہ شیعوں میں ظاہری تہذیب بہت ہوتی ہے یہاں تک کہ بعض شیعہ نے بیعت کی بھی درخواست کی مگر میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس کے کچھ شرائط ہیں جو بذریعہ خطوط طے ہو سکتے ہیں اور ٹالنے کی وجہ یہ تھی کہ میں جانتا تھا کہ جس وقت شرائط بیعت پیش کروں گا جن میں سب سے پہلے تبدیلی مذہب کی شرط ہوگی تو اس وقت یہ سب تہذیب رخصت ہو جائے گی۔

مسئلہ میراث خلافِ حکمت نہیں

یہ گفتگو ملکی کے لطیفہ پر چلی تھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر خدا تعالیٰ کو یہ تنزل ہی مقصود ہو کہ چوتھی پشت میں جا کر بہت جائیداد والا بزاز میندار نہ رہے تو پھر مسئلہ میراث پر خلافِ حکمت ہونے کا اعتراض تم کیونکر کر سکتے ہو۔ ارے جس بات کی وجہ سے تم اس کو خلاف حکمت سمجھتے ہو۔ اگر واقع میں خدا تعالیٰ کے نزدیک وہی حکمت ہو تو پھر کیا کہو گے؟ کچھ بھی نہیں تمہارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں بس اب ہم یوں کہیں گے۔

معشوق من است آنکہ بر نزد یک تو رشت است

(میرا محبوب وہ ہے جو تیرے نزدیک بدصورت ہے)

کہ جس بات کو تم عیب سمجھتے ہو اور مضر قوم بتلاتے ہو حقیقت میں وہی حکمت ہے اور قوم کی فلاح حقیقی اسی میں ہے۔ یہ میں نے تبرعاً مسئلہ میراث کی حکمت بیان کر دی۔

احکام کی حکمت نہ بتلانے میں مصلحت

مگر یہ طالب اسرار کے سامنے میں بیان نہیں کیا کرتا بلکہ ایسے لوگوں کے لئے میرے پاس دوسرا جواب ہے جب کوئی مجھ سے کسی حکم کا راز یا حکمت پوچھتا ہے تو میں کبھی تو وہ جواب دیتا ہوں جو اوپر گزر چکا کہ آپ کے سوال عن الحکمت میں کیا حکمت ہے اور کبھی یہ جواب دیتا ہوں کہ ہمیں اسرار و حکم معلوم ہیں مگر نہیں بتلاتے کیونکہ ہم کسی کے نوکر نہیں ہیں ہاں شریعت نے تبلیغ احکام کا تو ہم کو حکم کیا ہے بیان اسرار و حکم کا امر نہیں کیا پس ان کا بیان کرنا یا نہ کرنا شرعاً ہمارے اختیار میں ہے تو ہم نہیں بیان کرتے اس میں کسی کا کیا اجارہ ہے ایک بار میں علی گڑھ گیا تو کالج کے ایک عربی و انگریزی داں پروفیسر جو وہاں کے مجمع میں قابلیت میں یکتا سمجھے جاتے تھے مجھ سے ملنے آئے اور ان کا یکتا ہونا مجھے بعد میں معلوم ہوا انہوں نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ حدیث میں جو آیا ہے مَاظَهَرَ الزِّنَافِيْ قَوْمٍ اِلَّافَشَا فِيْهِمُ الطَّاعُوْنُ اَوْنَحْوُهٗ (مسند احمد ۱: ۴۰۲، کنز العمال: ۹۷۶۸ بالفظ آخر) (کسی قوم میں زنا کا ظہور ہوا اس میں طاعون یا اس کے مثل (کوئی اور بیماری) پھیل گئی) یہ سمجھ میں نہیں آیا میں نے پوچھا کہ مدلول لفظی سمجھ میں نہیں آیا یا زنا و طاعون کا ربط نہیں سمجھ میں آیا کہنے لگے ربط سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا تو ضرور کیا ہوا کیونکہ عمل و اعتقاد کے لئے فہم ربط کی ضرورت نہیں آپ مدلول لفظی کو سمجھ ہی گئے ہیں اُسی پر اعتقاد و عمل رکھئے کہنے لگے کہ ضرر تو کچھ نہیں ہوا لیکن اگر ربط معلوم ہو جائے تو نفع ہے میں نے کہا کیا نفع ہے تو کہنے لگے اس سے اطمینان ہو جائے گا میں نے کہا اسی کی دلیل ہے کہ اطمینان مطلوب ہے چونکہ ذی علم تھے اس لئے دلیل میں ایک آیت پڑھ دی قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (انہوں نے عرض کیا یقین کیوں نہ لاتا، لیکن اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو سکون ہو جائے) کہ ابراہیم علیہ السلام نے حصول اطمینان کے لئے کیفیت احیاء موتیٰ کا سوال کیا اور حق تعالیٰ نے اس منشا کو رد نہیں کیا میں نے کہا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ جو چیز ابراہیم علیہ السلام کے لئے نافع ہو وہ آپ کے لئے بھی نافع ہو یہ ضروری نہیں کہ جو دوا ایک شخص[1] کو نافع ہو وہ دوسرے کو

[1] اور راز اس میں یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان مشاہدہ سے ہوا جس میں زوال ممکن نہیں اور یہاں گر ہوگا مقدمات ظنیہ سے ہوگا جس میں زوال ممکن ہے پس ایک اطمینان پر قیاس نہیں کر سکتے۔

بھی نافع ہوا اس پر وہ خاموش ہوگئے پھر میں نے شیخ زادہ پن سے کام لیا اور کہا مولانا یہ نہ سمجھئے گیا کہ مولویوں کو اس کی حکمت معلوم نہیں بحمد اللہ معلوم ہے مگر ہم نہیں بتاتے کیونکہ اسرار و حکم کو بتلانا ہمارے ذمہ نہیں پھر میں نے یہ شعر پڑھا۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز　　　ورنہ در مجلس زنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز آشکارا ہو جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی ایسی خبر نہیں کہ نہ معلوم ہو)

یہ جواب گو ظاہر میں روکھے پن کا جواب ہے مگر اصلاح اسی سے ہوتی ہے کیونکہ آج کل بد دماغ لوگوں کا یہ خیال ہو گیا ہے کہ مولویوں کے ذمہ ہر بات کا جواب دینا ہے۔

حکایت مولوی غوث علی صاحب مرحوم

چنانچہ مولوی غوث علی صاحب پانی پتی نے ایسے ہی جواب سے ایک خاں صاحب کی اصلاح کی تھی وہ مولوی صاحب کے پاس آئے اور بہت للکار کر اینٹھ مروڑ کے ساتھ کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کو کیمیا آتی ہے فرمایا ہاں آتی ہے کہا بتلا دو فرمایا نہیں بتاتے کہا کیوں؟ فرمایا میں تمہارے باوا کا نوکر ہوں کہ جو پوچھو بتلا ہی دوں۔ اب ذرا خان صاحب کا دماغ ڈھیلا ہوا اور لگے خوشامد کرنے والے مولوی صاحب نے کہا ہاں اب راستے پر آئے خان صاحب چلمیں بھرو خدمت کرو دو سال میں تین سال میں اگر کبھی مزاج چاہا تو بتلا دیں گے اس کے بعد کھانے کا وقت آیا تو مولوی صاحب نے جنگل کی پتیاں ابال کر پیش کیں خان صاحب ناک منہ چڑھانے لگے مولوی صاحب نے کہا خان صاحب ابھی کیا ہے یہ تو کیمیا کی پہلی منزل ہے آگے آگے اس سے بھی زیادہ لطف ہیں خان صاحب کہنے لگے تب تو محض واہیات ہے فرمایا ہاں اس میں شک کیا ہے خان صاحب کو ہدایت ہوئی اور اپنا راستہ لیا۔ مولوی صاحب کے ایسے ایسے لطیفے بہت ہیں۔

ایک مدعی الوہیّت کا شرارت نفس کا اعتراف

چنانچہ ایک دفعہ مولوی صاحب اپنے پیر کے ساتھ جا رہے تھے راستہ میں ایک مقام پر گزر ہوا جہاں ایک شخص مدعی الوہیت تھا کمبخت اپنے کو خدا کہتا تھا مولوی صاحب کے پیر کو بڑا غصہ آیا اور اس کو مارنا پیٹنا چاہا مولوی صاحب نے کہا حضرت مارنے پیٹنے سے کیا ہوگا خواہ مخواہ فساد ہوگا کچھ لوگ اس کے موافق بھی ہوں گے وہ برسر مقابلہ ہوں گے۔ آپ ٹھہریئے میں جا کر اس کی اصلاح کرتا ہوں، چنانچہ آپ نے جیب میں باسی روٹیاں، سڑی بھسی لیں اور ان پر سڑا ہوا سالن

رکھ کر پہنچے اور اس شخص سے ملے اور پوچھا کہ آپ کا اسم شریف اس نے کہا کہ میں اللہ رب العالمین ہوں مولوی صاحب نے کہا الحمد للہ کہ حضور سے دنیا ہی میں ملاقات ہوگئی اور ہم کو عرش وسمٰوٰت طے کرنے نہ پڑے آپ ہی نے عرش سے دنیا میں نزول فرمالیا اب بندوں کو بہت آسانی ہوگئی اس کے بعد وہ روٹیاں جیب سے نکالیں اور ہدیہ میں پیش کیں اس نے بدبو کی وجہ سے ناک بھوں چڑھائی تو آپ فرماتے ہیں کہ حضور جب خالق آپ ہیں تو رازق بھی آپ ہی ہیں جیسا آپ نے ہم کو دیا ویسا ہی ہم نے آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ اس پر وہ خفیف ہوا اس کے بعد مولوی صاحب نے کہا کہ حضور ایک آیت کی تفسیر میں علماء کا بہت اختلاف ہے کسی جانب کو ترجیح نہیں معلوم نہیں ہوتی اب اس سے بہتر کیا موقع ہوگا کہ خود صاحب کلام موجود ہیں تو حضور خود ہی اپنے اس کلام کو حل فرمادیں اور ایسی تقریر فرمادیں جس سے میری تشفی ہو جائے۔

اس کے بعد وہ آیت پڑھی چونکہ وہ شخص بالکل جاہل تھا اس لئے بے ساختہ بول اٹھا کہ میں تو جاہل آدمی ہوں فرمایا پھر خدا کدھر سے ہوا کہ اپنے کلام کے معنی بھی معلوم نہیں کہنے لگا میں خدا ودا کچھ نہیں یہ محض میرے نفس کی شرارت تھی اب توبہ کرتا ہوں۔

مولوی صاحب کے یہاں ایسے ایسے لطیفے بہت ہوتے رہتے تھے اور وہ ہر شخص کو اس کے مذاق کے مطابق جواب دیتے اور اسی سے بند کر دیتے تھے چنانچہ اس موقع پر گفتگو کا یہ طرز اختیار نہیں کیا کہ اس کی الوہیت کا انکار کر کے مباحثہ کرتے بلکہ حکیمانہ طرز اختیار کیا کہ اس کو بظاہر تسلیم کر کے پھر جواب دیا اور اس سے توبہ کرالی اسی حکیمانہ طرز کا وہ جواب بھی تھا جو خان صاحب کو دیا کہ جاؤ ہم نہیں بتلاتے اس طرح کے جواب سے اس بد دماغ کا دماغ درست ہوا۔

ہر سوال کا جواب دینا علماء کے ذمہ نہیں

مولوی کو آج کل یہی طرز اختیار کرنا چاہئے عوام کے تابع ہو کر ہر بات کا جواب نہ دینا چاہیے۔ اسرار کے تعلق صاف کہہ دو کہ بعضے اسرار تو ہم خود نہیں جانتے اور بعضے جانتے ہیں مگر چونکہ بتلانا ہمارے ذمہ نہیں اس لئے نہیں بتلاتے اور ایسا ایک اور جواب بھی ہے وہ یہ کہ ہم بتلا بھی دیتے مگر تم سمجھو گے نہیں اس لئے نہیں بتلاتے۔ اس پر اگر کوئی یہ کہے کہ قرآن وحدیث تو آسان ہے سمجھ سے باہر نہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے پس کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے) اور حدیث میں ہے اَلدِّيْنُ يُسْرٌ (الدر المنثور ۱:۱۹۲، تفسیر القرطبی ۳:۳۴۲) (دین آسان ہے) اس کا جواب یہ ہے کہ

آیت اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے مطالب و مقاصد کا سمجھنا اور ان پر عمل کرنا آسان ہے۔ لِلذِّکْرِ خود اس کو ظاہر کر رہا ہے یہ مطلب نہیں کہ دلائل و اسرار کا سمجھنا بھی آسان ہے۔

شریعت کے سب مقاصد آسان ہیں

چنانچہ شریعت کے مطالب و مقاصد تو اس قدر سہل ہیں کہ دیہاتی اور جاہل بھی ان کو سمجھ سکتا ہے کہ خدا ایک ہے وہ اپنی صفات میں بے نظیر ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پیغمبر ہیں قیامت کا دن آنے والا ہے اور نماز فرض ہے زنا اور سود اور چوری حرام ہے نماز روزہ کے یہ احکام ہیں، بیع وشرا کے یہ احکام ہیں وغیرہ وغیرہ بتلاؤ ان میں کون سی بات باریک ہے کوئی اقلیدس کی شکل نہیں معقولی اور فلسفی دعوے نہیں جن کے سمجھنے میں دماغ کو کاوش ہو سیدھی سیدھی باتیں ہیں البتہ ان کے دلائل وحکم ضرور دقیق ہیں جن کو متکلم وفقیہہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ پس اَلدِّیْنُ یُسْرٌ (دین آسان ہے) کہ تفسیر یہ کرنا کہ دین کے اسرار ودلائل بھی آسان ہیں جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے غلط ہے اور مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ ہر شخص دلائل شرعیہ واسرار احکام کے فہم کا اہل نہیں، غرض یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ حدیث قدسی معجز ہے یا نہیں؟ اور معجز ہے تو متلو کیوں نہیں میں نے کہا تھا کہ یہ علم اسرار کی قبیل سے ہے، ان اسرار کو نہ ہم معلوم کریں اور نہ اس میں گفتگو کریں۔

حدیثِ قدسی

تو حدیث قدسی میں هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰی وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ (وہی ہے جس کے عذاب سے ڈرنا چاہیئے اور وہی ہے جو بندوں کے گناہ معاف کرتا ہے) کی تفسیر یہ آئی ہے اَنَا اَهْلُ اَنْ اُتَّقٰی وَ مَنِ اتَّقٰی فَاَنَا اَهْلُ اَنْ اَغْفِرَ لَهٗ اَوْ کَمَا قَالَ (یعنی میں اہل ہوں اس بات کا کہ مجھ سے ڈرا جائے اور جو شخص ڈرے گا پس میں اہل ہوں اس کا کہ میں اس کے گناہ معاف کر دوں) اور اس تفسیر کا لطف اہل علم کو آئے گا جو قواعد نحو سے واقف ہیں۔

علوم درسیہ

علماء متقدمین نے فہم قرآن کے لئے ایسے قواعد منضبط کئے ہیں جن کے بعد قرآن کا سمجھنا بہت آسان ہو گیا اور علوم درسیہ میں جتنے علوم اور کتابیں رکھی گئی ہیں وہ سب قرآن وحدیث ہی کی تسہیل کے لئے رکھی گئی ہیں۔ اور ان کتابوں میں ایسی عمدہ ترتیب رکھی گئی ہے کہ ان کو پڑھ کر آدمی بڑے سے بڑا متکلم وادیب وواعظ ومفسر ومحدث ہو سکتا ہے۔ آج کل بعض لوگوں کو علم کلام جدید کی

تدین کا خبط ہو رہا ہے۔ واہیات بس اس خیال سے اس کو جدید کہہ لو کہ تمہارے شبہات جدید ہیں ورنہ علم کلام قدیم کے قواعد قیامت تک کے شبہات کا جواب دینے کے لئے کافی ہیں۔

رسالہ الانتباہات تمام شبہاتِ جدیدہ کے ازالہ کا کفیل ہے

چنانچہ میرا ایک رسالہ ہے بلکہ رسلیا اور یہ لغت مجھے ایک بریلوی عنایت فرما سے معلوم ہوا ہے اس نے حفظ الایمان کو رسلیا کہا تھا تو ایسا ہی ایک چھوٹا سا رسالہ میرا الانتباہات ہے وہ تمام شبہات جدیدہ کے ازالہ کا کفیل ہے ذرا کوئی اس کے اصول کو توڑ تو دے۔ انشاء اللہ قیامت تک کوئی نہ توڑ سکے گا اور وہ رسالہ علم کلام قدیم ہی کے قواعد سے لے کر لکھا گیا ہے پس علم کلام جدید کا خیال محض خبط ہے متقدمین کے اصول سب شبہات کے دفع کے لئے کافی ہیں۔

اہل التقویٰ کی تفسیر

اور قرآن وحدیث کا تحقیقاً سمجھنا تو بدون ان کے ممکن ہی نہیں۔ تو علماء نحو نے لکھا ہے کہ مصدر کبھی معروف ہوتا ہے کبھی مجہول تو اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ تقویٰ تو مصدر مجہول ہے اور مغفرۃ مصدر معروف اب طلبہ کو اس عنوان تعبیری سے لطف آئے گا اور وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ اَهْلُ اَنْ اُتَّقٰی (میں اس بات کا اہل ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے) کے ساتھ تفسیر مصدر سے مجہول ہونے پر مبنی ہے اور اَهْلُ اَنْ اَغْفِرَلَه' (میں اہل اس بات کا کہ اس کے گناہ بخش دوں) کے ساتھ تفسیر مصدر معروف ہونے پر مبنی ہے۔

تمہید لمبی ہونے کی عجیب مثال

اب میں مقصود کا بیان شروع کرتا ہوں ابھی تک صرف تمہید ہی تھی جو اتفاق سے لمبی ہوگئی اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ تمہید اکثر لمبی ہوا کرتی ہے مقصود لمبا نہیں ہوا کرتا۔ دیکھو روٹی مطلوب ہے وہ تو مختصر ہے اور اس کی تمہید کس قدر لمبی ہے کہ زمین کو جوتو ہل چلاؤ بیل خریدو پانی دو اور ہزار قسم کے جھگڑے کرو تب روٹی سامنے آتی ہے یہ ایسا ہے جیسے مور کی دُم مور سے لمبی ہوتی ہے حالانکہ مثل تمہید کے تابع ہے، دیوبند میں اس پر ایک لطیفہ ہوگیا ایک طالب علم نئے آئے تھے ان سے دوسرے طالب علموں نے سوال کیا کہ اَلْكُلُّ اَعْظَمُ مِنَ الْجُزْءِ (کل جزو سے بڑا ہے) کو قطعی کہتے ہیں حالانکہ مور کی دُم مور سے لمبی ہوتی ہے یہاں تو اَلْجُزْوُ اَعْظَمُ مِنَ الْكُلِّ (جزء کل سے بڑا ہے) ہوگیا تو وہ طالب علم صاحب سوچ کر کیا فرماتے ہیں کہ مَامِنْ عَامٍ اِلَّا وَقَدْ خُصَّ

عَنۀُ الْبَعْضُ (کوئی عام ایسا نہیں جس سے بعض کی تخصیص نہ کی گئی ہو) یہ مثال اس قاعدہ سے مستثنٰی ہے واقعی ایسے سمجھدار لوگوں کو منطق وفلسفہ پڑھنا جائز نہیں کیونکہ جب فہم صحیح نہیں تو معقول وفلسفہ پڑھ کر ان کو دین کے احکام ومسائل میں اور شبہات پیدا ہوں گے اور جس کی فہم صحیح ہے وہ تو خود فلاسفہ کے اقوال ہی سے ان کے دعاوی کو باطل کر دے گا۔

حضرت گنگوہیؒ کے صدرا شمس بازغہ کو نصاب سے خارج فرمانے میں حکمت

ایک زمانہ میں مولانا گنگوہیؒ نے صدرا شمس بازغہ میر زاہد امور عامہ کو نصاب سے خارج فرما دیا تھا اس پر بعض طلبہ نے شور کیا مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے عرض کیا کہ حضرت مولانا نے ان کتابوں کو حرام فرما دیا تو مولانا نے فرمایا گنگوہیؒ نے ان کتابوں کو حرام نہیں کیا بلکہ تمہاری طبیعتوں نے ان کو حرام کیا یا ورنہ ہم تو جیسا بخاری کے پڑھنے کو ثواب سمجھتے ہیں ایسا ہی امور عامہ کے پڑھنے کو ثواب سمجھتے ہیں اب تمہید کے بعد مقصود کو بیان کرتا ہوں جو غالباً مختصر ہی ہوگا۔

ہماری دو حالتیں

وہ یہ کہ آج کل ایک خاص غلطی کے متعلق ہماری دو حالتیں ہیں ایک اتقیاء کی جو خواص الخواص سے معبر ہوں گے اور ایک بے باک لوگوں کی جو عوام سے معبر ہوں گے عوام کی حالت تو یہ ہے کہ انہوں نے صرف شان مغفرت کو مدنظر رکھا ہے اور شان ''اَنْ اتَّقٰی'' کو پیش نظر نہیں رکھا گو عقیدہ ان کا بھی یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے ڈرنا چاہیئے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ گناہوں پر مواخذہ بھی فرماتے ہیں اور جب کبھی وہ اپنی حالت کو سوچتے ہیں تو دل میں خوف وخشیت بھی پاتے ہیں مگر اس کا حال ان پر غالب نہیں کہ ہر وقت خوف وخشیت میں پیش نظر ہو یہ غلطی بھی غلطی ہے مگر اتنی زیادہ شدید نہیں جتنی دوسری غلطی شدید ہے کیونکہ اس کا انجام یہ ہے کہ پٹ چھٹ کر ایک دن جنت میں پہنچ جائیں گے اس غلطی کا درجہ معصیت ہی کی حد میں ہے، نیز اس غلطی کا زائل کرنا بھی آسان ہے کہ ان لوگوں کو وعید سنائی جائیں اور ایک غلطی اتقیا کی ہے جو خواص الخواص ہیں کہ وہ حق تعالیٰ کے اہل التقویٰ ہونے کی شان پر اتنی نظر رکھتے ہیں کہ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ سے بالکل نظر قطع کر لیتے ہیں مجھ کو اس وقت ان ہی کے متعلق بیان کرنا ہے نہ خواص سے تعرض کروں گا جن سے مراد عام صلحاء ہیں جو

خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا (جنہوں نے ملے جلے عمل کئے تھے اور کچھ برے) کے مصداق ہیں کیونکہ ان دونوں غلطیوں سے بری ہیں نہ وہ عوام کی طرح صرف شان اَنْ اَغْفِرَ لَهٗ (میں ان کو بخش دوں) پر نظر کو منحصر کرتے ہیں نہ خواص الخواص کی طرح صرف شان اَنْ اُتَّقٰى پر بلکہ وہ دونوں طرف نظر رکھتے ہیں اس لئے میں اس وقت ان کو خطاب نہیں کرتا اور نہ عوام کی غلطی سے زیادہ تعرض کروں گا کیونکہ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ وہ غلطی زیادہ شدید نہیں مجھ کو اس وقت اتقیاء اور خواص الخواص کی غلطی کو ازالہ مقصود ہے جو صرف شان تقویٰ پر اپنی نظر رکھتے ہیں کہ شان مغفرت پر ان کی نظر حالاً نہیں پہنچتی اور یہ وہ لوگ ہیں جن سے کبھی گناہ نہیں ہوتا یعنی عمداً نہیں ہوتا اگر کبھی اتفاق سے ہوگیا تو ان کی یہ حالت ہوتی ہے۔

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود　　　گرز باغِ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم وارد ہوتے ہیں اگر باطنی حالت میں ذرہ بھر بھی کمی پاتا ہے)۔

حاصل یہ ہوا کہ وہ خود گناہوں پر جرأت نہیں کرتے ورنہ معصوم تو سوائے انبیاء علیہم السلام کے کوئی نہیں ہے بشر تو بشر ہی ہے یعنی فارسی کا بشر جس میں بأ جارہ لفظ شر پر داخل ہے۔

حکایت حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتویؒ

اس فارسیت پر ایک لطیفہ یاد آیا ایک زمانہ میں مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی نے سرکاری اسکول میں ملازمت کے لئے گورنمنٹ کے یہاں درخواست دے رکھی تھی۔ اسی زمانہ میں خواب دیکھا کہ بریلی کی طرف سے کچھ بطیں ان کے مکان کی طرف آرہی ہیں یہ خواب مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے عرض کیا فرمایا اگر مٹھائی کھلاؤ تو اور تعبیر ہے اور مٹھائی نہ کھلاؤ تو فرمایا جاؤ تم بریلی میں بیس روپیہ کے ملازم ہو جاؤ گے اور مٹھائی کا وعدہ نہ کرتے تو میں یہ تعبیر دیتا کہ گیارہ روپیہ کے ملازم ہو جاؤ گے اس کی حقیقت پوچھنے پر فرمایا کہ لفظ بط کے عدد فارسی کے اعتبار سے گیارہ ہیں اور عربی میں طاء مشدّد ہے میں نے اس کو لے کر بیس سے تعبیر دی اور معبر کو یہ اختیار ہے کہ چاہے مکتوبی حروف کا اعتبار کرے یا ملفوظی کا۔

اتقیاء کو غلبہ حیاء کے باوجود استغفار کی ضرورت

بہر حال بشر تو شر سے خالی نہیں لیکن اتقیاء سے گناہ صادر نہیں ہوتا البتہ سہواً کبھی ایسا ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ یہ غلطی ہو جاتی ہے کہ مقدمات معصیت پر تو ان کو تنبیہ ہو جاتا ہے مگر وہ ان پر

التفات تام نہیں کرتے اور وہ مُفْضِیُ اِلَی الْمَعْصِیَۃِ (گناہ کی طرف پہنچانے والا) ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ مقدمات کا مقدمات معصیت ہونا ہی معلوم نہیں ہوتا جیسے ایک عورت سامنے سے گزری نفس نے اس کو دیکھنے کا تقاضا کیا اس نے اس تقاضے کو روکا پھر اتفاقاً اس کا بچہ رویا جو اس کے ساتھ پیچھے پیچھے تھا اب شیطان آیا اور اس نے اس متقی سے کہا کہ تم اس بچہ کی اعانت کرو اس کی ماں نے اس کو نہیں دیکھا تم اس کو اٹھا لو اب اس نے اس طرف اس نیت سے نظر کی کہ دیکھوں، ماں نے بچہ کو دیکھا ہے یا نہیں بس یہ اس نے بُرا کیا عورت کی طرف نظر ہرگز نہ کرنا چاہیئے تھی اب نظر کے بعد اس کو تنبیہ ہوا کہ اس نظر میں نفس کی شہوت کا شائبہ ضرور تھا اب شیطان پھر آیا اور اس نے کہا کہ تم نے عمداً یہ گناہ کیا ہے اور تم عوام کی مثل نہیں ہو بلکہ صاحب نسبت متقی ہو تمہارا یہ جرم نہایت سنگین ہے اب دیکھیئے یہ خطا معاف ہو یا نہ ہو۔ پھر چونکہ یہ شخص مراقبات نعماء وعنایت الٰہی کئے ہوئے ہے جس کی وجہ سے حیا من اللہ کا غلبہ ہے تو اب حیا کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ زبان سے مارے حیا کے اللّٰھم اغفرلی بھی نہیں نکلتا استغفار کرنا چاہتا ہے مگر زبان نہیں چلتی بس اس کا یہ حال ہو جاتا ہے۔

اَحَبُّ مُنَاجَاتِ الْحَبِیْبِ بِاَوْجُہٖ وَ لٰکِنَّ لِسَانَ الْمُذْنِبِیْنَ کَلِیْلٌ

(مناجات حبیب چند وجوہ سے پسندیدہ تر لیکن گناہگاروں کی زبان (غلبہ حیا سے) نہیں چلتی)۔

بلاتشبیہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے اطباء نے لکھا ہے کہ بعض لوگ غلبۂ حیا کی وجہ سے عورت پر قادر نہیں ہوتے ان کو اس سے شرم آتی ہے کہ ایک ایسی عورت کے ساتھ جو نکاح سے ایک ساعت پہلے اجنبی محض تھی اور نکاح کے وقت مثل مہمان اپنے گھر میں آئی ہوئی ہے ایسی حرکت کریں جو ظاہر میں خلاف تہذیب ہے پس ابتداء میں تو غلبۂ حیا کی وجہ سے وہ قادر نہیں ہوتا پھر اس کو اپنی نسبت یہ وہم ہو جاتا ہے کہ میں اس کام کے قابل ہی نہیں بلکہ جماع سے عاجز ہوں پھر وہم بڑھتے بڑھتے مایوسی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ اپنے کو عنین سمجھنے لگتا ہے اس کا علاج اطباء نے یہ لکھا ہے کہ بہ تکلف اس کو حیا کم کرنا چاہیئے اور دل لگی مذاق اور بے تکلفی اختیار کرنا چاہیئے اسی طرح طریق باطن میں جس شخص کو غلبہ حیا استغفار سے مانع ہو اس کا علاج یہی ہے کہ وہ بے حیا بن کر اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے اللہ مجھ کو معاف کر اے اللہ کو معاف کر) کہے اور بار بار کہے اور اپنی اس حالت حیاء پر التفات نہ کرے بلکہ بہ تکلف اس حیاء کو کم کرے اس شخص کے لئے واقعی مرن ہے جس سے اب تک تو حیادار بننے کو کہا گیا تھا اور آج بے حیا بننے کو کہا جا رہا ہے مگر اس حیا کو

چولہے میں ڈالنا چاہئے جو اس وقت محبوب سے بُعد کا سبب بن رہی ہے حیا وغیرہ اس وقت تک مطلوب ہیں جب تک موجب قرب ہوں اور اگر موجب بعد ہونے لگیں تو اب ان کی ضد مطلوب ہوگی، خوب کہا ہے مولانا نے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　　　خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

(اگر بادشاہ حقیقی مجھ سے طمع کے خواہش مند ہوں تو قناعت کے سر پر خاک ڈال دوں گا یعنی ترک کردوں گا)۔

اور ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

بہر چہ از دوست دامانی چہ کفر آں حرف وچہ ایماں　　　　بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

(جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو)۔

غرض اس کا علاج یہی ہے کہ بے حیا بن کر زبان سے توبہ واستغفار کے کلمات نکالے اور بار باران کا تکرار کرے ورنہ اگر یہ حیا ہی میں رہا تو چند روز کے بعد وہم بڑھے گا اور یہ یوں سمجھے گا کہ میں مردود ہوگیا پھر مردودیت کا خیال دل میں جگہ پکڑ لے گا تو اس کو اپنی مغفرت سے مایوسی ہو جائے گی اور کفر کی سرحد پر پہنچ جائے گا۔ جیسے وہ حیاء دار غلبۂ حیاء کی وجہ سے ابتدا میں عورت سے رکا پھر اپنے کو عنین لا علاج سمجھنے لگا بس اس کا علاج یہی ہے کہ بے حیا بن کر دربار میں چلا آئے ورنہ اس کی وہ مثال ہوگی، جیسے ایک ناپاک شخص دریا سے گزرتا ہے اور اس کے پاس جانے سے شرماتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ناپاک اور دریا پاک وصاف میں اس کے پاس کیونکر جاؤں مگر دریا کہتا ہے کہ بچہ جی تم میرے ہی پاس آنے سے پاک ہوسکتے ہو اگر پاک ہونا چاہتے ہو تو بے حیا بن کر اسی حال میں چلے آؤ ورنہ عمر بھر ناپاک ہی رہو گے کیونکہ دریا تو خود آنے سے رہا اور تم اس کے پاس جاتے نہیں تو پھر کام کیونکر چلے گا اگر کوئی درجہ مرادیت میں ہو تو اور بات ہے مراد کے پاس دریا خود ہی پہنچ جاتا ہے گو وہ کتنا ہی بھاگا پھرے مگر مراد بننا نہ کسی کے اختیار میں ہے نہ کسی کو اس کا علم ہے پھر اس کے بھروسہ کیسے رہے پھر یہ کہ اکثر تو مرید ہی ہوتے ہیں اور مرید نے اگر شرم کی اور شرم کو بالائے طاق نہ رکھا تو وہ مارا گیا پس اس کو یہ شعر پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ جو کسی نے حق تعالیٰ کی طرف سے کہا ہے گویا حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ　　　　گر کافر و گبر وبت پرستی باز آ

ایں درگہ مادر گہ نومیدی نیست　　　　صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(واپس آواپس آجو کچھ بھی تو ہے واپس آجا اگر کافر اور آتش پرست اور بت پرست ہے تو بھی واپس آ یہ ہمارا در بارنا امیدی کا در بار نہیں ہے اگر سو بار تو نے توبہ توڑی ہے تو بھی واپس آجا)۔

حکایت طالب مراد

مراد پر ایک حکایت یاد آئی حضرت فرید عطارؒ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک طالب علم نے شیخ سے عرض کیا کہ مجھے حق تعالیٰ کے دیدار کی بہت تمنا ہے کوئی تدبیر بتلایئے جس سے خواب میں دیدار ہو جائے شیخ نے فرمایا کہ آج رات کو عشاء کی نماز چھوڑ دو دیدار ہو جائے گا۔ طالب کو اس تدبیر سے بڑا توحش ہوا کہ شیخ نے یہ کیا فرمایا دولت دیدار معصیت سے حاصل ہوگی پھر چونکہ اس نے اس وقت تک کبھی نماز قضا نہ کی تھی اس لئے ہمت نہ ہوئی مگر شیخ کے قول کا الغاء (لغو سمجھنا) بھی گوارا نہ ہوا تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ لاؤ آج سنتیں چھوڑ دو اور فرض و وتر پڑھ لو سنتوں کا ترک اہون ہے سنتیں چھوڑ کر جو سویا تو رات کو خواب میں جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی کہ آپ فرمار ہے ہیں کیوں بھائی ہم نے کیا خطا کی جو تم نے آج ہماری سنتوں کو چھوڑ دیا اس تنبیہ سے فوراً آنکھ کھل گئی اور اٹھ کر سنتیں پڑھیں صبح کو شیخ سے یہ واقعہ بیان کیا شیخ نے فرمایا کہ اگر فرض چھوڑ دیتے تو خواب میں اللہ تعالیٰ کو یہی فرماتے ہوئے دیکھتے۔ شیخ فرید الدین عطارؒ نے تو قصہ لکھ کر چھوڑ دیا اور اس کی حقیقت مفصل نہ بتلائی کہ فرض چھوڑنے اور دیدار حق ہونے میں ربط کیا تھا صرف مجملاً اتنا لکھا ہے کہ طبیب کبھی زہر سے بھی علاج کرتا ہے۔ بس اتنا لکھ کر چلے گئے اور علماء ظاہر کو صوفیہ پر طعن کرنے کا موقع مل گیا کہ یہ مشائخ بھی شریعت کی ذرا عظمت نہیں کرتے کہ شریعت تو فرض کے چھوڑنے پر وعید سناتی ہے اور یہ فرض کے چھوڑنے کی اجازت دیتے اور اس پر بشارتیں مرتب کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا دیدار ہوتا اور یوں ہوتا۔ میں حاجی صاحب کو امام وقت اسی لئے کہتا ہوں کہ وہ ایسے ایسے وحشت ناک واقعات کو اس خوبی سے حل فرماتے تھے کہ شریعت پر بھی پورا انطباق ہو جاتا تھا حاجی صاحب نے اس حکایت کو بیان کر کے فرمایا کہ وہ طالب مراد تھا شیخ کو معلوم تھا کہ یہ مراد ہے اگر فرض چھوڑ کر سوئے گا تو حق تعالیٰ اس کو نہ چھوڑیں گے فوراً خواب میں تنبیہ فرما کر وقت کے اندر اندر اس سے نماز پڑھوالیں گے پس شیخ نے ترک نماز کی اجازت نہیں دی بلکہ عمر بھر کے لئے اس کو ایسا پابند کرنا چاہا کہ پھر کبھی اس کا وسوسہ بھی نہ آتا کیونکہ حق تعالیٰ کی تنبیہ کا عشاق پر خاص اثر ہوتا ہے۔ بہر حال مراد تو اگر خود کبھی رکتا ہے تو حق تعالیٰ خود اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں مگر یہ دولت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی اور نہ

اس میں کسب واختیار کو دخل ہے ہمارے اختیار میں مرید بنا ہے اور مرید کے لئے یہی قاعدہ ہے کہ خود محبوب کی طرف چلنے کی کوشش کرے اگر یہ اعراض کرے گا ادھر بھی اعراض ہوگا۔ پس اس کو شرم نہ کرنا چاہیئے بلکہ ایسے وقت میں عدوئے شرم کو بلانا چاہیئے کہ ۔

اے عدوئے شرم واندیشہ بیا (اے شرم واندیشہ کے دشمن آ تو) دوسرا مصرع یاد نہیں رہا۔

اتقیاء کی ایک اشد غلطی

اب آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اتقیاء کی یہ غلطی کیسی اشد ہے عوام کو گناہ کر کے توبہ استغفار سے کچھ بھی رکاوٹ نہیں ہوتی اور نہ ان کو مایوسی کا وسوسہ آتا ہے نہ ان پر کفر کا خطرہ ہوتا ہے۔ مگر اخص الخصواص کو یہ بات رات دن پیش آتی ہے کہ ذرا سی خطا میں غلبہ حیا اُن کو اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ (اے اللہ مجھ کو معاف کر) کہنے سے بھی روک دیتا ہے۔ واقعی یہ دولت باطنیہ مثل جنت کے ہے جیسے جنت کے بارے میں آیا ہے خَفَّتْ بِا لْمَکَارِہِ (صحیح مسلم، المقدمہ:ا، سنن الترمذی:۲۵۵۹) (جنت مکارہ سے گھری ہوئی ہے) ایسے ہی اس دولت باطنیہ میں قدم قدم پر مکارہ ہیں اول تو سالک کو یہ مصیبت پیش آتی ہے کہ اس کو حَیَاء'' مِنَ الْخَلْقِ سے چھڑایا جاتا ہے کہ اطاعت حق میں کسی سے شرم نہ کرو کسی کی پرواہ نہ کرو بلکہ حق تعالیٰ سے حیا کرو ان کی معصیت نہ کرو اب جب اس میں حَیَاءٌ مِّنَ اللّٰہِ (اللہ سے حیا) کی صفت راسخ ہوگئی تو اب دوسری مصیبت پہلے سے اشد یہ پیش آئی کہ اس کو ایسے موقع پر حیاء مع الحق سے بھی روکا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو بے حیاء بن کر دربار پر کھڑے ہو جاؤ بغیر اس کے کام نہ چلے گا سالکین کو یہ واقعات پیش آتے ہیں اس واسطے میں اس کو بیان کر رہا ہوں۔ پھر اس حالت میں اس کا بھی لحاظ نہ کرو کہ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ دل سے بھی نکلتا ہے یا نہیں بس تم زبان سے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے اللہ میرے گناہ معاف کر، اے اللہ میرے گناہ معاف کر) کہتے رہو چاہے دل سے نکلے یا نہ نکلے۔ حضرت حاجی صاحب سے جب کوئی عرض کرتا کہ ذکر میں وساوس آتے ہیں توجہ نہیں ہوتی اس لئے نفع نہیں ہوتا تو فرماتے کیا یہ نفع نہیں ہے کہ زبان سے ذکر کی توفیق ہو رہی ہے لذت وحظ پر نظر نہ کرو۔

صرف طلب مقصود ہے

اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ طلب مقصود ہے وصول مقصود نہیں تم طلب کے وقت طلب پر نظر رکھو وصول پر نظر نہ کرو کہ فائدہ ہوا یا نہیں ۔

کار خود کن کار بیگانہ مکن (اپنے کام لگو دوسرے کے کام میں دخل نہ دو)۔

تمہارا کام طلب ہے تم وہ کرو وصول حق تعالیٰ کا کام ہے وہ خود کریں گے یہ ایسی تحقیق ہے جس کے بعد سالک کو پریشانی ہو ہی نہیں سکتی۔

صحیح طریقہ علاج

دوسرے مشائخ کے یہاں تو ہم نے یہ دیکھا ہے کہ جہاں مرید نے وساوس وقلت نفع کی شکایت کی انہوں نے ایک وظیفہ دل جمعی کے لئے بتلا دیا پھر اس وظیفہ میں اسی کی شکایت کی تو ایک وظیفہ اور بتلا دیا اب وہ مجموعہ وظائف ہو گیا! اگر پھر بھی حضور حاصل نہ ہوا تو کیا سر دے ماریں گے پھر حاجی صاحب ہی کے قول کی طرف رجوع کریں گے اور تجربہ ہے کہ ان ترکیبوں سے نفع نہیں ہوتا بلکہ نفع اسی طریق سے ہوتا ہے کہ لذت ونفع پر نظر نہ کرے بلکہ کام ہی کو مقصود سمجھے۔ اور یہ وظائف تو ملذذات ہیں اور محض ملذذات سے کام نہیں چلا کرتا بلکہ صحیح طریقہ علاج یہ ہے کہ اول مرض کی جڑ کو نکالا جائے جس کے لئے کڑوی دوا ہی نافع ہوتی ہے ملذذات کا درجہ بعد میں ہے جب کہ مرض کی جڑ نکل جائے اور میں تو ایسے لوگوں سے جو ذکر میں مزا نہ آنے کی شکایت کرتے ہیں کہہ دیا کرتا ہوں کہ میاں مزا تو ندی میں ہے یہاں مزا کہاں یہ تو لوہے کے چنے جب اگر لوہے کے چنے چبانا ہوں تو آؤ اور اگر یہ منظور نہیں تو عشق کا نام نہ لو کیوں کہ ۔

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن دل بدستِ دگرے دادن وحیراں بودن

(عاشقی کیا ہے محبوب کا بندہ بن جانا دل دوسرے یعنی محبوب کے قبضہ میں دے دینا اور حیران رہنا)۔

یہاں تو حیرت ہی حیرت ہے لذت کا کیا کام اور آگے اس سے بھی سخت بات ہے ۔

سوئے زلفش نظرے کردن در دیش دیدن گاہ کافر شدن گاہ مسلماں بودن

(محبوب کی زلف یعنی تجلی کی طرف نظر کرنا، کبھی فانی ہونا ہے کبھی باقی ہونا)۔

اصطلاح فنا وبقا کی حقیقت

اس لفظ سے گھبرانا نہیں کیوں کہ یہ ان کی خاص اصطلاح ہے اور اس اصطلاح کی نظیر قرآن میں بھی آئی ہے فرماتے ہیں فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (جو شخص کے شیطان کے ساتھ کفر کرے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا) معلوم ہوا کہ ہر کفر مذموم نہیں ہے بلکہ ایک کفر محمود بھی ہے یعنی "کُفر" بِالطَّاغُوتِ (شیطان کے

ساتھ کفر کرنا) تو کافر بھی بہ ایں معنی محمود ہے اور صوفیہ کی اصطلاح میں بھی کافر کے معنی اسی کے قریب ہیں کیونکہ وہ فانی کو کافر کہتے ہیں جو غیر حق سے نظر قطع کر چکا ہو تو اس کا حاصل بھی وہی ہے جو کَافِرٌ بِالطَّاغُوْتِ کا حاصل ہے کیونکہ صوفیہ کے نزدیک وہ غیر حق طاغوت ہے جس کو وہ صنم اور بت سے تعبیر کرتے ہیں اور مسلمان ان کی اصطلاح میں باقی کو کہتے ہیں اور کفر و اسلام فنا و بقا کو کہتے ہیں۔ اسی معنی کو حضرت خسرو فرماتے ہیں۔

کافرِ عشقم مسلمانی درکار نیست ! ہر رگِ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

(میں عشق میں فانی ہوں مجھ کو بقا کی خواہش نہیں ہے میری ہر رگ تار ہو گئی ہے زنار کی ضرورت نہیں ہے)۔

مگر مولوی ان اصطلاحات کے نہ جاننے سے خواہ مخواہ ان بیچاروں کو کافر کہتے ہیں۔ مگر میں ان مفتی صاحب سے جو گو قیمتی ہیں مگر کفر کے فتوے بلا فیس مفت بانٹتے ہیں کہتا ہوں کہ اگر تم ان اصطلاحات کی وجہ سے صوفیہ کو کافر کہتے ہو تو ابن حاجب اور علماء نحو کو بھی کافر کہو کیونکہ حدیث میں تو یہ آیا ہے کہ الف حرف لام حرف میم حرف اور نحاۃ نے یہ غضب کیا کہ جس چیز کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حرف فرمایا ہے وہ اس کو اسم کہتے ہیں جس میں حدیث مخالفت لازم آتی ہے۔ یاد رکھو صوفیہ تو تمہارے فتوے اسلام کے بھوکے نہیں ہیں وہ تو صرف ایک کے بھوکے ہیں جس کے ہاتھ میں حقیقتاً اسلام و کفر کی کنجی ہے مگر تم اپنی خیر مناؤ۔ کہیں بے گناہوں کو کافر کہتے کہتے تمہارے ایمان پر آفت نہ آ جائے اگر یہ کہو کہ ان حضرات نے ایسی وحشتناک اصطلاحیں ہی کیوں مقرر کیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس کو ان باتوں سے توحش ہوتا ہو وہ ان کی کتابیں نہ دیکھے اور وہ تو خود بھی تم جیسے نااہلوں پر اپنی کتابوں کا مطالعہ حرام کرتے ہیں۔

نااہلوں کو صوفیاء کی کتب نہ دیکھنے کی عجیب مثال

ایک عارف صاف فرماتے ہیں یَحْرُمُ النَّظْرُ کُتُبَنَا لِمَنْ لَمْ یَذُقْ مَذَاقَنَا (جس نے ہمارے مذاق کا ذائقہ نہیں چکھا اس کو ہماری کتابیں دیکھنا حرام ہے) اس پر اگر یہ کہو کہ شاید کچھ دال میں کالا ہے جبھی تو اس کو چھپاتے ہیں تو سبحان اللہ اگر کسی کی بیوی حسین ہو اور اس سے کوئی سوال کرے کہ تمہاری بیوی کو دیکھنا جائز ہے یا حرام تو بتلاؤ وہ کیا جواب دے گا؟ یقیناً اگر وہ غیور ہے تو یہی جواب دے گا کہ حرام ہے کیا اس پر بھی آپ کہیں گے کہ شاید دال میں کالا ہے اور اگر کوئی یوں ہی کہے تو ان کی بلا سے محروم کو یہی سمجھنا مبارک ہو اس کے سمجھنے سے حسین محبوبہ تو بدنما نہ ہو

جائے گی یہ تو غیور کا جواب تھا اور جو ذرا بے باک ہیں وہ گویا نقاب کھول کر معترض کے سامنے کر دیتے اور یوں کہتے ہیں۔

ایں است کہ دل بردہ وخوں خوردہ بسے را　　بسم اللہ اگر تابِ نظر ہست کسے را

(یہی تو ہے جو بہتوں کے دل لے گیا اور خون پئے ہیں بسم اللہ اگر کسی کو دیکھنے کی قدرت ہے تو دیکھ لے)۔

جیسا حضرت زلیخا نے کیا تھا کہ ملامت گر عورتوں کو گھر میں بلا کر بٹھلا دیا اور یوسف علیہ السلام سے کہا اُخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ذرا ان کے سامنے تو آجاؤ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هٰذَا بَشَرًا إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ (پس جب عورتوں نے جوان کو دیکھا تو حیران رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور کہنے لگیں للہ یہ شخص آدمی ہر گز نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے) صورت دیکھتے ہی ہوش اُڑ گئے اور بجائے پھل کاٹنے کے سب نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔

حضرات صوفیاء پر غلبہ حیرت

اسی طرح حضرات صوفیہ میں بعض پر تو غیرت کا غلبہ ہے وہ نااہلوں پر اپنے علوم کا مطالعہ حرام کرتے ہیں اور ان کے سامنے اپنے علوم کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ جب غیرت کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے تو وہ اس سے بڑھ کر یوں کہتے ہیں۔

بخدا کہ رشکم آیدز دو چشم روشن خود　　کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

(بخدا مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ وہ محبوب کے چہرہ انور کو دیکھتی ہیں)۔

اس وقت ان کو خود اپنے دیکھنے سے بھی غیرت آتی ہے دوسرے کا دیکھنا تو کیا گوارا ہوتا اور کبھی شوق کا غلبہ ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں۔

گر باید ملک الموت کہ جانم بہ برد　　تا نہ بینم رخِ تو روح رمیدن نہ دہم

(یعنی اگر ملک الموت میری جان لینے کو آئے تو میں آپ کی جب تک تجلی نہ دیکھ لوں گا جان نہ دوں گا)

اور اس وقت کبھی دوسرے کے سامنے بھی اپنے حقائق و معارف کو پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو ہمارا محبوب ایسا ہے۔

این است کہ دل بردہ وخوں خوردہ بسے را　　بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

(یہی تو ہے جو بہت سوں کے دل لے گیا ہے اور خون پیا ہے بسم اللہ ذرا دیکھے تو جس کی نظر میں طاقت ہے)۔

اوراس کے ساتھ ہی خیر خواہی سے یوں بھی کہہ دیتے ہیں ۔

پیش ایں الماس بے اسپر میا　　کز بریدن تیغ رانبود وحیا

(اس تیغ آبدار یعنی مسائل دقیقہ کے روبرو بے سپر فہم نہ آنا چاہیئے کیونکہ تلوار کاٹنے سے نہیں شرماتی)

کہ ذرا سنبھل کر اس میدان میں قدم رکھنا ورنہ گردن ایمان کی خیر نہیں بھٹا سی الگ نہ جا پڑے غرض کسی کو کیا معلوم ہے کہ ان بے چاروں پر کیا گزرتی ہے دوسرے تو کفر کے فتوے لگانا ہی جانتے ہیں ان پر وہ حالت ہی نہیں گزری جو عشاق پر گزرتی ہے ۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست　　حال شیرا نے کہ شمشیر بلا برسر خورند

(تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہیں لگا تم کو ان لوگوں کی حالت کی کیا خبر ہے جن کے سروں پر بلا (مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

پس جو شخص ان سب عقبات سے گزر جائے گا وہ یہی کہے گا کہ متقی کو صدور معصیت کے وقت بے حیا بن کر اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ (اے اللہ میرا گناہ معاف فرما) کہنا چاہیئے اور دل سے نہ نکلے تو زبان ہی سے کہے اگر ساری عمر بھی دل حاضر نہ ہو تو تم اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ (اے اللہ میرا گناہ معاف فرما) کہتے رہو اور عدم حضور پر اصلاً التفات نہ کرو بس قبض وبسط وشدت ولذت سب سے نظر قطع کرو اور ایک کام میں لگو وہ یہ کہ ان کی اطاعت وذکر جس طرح بھی ہو سکے کرتے رہو اور جس نے اس راستہ کو طے نہیں کیا جس کو یہ عقبات ہی پیش نہیں آئے وہ میری اس بات کی قدر نہیں جان سکتا وہ تو یوں ہی کہے گا کہ جب دل حاضر نہیں تو محض زبانی استغفار سے کیا نفع مگر میں اس کو کیونکر سمجھاؤں کہ اس میں کیا نفع ہے واللہ کرنے کے بعد نفع معلوم ہوگا سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آ سکتا بس ان کو میں وہ ہی جواب دوں گا ۔

واقعی عدیم الذوق سمجھنے سے قاصر ہے

جو حضرت استاد نے درس حدیث میں ایک طالب علم کو دیا تھا ۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب صحابی سے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا مجھے حکم ہوا ہے کہ تم کو سورۃ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سناؤں صحابیؓ نے سوال کیا اَللّٰہُ سَمَّانِیْ کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر ارشاد فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اس پر صحابی رونے لگے تو وہ طالب علم کہتا ہے کہ یہ تو ہنسنے کی بات تھی نہ کہ رونے کی مولانا نے فرمایا جا بھدے واقعی ایسے عدیم الذوق کو کوئی کیا سمجھائے ۔

رسالہ ہفت گریہ

مولانا شاہ ابوالمعالی صاحبؒ کے شیخ کی مجلس میں ایک منکر آیا دیکھا کہ سب اہل مجلس رو رہے ہیں کہنے لگا یہ سب محروم ہیں جبھی تو رو رہے ہیں۔ اس پر شاہ صاحب کو جوش آیا اور ایک رسالہ بنام ہفت گریہ لکھا جس میں ثابت کیا ہے کہ رونے کی سات قسمیں ہیں منکر کے تو باپ کو بھی یہ اقسام کبھی معلوم نہ ہوئی ہوں گی اور ایک رونا خوشی کا ہے۔ کیونکہ کبھی غایت فرح سے بھی آنسو بہنے لگتے ہیں اور ایک بکا دونوں سے عالی ہے جس کا نام گرم بازاریٔ عشق ہے پھر اس پر حضرت عارف کا یہ قطعہ لکھا عارف کے کلام میں مسائل سلوک بہت کثرت سے ہیں۔

بلبلے برگ گلے خوشرنگ درمنقار داشت — واندراں برگ ونوا صد نالہ ہائے زار داشت
گفتمش درعین وصل ایں نالہ وفریاد چیست — گفت مارا جلوہ معشوق درایں کار داشت

(ایک بلبل ایک خوشرنگ پھول کی پتی چونچ میں رکھے ہوئے زاروقطار نالہ وفریاد کررہی تھی میں نے اُس سے کہا کہ عین وصل میں نالہ وفریاد کیوں کررہی ہے جواب دیا کہ جلوۂ معشوق نے ہم کواس کام میں مشغول کیا ہے)۔

غرض ایک رونا جوش عشق کا بھی ہوتا ہے جیسا وہ صحابی اس بات کوسن کررونے لگے کہ حق تعالیٰ نے ان کا نام لے کرفرمایا ہے کہ ان کوفلاں سورت سناؤ جس پر ایک بھدے نے کہا کہ یہ تو ہنسنے کی بات تھی ارے تم کیا جانو کہ اس سے عاشق کے کلیجے پر کیسا تیر چل گیا۔ عارفین کے دل پر جوگزرتی ہے اس کو کوئی کیا جانے وہ توان کوروتا ہوادیکھ کر یہی سمجھتا ہے کہ ہائے بے چارے محروم ہیں خصوصاً چشتیہ کودیکھ کر کیونکہ یہ تو ہمیشہ افروختن وسوختن (جلنا بھننا) ہی میں رہتے ہیں کیونکہ یہ چشتیہ ہونے کے ساتھ کشتیہ (قتل ہونا) بھی ہیں۔ جن کے نیچے بھی پانی ہے اور موجوں کی وجہ سے اوپر بھی پانی ہے۔ اس لئے یہ ہر وقت روتے ہی رہتے ہیں یہ عین وصل میں بھی روتے ہیں اوران کوعقبات بھی زیادہ پیش آتے ہیں بات یہ ہے کہ ان کودولت بہت بڑی اور بہت زیادہ مل گئی ہے جوتحمل سے باہر ہے اور جس پر زیادہ بوجھ لادا جائے گا۔ اس کا تو موت ہی نکلے گا اب چاہے کپڑے خراب ہوں یا کچھ بھی ہوں۔ (اس موقعہ پر پہنچ کراذان عصر ہوگئی اور حضرت مولانا خاموش ہوگئے جب اذان ختم ہوئی تو دعائے مسنونہ پڑھ کرفرمایا)

عقبات کی ایک نظیر

ایک نظیران عقبات کی جوسالک کوپیش آتے ہیں یہ ہے کہ جوابھی مجھ پرگزری کہ اذان جو

ہوئی اور مؤذن نے ٹھہر ٹھہر کر اذان دی تو دل میں یہ خطرہ آیا کہ جلدی اذان کیوں نہیں دیتا پھر معاً غیب سے متنبہ کیا گیا کہ یہ تو عبدیت کے خلاف ہوا کہ اذان میں تو ترتیل مسنون ہے اور تم اس کی ضد کو تجویز کرتے ہو تو میں نے فوراً اس خطرہ سے توبہ کی کسی اور کو بھی اگر یہ وسوسہ ہوا ہو تو توبہ کرے اگر میں صرف شان اِن اتَّقٰی (اگر ڈرے) پر نظر رکھتا تو ہلاک ہو جاتا مگر ساتھ شان اَھْلُ الْمَغْفِرَۃِ (اہل ہے بخشش کا) پر نظر کرنے سے کام چل گیا اور جب ہمارے محبوب میں دونوں شانیں ہیں تو ہم صرف ایک ہی شان پر نظر کیوں منحصر کریں بلکہ دونوں پر نظر کرنا چاہیئے ۔

درد از یار ست و درماں نیز ہم   دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

(درد محبوب کی طرف سے اور علاج بھی اس پر دل فدا ہے اور جان بھی)۔

آنچہ میگو یند آں بہتر ز حُسن   یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

(اس کے حسن سے جو کچھ لوگ بیان کرتے وہ اس سے بہتر ہے ہمارا محبوب یہ رکھتا ہے اور وہ بھی)

بس ان عقبات میں شریعت کو امام بناؤ اور وحی پر نظر رکھو اور بے خطرہ چلے چلو عارف فرماتے ہیں ۔

در راہ عشق وسوسۂ اہرمن بسے ست   ہشیار و گوش را بہ پیام سروش دار

(طریق باطن نہیں شیطان کے وساوس اور خطرات ہیں اور ان سے بچنا چاہتے ہو تو ہوشیار رہو اور شریعت کا اتباع کرو)۔

پیام سروش سے مراد وحی ہے۔

نماز میں احضار قلب مطلوب ہے

اسی واسطے بعض سالکین کو جو یہ خیال ہوتا ہے کہ ذکر وصلوٰۃ میں حضور نہیں ہوتا میں ان سے کہہ دیتا ہوں کہ احضار مطلوب ہے حضور مطلوب نہیں اور یہ بات وحی نے ہم کو بتلائی ہے حدیث میں آیا ہے مَنْ صَلّٰی رَکْعَتَیْنِ مُقْبِلاً عَلَیْھِمَا بِقَلْبِہٖ لَا یُحَدِّثُ فِیْھِمَا نَفْسَہٗ اَوْنَحْوَہ' (جو شخص دو رکعت پڑھے کہ ان دونوں پر اپنے دل سے متوجہ ہو اور اس کے دل میں کوئی وسوسہ نہ آئے)۔

اس پر ایک صاحب علم نے ایک علمی اعتراض کیا ہے وہ یہ حضور مطاوع احضار ہے اور جب حضور منتفی (نفی کرنیوالا) ہے تو یہ دلیل ہے انتفاء احضار (احضار (حاضر کرنا) سے نفی حاصل کرنا) کی بھی اگر احضار ہوتا تو اس کا مطاوع حضور بھی موجود ہوتا۔ میں نے کہا کہ آپ کو دھوکہ ہوا جس احضار کا حدیث میں امر ہے اس کا مطاوع (فرمانبرداری کرنا) حضور بھی موجود ہوتا ہے۔ منتفی

حضور کامل ہے جس کے انتفاء سے حضورِ مطلق کا انتفاع لازم نہیں آتا۔ اور ایسا احضار ماموربہ نہیں ہے جس کا مطاوع حضور کامل ہو بلکہ احضار ماموربہ صرف اسی قدر ہے کہ یہ اپنی طرف سے دل کو افعال صلوٰۃ پر متوجہ رکھے اور از خود نفس سے باتیں نہ کرے اس احضار سے اس کے مناسب حضور بھی ضرور پیدا ہوگا گو حضور کامل بمعنی عدم خطور وساوس بالکلیہ نہ ہو اور اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کہ احضار کا ایسا درجہ مطلوب ہے جس کا مطاوع ایسا حضور ہو۔ فَافْهَمْ (خوب سمجھ کر) بہر حال سالک کو جو حالت یا کیفیت پیش آئے اس کو شریعت پر پیش کر کے دیکھے کہ یہ شریعت کے موافق ہے یا نہیں پس متقی کو جو یہ حالت پیش آتی ہے کہ صدور معصیت کے وقت غلبۂ حیاء کی وجہ سے اس کی زبان استغفار پر نہیں چلتی یہ حالت خلاف شریعت ہے اس وقت شریعت کا حکم یہ ہے کہ استغفار کرنا چاہیئے اور حیاء کو بالائے طاق رکھ کر بے حیاء بن کر اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے اللہ میرا گناہ معاف فرما) کہنا چاہیئے اسی واسطے بعض عارفین نے تو یہ فرمادیا ہے کہ کیفیات کو بالکل الگ کرو کیسی حیا اور کیسا بسط ایک پر نظر کرو اگر سب کیفیات سلب ہو جائیں تب بھی پرواہ نہ کرو اور کام میں لگے رہو اور یوں کہو۔

روز ہا گر رفت گو رو باک نیست تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

(ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہیئے اگر گئے بلا سے عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا ہونا کافی ہے)۔

اور یوں کہا۔

میلِ من سوئے وصال ومیل اوسوئے فراق ترکِ کامِ خود گرفتم تا بر آید کامِ دوست

(میرا میلان وصل کی طرف اس کا میلان ہجر کی طرف میں نے اپنی مراد کو ترک کر دیا تا کہ محبوب کی مراد پوری ہو جائے)۔

اور۔

اُرِیْدُ وِصَالَهٗ وَیُرِیْدُ هُجْرِیْ فَاَتْرُکُ مَا اُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ

(میں محبوب کے وصال کا خواہاں ہوں وہ ہجر کے خواہاں، سو میں نے اپنی خواہش کو ان کی خواہش کی وجہ سے ترک کر دیا)۔

ثمرات کا محل دارالجزاء ہے

صاحبو! یہ کیفیات ثمرات ہیں اور ثمرات کا محل دارالجزاء ہے اور دارالجزاء آخرت ہے دنیا

نہیں ہے پھر تم یہاں ثمرات کے طالب کیوں ہو تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ اِلاَّ اللّٰہ اِلاَّ اللّٰہ کرنے سے کچھ نظر آیا یا نہیں۔ ارے جو کچھ نظر آئے گا، وہاں نظر آئے گا یہاں تو عمل مقصود ہے نظر آنا کیسا۔ بس اب چاہے مزا ہو یا نہ ہو تم بلا خوف اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِی (اے اللہ میرے گناہ معاف فرما) کہے جاؤ اور ذکر و طاعت میں مشغول رہو اور اچھا ہم نے مانا کہ دنیا میں بھی بعض ثمرات حاصل ہوتے ہیں تو کیا محبوب کبھی تمہارا امتحان نہ کرے تو کبھی وہاں سے امتحان اسی طرح ہوتا ہے کہ کیفیات سلب کر لیتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ تم ان کو چاہتے ہو یا کیفیات کو چاہتے ہو اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ کیا تم صرف آمنا کہہ کر چھوٹنا چاہتے ہو کیا تمہاری آزمائش نہ کی جائے ضرور کی جائیگی۔ اٰمَنَّا (ہم ایمان لائے) کی تفسیر تو میں نہیں کرتا مگر قریب مطلب وہی ہے جو اَحْیَیْنَا[1] کا ہے اور اَشْقَنَا اس واسطے نہیں کہتا کہ یہ لفظ حدیث و قرآن میں وارد نہیں ہوا۔ پس جب اُدھر سے کبھی آزمائش بھی ہوتی ہے تو اس کا مقتضا بھی یہی ہے کہ تم جی لگنے اور مزا آنے پر نظر نہ کرو کرنے کا کام کرتے رہو یہ تھا مقصود بیان جس سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ یہ مضمون کس قدر ضروری تھا۔

عدم استحضار شانِ مغفرت کا نتیجہ

صاحبو! عدم استحضار شان مغفرت کا نتیجہ یہ ہے کہ متقی کو صدور معصیت کے وقت بعض دفعہ مایوسی تک نوبت پہنچ جاتی ہے پھر نماز وغیرہ کو بھی ترک کر دیتا ہے ابتداء میں تو غلبۂ حیا کی وجہ سے کئی کئی دن تک ذکر کو چھوڑے رکھتے ہیں پھر ترک صلوٰۃ تک نوبت پہنچتی ہے اور یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ وہ ابتداء میں اس بات کے منتظر رہے کہ گناہوں سے پاک ہو جائیں تو حق تعالیٰ کی طرف چلنے کا ارادہ کریں اور وہ اس انتظار میں ہیں کہ یہ آئے تو اس کو پاک کروں اب یہ تو دور ہوا صاحبو! دور کو چھوڑ و دوڑ سے کام لو پھر تسلسل نعمائے الٰہی ہو جائے گا یہ تھا میرا مقصود جس کو یہ عقبات پیش آتے ہیں وہ ان کی قدر جانتا ہے۔ صاحبو! میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو صرف شان اِنَ اتَّقٰی پر نظر کرتے اور شان مغفرۃ پر نظر نہ کرتے تھے جن کا انجام تعطل ہو گیا بعض نے شان مغفرت پر نظر بھی کی اور ایک دو دفعہ صدور معصیت کے وقت طبیعت پر جبر کر کے توبہ و استغفار بھی کیا مگر جب بار بار معاصی کا صدور ہوا اور توبہ ٹوٹنے لگی تو اب انہوں نے استغفار کرنا چھوڑ دیا اور بالآخر ان کی نوبت بھی تعطل تک پہنچی ان کو یہ غلطی پیش آئی کہ بار بار توبہ شکست ہونے پر ان کو یہ آیت یاد آئی

---

[1] ویستانس له بقوله تعالیٰ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ فالایمان یستبع شدة الحب فقول القائل امنافی حکم قوله حیینا ۱۲ منه .

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًالَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِ یَھُمْ سَبِیْلاً (بلاشبہ جولوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ ایسوں کو ہر گز نہ بخشیں گے اور نہ ان کو راستہ دکھائیں گے) اور وہ حدیث ذہن میں آئی جو احیاء العلوم میں مذکور ہے جس کی عراقی نے تخریج کی ہے یہ تو یاد نہیں رہا کہ قوی ہے۔ یا ضعیف لیکن موضوع نہیں ہے مَنِ اسْتَغْفِرَ وَ ھُوَ مُصِرٌّ عَلَی الذَّنْبِ کَانَ کَا لْمُسْتَھْزِیٔ بِرَبِّہٖ (جو شخص گناہوں سے توبہ کرے اس حالت میں گناہوں پر اصرار کرنے والا ہو کے گویا وہ اس شخص کی طرح ہے جو اپنے اللہ کے ساتھ دل لگی کر رہا ہو) اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ تم چلے چلو تم کو ساری آیتیں دیکھنے کی اور محقق بننے کی کیا ضرورت ہے تم اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌرَّحِیْمٌ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے) اور ھُوَاَھْلُ لتَّقْوٰی وَاَھْلُ الْمَغْفِرَۃِ (وہی اہل ہے اس بات کا اس سے ڈرنا چاہیئے اور وہی اہل ہیں بندوں کے گناہ بخشنے کے) کو دیکھو جن میں تمہارا علاج ہے۔

مریض کو اجمالی جواب کافی ہے

یہ تو اجمالی جواب ہے اور کام اسی سے چلے گا مریض کے لئے تفصیل مفید نہیں ہوتی اور دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت میں ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا (پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے) آخیر حالت ہے جس کے معنی ہیں ثُمَّ دَائِمُوْا عَلَی الْکُفْرِ (پھر کفر پر دوام کیا) اور جس کی اخیر حالت توبہ ہو گو ہزار معصیت و کفر کے بعد ہو وہ آیت میں داخل ہی نہیں۔ اور حدیث کا جواب یہ ہے کہ وہ وعید مصر کے لئے ہے واقعی جو شخص گناہ پر مصر ہو اس کا بحالت اصرار استغفار کرنا مثل استہزاء بالآیات کے ہے مگر پہلے یہ تو معلوم کرو کہ مصر کسے کہتے ہیں مُصِر وہ ہے جو گناہ پر نادم بھی نہ ہو اور تم تو نادم ہو بلکہ اس درجہ نادم ہو کہ غلبہ ندامت وحیاء تمہاری زبان کو استغفار سے پکڑے لیتی ہے اور حدیث میں ہے مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفِرَ وَ اِنْ عَارَفِي الْیَوْمِ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً (مشکوۃ المصابیح: ۲۳۴۰، الدر المنثور ۲:۷۸) (نہیں مصر وہ شخص جو استغفار کرے اگر چہ ٹوٹے دن میں ستر مرتبہ) اور دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے اَلنَّدَمُ تَوْبَۃٌ" (ندامت توبہ ہے) پس جو شخص گناہ کر کے نادم و پشیمان ہو وہ حدیث احیاء العلوم کا مصداق نہیں پھر ان کو ایک شعر یاد آتا ہے جو نہ معلوم کس کا ہے میرے نزدیک تو یہ شعر خلاف تحقیق ہے مگر جس شخص پر جو حالت و کیفیت غالب ہوتی ہے اس کو ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں جو اس کیفیت کو اور بڑھائے خواہ وہ حجت ہو یا نہ ہو بس اس کا وہ حال ہوتا ہے۔

بسکہ در جانِ فگار وچشم بیدا رم توئی ہر چہ پیدامی شوداز دور پندارم توئی
(میری جان فگاراور چشم بیدار میں تو ہی بسا ہوا ہے جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے تجھ ہی کو گمان کرتا ہوں)
اس کو آیتیں اور حدیثیں اور اشعار سب ایسے ہی یاد آتے ہیں جن سے پریشانی بڑھے وہ شعر یہ ہے ۔
سبحہ بر کف توبہ بر لب دل پُر از ذوقِ گناہ معصیت راخندہ می آید بر استغفار ما
(ہاتھ میں تسبیح لب پر توبہ دل ذوق گناہ سے لبریز ہے۔ ہماری معصیت کو بھی ہمارے استغفار پر ہنسی آتی ہے)۔

کثرتِ استغفار کی ضرورت

اس کا جواب یہ ہے کہ اشعار حجت نہیں ہیں۔ دوسرے تمہارا دل ذوق گناہ سے کہاں پُر ہے بلکہ ذوق حیاء و ندامت سے پُر ہے یہ تو ان دلائل کا جواب تھا جن سے ان لوگوں کو دھوکہ ہوا تھا اب ہم ان کے مقابل دوسری آیتیں اور احادیث واشعار سناتے ہیں آیت تو یہ ہے ۔ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (ایسے لوگوں پر جو ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے پیتے ہوں جب کہ وہ لوگ پرہیز رکھتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں اور خوب نیک عمل کرتے ہوں اللہ تعالیٰ ایسے نیک کاروں سے محبت رکھتے ہیں) اس کی ایک تفسیر آج ہی ذہن میں آئی ہے وہ یہ کہ جو لوگ نیک کام کرتے ہیں پھر ان سے گناہ ہو جاتا ہے پھر وہ تقویٰ اختیار کرتے ہیں پھر گناہ ہو جاتا ہے پھر تقویٰ وایمان کے مقتضا پر عمل شروع کرتے ہیں پھر ان کا انجام احسان پر ہوا کہ آخر نیک کام کرنے لگے تو وہ محبوب ہو جائیں گے اور دوسری آیت میں ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (آپ کہہ دیجئے اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے نا امید مت ہو بلاشک وہ تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا واقعی وہ بخشنے والا مہربان ہے) اس میں ان لوگوں کو مایوسی سے روکا گیا ہے جو اپنے گذشتہ معاصی پر نادم تھے۔ اور حدیث یہ ہے مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَاِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (مشکوۃ المصابیح: ۲۳۴۰، الدر المنثور ۲: ۷۸) (جو شخص استغفار کرتا ہوا گرچہ دن میں سو مرتبہ ٹوٹے مصر نہیں) تم عمر بھر میں

۷۰ دفعہ گناہ ہونے سے اور توبہ کے ٹوٹنے سے اپنے کو مصر سمجھنے لگے اور حدیث یہ بتلاتی ہے کہ اگر ایک دن میں بھی ستر بار توبہ ٹوٹے اور ہر دفعہ میں توبہ کرتا رہے تو وہ مصر نہیں اور شعر یہ ہے ۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ — گر کافر وگبر وبت پرستی باز آ

ایں در گہ مادر گہ نومیدی نیست — صدبار اگر توبہ شکستی باز آ

(لوٹ تو لوٹ تو جو کچھ بھی تو ہے لوٹ اگر کافر وآتش پرست اور بت پرست ہے تو بھی ہماری طرف لوٹ یہ ہمارا دربار نا امیدی کا دربار نہیں ہے اگر سو بار توبہ تو نے توڑی ہے تو بھی ہماری طرف رجوع کر)۔

تم ان آیات واحادیث وغیرہ کو پیش نظر کر کے استغفار کی کثرت میں لگو اس تقریر سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا جو بعض لوگوں کو اس حدیث قدسی پر پیدا ہوا ہوگا جو **هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ** (وہی اہل ہے اس بات کا کہ اس سے ڈرنا چاہئے اور وہی اہل ہے بندوں کے گناہ بخشنے کا) کی تفسیر اوپر بیان کی گئی ہے یعنی **اَنَا اَهْلُ اَنْ اُتَّقٰى وَمَنِ اتَّقٰى فَاَنَا اَهْلُ اَنْ اَغْفِرَ لَهٗ** (میں اہل ہوں اس بات کا کہ مجھ سے ڈرا جائے اور جو شخص ڈرے گا پس میں اہل ہوں اس بات کا کہ اس کے گناہ بخش دوں) شبہ کا حاصل یہ ہے کہ اس میں شان مغفرت کے ظہور کو تقویٰ پر مرتب کیا گیا ہے اور ہمارا تقویٰ تو شکست ہو گیا اب ہم ظہور شان مغفرت کے اہل کہاں رہے جواب کا حاصل یہ ہے کہ ایک تقویٰ شکست ہو گیا یعنی تقویٰ سابق تو دوسرا تقویٰ تو موجود ہے یعنی توبہ واستغفار تم اس کو اختیار کرو پھر اہل المغفرۃ کے محل بن جاؤ گے بس یوں ہی سلسلہ چلتا رہے گا کہ ایک تقویٰ شکست ہوا اور دوسرا موجود ہو گیا حدیث میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ قیامت تک ایک ہی تقویٰ چلا جائے تب مغفرت ہوگی۔

توبہ سے متعلق ایک ضروری بات

اب میں آخر میں ایک اور بات کہتا ہوں جس کے متعلق کبھی جی میں آتا ہے کہوں کبھی جی میں آتا ہے نہ کہوں مگر جب زبان پر آ ہی گئی تو کہے دیتا ہوں اللہ تعالیٰ سامعین کو غلط فہمی سے محفوظ رکھیں مگر اردو میں نہ کہوں گا بلکہ عربی میں کہوں گا تاکہ اہل علم سمجھیں عوام نہ سمجھیں وہ یہ کہ حدیث میں اہل معاصی کی نسبت آیا ہے **لَوْلَمْ تُذْنِبُوْا الذَّهَبَ اللّٰهُ بِكُمْ وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ يُذْنِبُوْنَ فَيَسْتَغْفِرُوْنَ وَيَغْفِرُ لَهُمْ** (صحیح لمسلم کتاب التوبۃ ب۲ رقم:۱۱، مسند احمد ۲:۳۰۹) (اگر تم گناہ نہ

کرتے تو اللہ تعالیٰ تمہاری بجائے اور ایسی قوم کو پیدا کرتے جو گناہ کرتے اور گناہوں سے استغفار کرتے اور اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو بخشتا) بھلا اہل طاعات کی نسبت بھی کہیں یہ آیا ہے کہ اگر وہ نہ رہیں تو ان کی جگہ دوسری مخلوق پیدا کی جائے گی ہاں یہ تو وارد ہے کہ اگر اہل طاعات علم میں بالکل نہ رہیں اور طاعات بالکل دنیا سے گم ہو جائے جیسا کہ آخر زمانہ میں ہوگا تو عالم کو فنا اور ہلاک کر دیا جائے گا مگر طاعت کے لئے دوسری مخلوق پیدا کئے جانے کا حدیث میں کہیں ذکر نہیں اور معصیت کے لئے دوسری مخلوق کا پیدا کیا جانا حدیث اول میں مصرح ہے اس سے معلوم ہوا کہ سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ عَلٰى غَضَبِيْ (مسند الحمیدی:۱۱۲۶) (میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی) کا اصل مظہر معصیت ہی ہے مگر وہی معصیت جس کے ساتھ استغفار وتوبہ بھی ہو بس اس سے زیادہ میں کھولنا نہیں چاہتا اور اتنا بھی اس شخص کے لئے کہہ دیا ہے جو حد مایوسی تک پہنچ گیا ہو کہ اس کے لئے مسکنات تو یہ کی ضرورت ہے اور ہم جیسے ہٹوں کٹوں کو جو ہر دم شرارت پر کمر بستہ ہیں اس سے کام لینا جائز نہیں۔ کریم کے دسترخوان پر ہر قسم کے کھانے ہوتے ہیں۔ حلوے بھی پلاؤ بھی سرکہ کی چٹنی بھی مگر ہر شخص کو ہر چیز کا کھانا جائز نہیں۔ زکام والے کو چٹنی کھانا ممنوع ہے ایسے ہی دسترخوان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر قسم کے اطعمہ ہیں مگر سب کے لئے ہر طعام نہیں ہے اور نہ ہر شخص چٹنی کا اہل ہے بس مہتمم دسترخوان سے پوچھو اور کھاؤ۔ اب میں ختم کرتا ہوں اللہ ہم سب کو فہم سلیم عطا فرمائیں۔ آمین۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ
وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ط

تَفصیل التوبة

یہ وعظ

متعلق تفصیلِ توبہ شب ۲۸ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ کو ریاست خیر پور وسندھ زبیر صاحب کے مکان پر دو گھنٹے کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد پچاس ساٹھ مَرد کے علاوہ مستورات بھی تھیں۔ مولانا سعید احمد صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ (دَائِمًا اَبَدًا کَمَا یُحِبُّ وَیَرۡضٰی ۱۲) اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ. ھُوَاَھۡلُ التَّقۡوٰی وَاَھۡلُ الۡمَغۡفِرَۃِ (القیمۃ: ۵۶)

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ تَوۡبَۃً نَّصُوۡحًا عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّکَفِّرَ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَیُدۡخِلَکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھَا الۡاَنۡھٰرُ (التحریم: ۸) (اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کے آگے سچی توبہ کرو امید ہے تمہارا رب تمہارے گناہ معاف کردیں گے)

حصولِ حظ وعظ کا مقصد نہیں

یہ ایک آیت ہے جس کی صبح بھی تلاوت کی گئی تھی اور بطور تمہید کے اس کے متعلق کچھ بیان کیا گیا تھا اس وقت یہ علم نہ تھا کہ دوسرا موقع اتنی جلدی بیان کرنے کا مل جائے گا اس لئے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کا تتمہ پھر کبھی بیان کردیا جائے گا۔ مگر یہ خدا کا فضل ہے کہ اس نے اتنی جلدی موقع دے دیا لیکن یہ ضرور ہے کہ چونکہ مجمع مستورات کا بھی ہے اور اس بیان کی اصلی مخاطب بھی وہی ہیں اس لئے رنگ بیان کا دوسرا ہوگا کیونکہ مستورات کے سمجھنے کے لائق دوسرے مضامین ہوتے ہیں بعضے تو مضامین ہی ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کو عورتیں نہیں سمجھ سکتیں اور بعض دفعہ مضمون تو سہل ہوتا ہے مگر اس کا عنوان علمی ہوتا ہے اس وقت چونکہ مخاطب عورتیں ہیں اس لئے مضامین ان کی ضرورت کے لائق اور اُن کے ساتھ مخصوص یا مشترک ہوں گے اور جو مشترک ہوں گے اُن کو ایسے طرز سے بیان کیا جائے گا جو کہ عورتوں کی سمجھ کے مناسب ہو لہٰذا اگر مردوں کو اس وقت کے بیان میں حظ نہ آئے تو تنگ دل نہ ہوں اس لئے کہ اول تو حظ مقصود نہیں دوسرے کبھی تو عورتوں کو

بھی سننا چاہئیے ۔صبح اس آیت کے متعلق صرف تمہید تھی مقصود باقی رہ گیا تھا مقصود اس آیت کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے ایمان والے بندوں کو توبہ کا حکم کرتا ہے۔

توبہ کی حقیقت

چنانچہ ترجمہ سے معلوم ہوگا فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ اسی کو توبہ کہتے ہیں کہ بندہ خدا کی طرف متوجہ ہو جائے یہی توبہ کی حقیقت ہے اور صرف لفظِ توبہ زبان سے کہہ لینا کافی نہیں کیونکہ صرف زبانی وہی توبہ ہے جس کو کہتے ہیں ۔

سبحہ برکف توبہ برلب دل پُر از ذوق گناہ　　　معصیت راخندہ می آید براستغفار مَا

(ہاتھ میں تسبیح ہو ہونٹوں (زبان) پر توبہ ہو اور دل اندر اندر گناہ کے مزے لے رہا ہو تو ایسی حالت میں خود گناہ کو بھی ہماری ایسی توبہ واستغفار پر ہنسی آجاتی ہے)

تو حقیقت توبہ کی یہ ہوئی کہ دل سے توجہ ہو تو فرماتے ہیں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا الخ (اے مسلمانو توبہ کرو) چونکہ توبہ کی حقیقت معلوم ہو چکی ہے اس لئے اب میں توبہ ہی کا لفظ کہوں گا کہ اے ایمان والے بندو توبہ کرو خدا کی طرف خالص توبہ یہ حاصل ہے اس جملہ کا بیان کرنا ہے آیت کے دوسرے اجزاء کا بیان اس وقت نہ ہوگا۔ اور اگر ہوا بھی تو صرف ترجمہ باقی تفصیل صرف جز اول ہی کی مقصود ہے اس آیت کا یہ مضمون کوئی نیا مضمون نہیں ہے بہت دفعہ کانوں میں پڑا ہوگا لیکن شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب یہ پرانا مضمون ہے تو اس کے اس وقت بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی ۔سو ضرورت یہ ہے کہ وعظ میں جو مضمون بیان کیا جاتا ہے اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور جب ایک مضمون پر متعدد مرتبہ سننے کے بعد بھی عمل نہ ہوا تو معلوم ہوا کہ ہنوز اس کے مکرر بیان کی ضرورت ہے تاکہ اس طرف التفات پیدا ہو بلکہ نامعلوم مضامین سے بھی ایسے مضمون کی ضرورت زیادہ ہوگی وجہ یہ کہ ۔

فَاِنْ كُنْتَ لَاتَدْرِی فَتِلْکَ مُصِیْبَةٌ　　　وَاِنْ كُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِیْبَةُ اَعْظَمُ

(اگر تو نہیں جانتا تو یہ جاننا کہ خود ایک بڑی بات ہے اور اگر تو جانتا ہے اور پھر عمل نہیں کرتا تب تو بہت بُری بات ہے)۔

جان بوجھ کر خلاف کرنا بہت بڑی مصیبت ہے اس کا علاج نہایت ضروری ہے حاصل یہ ہے کہ بار بار کان میں پڑ کر عمل نہ ہونا یہی وجہ ہے اس کے ضروری الغرض ہونے کی دوسری بات یہ ہے کہ بعض احکام تو خاص حالتوں کے متعلق ہوتے ہیں کہ جن کی ضرورت مخصوص اوقات میں واقع

ہوتی ہے اور بعض احکام ہر حالت کے متعلق ہوتے ہیں کہ ان کی ہر وقت حاجت ہوتی ہے سو جس شخص کو یعنی واعظ کو کسی موقع پر اکثر بیان کرنے کا موقع ملتا ہو اس کو تو چاہیے کہ بالترتیب خاص خاص حالتوں کے احکام بیان کرے اور جس کو گاہ گاہ موقع ملے جیسا اس وقت میرا آنا مسافرانہ ہو گیا ہے اس کو چاہیے کہ اہم مضامین کو بیان کرے۔

ہر وقت توبہ کی ضرورت

اور ظاہر ہے کہ اس مضمون سے زیادہ اہم کون سا مضمون ہوگا کہ جس کی ہر وقت ہم کو ضرورت ہو تو توبہ کا مضمون ایسا ہے کہ ہر حالت کو عام ہے اور ہر وقت ہم کو اس کی ضرورت ہے کیونکہ توبہ گناہ سے ہوا کرتی ہے اور گناہ ہم سے ہر وقت ہوتے ہیں اس پر شاید کسی کو تعجب ہو کہ ہر وقت تو ہم گناہ نہیں کرتے۔ پھر یہ کیونکر صحیح ہوا کہ کوئی وقت ہمارا گناہ سے خالی نہیں تو وجہ اس تعجب کی یہ ہے کہ لوگوں کو گناہ کی حقیقت معلوم نہیں صرف ٹوٹی پھوٹی فہرست گناہوں کی یاد کر رکھی ہے کہ چوری، قتل، زنا، جوا، وغیرہ جب گناہ کی حقیقت معلوم ہوگی تو معلوم ہوگا کہ کوئی وقت بھی ہمارا گناہ سے خالی نہیں اور جب ایسا ہے تو ہر وقت ہم کو توبہ کی ضرورت ہے۔

گناہ کا خلاصہ

گناہ کا خلاصہ ہے خدا کی نافرمانی کرنا تو اول یہ معلوم کرو کہ خدا نے کس کس بات کا ہم کو حکم کیا ہے پھر دیکھو کہ ہم ان میں سے کتنے حکموں پر عمل کرتے ہیں اور کتنے نواہی سے اجتناب نہیں کرتے اور یہ اس وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ شریعت کا علم سیکھا جائے کیونکہ یہ اس پر موقوف ہے، افسوس ہے کہ آج کل مسلمانوں نے بالخصوص عورتوں نے علم دین کی طرف سے بالکل توجہ ہٹالی ہے۔ عورتوں کو اول تو موقعہ نہیں ملتا کہ وہ علم دین سیکھیں نیز ان کی توجہ بھی نہیں اور عورتوں کے بارے میں بڑا الزام مردوں پر ہے کہ وہ ان سے صرف کھانے پکانے کا کام لیتے ہیں اور علم دین سکھانے کا ذرا اہتمام نہیں کرتے کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ عورتیں مردوں کی طرح باہر پھر کر نہیں سیکھ سکتیں اس لئے کہ ان کو پردے سے نکلنا جائز نہیں۔ اب اگر ان کی کوئی سبیل تعلیم کی ہو سکتی ہے تو اسی طرح کہ مرد کریں اور ان کی تعلیم کو خود ذمہ لیں آج کل کے عقلاء پردے کے مسئلے میں بھی بہت موشگافیاں کرتے ہیں۔

امّہات المومنین رضی اللہ عنہن کو پردہ کی تاکید

میں اس کے لئے مختصراً اتنا بیان کرتا ہوں کہ دیکھئے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج

مطہراتؓ تمام امت کی امہات ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ماں کے ساتھ بیٹیوں کو کسی قسم کے فتنہ کا احتمال ہو ہی نہیں سکتا لیکن باوجود اس کے دیکھ لیجئے پردے کے بارے میں ان کو کیا کیا حکم ہوئے ہیں پہلا حکم یہ ہے کہ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى (اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے موافق مت پھرو) کہ گھر میں بیٹھو تو جب ان کو بصیغۂ امر ارشاد ہوا ہے کہ گھر میں رہو اور باہر نہ نکلو تو اور بیبیوں کو کیسے حکم نہ ہوگا۔ بعض لوگ شبہ کرتے ہیں کہ اس کا خطاب خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو ہے تمام امت کی عورتوں کو نہیں لیکن ان معترضین پر افسوس ہے کہ انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ جب ازواج مطہراتؓ کو یہ حکم ہے تو دوسری عورتوں کے لئے تو علی السبیل الاولویت (پہلے طریق پر) ثابت ہوگا بدلالۃ النص (نص کی دال (بمعنی دلیل) اور یہ اس وقت ہے کہ جب قرآن شریف میں اسی پر اکتفا ہوتا حالانکہ دوسری آیات بھی موجود ہیں فرماتے ہیں وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِ هِنَّ الخ کہ مومنات کو حکم فرما دیجئے کہ اپنی نگاہیں پست رکھیں اور اپنی زیب و زینت ظاہر نہ کریں الخ۔

جملہ مؤمنات کو پردہ کی تاکید

دوسری جگہ ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں اپنی بیبیوں سے بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہ ڈالیں اپنے اوپر اپنی چادریں) دیکھئے اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سب عورتوں کے لئے برابر حکم ہے تو جب پردہ ضروری ہے۔

مردوں کو مستورات کو احکام دین سکھلانے کا حکم

تو ظاہر ہے کہ عورتوں کو ایسا موقعہ نہیں مل سکتا کہ وہ باہر پھر کر علم دین سیکھیں اس لئے مردوں پر واجب ہے کہ ان کو دین کے احکام بتلائیں۔ حدیث میں ہے کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ (صحیح بخاری ۲:۶، سنن الترمذی: ۱۷۰۵) یعنی تم سب ذمہ دار ہو اور تم سے قیامت میں تمہاری ذمہ داری کی چیزوں سے سوال ہوگا قرآن شریف میں ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا (اے مسلمانو! بچاؤ خود اپنی جانوں اور اپنی اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے) تو گھر والوں کو بچانے کے معنی یہی ہیں کہ ان کو تنبیہ کرو بتلاؤ بعض لوگ بتلا تو دیتے ہیں مگر پھر ڈھیل چھوڑ دیتے ہیں کہتے ہیں کہ دس (۱۰) دفعہ تو کہہ دیا نہ مانیں تو ہم کیا کریں۔ صاحبو! یہ سب قلت تدبر (کم

سوچ و بچار) کی وجہ سے ہے میں نمونہ کے طور پر ایک مثال بیان کرتا ہوں کہ اگر کسی دن کھانے میں نمک تیز ہو گیا ہو اور اس قدر تیز ہوا ہو کہ اس کی اصلاح ہی ممکن نہ ہو اور آپ بہت کچھ سخت وست کہہ لیں لیکن باوجود آپ کے برا بھلا کہنے کے اگلے دن بھی وہی حالت ہو حتی کہ پندرہ روز تک برابر کھانے میں نمک تیز رہے تو اس وقت آپ معاملہ کریں گے آیا یہی جو کہ احکام دین میں کیا یا کچھ اور ظاہر ہے کہ یہ برتاؤ نہ کیا جائے گا بلکہ کم از کم اتنا ضرور کیا جائے گا کہ اس کا پکایا ہوا کھانا نہ کھایا جائے گا کیا کوئی صاحب بتلا سکتے ہیں کہ انہوں نے ایسے موقع پر نہایت نرمی سے کہا ہو کہ بی صاحبہ کھانے میں نمک تیز نہ کیا کیجئے اور اگر اس پر نہ مانا ہو تو یہ کہہ کر خاموش ہو رہے ہوں کہ ہم نے تو دس دفعہ کہہ دیا نہ مانے تو ہم کیا کریں۔ تو صاحبو! جب اپنے معاملات میں اس قدر سختی برتی جاتی ہے تو کیا وجہ کہ دین کے معاملے میں یہ سختی نہیں۔ معلوم ہوا کہ دین کا اس قدر اہتمام خود تمہارے قلب میں نہیں ہے اگر نماز روزے کے بارے میں بھی اسی تشدد سے کہا جاتا جس تشدد سے نمک تیز ہو جانے پر کام لیا گیا تھا تو ممکن نہ تھا کہ اثر نہ ہو ضرور اثر ہوتا۔

عورتوں کو صوم وصلوٰۃ کا پابند کرنے کی آسان تدبیر

اور میں ایک آسان تدبیر اس کی بتلاتا ہوں کہ اس پر عمل کرنے سے ضرور دین کی پابندی ہو جائے گی وہ یہ ہے کہ جس روز نماز وغیرہ میں عورتوں کی ذرا سستی دیکھو اس روز ان کے ہاتھ کا کھانا نہ کھاؤ یہ ایسی سخت سزا ہے کہ اس کے بعد بہت جلد اصلاح ہو جائے گی کیونکہ جس روز تم ان کے ہاتھ کا کھانا نہ کھاؤ گے اس روز یقیناً ان کا بھی فاقہ ہو گا بس جب دو چار روز ایسا ہو گا خود سنبھل جائے گی۔ تو طریقہ یہ ہے۔ صاحبو کام تو کرنے ہی سے ہوتا ہے۔ نرے الفاظ سے نہیں ہوتا تو زیادہ تر الزام مردوں پر ہے بہر حال چونکہ اسباب عورتوں کی تعلیم کے کم ہیں اس لئے مناسب ہے کہ جب عورتوں کو کچھ سنائے تو انہیں کی ضرورت کا زیادہ لحاظ رکھے، مردوں کی رعایت نہ کرے اس لئے اس وقت کا بیان بالکل سادہ ہو گا اگرچہ ان میں سہل الفاظ سوچنے میں مجھے گو نہ وقت ضرور ہے اور چونکہ اس وقت عورتوں کی طبائع کے انداز پر بیان ہو گا اس لئے جو مضامین صرف مردوں سے متعلق ہیں وہ چھوڑ دیئے جائیں گے اور یہ اس لئے بیان کر دیا کہ آگے یہ شبہ نہ ہو کہ فلاں جز بیان سے رہ گیا ہے دوسرے اس لئے بھی اس وقت خاص عورتوں کے مضامین بیان کئے جائیں کہ مردوں کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ ہم جب عورتوں کو نصیحت کیا کریں تو کیا نصیحت کیا کریں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس مقام پر توبہ کا حکم ہے اور توبہ گناہ سے ہوتی ہے اور گناہ کا علم دین کے

جاننے سے ہوتا ہے کہ اس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ گناہ کس قدر ہیں اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ شاید ہی کوئی وقت ایسا گزرتا ہو کہ ہم سے گناہ نہ ہوتے ہوں مثلاً دل ہی ہے کہ اس کے گناہوں کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا حالانکہ اس کے بہت سے گناہ ہیں۔ مثلاً کسی شخص کو بہ نظرِ حقارت دیکھا یہ بھی گناہ ہے جس کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا۔

حکایت حضرت جنیدؒ

حضرت جنیدؒ کی حکایت ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو سوال کرتے دیکھا جو کہ صحیح وتندرست تھا آپ نے دل میں فرمایا کہ یہ شخص صحیح سالم ہے اور پھر سوال کرتا ہے۔ رات کو اپنے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص آپ کے پاس مُردار لایا اور کہا کہ اس کو کھایئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو مُردہ ہے کیونکر کھاؤں اس شخص نے جواب دیا کہ آج صبح تم نے اپنے ایک بھائی کا گوشت کھایا ہے تو اس کے کھانے میں کیوں تامل ہے انہوں نے کہا کہ میں نے تو غیبت نہیں کی۔ اس نے جواب دیا کہ گو زبان سے غیبت نہیں کی لیکن دل میں اس کو حقیر تو سمجھا اور دل ہی سے تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ آخر جنید رحمۃ اللہ علیہ بہت گھبرائے اور اس فقیر کے پاس پہنچے وہ کوئی کامل شخص تھا ان کو دیکھتے ہی کہا وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے)۔

جوارح کے گناہ

سوان گناہوں کی طرف کبھی ہمارا ذہن بھی نہیں جاتا کہ یہ بھی گناہ ہیں اسی طرح بعض جوارح کے ایسے گناہ ہیں کہ ان کو گناہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ نہایت بے تکلف کیا جاتا ہے جیسے زبان کے اکثر گناہ اسی طرح اپنے کو بڑا سمجھنا اس کو بھی ہم لوگ گناہ نہیں سمجھتے بلکہ خود بینی اور خودداری کو عزت سمجھتے ہیں اور ضروری جانتے ہیں۔

گناہ کی علامت

صاحبو! گناہ کی علامت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہو دیکھ لیجئے کہ ان گناہوں پر کیا کیا وعیدیں ہیں غیبت پر کیا وعید ہے تکبر پر کیا وعید ہے اسی طرح بلاتحقیق کسی واقعہ پر حکم کر دینا اس پر کیا وعید ہے۔ تو جب لوگ علم دین حاصل کریں گے اس طرح کہ مرد تو پڑھیں اور عورتیں یا تو پڑھ لیں یا اگر اس کا موقعہ نہ ملے تو اہل علم کے چھوٹے چھوٹے رسائل سن کر یاد کر لیں اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ گناہ کیا کیا ہیں چنانچہ شادی اور غمی میں اس قدر رسوم خلاف شریعت

ہوتی ہیں جن کو کچھ حد نہیں۔ اکثر لوگ شادی میں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ناچ نہ کرایا اور گانا نہ ہوا تو بس کوئی رسم ہم نے نہیں کی شرعی نکاح ہو گیا حالانکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی رسمیں ایسی ہیں کہ وہ بدعت بلکہ بعض شرک ہیں اگرچہ اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ایسی رسموں میں سے اکثر چھوٹ گئی ہیں جیسے دولہا کو اُلّو کا گوشت کھلانا یا دامن میں ہلدی باندھنا میانہ سے اُتر کر چار پائی پر نہ بیٹھنا وغیرہ وغیرہ کہ اس قسم کی رسمیں اکثر ترک ہو گئی ہیں۔

شادی میں فخر و مباہات کی رسومات کی کثرت

لیکن ان کے چھوٹنے کے ساتھ ہی وہ رسمیں کہ جن میں فخر اور مباہات (شیخی - ناز) ہے اور زیادہ ہو گئی ہیں کیونکہ بہ نسبت سابق کے اس وقت تمول (دولتمندی) زیادہ ہوتا چلا جا رہا ہے پہلے لوگوں میں اس قدر تمول کہاں تھا ایسا ساز و ساماں کہاں تھا یہ رنگ برنگ کے کپڑا کوئی جانتا بھی نہ تھا چنانچہ اب بھی جو لوگ پرانی وضع کے باقی ہیں ان کی زندگی بالکل سیدھی سادھی ہے۔ اور آج کل کے نئے رنگینیوں کی تو یہ حالت ہے کہ ایک مقام پر پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ شادی میں ڈیڑھ ہزار کا صرف کپڑا دیا گیا شاید اس کی تو ساری عمر میں بھی اس کپڑے کا نصف بھی اس کو پہننا نصیب نہ ہو کیونکہ اول تو اتنا کپڑا ، دوسرے عورتوں کا پہننا کہ ایک ایک کپڑے کو دس دس برس تک احتیاط سے رکھ کر پہنتی ہیں کیونکہ ان کی حالت یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو ایسی حالت میں رہیں گی کہ صورت دیکھ کر بھی نفرت پیدا ہو اور دوسری جگہ جائیں گی تو بن سنور کر خدا جانے دوسری جگہ کسی کو دکھلانا منظور ہوتا ہے اور پھر اس کپڑے سے اس قدر مشغولی ان کے قلب کو ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ آج دھوپ دکھلائی جا رہی ہے اور کل صاف کیا جا رہا ہے کپڑا جو کہ خادم تھا ان کا مخدوم ہو گیا تعجب ہے کہ ان کا جی نہیں گھبرایا لیکن جب دوسرا کوئی کام نہیں تو آخر یہ بچاری دن کس طرح کاٹیں ، اسی طرح شادی میں فضولیات ہوتے ہیں مثلاً کھانا کھلانا ہے کہ ساری برادری کو نوتا جاتا ہے مشورہ کرنا ہے کہ ایک ایک سے رائے لی جاتی ہے۔ ایک صاحب نے اپنی لڑکی کا نکاح کرنا چاہا اور یہ رائے ہوئی کہ اس خوشی میں ایک ہزار روپیہ کسی اسلامی مدرسے میں دے دیں۔ ان بیچاروں سے خطا یہ ہوئی کہ برادری کو جمع کر کے رائے لے لی تمام برادری نے ان کو دِق کر دیا اور کہا کہ ہمارا جو کچھ آپ نے کھایا ہے وہ واپس کیجئے آخر مجبور ہو کر بیچاروں کو ساری رسمیں کرنا پڑیں ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ اس رقم کے برباد کرنے سے آپ کا کیا نفع ہوا۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ صاحب اس میں کیا گناہ ہے کہ برادری کو کھلا دیا پلا دیا۔

شادی کے موقع پر مقصود تفاخر ہوتا ہے

صاحبو! یہ عنوان تو بہت پیارا ہے مگر ذرا اس کی حقیقت کو تو دیکھو یہ ایسا ہی عنوان ہے جیسا کہ ایک چور نے کہا تھا کہ ہم تو جو کچھ کھاتے ہیں حلال کر کے کھاتے ہیں دیکھئے رات کو نیند برباد کرتے ہیں محنت کرتے ہیں جب کہیں ہم کو کھانے کو نصیب ہوتا ہے۔ تو جیسا اس چور نے ایک نیا عنوان نکال کر چوری کو حلال کیا تھا ایسی ہی ہماری حالت ہے کہ ایسا عنوان اختیار کرتے ہیں کہ گناہ بظاہر نظر میں گناہ ہی نہ معلوم ہو کہ برادری کو کھلا دیا ادائے حق کیا لڑکی کو دیا صلہ رحمی کی تو اس میں کیا حرج ہے میں کہتا ہوں کہ اگر لڑکی کے ساتھ صرف صلہ رحمی کرنی ہے تو کیا وجہ کہ برادری کو جمع کر کے ان کو دکھلا کر صلہ رحمی کی جاتی ہے اور اگر صلہ رحمی کے لئے برادری کو جمع کرنا ضروری ہے تو کیا وجہ کہ پندرہ سولہ برس تک جو صلہ رحمی لڑکی کے ساتھ کی گئی ہے اس میں برادری کو جمع کیوں نہیں کیا گیا کہ صاحبو دیکھ رکھو میں آج لڑکی کے واسطے کپڑا لایا ہوں آج اس کے لئے حلوا تیار کرایا ہے معلوم ہوا کہ شادی کے موقعہ پر مقصود تفاخر ہوتا ہے نہ کہ صلہ رحمی دوسری علامت تفاخر مقصود ہونے کی یہ ہے کہ سامان دینے کے بعد اس طرف کان جھکتے ہیں کہ دیکھیں لوگ ہماری نسبت کیا کہہ رہے ہیں اگر کسی نے کہہ دیا کہ مواقع حوصلے سے زیادہ کام کیا تو سمجھا جاتا ہے کہ بہت بڑی تعریف کی۔

حوصلہ سے زیادہ کام کرنا حماقت ہے

حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا معنیٰ یہ ہیں کہ اس نے بہت بڑی حماقت کی کہ اپنی وسعت سے زیادہ خرچ کر دیا لیکن یہ تعریف کم نصیب ہوتی ہے اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ اس کی یہ نیت بھی پوری نہیں ہوتی بلکہ جتنا بھی یہ زیادہ خرچ کرتا ہے برادری زیادہ عیب نکالتی ہے اور ہمدردی بھی اگر کی جاتی ہے تو دل میں اس کے بگاڑنے کی فکر کی جاتی ہے، ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے بگہرہ وہاں ایک نو دولت تھے انہوں نے اپنے لڑکے کی شادی کی برادری کے لوگوں نے باہم مشورہ کیا کہ یہ موقع بہت اچھا ہے یہ شخص بہت بڑھ گیا ہے اس کو اپنے جیسا بنانا چاہیئے چنانچہ دو چار آدمیوں نے متفق ہو کر ان کو یہ رائے دی کہ اس شادی میں طائفہ کو ضرور بلانا چاہیئے اور کہا کہ میاں کیا روز روز یہ موقع آتا ہے چنانچہ طائفہ کو بلایا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ کما کر جمع کیا تھا سب کھو کر بیٹھ رہے برادری نے جب دیکھا کہ یہ بھی ہماری طرح کنگال ہو گیا تو بہت خوش ہوئے واقعی لوگوں کی وہ حالت ہے کہ کسی کو اچھی حالت میں دیکھ نہیں سکتے کسی کبڑی سے پوچھا تھا کہ تیری

کیا تمنا ہے اس نے کہا کہ میری تمنا یہ ہے کہ یہ سب لوگ کبڑے ہو جائیں تا کہ میں بھی ان کو ہنسوں اور اگر اتفاق سے کسی نے ایسا سامان کر بھی لیا کہ اس میں کوئی عیب نہ نکل سکا تو کہتے ہیں کہ میاں اگر کیا تو کیا بڑی بات ہوئی جن کے پاس ہوا کرتا ہے کیا ہی کرتے ہیں بتلایئے کہ جب برادری بھی خوش نہ ہوئی۔ کہ یہ کھلا دینا پلا دینا ہے کیا یہ اسراف اور تفاخر نہیں ہے اور کیا تفاخر گناہ نہیں قرآن شریف سے ثابت حدیث شریف سے ثابت دیکھئے حدیث میں ہے مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةً اَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ الذُّلِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (مسند احمد ۲:۹۲، کنز العمال: ۴۱۱۷۰) (جس کسی نے شہرت کا لباس پہنا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو ذلت کا لباس پہنائیں گے) غور کیجئے کہ کپڑے میں خرچ ہی کیا ہوتا ہے جب اس میں یہ وعید ہے تو دوسرے فضولیات جن میں زیادہ خرچ ہوتا ہے کیا ان میں یہ وعید نہ ہوگی۔ اسی طرح کے اور بہت گناہ ہیں جو سرسری سمجھتے جاتے ہیں غرض گناہوں کی اس قدر کثرت ہے کہ اگر ان کی فہرست پیش نظر رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم ہر وقت گناہ میں مبتلا ہیں تو ہم کو توبہ کی بھی ہر وقت ضرورت ہے۔ اور توبہ کرنا ہر وقت ہم پر واجب ہے لہٰذا اس کا بیان کرنا بھی ضروری ہوا لیکن چونکہ نرے وجوب کا بیان کر دینا کافی نہیں ہوا کرتا اس لئے کہ اکثر موانع قوی ہوتے ہیں کہ ان کے ارتفاع (بلندی کا سبب) کا ذریعہ نہ بتلانے سے طبیعت پر گرانی اور مایوسی ہوتی ہے اس لئے موانع (روکنے وای چیزیں) کا بتلانا اور ان کے ارتفاع کی تدابیر بتلانا بھی ضرور ہوا کہ کن کن چیزوں سے توبہ کرنی چاہیئے۔

چند کثیر الوقوع گناہ

تو نہ محض اجمالی کافی ہے اور نہ زیادہ تفصیل کا وقت ہے اس لئے بیان مواقع کے ساتھ چند کثیر الوقوع (بہت زیادہ کئے جانے والا) گناہ بھی بتلاتا ہوں کہ ان سے اجتناب (بچنا) کیا جائے اور چونکہ وہ کثیر الوقوع ہی جب ان سے اجتناب ہوگا تو انشاء اللہ سب گناہوں سے اجتناب ہو جائے گا۔ دوسرے یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان کسی ایک گناہ کو چھوڑتا ہے تو سب گناہ اس سے چھوٹ جاتے ہیں یعنی ایک گناہ کا ترک دوسرے کے ترک میں معین ہوتا ہے تو گویا اب دو باتیں بیان کرنی رہ گئیں۔ ایک تو مختصر سی فہرست گناہوں کی۔ دوسرے توبہ کرنے کے موانع اور ان کے ارتفاع کے ذرائع سو سمجھنا چاہئے کہ جب توبہ کا وجوب قرآن شریف سے ثابت حدیث شریف سے ثابت تو اس کی طرف سے بھی توجہ ہونے کے اسباب کا ارتفاع واجب ہوگا۔ اسباب یہ ہیں جن کو میں مع ان کے علاج کے بیان کرتا ہوں اور یہ موانع ؛ ستقراری (قیام پکڑنے والے) ہیں ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی موانع ہوں۔

گناہوں کی تفصیلات کا علم ضروری ہے

پہلا سبب تو یہ ہے کہ ہم کو گناہوں کی تفصیل معلوم نہیں تو جب گناہ ہی کا علم نہ ہوگا اور توبہ گناہ ہی سے ہوتی ہے تو توبہ کیونکر ہوگی افسوس ہے ہم لوگوں کو علم سے اس قدر اجنبیت ہوگئی ہے کہ اگر کوئی عالم ہمارے سامنے ہمارے افعال کا گناہ ہونا بیان کرتا ہے تو سن کر تعجب ہوتا ہے علم سے اجنبیت کے متعلق ایک حکایت یاد آگئی ایک معتبر راوی سے معلوم ہوا کہ ایک بڑے انگریزی کے فاضل کو سفر میں پانی نہ ملا تو نماز کے وقت آپ نے تمیم کیا اور مٹی لے کر اس سے کلی بھی کی خدا جانے کیا کیا ہوگا منہ میں مٹی لے کر اس کو تھوکا ہوگا یا اور کوئی صورت نکالی ہوگی ملاحظہ کیجئے کہ ناواقفی کس حد تک پہنچ گئی۔ عورتوں کی یہ حالت ہے کہ اگر دس بیس عورتوں کو جمع کر کے ان کی نمازیں سنی جائیں تو شاید ایک کی بھی نماز صحیح نہ نکلے اور اگر ان سے کہا جاتا ہے کہ مردوں سے سیکھ کر نماز صحیح کر لو تو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہم کو تو شرم آتی ہے انہیں شرم والیوں سے اگر ان کا شوہر یہ کہے کہ میں تم کو ایک ہزار کا زیور بنادوں گا بشرطیکہ تم نماز صحیح کر لو تو دیکھیں اس وقت ان کی شرم کہاں جاتی ہے خاص کر اگر کسی بوڑھی عورت سے کہا جاتا ہے تو وہ تو ذرا بھی متوجہ نہیں ہوتی اور کہتی ہے کہ اب بوڑھے طوطے کیا پڑھیں گے لیکن اگر انہیں بوڑھے طوطوں کو کوئی دنیا کا لالچ ہو تو دیکھئے کیسی زبان کھلتی ہے۔ افسوس ہے کہ عورتوں کو تو ثواب عذاب کا مردوں سے زیادہ خیال ہوتا ہے کہ وہ عذاب سے ڈرتی ہیں اور ثواب کی طرف راغب ہوتی ہیں پھر بھی وہ کیوں متوجہ نہیں ہوتیں ہاں اگر کسی نے تصحیح قرآن شریف میں محنت و مشقت کی اور پھر بھی حروف درست نہ ہوئے تو وہ معذور ہے پھر اس سے جس طرح بھی ادا ہو سکے جائز ہے لیکن محنت کئے بغیر معاف نہیں ہوگا۔ غرض کوشش کرنی چاہیئے کہ نماز صحیح ہو جائے اسی طرح نماز تنگ وقت میں پڑھنا بھی عام عادت ہوگئی ہے۔ خاص کر اکثر عورتیں کام کاج میں اس قدر دیر کر دیتی ہیں کہ مکروہ وقت میں نماز پڑھتی ہیں لیکن اس کو ذرا بھی برا نہیں سمجھا جاتا۔

علیٰ ہذا جلدی جلدی نماز پڑھنا کہ گویا ایک بے گار ہے جس طرح بنے اس سے جان چھڑاؤ اس میں بعض اوقات ایسی صورتیں پیش آجاتی ہیں کہ نماز بالکل ہی نہیں ہوتی کہ پڑھی بھی اور ثواب بھی نہ ملا بلکہ الٹا گناہ ہوا عورتوں سے تعجب ہے کہ وہ ان باتوں کی طرف ذرا خیال اور توجہ نہیں کرتیں اسی طرح بہت سے ایسے امور ہیں کہ ان کے گناہ ہونے کی خبر بھی نہیں سو اس کا علاج یہی ہے کہ علم دین پوری طرح حاصل کیا جائے۔

بہشتی زیور کا صرف دیکھ لینا کافی نہیں

اور کچھ بھی نہ ہو تو کم از کم بہشتی زیور کے دسوں حصے ہی پڑھ لیں اور سہل طریقہ اس کا یہ ہے

کہ مرد علماء سے پڑھیں پھر جو کچھ پڑھا ہے عورتوں کو پڑھاویں اور یہ نہ سمجھیں کہ صرف دیکھ لینا کافی ہوگا عورتیں تو بھولی بھالی ہوتی ہیں اکثر مقامات کو مرد بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے اور علم دین ہی کے ساتھ خاص نہیں ہر فن ہر علم کی یہی کیفیت ہے مثلاً دیکھئے کسی شخص نے آج تک ایسی جرأت نہیں کی کہ طب کی کتابیں دیکھ کر اپنا یا اپنی بیوی بچوں کا علاج کر لیا ہو اور مُنضج (مادہ پکانے والا) اور مسہل کے نسخے تجویز کر لئے ہوں بلکہ ہر مرض میں یہی کہتے ہیں کہ کسی طبیب سے رجوع کرو پس جب دوسرے علوم میں صرف مطالعہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا اور اپنے کو صاحب فن کا محتاج سمجھا جاتا ہے تو علوم دینیہ میں اپنے دیکھ لینے کو کافی کیوں سمجھا جاتا ہے۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی ایک شخص مدت سے مجھ سے خط وکتابت رکھتے تھے لیکن جب ان کا خط آتا تھا کسی نہ کسی دنیاوی ہی غرض کے لئے آتا تھا میں نے ان کو لکھا کہ تم جب لکھتے ہو دنیا ہی کی باتیں لکھتے ہو کیا تم کو دین کی باتوں میں کبھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تو وہ جواب میں لکھتے ہیں کہ میرے پاس بہشتی زیور موجود ہے مجھ کو جو دین کی ضرورت پیش آتی ہے اس میں دیکھ لیتا ہوں گویا ان کے نزدیک سارا دین بہشتی زیور ہی کے اندر آ گیا ہے یا ان کو بجز ان مسائل کے جو اس میں ہیں اور کسی مسئلے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس میں شک نہیں کہ بہشتی زیور میں ایک کافی تعداد مسائل کی موجود ہے لیکن اول تو اس میں زیادہ تر وہ مسائل ہیں جو عورتوں کے ساتھ خاص ہیں یا مشترک ہیں عورتوں اور مردوں میں اور قطع نظر اس سے اس میں مسائل اس قدر نہیں کہ ان کے بعد ضرورت دریافت کی ہی نہ ہو نیز یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کے سارے مسائل مطالعے سے حل ہی ہو جائیں اور کسی مسئلے میں شبہ ہی پیدا نہ ہو غرض اس کی ہے کہ اول اس کو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھا جائے اس کے بعد عورتوں کو پڑھایا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اول خود کتابیں دیکھیں اور جس مقام پر شبہ ہو وہاں نشان بنادیں اور جب کبھی علماء سے ملاقات ہو اس کو حل کر لیں۔ یا کسی عالم کے پاس لکھ بھیجیں کہ وہ اس کا مطلب لکھ کر بھیج دیں اگر ایک مدت تک اس التزام سے مطالعہ کیا جائے تو اللہ کی ذات سے امید ہے کہ بہت کم غلطی ہوگی۔ دوسرے ایک دفعہ دیکھنے پر اکتفا نہ کریں بلکہ دینیات کی کتابیں روزانہ مطالعہ میں رکھیں جیسے کھانا پینا روزانہ ہوتا ہے۔

غذائے روح کی روزانہ ضرورت

صاحبو! جب قالب (جسم) کا تغذیہ (غذا دینا) روزانہ ہوتا ہے تو کیا روح کے تغذیہ کی روزانہ ضرورت نہیں ہے بے شک ضرورت ہے اور میں تجربہ کی بات بتلاتا ہوں کہ ایک دفعہ کا دیکھا

ہوا بہت کم یاد رہتا ہے بلکہ اکثر ذہن سے نکل جاتا ہے پس اگر کسی نے ایک دفعہ دیکھ کر کتاب کو اٹھا کر طاق میں رکھ دیا تو اس کو دیکھنے سے کیا نفع ہوا۔ غرض خورد نوش کی طرح روزانہ اس کا بھی دور رکھو اگرچہ قلیل ہی مقدار میں ہو جب دیکھتے دیکھتے کتاب ختم ہو جائے پھر دوبارہ ابتداء سے دیکھنا شروع کر دو اسی طرح سلسلہ جاری رکھے پس اس طرح کتاب بالکل حفظ ہو جائے گی لیکن پھر بھی بعض صورتیں تم کو ایسی پیش آئیں گی کہ ان کا حکم اس کتاب میں نہ ملے گا ایسی صورتوں کو کسی سے دریافت کرلو اور ساری عمر اسی شغل میں رہو۔

زائد وقت دین کے کاموں میں خرچ کرے

میں یہ نہیں کہتا کہ اپنی دنیا کا حرج کرو بلکہ تم کو دنیا کے کاموں سے جو وقت بچے اس وقت میں کچھ دین کا کام بھی کرلو اب یہ تم خود دیکھ لو کہ دنیا کے کاموں میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے اور فضول گپ شپ میں غیبت شکایت میں کتنا وقت جاتا ہے بس اس کے وقت میں سے کچھ تھوڑا سا دین کے کام میں بھی صرف کرو اگرچہ مناسب تو یہ ہے کہ یہ زائد وقت سارا دین ہی کے کام میں صرف ہوتا اور زائد وقت کو میں نے دین کے لئے۔

اللہ کے نام پر بیکار شئے خیرات کرنے کی مذمّت

اس واسطے تجویز کیا کہ آج کل اکثر لوگ خدا کے لئے وہی چیز تجویز کرتے ہیں جو اپنے سے بیکار ہو جائے مثلاً کپڑا جب تک سالم رہے تو اپنے لئے اور جب بالکل بے کار ہو جائے کہ پیوند بھی اس میں نہ لگ سکے اس وقت وہ خدا کے لئے دیا جاتا ہے مجھے اس کے مناسب ایک حکایت یاد آئی۔ ایک بزرگ کہتے تھے کہ ایک عورت نے کھیر پکائی اور اس کو ایک رکابی میں لگایا اتفاق سے اس میں کتے نے منہ ڈال دیا اور کچھ اس سے کھا بھی گیا اس عورت نے اپنے لڑکے سے کہا کہ جا اس کو مؤذن کو دے آ چنانچہ وہ لے گیا اس بیچارے غریب کو خدا جانے کتنے وقت کے بعد کھانے کو ملا تھا۔ مشہور ہے کہ یہ لوگ حریص ہوتے ہیں، صاحبو! کیوں نہ ہوں ان بچاروں کا رزق تو آپ کے ذریعے سے ہے اور آپ ان کو غمی کے سوا کسی وقت پوچھتے ہی نہیں اگر ہمیشہ ان کا خیال رکھو تو کیوں وہ حریص ہوں۔ واقعی ان لوگوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ دعائیں کرتے ہیں کہ کوئی مرے تو ہماری پوچھ ہو ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے، وہاں ایک شخص کا انتقال ہوا اس کے ورثاء نے کفن کا چادرہ ایک غریب آدمی کو دے دیا تو وہاں کا تکیہ دار کہتا ہے کہ صاحب یہ تو ہمارا حق

ہے یہ آپ نے دوسرے کو کیوں دے دیا انہوں نے کہا کہ بھائی تم کو تو ہمیشہ ملتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ واہ صاحب خدا خدا کر کے تو یہ دن آتا ہے اس میں بھی آپ نے ہمارا حق دوسرے کو دے دیا۔ غرض اس مؤذن نے کھانا شروع کر دیا اور اُدھر ہی سے ہاتھ مارا جدھر سے کتے کا کھایا ہوا تھا لڑکے نے کہا ملا جی اِدھر سے مت کھاؤ کتے کا کھایا ہوا ہے یہ سن کر اس ملا نے رکابی کو اٹھا کر پھینک دیا کہ وہ ٹوٹ گئی رکابی کے ٹوٹنے سے لڑکے نے رونا شروع کیا اس نے کہا کہ کم بخت ایک تو مجھے کتے کی جھوٹی کھیر کھلا دی۔ پھر روتا ہے کہنے لگا اس لئے روتا ہوں کہ یہ رکابی میرے بھائی کے پیخانہ (پاخانہ) اٹھانے کی تھی تو نے وہ توڑ ڈالی مجھے ڈر ہے کہ میری والدہ مجھے مارنے نہ لگیں۔ یہ حکایت صحیح ہو یا غلط لیکن ان لوگوں کے ساتھ ہمارا جو برتاؤ ہے وہ اس سے کچھ کم نہیں تو جیسے ہم لوگ ہر چیز بے کار خدا کے لئے تجویز کرتے ہیں اسی طرح وقت بھی تھوڑا سا نکمّے ہی وقت میں سے نکال کر خدا کے کام میں صرف کر لینا چاہیئے اور صاحبو! یہ نہ سمجھو کہ اس طرح ہم فاضل تو بن ہی نہ سکیں گے پھر کیا فائدہ دیکھو مَالَایُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ (جو اچھی چیز پوری نہ حاصل کی جا سکے اس کو بالکل چھوڑا بھی نہ جائے) اگرچہ تم پورے عالم نہ ہو جاؤ گے لیکن جو کچھ علم ہو جائے گا وہ کیا کم ہے بڑا فائدہ اس میں یہ ہے کہ جب چار باتیں تم کو معلوم ہوں گی۔ ان کی بنا پر اپنے ماتحتوں کو تم روکتے ٹوکتے رہو گے اس روکنے سے بہت بڑا فائدہ ہوتا ہے جب انسان ایک بات کو دس دفعہ سنے گا تو ضرور ہے کہ اس پر اثر ہوگا۔ دوسرے جب بڑے آدمی کو کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو اس سے بہت سے لوگوں کو نفع ہوتا ہے کیونکہ وہ جس طرح چھوٹوں کو کہہ سکتا ہے بڑوں کو بھی کہہ سکتا ہے۔ برخلاف ایک غریب اور ادنیٰ درجے کے آدمی کے کہ وہ اگر کہے گا بھی تو صرف اپنے سے چھوٹے یا اپنے برابر کے لوگوں کو۔ اس کی اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ ان بڑے لوگوں کو کچھ کہے۔ علیٰ ہذا ایک یہ انتظام کیا جائے کہ عوام الناس کے لئے ایک وقت مقرر کیا جائے اگرچہ دن میں ایک ہی گھنٹہ ہو بلکہ خواہ ہفتہ میں ایک ہی گھنٹہ ہو کہ اس وقت میں سب کو ایک جگہ جمع کر کے احکام سنائے جائیں اور اگر زیادہ مجمع ہو جائے تو ایک ایک معلم کو چالیس چالیس پچاس پچاس آدمی دے دیئے جائیں یا یہ کیا جائے کہ ایک محلے کے لئے ایک آدمی تجویز کر دیا جائے دوسرے محلے کے لئے دوسرا آدمی اور اگر متعدد آدمی نہ مل سکیں تو ایک ہی آدمی نمبردار ہو ہر محلے میں جایا کرے اور جس قدر لوگ جمع ہو جائیں ان کو احکام سنا دیا کرے لیکن احکام کتاب میں دیکھ دیکھ کر سنائیں اس طرح سے اگر ایک سال بھی سلسلہ رہے تو تمام مسلمان دین کے عالم ہو جائیں غرض ضرورت اس کی ہے کہ تعلیم

دین بالکل عام ہو اور جب تک تعلیم عام نہ ہوگی احکام کی خبر ہی نہ ہوگی تو پھر توبہ کیونکر ہو سکے گی۔ دوسرا مانع توبہ سے یہ ہے کہ بعض لوگ گناہ کا گناہ ہونا تو جانتے ہیں لیکن اس کو کوئی بڑی چیز نہیں سمجھتے بلکہ ایک ہلکی بات سمجھتے ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ کبھی گناہ کر کے ان لوگوں کا جی برا نہیں ہوتا دوسرے توبہ نہیں کرتے دیکھئے اگر اس شخص کو جو کہ شراب نہ پیتا ہو دھوکے میں کوئی شراب پلا دے تو دل پر کتنا صدمہ ہوگا لیکن جن گناہوں کی عادت ہوگئی ہے اور عادت کی وجہ سے ان کو خفیف سمجھ لیا ہے جیسے غیبت اس کے کرنے سے ذرا بھی جی بُرا نہیں ہوتا اور گناہ کے خفیف سمجھنے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہم کو یہ معلوم نہیں کہ اس گناہ کے کرنے سے ہم کو کیا سزا ملے گی اور کتنا عذاب ہوگا اس کا علاج یہ ہے کہ احادیث ترغیب و ترہیب کو ایک جگہ جمع کر کے ان کا ترجمہ کر دیا جائے۔ اور ایسے لوگ ان کو مطالعہ میں رکھا کریں لیکن ابواب فقہ کے دیکھنے کی اجازت عوام کو نہ دی جائے کیونکہ ایسے احکام مختلف فیہا ہیں اگر عوام ان کو دیکھیں گے تو ان کو ضرر زیادہ ہوگا اس لئے صرف ترغیب و ترہیب کی احادیث ان کو دی جائیں چنانچہ منذری کی ترغیب و ترہیب بہت عمدہ کتاب ہے اس بارے میں اگر اس کا ترجمہ ہو گیا ہو تو اس کو دیکھیں اور اگر اس کا ترجمہ نہ ہو تو کسی اہل علم کو چاہیئے کہ اس کا ترجمہ کر دے اور بہشتی زیور میں بھی میں نے سو حدیثوں کا ترجمہ کر دیا ہے اس کا دیکھنا بھی بہت مفید ہے اس سے معلوم ہوگا کہ فلاں گناہ میں یہ عذاب ہوگا اس لئے اس گناہ سے بچنا چاہیئے۔ دوسرا سبب گناہ کے خفیف سمجھنے کا یہ ہے کہ گناہ کرتے کرتے ہماری عادت ثانیہ ہوگئی ہے کہ اس سے ذرا بھی طبیعت میلی نہیں ہوتی بلکہ اس کی طرف التفات بھی نہیں جاتا کہ ہم نے فلاں گناہ کیا ہے چنانچہ بعض اوقات اگر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو تعجب سے پوچھا جایا کرتا ہے کہ خدا جانے ہم نے کیا گناہ کیا تھا جس کے پاداش میں یہ مصیبت ہم پر نازل کی گئی ہیں۔ اس تعجب پر تعجب کرتا ہوں صاحبو! کیا کوئی وقت بھی گناہ سے بچا ہے پھر اس کے کیا معنی کہ جانے کون سا گناہ ہو گیا ہے بلکہ انصاف اور عقل کی رو سے تو یوں چاہیئے تھا کہ اگر ہم پر خدا تعالیٰ کا کوئی انعام ہو تو تعجب کریں کہ ہم جیسے گناہ گاروں سے کیا بھلائی بن پڑی ہوگی جس پر یہ انعام ہوا ہے۔

گناہ کی عادت چھوڑنے کا طریق

عادت ایسی بُری چیز ہے کہ اس کی بدولت معصیت کا معصیت ہونا بھی ذہن سے نکل جاتا ہے اس کا علاج یہ ہے کہ گناہ کی عادت چھوڑی جائے اور اپنے اوپر جبر کر کے گناہ کو ترک کیا جائے۔ مثلاً غیبت کا گناہ ہے کہ اس میں علی العموم (عام طور پر) لوگ مبتلا ہیں اس کے چھوٹ

جانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہمت کر کے ایک ہفتے تک زبان کو غیبت کرنے سے اور کان کو غیبت سننے سے بند رکھا جائے جب ایک ہفتہ اس طرح گزر جائے گا تو انشاء اللہ تعالیٰ دیکھو گے کہ غیبت کرنا تو در کنار غیبت سننا بھی گوارا نہ ہوگا بلکہ ایسا معلوم ہوگا گویا کسی نے ایک پہاڑ تم پر رکھ دیا ہے ۔

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود گر زباغِ دل خلالے کم بود

(اللہ والوں کے دل پر ہزار درجہ کا غم ہوتا ہے اگر دل کے باغ (دلی وروحانی میزان میں) سے ایک تنکے کے برابر کمی ہو جائے)۔

توبہ کے موانع

ایک مانع توبہ کرنے سے یہ ہوتا ہے کہ انسان گناہ کو بہت ہی بڑی چیز سمجھ لیتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ اتنے بڑے گناہ کے مقابلے میں توبہ سے کیا کام نکل سکے گا۔ علیٰ ہٰذ البعض کو یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ ہمارے گناہ اس قدر کثیر ہیں کہ ان کی معافی ممکن ہی نہیں اگرچہ ہم کتنی ہی توبہ کریں ان دونوں غلطیوں کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی بارگاہ کو بندوں پر قیاس کرتے ہیں کہ جس طرح دنیا میں عادت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بہت بڑے امر میں کسی کی نافرمانی کرے یا معمولی باتوں میں ہمیشہ نافرمانی کرے تو ان دونوں کے قصور کو معاف نہیں کیا جاتا اسی طرح گویا خدا کے کارخانے کو بھی سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ قیاس مع الفارق ہے بندہ اول تو محتاج ہے اس کو اپنا دل ٹھنڈا کرنے کی بھی ضرورت ہے، دوسرے کے مقابلے میں اپنی بات رکھنے کی بھی ضرورت ہے دوسرے بندہ متاثر ہے کہ جب کسی نے اس کی مخالفت کی تو اس پر کچھ اثر ہوا اگر مکرّر مخالفت ہوئی اس اثر اور انفعال (شرمندگی) میں ترقی ہوئی اسی طرح ترقی ہوتے ہوتے اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ استعداد (صلاحیت) موافقت سلب ہو جاتی ہے اس لئے یہ معاف نہیں کرسکتا برخلاف خدا تعالیٰ کے کہ ان کا ہر فعل اختیاری ہے وہاں تاثر کا نام بھی نہیں وہ عذاب بھی کرتے ہیں تو ارادہ محض سے کہ اس میں غیر اختیاری جوش کا شائبہ بھی نہیں ہوتا اس کا علاج یہ ہے کہ اس خیال فاسد سے توبہ کرے اور رحمت کی حدیثیں مطالعہ میں رکھے یقین ہے کہ ان سے یہ مایوسی مبدّل بأمید (امید میں تبدیل ہونا) ہو جائے گی، حدیث میں ہے کہ اگر کسی شخص نے تمام روئے زمین کی برابر گناہ کئے اور وہ توبہ کرلے تو خدا تعالیٰ اس کے سب گناہ معاف فرما دیں گے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عدد گناہوں کا بڑھ جانا موجب یاس نہ ہونا چاہیئے، رہی کیفاً زیادتی اس کو یوں سمجھئے کہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ کفر ہے

کہ اس کی برابر کوئی دوسرا گناہ نہیں ہے پھر دیکھ لیجئے جس وقت حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروزِ عالم ہوئے دنیا کا کیا حال تھا بجز معدودے چند فرقوں کے اوران میں بھی گنتی کے چند آدمیوں کے علاوہ ساری دنیا کفر وجہل سے پُرتھی خصوصاً عرب اور پھراس میں بھی خاص کر قریش کہ انہوں نے تین سوساٹھ بت اپنے لئے بنا رکھے تھے یعنی ہر دن ایک نیا خدا (بزعم شاں) ان سے سر تسلیم خم کراتا تھا لیکن دیکھ لیجئے خدا تعالیٰ نے اسی قبیلۂ قریش سے فلکِ اسلام کے لئے کیسے نیرّ اکبر پیدا کئے ۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسی قبیلے کے ہیں جن کے بارے ارشاد ہے **اِذْيَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَاتَحْزَنْ** (جب وہ کہنے لگے اپنے ساتھی سے غم نہ کرو) حضرت عمرؓ اس قبیلے کے ہیں جن کے لئے حدیث ہے اَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ عُمَرُؓ وَعَلیٰ ھٰذَا (المستدرک للحاکم ۴۲۲:۳) (احکام الٰہی کے جاری کرنے میں سب سے زیادہ مضبوط حضرت عمرؓ ہیں) غرض یہ سمجھنا کہ ہمارے گناہ معاف نہ ہوں گے غلطی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بغیر توبہ کئے مرجاتا ہے۔

ایک مانع توبہ سے یہ ہے کہ انسان یہ خیال کرتا ہے کہ مجھ سے پھر گناہ ہوجائے گا اور جب کہ ہنوز صدورِ گناہ کا احتمال باقی ہے تو توبہ سے کیا فائدہ ہوگا لہٰذا توبہ اس وقت کرنی چاہئے کہ اس کے بعد پھر گناہ نہ ہو۔

صاحبو! میں پوچھتا ہوں کہ زندگی کا کون سا حصہ ہے جس میں نہ ہونے کا یقین کرلیا ہے جوانی میں اگر چالاکی عیاری نہیں تو بدمستی لاابالی پن ہوتا ہے، بڑھاپے میں اگر آوارگی بدمستی نہیں ہوتی تو حرص طولِ امل حیل سازی مکروفریب حسد بغض۔

توبہ کی برکت سے سابقہ گناہ محو ہوجاتے ہیں

غرض بیسیوں امراض باطنی پیدا ہوجاتے ہیں تو حاصل اس عذر کا یہ ہوا کہ مرکر توبہ کریں گے مگر سمجھ لو کہ مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتَه' (جو مرگیا تو سمجھ لو کہ بس اس کی قیامت کا سلسلہ شروع ہوگیا) اور قیامت میں قبول توبہ ہے نہیں نتیجہ جو ہے ظاہر ہے اور سبب اس مانع کے پیش آنے کا یہ ہوتا ہے کہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب توبہ کے بعد بھی گناہ کا صدور ہوا تو وہ توبہ ٹوٹ گئی حالانکہ یہ غلط خیال ہے بلکہ پچھلے گناہ جو معاف ہوچکے ہیں وہ معاف ہوچکے ہیں ان پر اب دار وگیر (گرفت، محاسبہ) نہ ہوگی اسی طرح جس جس گناہ سے توبہ کرتے جاؤ گے وہ محو ہوتا جائے گا لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تو بہت آسان ترکیب آئی بس آئندہ سے یہی کیا کریں گے کہ خوب جی بھر کر گناہ کئے پھر توبہ کرلی پھر گناہ کئے پھر توبہ کرلی کیونکہ جس توبہ کے وقت آئندہ گناہ

کرنے کا بھی قصد ہو وہ توبہ مقبول نہیں جیسا کہ میری پچھلی تقریر بابت حقیقت توبہ سے معلوم ہوا ہو گا اور قبول توبہ کے مضمون میں یہ خیال کہ خوب گناہ کریں اسی کو پیدا ہو گا جو کہ نہایت پلید الطبع ہو اور بالکل ہی گیا گزرا ہو ورنہ سلیم الطبع کو تو اس سے اطاعت کا زیادہ جوش پیدا ہو گا کہ اللہ اکبر جب بارگاہِ خداوندی میں اس قدر رحم و کرم ہے تو ہم کو ہرگز مناسب نہیں ہے کہ اس کی مخالفت کریں۔ حاصل یہ کہ حدیث میں ہے مَآ اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ (مشکوۃ المصابیح: ۲۳۴۰، الدر المنثور ۲: ۷۸) یعنی جس شخص نے گناہ کے بعد توبہ کر لی وہ گناہ پر ہٹ کرنے والوں میں نہیں ہے اور فرماتے ہیں کُلُّکُمْ خَطَّاؤُنَ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ (مسند احمد ۲: ۱۹۸، سنن الترمذی: ۲۴۹۹) کہ گنہگار تو سب ہیں مگر ان میں اچھے وہ ہیں کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے رہتے ہیں۔ پس اگر اتنی ہمت نہ ہو کہ گناہ چھوڑ دو تو توبہ کرنے سے تو ہرگز ہمت نہ ہارو بلکہ جو گناہ ہو جایا کرے اس سے فوراً توبہ کر لیا کرو۔ اگر پھر ہو جائے پھر توبہ کر لو دیکھو ایک شخص بیمار ہو جائے اور اس کو کوئی یہ رائے دے کہ علاج سے کیا فائدہ آخر پھر بھی احتمال ہے کہ بیمار ہو جاؤ گے تو وہ جواب دیتا ہے کہ میاں اگر پھر بیمار ہوں گے تو پھر علاج کر لیں گے آئندہ کی بیماری کے اندیشے سے موجودہ بیماری کے اندیشے سے موجودہ بیماری کا علاج کیوں نہ کریں تو جو فتویٰ آپ کی عقل نے جسمانی مرض میں دیا ہے وہ فتویٰ روحانی امراض میں کیوں نہیں ہوتا۔ اسی حدیث مَآ اَصَرَّ میں وَاِنْ عَادَفِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (مشکوۃ المصابیح: ۲۳۴۰، الدر المنثور ۲: ۷۸) یعنی اگرچہ ستر دفعہ توبہ ٹوٹ جائے۔

غفور رّحیم کی خبر سے مقصود

ایک مانع توبہ سے یہ ہے کہ بندہ سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ غفور رحیم ہے اس کو ہمارے گناہ بخش دینے کیا مشکل ہیں لیکن صاحبو! یہ جواب ظاہری بیماریوں میں کیوں نہیں دیا جاتا اور امراض سمی میں اس پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا کیا کوئی شخص بتلا سکتا ہے کہ اس نے اس خیال سے کہ خدا تعالیٰ غفور رحیم ہے وہ ہم کو ضرور تندرست کر دے گا۔ امراض جسمانی کا علاج نہ کیا ہو یا کوئی شخص بتلا سکتا ہے کہ اس نے خدا کی رحمت پر بھروسہ کر کے زہر کھا لیا ہو کبھی نہیں بلکہ اگر کوئی دوسرا یوں کہے کہ میاں خدا کی رحمت پر بھروسہ کر کے سنکھیا کھا جاؤ تو اس کو دیوانہ بتلایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ خدا کے غفور رحیم ہونے کے یہ معنی کہ سنکھیا کھاؤ تو ضرر نہ کرے بلکہ سنکھیا ضرر بھی کرے گا اور خدا غفور رحیم بھی رہے گا اسی طرح گناہ کا ضرر ہوتا ہے لیکن اس سے خدا تعالیٰ کے غفور رحیم رہنے میں کوئی نقص نہیں آتا۔

صاحبو! اس خبر سے کہ ہم غفور رحیم ہیں مقصود یہ ہے کہ جو گناہ تم سے ہو گئے ہیں ان کی وجہ سے

پریشان خاطر مت ہواور توبہ کو بے کار نہ سمجھو۔ ہم ان سب کو معاف کر دیں گے چنانچہ اس آیت قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (آپ فرمادیں کہ اے میرے بندو جو اپنے نفسوں پر زیادتی کر کے گناہ کر چکے ہو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو جاؤ۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو معاف کر دے گا درحقیقت وہی بخشش کرنے والے اور رحم کرنے والے ہیں) کا شانِ نزول یہی ہے کہ جب حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّل مکہ میں مبعوث ہو کر دعوت اسلام فرمائی تو لوگوں نے آ کر عرض کیا کہ ہم آپ پر ایمان تو لے آئیں لیکن جو گناہ ہم نے اس کے قبل کئے ہیں ان پر تو ہم کو ضرور سزا ہوگی بس جب دینِ آبائی بھی چھوڑا بدنامی بھی اٹھائی اور آخرت کا عذاب بھی باقی رہا تو ہم کو فائدہ ہی کیا ہوا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ تم لوگ پچھلے گناہوں کا اندیشہ نہ کرو ہم غفور رحیم ہیں سب پچھلے گناہ بھی معاف کر دیں گے اور اگلے بھی بس معلوم ہوا کہ مقصود آیت سے ان لوگوں کی ناامیدی کو دور کرنا ہے جو اسلام اور توبہ سے اس خیال پر رُکتے تھے نہ کہ وہ مقصود جو لوگوں نے سمجھا۔

آخرت کے لئے تدابیر کی ضرورت

ایک مانع یہ ہے کہ یوں سمجھتے ہیں بلکہ زبان سے کہتے ہیں کہ جو تقدیر میں لکھا ہے جنت یا دوزخ وہ ضرور ہو کر رہے گا۔ پھر نہ طاعت سے کچھ فائدہ اور نہ گناہ سے کوئی ضرر مگر تعجب ہے کہ یہ تقدیر دنیا کے کاموں میں مثلاً کمانا کھانا مال و دولت جمع کرنا ان میں کہاں چلی جاتی ہے ہم نے کسی کو نہ دیکھا کہ اس نے تقدیر کے بھروسے پر کمانا چھوڑ دیا ہو یا کھانا نہ کھایا ہو یا کھیتی کرنی چھوڑ دی ہو اور اس میں تخم ریزی نہ کی ہو۔ کہ اگر تقدیر میں ہے تو خود بہ خود سب کام ہو جائیں گے اس موقعہ پر تو کہتے ہیں کہ صاحب تقدیر حق ہے لیکن تدبیر بھی تو کرنی چاہیئے بدوں تدبیر کے کوئی کام نہیں ہوتا افسوس یہاں تو تدبیر کی ضرورت اور دین کے کام میں تدبیر کی ضرورت نہیں حالانکہ آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاش کی خدا تعالیٰ نے ایک حد تک ذمہ داری بھی کی ہے فرماتے ہیں وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (زمین پر چلنے والی اور رہنے والی جتنی بھی چیزیں ہیں سب کا رزق اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے) اور معاد کے بارے میں ذرا بھی ذمہ داری نہیں فرمائی بلکہ صاف ارشاد ہے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (انسان کو اسی قدر ملے گا جس قدر وہ کوشش کرے گا) اور مَنْ عَمِلَ صَالِحاً فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا (جس نے اچھے عمل کئے تو اپنے فائدے کے لئے کئے جس نے برا عمل کیا اپنے لئے کیا) کہ ہم بالکل وعدہ نہیں کرتے جو جیسا کرے

گا بھرے گا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ارشاد فرمایا اَیَطْمَعُ كُلُّ امْرِءٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ كَلَّا (کیا ہر شخص اس کی خواہش کرتا ہے کہ وہ نعمتوں والی جنت میں داخل کیا جائے ایسا تو ہرگز نہ ہوگا یعنی عمل کے موافق جزا ملے گی) تو جب تک پاک نہ بنو گے ہرگز دخول جنت کے قابل نہ ہو گے۔

غرض معاش کو تدبیر پر رکھنا اور معاد کو تقدیر پر چھوڑ دینا سخت غلطی ہے بالخصوص جب کہ تحصیل معاد کی تدابیر خود خدا تعالیٰ ہی نے بتلائی ہیں اگر معاد کا حصول محض تقدیر سے ہوتا۔ اور تدبیر کو اس میں دخل نہ ہوتا تو تدابیر بتلانے کی کیا ضرورت تھی۔

فوراً توبہ کی ضرورت

اسی طرح اور بہت سے موانع ہیں گو یہاں سب مذکور نہیں ہوئے مگر اس مختصری فہرست سے تھوڑے سے غور کے بعد وہ بھی سمجھ میں آ سکتے ہیں پس جب موانع اور ان کے ازالہ کی تدبیر معلوم ہو گئی تو جلدی سے ان موانع کو زائل کرنا چاہیئے اور توبہ کر لینا چاہیئے تاخیر نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ تاخیر کی خاصیت یہ ہے کہ پھر اکثر توبہ میسر ہی نہیں ہوتی یہ حالت ہوتی چلی جاتی ہے کہ۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترکِ ایں سودا کنم   باز چوں فردا شود امروز فردا کنم

(میں ہر رات کو توبہ کے وقت یہ کہتا ہوں کہ ضرور اس برے خیال کو چھوڑ دوں گا لیکن جب دوسرا دن آتا ہے پھر یہ ہی کہتا ہوں کہ کل سے نہ کروں گا)۔

کیونکہ توبہ ندامت کا نام ہے اور ندامت کہتے ہیں جی بُرا ہونے کو اور قصور پر شرمندہ ہونے کو اور شرمندگی اس وقت ہوتی ہے کہ طبیعت پر اثر باقی رہے اور اثر تھوڑے دنوں کے بعد زائل ہو جاتا ہے تو جب دل سے مقدمہ توبہ ہی نکل گیا تو توبہ کیونکر نصیب ہو سکے گی غرض کبھی توبہ کرنے میں دیر نہ کرے بلکہ دن کے گناہوں سے رات آنے کے قبل توبہ کر لے اور رات کے گناہوں سے دن ہونے سے پہلے۔

ہر صبح وشام توبہ کی ضرورت

اور اگر کہو کہ سب سے آخری جو توبہ ہو گی اس کے بعد کے گناہ تو پھر بھی بلا توبہ کے رہ جائیں گے تو مواخذہ ہر حال میں ہوا پھر روز کی توبہ کیا مفید ہوئی تو جواب یہ ہے کہ کیا وہ شخص جس پر دس برس کے گناہوں کا بار ہو اور وہ شخص جس پر ایک دن کے گناہوں کا بار ہو برابر ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص پر دس مقدمہ فوجداری کے ہو جائیں اور اس سے وکیل یوں کہے کہ اگر پیروی کی گئی تو امید ہے کہ نو مقدموں سے تم بری ہو جاؤ گے لیکن ایک مقدمہ میں باوجود پیروی کے بھی تم کو سزا ہو گی تو میں

پوچھتا ہوں کہ ایسی صورت میں کیا رائے قائم کی جائے گی آیا یہ کہ جب ایک میں سزا ہوگی تو پیروی کی کیا ضرورت بقیہ نو میں بھی ہونے دو یا یہ کہ باوجود ایک میں یقین سزا ہونے کے دوسرے مقدمات کی اس لئے پیروی کی جائے گی کہ جس قدر بھی سزا کم ہو بہتر ہے ظاہر ہے کہ دوسری تجویز پر عمل ہوگا تو جو شخص پچاس برس کے گناہوں کی پوٹ لے گیا اور جو شخص ایک دن کے گناہ لے گیا کیا دونوں برابر ہیں ہرگز نہیں اور اگر کہیئے کہ برابر ہیں تو میں کہتا ہوں کہ مقدمات کی پیروی میں دونوں کو برابر کیوں نہیں سمجھا گیا اور نو مقدمات کی پیروی کیوں کی گئی بعض موانع ضروری اور بھی قابلِ ذکر ہیں۔

حرام کمائی سے توبہ کی ضرورت

چنانچہ ایک مانع خاص معصیت اکتساب حرام سے توبہ کرنے کا یہ بھی ہے کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ گناہ ہم سے چھوٹ نہیں سکتا کیونکہ ہم کھانے کمانے کی طرح طرح کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں ان میں حلال، وحرام کی تمیز بہت مشکل ہے ہاں مولویوں کو گناہ چھوڑ دینا آسان ہے کیونکہ ان لوگوں کو مفت کو ملتا ہے اس لئے یہ بآسانی گناہ چھوڑ سکتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو میں اس وقت ترک گناہ کے لئے کہہ نہیں رہا میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جب گناہ ہو جایا کرے تو توبہ کرلیا کرو تو گناہ کے نہ چھوٹ سکنے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ توبہ بھی نہ ہو سکے دوسرے غور کر کے دیکھا جائے تو کوئی ناجائز ذریعہ ایسا نہیں ہے کہ جس کو ترک نہ کیا جا سکے اور یہ جو ہم کو ترک کرنا گراں معلوم ہوتا ہے۔

اپنے اخراجات کو کم کرنے کی ضرورت

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے اخراجات روزمرہ میں بعض ایسی چیزیں بڑھالی ہیں کہ جن کی ہم کو کوئی ضرورت نہیں لیکن ہم ان کو ضروری سمجھ رہے ہیں تو اس کا جواب وہی ہے جو کہ کسی شخص نے ایک ادھورے شاعر کو جس نے شعر میں تشدید آنے میں ضرورت کا عذر کیا تھا اس کو جواب دیا تھا کہ شعر گفتن چہ ضرور۔ تو اگر بضرورت کثرت تعلقات گناہ ہوتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ تکثیر تعلقات چہ ضرور۔ اصل جواب تو یہی ہے لیکن یہ جواب ان لوگوں کے لئے ہے جو کہ عالی ہمت ہوں اور دین کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح نہ دیتے ہوں کم ہمتوں کے لئے دوسرا جواب بھی ہے مگر میں اس جواب کو زبان پر لاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کم فہم لوگ اس سے گناہ کی اجازت نہ سمجھ جائیں مگر حاشا وکلا (ہرگز نہیں) گناہ کی اجازت دینا ہرگز مقصود نہیں بلکہ منظور تقلیل اثم (گناہ کا بوجھ) ہے۔

گناہ کی دو قسمیں

حاصل اس جواب کا یہ ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں ایک تو وہ ہیں کہ اگر ان کو نہ کیا جائے تو دنیا کا کوئی کام اٹکتا ہے بعض وہ ہیں کہ اگر ان کو چھوڑ دیا جائے تو کوئی نقصان نہیں ہے۔ مثلاً لباس خلاف وضع اسلامی پہننا اگر اس کو ترک کر دیا جائے تو دنیا کا کوئی بھی نقصان نہیں ہے۔ اسی طرح ٹخنوں سے نیچے پاجامے پہننا کہ ان کے ترک سے دنیا کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ یا مثلاً عورتیں اس قدر باریک لباس پہنتی ہیں کہ اس میں پورے طور پر ستر نہیں ہوتا تو ان باتوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو کوئی نقصان بھی نہیں ہے رشوت وغیرہ میں تو آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بغیر ان کے ہمارے کام چلنے دشوار ہیں لیکن ان معاصی بے لذت میں کیا نفع ہے اور ان کے ترک میں کیا نقصان ہے علیٰ ہذا کسی امرد یا اجنبی عورت کو بری نظر سے دیکھنا کہ اس میں کچھ بھی نفع نہیں نہ اس کے ترک میں کوئی ضرر۔ اگر کہو کہ صاحب نہ دیکھنے میں تکلیف ہوتی ہے تو یہ بالکل غلط ہے بلکہ تکلیف دیکھنے میں ہوتی ہے کہ اول نظر پڑتے ہی قلب میں ایک سوزش پیدا ہوئی اس کے بعد جب وہ نظر سے غائب ہو گیا تو اس سوزش میں ترقی شروع ہوئی حتیٰ کہ بعض لوگوں کا اس میں خاتمہ ہو گیا اور اگر مان بھی لیا جائے کہ نہ دیکھنے میں کچھ تکلیف ہوتی ہے تو تھوڑی سی تکلیف کا پھر وہ بھی چند دن کی برداشت کر لینا کیا دشوار ہے اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ بہت ہی تکلیف ہوتی ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر ضرر کیا ہوا کیا اس تکلیف سے تنخواہ بند ہو گئی یا کھانا بند ہو گیا ہرگز نہیں اور خود یہ تکلیف دہی کوئی معتد بہ ضرر نہیں غرض ان معاصی کو تو فی الفور چھوڑ دیا جائے اور جن معاصی کو بہ زعم خود موقوف علیہ حوائج دنیویہ کا سمجھ رکھا ہے ان کو اگر ترک نہ کر سکیں تو روزانہ ندامت و استغفار اور یہ دعا کہ اے اللہ ہم کو اس سے نجات دے یہ تو ممکن ہے اتنا ہی کر لیا کرو یہ بے فکری و بے پروائی تو بہت بری چیز ہے۔

گناہ کو لذیذ سمجھنے کا علاج

ایک مانع یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ گناہ کو لذیذ سمجھتے ہیں اور اس لئے نہیں چھوڑ سکتے اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ مال پر نظر کرے اور سوچے کہ یہ ساری لذت ایک دن ناک کے راستے نکلے گی۔ دوسرے اہل فہم کے لئے اس کا یہ جواب ہے کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ گناہ میں لذت ہوتی ہے۔ دیکھئے اگر عادت سے زیادہ مرچیں سالن میں ڈال دی جائیں تو اگرچہ ان میں لذت ہو گی لیکن اس لذت کے ساتھ سوزش ایسی ہو گی کہ اس کے سامنے لذت کا ادراک بھی نہ ہو گا اور اگر کچھ

ادراک ہو بھی تو لذت کا ادراک تو فوراً ہی ختم ہو جائے گا لیکن سوزش بہت دیر تک رہے گی اسی طرح گناہ کرنے میں گو کچھ لذت بھی ہو لیکن اس روحانی تکلیف و پریشانی کے مقابلے میں جو کہ گناہ میں ہوتی ہے یہ لذت کچھ بھی نہیں۔ دوسرے اس لذت کا خاتمہ تو فوراً ہی ہو جاتا ہے اور اس روحانی تکلیف کا اثر مدت تک باقی رہتا ہے ہم کو التفات نہیں ورنہ معلوم ہو سکتا ہے کہ گناہ کر کے کس قدر کدورت (تیرگی، گندلاپن) اور طبعی توحش (نفرت) پیدا ہوتا ہے۔ فوراً ہی مرتکب کی طبیعت یہ فتویٰ دیتی ہے کہ تم نے بہت بُرا کام کیا۔

نیکیوں سے روحانی مسرت

اس کو وہ مسرت نصیب نہیں ہوتی جو کہ نیکی کر کے مثلاً نماز پڑھ کر یا روزہ رکھ کر ہوتی ہے کہ قلب میں ایک اطمینان ایک نور سا معلوم ہوتا ہے برخلاف گناہ کے کہ اس کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سر پر جوتیاں ماردیں مگر افسوس ہے کہ ہم پھر بھی باز نہیں آتے گویا جوتیاں کھانے کی عادت ہوگئی ہے جیسے چماروں کی عادت ہو جاتی ہے یا جیسے نمرود کی عادت ہوگئی تھی اور یہ تکلیف تو فی الحال ہوتی ہے پھر اس کا ایک مال ہوتا ہے یعنی دنیا ہی میں کہ اس پر طرح طرح کی آفتیں مصیبتیں نازل ہوتی ہیں اکثر رزق سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کو بشرط غور معلوم بھی ہو جاتا ہے کہ یہ فلاں گناہ کی سزا ہے خوب کہا ہے۔

ہرچہ برتو آیدت ظلمات و غم   آں ز بیبا کی و گستاخی ست ہم
غم چو بینی زود استغفار کن   غم بأ مر خالق آمد کا رکن

(جو کچھ تجھ کو ظلمات اور غم والم پیش آتے ہیں وہ تیری بے باکی زور گستاخی سے پیش آتے ہیں جب کوئی غم پیش آئے فوراً استغفار کرو غم حق تعالیٰ سے کار کن ہو کر آتا ہے)

گناہ کی بدولت رزق میں کمی

ابن ماجہ کی حدیث میں ہے اِنَّ الْعَبْدَ یُحرِمُ الرِّزْقَ بَخطِیْئَۃٍ یَعْلَمُھَا (مسند احمد ۵:۲۸۰، الدر المنثور ۶:۲۳۳) (درحقیقت بندہ کے گناہ کی وجہ سے اس پر رزق بند کر دیا جاتا ہے اور بندہ اپنے گناہ کو جانتا ہے) اور کھانے کو ملے بھی تو اس کی برکت بالکل جاتی رہتی ہے اس کا سہل طریقہ مشاہدے کا یہ ہے کہ آپ دو مہینے کی رخصت لے کر ان میں سے ایک مہینہ تو کسی ایسے شخص کے پاس گزارے جو کہ نہایت تنعم اور آرام میں زندگی بسر کرتا ہو اور کسی گناہ سے نہ بچتا ہو اور دیکھئے

کہ ان گناہوں کی بدولت اس کے قلت کی کیا کیفیت ہے آخر بات چیت سے اس کے انداز کا پتہ لگ ہی جائے گا خاص کر اس وقت میں جب اس پر کوئی مصیبت آئے مثلاً بیمار ہو جائے یا کسی دشمن کی مخالفت کا اندیشہ ہو اس کے بعد کسی ایسے شخص کے پاس رہیئے کہ اس کو اچھی طرح کھانے کو بھی میسر نہ آتا ہو خدا کا مطیع وفرمانبردار ہو اور اس کے قلب کی کیفیت دیکھئے خاص کر کسی مصیبت کے وقت اس کے بعد ان دونوں کی قلبی حالت کا موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ سرورِ اصلی کس کے قلب میں ہے آپ پائیں گے کہ وہ فاقہ مست ہر وقت شاداں وفرحاں ہے اور یہ متنعم ہر وقت غم والم میں مبتلا ہے اور یہ ایسا یقینی اور بیّن فرق ہے کہ جب چاہے اور جس کا جی چاہے امتحان کر دیکھے۔

پریشانی اور سرور کا سبب

اب میں پوچھتا ہوں کہ یہ پریشانی کس چیز کی ہے اور وہ سرور کس چیز کا ہے ظاہر ہے کہ پریشانی نافرمانی کی اور سرور فرمانبرداری کا ہے بس نافرمانی میں لذت اور فرمانبرداری میں کلفت کہنا غلط ہوا بلکہ امر بالعکس ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے وَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (ہم ضرور اسی کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے) یہ تو فرمانبردار کے لئے ہے اور ارشاد ہوتا ہے فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (بے شک اس کے لئے تنگی کی زندگی ہے) یہ نافرمان کے لئے ہے غرض فرمانبرداری میں پوری راحت ہے اور راحت کا نام عیش ہے دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر ایک امیر کبیر کو پھانسی کا حکم ہو جائے کہ تم اس پر راضی ہو کہ یہ تمام دولت اس غریب کو دے دو اور یہ تمہاری عوض پھانسی لے لے تو وہ یقیناً قبول کر لے گا۔ اب بتلایئے کہ یہ قبول کیوں ہوا اس لئے کہ دولت کے بدلے میں ایک مصیبت سے نجات ہوئی اور راحت نصیب ہوئی غرض یہ کہنا کہ لذت کی وجہ سے گناہ نہیں چھوٹ سکتے غلط ہوا یہاں تک تو توبہ کے موانع اور انکے علاج کا ذکر تھا اب ایک مختصر سی فہرست ان گناہوں کی جن میں سب مبتلا ہیں بیان کرنی باقی ہے۔

دین کے پانچ اجزاء

سو اول یہ سمجھے کہ دین کے پانچ جزو ہیں، پہلا جز عبادات جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ دوسرے معاملات جیسے بیچنا خریدنا، نوکر رکھنا رشوت لینا سود لینا روپے کی عوض پیسے لینا یا گوٹہ پٹھہ خریدنا وغیرہ، تیسرے عقائد کہ خدا کو ایک جاننا اور اس کو قادر مطلق ماننا سیتلا وغیرہ کے توہمات کو باطل سمجھنا وغیرہ، چوتھے معاشرت کہ آپس میں میل جول کس طرح رکھیں جب ملیں سلام کریں، مصافحہ وغیرہ، پانچویں اخلاق یعنی ملکاتِ باطنہ کا درست کرنا، حسد بغض، کینہ، عداوت وغیرہ سے

دل کو پاک کرنا تحمل بُردباری وقار نرمی خوش کلامی اپنے اندر پیدا کرنا۔ یہ پانچ حصے دین کے ہیں، ہمارے مسلمان بھائیوں نے دین کو صرف عبادات میں منحصر کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ چاروں اجزاء کو دین سے خارج سمجھتے ہیں گویا ان کے نزدیک بہت سی نفلیں پڑھ لینا گلے میں تسبیح ڈال لینا روزہ رکھ لینا بس اسی کا نام دین ہے بعضے عبادات کے ساتھ تصحیح عقائد کو بھی دین سمجھتے ہیں۔ باقی معاملات اور معاشرت اور اخلاق کوئی شخص دین کا جزو ہی نہیں سمجھتا الّا ماشاء اللہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے دنیا کے حالات ہیں ان میں ہم جس طرح چاہیں کریں، شریعت کو ان سے کوئی تعلق نہیں حالانکہ یہ سب شریعت کے اجزاء ہیں اسی طرح عقائد بھی۔ ان اجزاء میں ہر جزو کے اندر بہت سے احکام ہیں مگر میں ہر ایک میں سے بطور نمونہ کے دو چار اجزاء کا بیان کر کے وعظ کو ختم کر دوں گا۔

غلط اور خلاف واقعہ عقائد

اول عقائد کو لیجئے کہ ان میں سے بعض عقائد غلط اور خلاف واقع ہیں۔ مثلاً عورتیں بہت سی اچھی چیزوں کو بُری یا بُری چیزوں کو اچھی سمجھتی ہیں جیسے دنوں کو منحوس کہنا اکثر عورتیں بدھ کے دن کو منحوس سمجھتی ہیں اور غضب ہے کہ بعض مرد بھی اس میں ان کے ہم عقیدہ ہیں یا مثلاً عورتوں کا عقیدہ ہے کہ اگر کسی دن کوا گھر میں بولے تو اس دن مہمان ضرور آتے ہیں اسی طرح اگر آٹے میں پانی زیادہ ہو جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ آج کوئی مہمان آنے والا ہے اکثر جانوروں کو منحوس سمجھ رکھا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ قمری منحوس ہے اس کو گھر میں نہ پالو بلکہ اگر شوق ہو تو مسجد میں پالنا چاہیئے شاید اس میں یہ حکمت ہو کہ اگر اجڑے تو اللہ ہی کا گھر اُجڑے۔ نعوذ باللہ!

بعض جانوروں کو منحوس سمجھنا غلط ہے

غرض جتنی چیزیں اپنے سے نکمی ہوں سب خدا کے لئے بعض عورتیں کیلے کے درخت کو منحوس سمجھتی ہیں کہتی ہیں کہ یہ درخت مُردے کے کام میں آتا ہے اس لئے اس کو گھر میں نہ ہونا چاہیئے کہ شگون بد ہے اور مُردے کی چارپائی کو اس کے کپڑوں کو منحوس سمجھتے ہیں مگر تعجب ہے کہ اس کے کپڑوں کو تو منحوس سمجھا جاتا ہے لیکن اگر اس کا قیمتی دوشالہ ہو یا اس کی جائیداد ہو تو اس کو منحوس نہیں سمجھتے حالانکہ اگر مُردے کے ساتھ تلبس سے اس کے لباس میں نحوست آئی ہے تو اس تلبس سے اس کے قیمتی کپڑوں میں نحوست آنی چاہیئے اور اگر مردے کی طرف نسبت سے ان چیزوں میں نحوست آئی ہے تو اسی نسبت سے اس کی جائیداد میں بھی نحوست آنی چاہیئے یہ عقیدہ بالکل مہمل اور

وہم ہے مسلمانوں میں اس کا رواج ہندوؤں سے آیا اور بعض چیزوں کو مرد بھی منحوس سمجھتے ہیں جیسے اُلو کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ جس مقام پر بولتا ہے وہ مقام ویران ہو جاتا ہے اس لئے وہ منحوس ہے حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے نہ اُلو منحوس ہے نہ اس کے بولنے سے کوئی جگہ ویران ہوتی ہے یاد رکھو وہ جو بولتا ہے تو خدا کا ذکر کرتا ہے تو کیا خدا کے ذکر سے یہ نحوست آئی بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ ذاکر تو ہے لیکن اس کا ذکر جلالی ہے اس لئے اس کا یہ اثر پڑتا ہے، حالانکہ خود یہ تقسیم اور یہ کہ جلالی میں یہ خاصیت ہوتی ہے یہی بے اصل ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اُلو ایسے مقام کو تلاش کرتا ہے جہاں یکسوئی ہو اور اس کو اندیشہ نہ رہے اس لئے وہ ویرانوں میں بیٹھتا ہے۔

نحوست کا اصل سبب معاصی ہیں

اب یہ دیکھئے کہ وہ ویرانی جو پہلے سے ہے کہاں سے آئی سو وہ ہم لوگوں کے گناہ اور بداعمال کی وجہ سے ہوتی ہے اس کے بعد اُلو اس مقام پر آتا اور بولتا ہے بس ویران کن ہم اور ہمارے گناہ ہوئے نہ کہ اُلو اور جب یہ ہے تو منحوس گنہگار ہوئے اُلو کیوں منحوس ہوا بعض پڑھے ہوئے لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کیا ہے دن کے منحوس ہونے پر وَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِیْ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ الخ (اور ہم نے ان پر ایک تند و تیز ہوا ایسے دنوں میں بھیجی جو ان کے حق میں منحوس ہے) کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں میں عاد پر عذاب نازل ہوا ہے وہ دن منحوس ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ دن کون کون ہیں اس کا پتہ دوسری آیت کے ملانے سے چلے گا فرماتے ہیں کہ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۞ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا (اور قوم عاد کو ہلاک کر دیا گیا، تیز و تند ہوا کے ذریعہ جو ان پر سات رات اور آٹھ روز مقرر کر دی گئی تھی) کہ آٹھ دن تک ان پر وہ عذاب رہا تو صاحبو! اس اعتبار سے تو چاہیئے کہ کوئی دن مبارک ہی نہ ہو بلکہ ہر دن منحوس ہو کیونکہ ہفتہ کے ہر دن میں ان کا عذاب پایا جاتا ہے جن کو ایام نحسات کہا گیا ہے تو کیا اس کا کوئی قائل ہو سکتا ہے۔ اب آیت کے صحیح معنے سُنئے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ان پر جن ایام میں عذاب ہوا وہ ایام بوجہ نزولِ عذاب خاص ان کے لئے منحوس تھے نہ کہ سب کے لئے اور وہ عذاب تھا بوجہ معصیت کے پس مدارِ نحوست کا معصیت ہی ٹھہری اب بحمد اللہ کوئی شبہ نہیں رہتا۔

نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ کا مفہوم

بعض لوگوں نے قرآن مجید کی دوسری آیت سے استدلال کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے

کہ یہ نحوست ہمیشہ کے لئے ہے قرآن شریف میں ہے فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (منحوس دن میں آندھی چلائی) مگر میں کہتا ہوں کہ مستمر کے دو معنی ہیں ایک دائم دوسرے منقطع۔ دوسری تفسیر پر یہ معنے ہوں گے کہ وہ نحوست منقطع ہوگئی اور یہ قاعدہ عقلی ہے کہ اِذَا جَآءَ الْاِحْتِمَالُ بَطَلَ الْاِسْتِدْلَالُ (جب کسی چیز میں شک پیدا ہوجائے تو اس کو دلیل میں پیش کرنا صحیح نہیں) اور اگر کسی کی خاطر سے ہم مان بھی لیں کہ مستمر کے معنی دائم ہی کے ہیں تو ہم وہی پہلا جواب دیں گے کہ نحس سے مراد نحس علیہم ہے اور ان کے حق میں بوجہ عذاب کے دائم ہونے کے وہ یوم ہمیشہ ہی کے لئے منحوس ہے غرض یہ اعتقاد کہ چیزوں میں نحوست ہے غلط ہے ایک ہندو کا ایک قصہ یاد آ گیا جو مجھ سے ایک معتبر راوی نے کہا کہ وہ شہر بھر کے وہ گھوڑے جن کو منحوس سمجھ کر مالک بیچ دیتے تھے۔ ارزاں خرید لیتا تھا اور ان کو خوب نفع سے بیچتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ مجھ کو ان کی نحوست نہیں لگتی بعضے لوگ اگر کسی عورت کی جِیب کالی ہو تو اس کو منحوس سمجھتے ہیں اس کا نام رکھا ہے کال جیبی یہ بھی لغو ہے۔

اپنی نحوست نظر نہ آنے کی عجیب مثال

صاحبو! یہ جو کچھ نحوست ہے بدولت معاصی کے ہمارے اندر ہے۔ مگر افسوس کہ ہم کو اپنے اندر نہیں نظر آتی دوسروں میں نظر آتی ہے۔ ہماری وہ حالت ہے جیسے ایک حبشی چلا جاتا تھا۔ رستے میں دیکھا کہ ایک آئینہ پڑا ہوا ہے اُٹھا کر دیکھا تو اس میں اپنی صورت نظر آئی بہت خفا ہوا غصے میں آ کر اس کو زمین پر ٹیک دیا اور کہنے لگا کہ ایسا بدصورت تھا تب تو کسی نے یہاں پھینک دیا۔ ایک اور دیہاتی کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا اتفاق سے ایک ٹکڑا پانی کی بدھنی میں گر گیا جھانک کر دیکھا تو اس میں اپنی صورت نظر آئی باپ سے کہنے لگا کہ ابا جان اس نے ہمارا ٹکڑا لے لیا ابا جان نے جو لوٹے میں دیکھا تو اپنی صورت نظر پڑی آپ نے سمجھا کہ یہی ہوگا جس نے ٹکڑا چھینا تو آپ فرماتے ہیں کہ سفید داڑھی منہ پر لگا کر بچے کا ٹکڑا چھینتے ہوئے شرم تو نہ آئی آخر غصے میں آ کر لوٹے کا پانی گرا دیا پھر جو دیکھا تو ٹکڑا موجود ہے مگر صورت ندارد تو آپ فرماتے ہیں کہ اگرچہ غاصب تھا مگر تھا حیادار دیکھو ٹکڑا ڈال کر غائب ہو گیا بعینہٖ یہی ہم لوگوں کی حالت ہے کہ اپنے عیوب دوسروں میں جلوہ گر نظر آتے ہیں نحوست اپنے اندر ہے کہ گناہ پر گناہ کرتے چلے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُلو منحوس ہے اور قمری منحوس ہے۔ ایک گناہ عقیدے کے متعلق عورتیں یہ کرتی ہیں کہ ٹونے ٹوٹکے کرتی ہیں افسوس ہے کہ نہ شریعت کا لحاظ ہے نہ خدا کا خوف ہے، سو بیبیو! یاد رکھو کہ خدائی کارخانے میں کوئی دخیل نہیں ہے نہ وہاں کسی کا کچھ اثر ہے۔

نکاح ثانی کو بُرا سمجھنا قابلِ افسوس ہے

ایک گناہ عقیدے کے متعلق یہ ہے کہ عورتیں قریب کل کے اور اکثر مرد بھی نکاح ثانی کو بُرا سمجھتے ہیں اور افسوس ہے کہ بعض لکھے پڑھے لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب نکاح ثانی فرض نہیں تو نکاح اول فرض ہے اور اگر نہیں تو نکاح اول کے ساتھ یہی معاملہ کیوں نہیں کیا جاتا اگر اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے تو خیر مولویوں کے کچھ تو آنسو پُونچھ جاتے کیا وجہ ہے کہ نکاح اول کے لئے تو اس قدر کوشش کی جاتی ہے کہ اگر لڑکی کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہو جائے اور کہیں سے پیام نہ آئے تو فکر پڑ جاتی ہے اور اس کے تذکرے کئے جاتے ہیں ہاں اگر کسی عورت پر شوہر اول کا بہت رنج غالب ہو یا اس کے پاس چھوٹے چھوٹے بچے ہوں کہ ان کی پرورش کا انتظام نکاح کے بعد دشوار ہو یا بچوں کی جائیداد وغیرہ موجود ہو کہ اس کا انتظام اس کے سپرد ہو تو البتہ ایسی عورت کو اجازت ہے کہ وہ نکاح نہ کرے، بشرطیکہ مرد کی بالکل خواہش نہ ہو لیکن اگر کوئی مانع بھی نہ ہو اور پھر بھی عرف کی شرم کی وجہ سے نکاح ثانی نہ کرے اور اس کو عیب سمجھے تو سخت گناہ ہے بعض مقامات پر اس قدر جہالت ہے کہ اگر منگنی کے بعد لڑکے کا انتقال ہو جائے تب بھی نکاح نہیں کرتے اور لڑکی کو بٹھلائے رکھتے ہیں یہ سخت جہالت ہے، اور عورتوں سے زیادہ مردوں کی حالت پر افسوس ہے کہ وہ باوجود ذی عقل ہونے کے بھی اس کو عیب سمجھتے ہیں اور بعضے مرد اگرچہ زبان سے اس کو بُرا نہیں کہتے لیکن ایسی عورت کو جس نے دوسرا نکاح کرالیا ہو ذلیل سمجھتے ہیں اور ان کے دل میں اس کی اتنی عزت نہیں ہوتی جتنی اس عورت کی جو کہ ساری عمر بیوہ بنی بیٹھی رہے علماء اس بارے میں جتنی کچھ کوشش کرتے ہیں ان کا مقصود صرف یہ ہے کہ لوگوں کے دل سے اس کے عیب سمجھنے کا خیال نکل جائے یہ تو مختصر سی فہرست عقائد کے متعلق تھی۔ اب عبادات کو لیجئے کہ ان میں بھی بہت سی باتوں میں کوتاہی ہو رہی ہے۔ مثلاً عورتیں اکثر تو نماز ہی نہیں پڑھتیں اور یہ عذر کرتی ہیں کہ ہم کو گھر کے کاموں سے فرصت نہیں ہوتی میں کہتا ہوں کہ ان عذر کرنے والوں کو اگر عین کام کے وقت پیشاب کی ضرورت اس شدت سے ہو کہ اس کو روک ہی نہ سکیں اور اتفاق سے بیت الخلا میں جانے کے بعد بند پڑ جائے تو اس صورت میں یہ کیا کریں آیا اس وقت تک کہ جب تک پیشاب سے فراغت ہو کام کا حرج کریں یا نہیں ظاہر ہے کہ مجبوراً کام کا حرج کرنا پڑے تو کیا خدائی حکم کی اتنی ضرورت بھی نہیں جتنی کہ طبعی تقاضوں کی۔

مستورات کی نماز کی چند کوتاہیاں

اور بعض عورتیں اگر نماز پڑھتی بھی ہیں تو بہت ہی دیر کر کے اور مکروہ وقت میں اور پھر اس

قدر جلدی کہ نہ قیام درست نہ رکوع ٹھیک گویا ایک قید ہے کہ جس طرح بنے اس سے چھوٹیں، بیبیو، اگر زیادہ ہمت نہیں ہے تو خیر نفلیں نہ پڑھا کرو لیکن فرائض وسنن میں تو کتر بیونت نہ کیا کرو ان میں تو ارکان کی تعدیل کا لحاظ ضرور کرلیا کرو۔ اسی طرح زکوٰۃ دینا حج کرنا اس میں عورتیں بہت سستی کرتی ہیں یاد رکھو کہ جس مال پر زکوٰۃ نہیں دی جاتی وہ قیامت کے دن سانپ کی شکل بن کر ڈسے گا۔ اب معاملات کو سنئے ان میں بھی بہت زیادہ گڑبڑ کر رکھی ہے۔ مثلاً عورتیں اکثر گیہوں کے آٹے سے چنے یا مکئی کا آٹا بدلتی ہیں مگر ان کو کچھ خبر نہیں کہ اس کے بدلنے کا کیا طریقہ ہے اس میں بعض صورتیں ایسی ہیں کہ ان کی بدولت یہ لین دین سود کا لین دین ہو جاتا ہے۔ اور اس سے سود کا گناہ ہوتا ہے یہ مثال میں نے اس لئے بیان کی کہ ہم کو معلوم ہو کہ کھانے پینے میں بھی مسائل شرعیہ کے جاننے کی ہم کو ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ مردوں کو بھی ان مسائل سے آگاہی نہیں اور لیجئے عورتیں زیور بنواتی ہیں اور خرید کرتی ہیں اس میں بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ پرانے زیور سے نیا زیور بدلا گیا اور فرض کیجئے کہ نیا تو بارہ تولہ ہے اور پرانا پندرہ تولہ ہے اور اس بارہ تولہ کو بیس تولہ کی عوض میں لیا گیا تو یہ معاملہ سود کا معاملہ ہو گیا اسی طرح اکثر چاندی کا زیور روپے سے خریدا جاتا ہے اس میں بھی بہت گڑبڑ کی جاتی ہے۔

سفر ریل میں زائد اسباب لے جانے کی ممانعت

صاحبو! ان میں سخت ضرورت ہے مسائل دین کے سیکھنے اور معلوم کرنے کی بتلایئے کہ جب بدن پر ناجائز مال لپٹا ہوا ہوگا تو نماز روزے کی توفیق اور اعمال صالحہ کی ہمت کیونکر ہوگی۔ اسی طرح سفرِ ریل میں اکثر عورتیں اور بعض مرد بھی اس قدر اسباب لے جاتے ہیں کہ وہ حد اجازت سے زیادہ ہو جاتا ہے اور نہ اس کا محصول دیتے ہیں نہ اس کو وزن کراتے ہیں اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خود تو تیسرے درجے کا ٹکٹ لیا تھا لیکن اتفاق سے درمیانہ درجے میں کوئی دوست بیٹھا ہے اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور دو تین اسٹیشن تک اس میں بیٹھے چلے گئے یا ٹکٹ لیا دو تین اسٹیشن کا اور چلے گئے بہت دور تک ان سب صورتوں میں یہ شخص ریلوے کمپنی کا قرضدار رہتا ہے اور قیامت کے دن اس سے وصول کیا جائے گا۔ اگر کبھی ایسی غلطی ہوگئی ہو تو اس کا سہل طریقہ ادا کرنے کا یہ ہے کہ حساب کر کے جس قدر قیمت ریلوے کی اپنے ذمہ نکلے اس قیمت کا ایک ٹکٹ خرید کر اس سے کام نہ لے اس سے کمپنی کا روپیہ بھی ادا ہو جائے گا اور اس شخص پر کوئی الزام بھی نہ آئے گا۔ اب

معاشرت کو لیجئے کہ اس میں لوگوں سے بہت گناہ ہوجاتے ہیں آج کل نوجوانوں نے اہل یورپ کی تقلید کو تہذیب اور انسانیت سمجھ رکھا ہے۔

اسلام کے برابر تہذیب اور شائستگی کسی مذہب میں نہیں

صاحبو! قرآن وحدیث کو دیکھو تو معلوم ہو کہ تمہارے مذہب کی برابر تہذیب اور شائستگی دنیا کے کسی فرقے میں نہیں ہے علیٰ ہذا عورتوں کی معاشرت بالکل خراب ہے اکثر عورتوں میں پردہ بہت ہی کم ہے اور سر تو ان کا ہمیشہ ہی کھلا رہتا ہے خصوصاً آدھا سر تو گویا ڈھانپا ان کو ضروری ہی نہیں ہے اکثر عورتیں زیور ایسا پہنتی ہیں جس میں آواز پیدا ہوتی ہے یاد رکھو ایسا زیور پہننا جائز نہیں ہے ہاں آپس میں لگ کر بجے اور قدم بھی آہستہ سے رکھا جائے کہ اس میں زیادہ آواز پیدا نہ ہو تو جائز ہے۔

عورتوں میں ایک مرض یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو بالکل میلی کچیلی خراب حالت میں رہیں گی اور جب برادری میں جائیں گی تو خوب بن سنور کر بلکہ پڑوسن تک کا زیور بھی مانگ کر لے جائیں گی۔ اور بجتا ہوا زیور ضرور پہنیں گی اور پھر اس پر اس قدر توجہ ہے کہ ہر عورت سے مجمع بھر کی عورتوں کا زیور ان کا لباس سب ایک ایک کر کے دریافت کر لیجئے گویا اس فہرست لینے ہی کے لئے یہ اس مجمع میں گئی تھیں۔ اسی طرح لباس ایسا بیہودہ پہنتی ہیں کہ اس میں ذرا بھی پردہ نہیں ہوتا اور سارا بدن جھلکتا ہے۔

عورتوں کو آپس میں مسنون طریقہ پر سلام کی ضرورت

اور ایک جزء معاشرت کا یہ ہے کہ عورتیں سلام شریعت کی تعلیم کے بالکل خلاف کرتی ہیں، بعض عورتیں تو صرف سلام کہتی ہیں گویا اس قدر تخفیف کہ چار حرف بھی پورے زبان سے نہ نکلیں اور اس سے بھی زیادہ لطف یہ کہ جواب دینے والی سارے کنبے کی فہرست گنوادے گی کہ بھائی جیتا رہے اور بیٹا زندہ رہے اور شوہر خوش رہے لیکن ایک لفظ وعلیکم السلام نہ کہا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

اب رہے اخلاق ان کو تو کوئی جانتا ہی نہیں بس یہ سمجھتے ہیں کہ نرمی سے باتیں کر لینا یہی اخلاق ہے۔

صاحبو! اخلاق کہتے ہیں ملکات باطنہ کو مثلاً اپنے کو سب سے کمتر سمجھنا اعمال میں ریا نمود نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔

آج کل کی تواضع

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل تواضع کی شکل میں تکبر ہوتا ہے یعنی بہت سے لوگ صورتِ تواضع اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ لوگ ان کی اور زیادہ تعریف کریں مثلاً کہتے ہیں کہ صاحب میں تو کوئی چیز نہیں ہوں اور دل میں یہ ہوتا ہے کہ میں سب کچھ ہوں یہ صرف

اس لئے کہہ رہا ہے کہ سننے والے زیادہ تعریف کریں گے اور اس کا امتحان کہ ان الفاظ سے واقعی تواضع مقصود ہے یا محض تصنع اور بناوٹ ہے یہ ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ میں تو نالائق ہوں سامع بھی اگر اس کی موافقت کرے اور کہے کہ واقعی آپ نالائق ہیں تو پھر دیکھئے ان کی کیا حالت ہوتی ہے مگر ہم لوگوں کی بالکل وہ حالت ہے کہ

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو (میں تجھ کو حاجی کہوں تو مجھے حاجی کہہ)

غرض اخلاق کی اصلاح کی بھی بہت زیادہ ضرورت ہے اس وقت زیادہ وقت نہیں ہے۔ ورنہ میں اس کے متعلق بہت سی جزئیات بیان کرتا پس یہ پانچ قسم کے گناہ ہیں جن کی اصلاح کی ہم کو ضرورت ہے۔

خلاصہ علاج

ان کے علاج کا خلاصہ یہ ہے کہ اول احکام کو معلوم کرو دوسرے عمل کا قصد پختہ کرو تیسرے قصد کے پختہ کرنے کے لئے اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو۔

عورتوں کے لئے صحبت اہل اللہ کا نعم البدل

لیکن عورتیں چونکہ پردہ نشین ہیں اس لئے وہ اس کے بجائے اہل اللہ کی حکایات دیکھا کریں خاص کر بزرگ عورتوں کی حکایتیں کہ ان سے بہت کچھ اثر ہوگا اور ہمت قوی ہوگی اس سے تمام گناہ چھوٹ جائیں گے اور خدا تعالیٰ کی طرف کامل توجہ ہو جائے اور اس کے بعد تم اس کے مخاطب ہو سکو گے۔

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

(قریب ہے کہ آپ کا رب ان کے گناہوں کو بدل دے اور ان کو ایسی جنتوں میں داخل کر دے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں)۔

اب خدا سے دُعا کرو کہ وہ توفیق دے آمین۔

ضرورۃ التوبہ

یہ وعظ

متعلق ضرورتِ توبہ ۷ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ کو جامع مسجد ریاست خیر پور سندھ میں کھڑے ہو کر دو (۲) گھنٹے بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً دوسو تھی۔ مولانا سعید احمد صاحبؒ نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارِكۡ وَسَلِّمۡ (دَائِمًا اَبَدًا كَمَا يُحِبُّ وَيَرۡضٰى ۱۲) اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ. بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ.

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ تَوۡبَةً نَّصُوۡحًا عَسٰى رَبُّكُمۡ اَنۡ يُّكَفِّرَ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَيُدۡخِلَكُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِيۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ (التحریم: ۸)

ترجمہ: اے ایمان والوتم اللہ تعالیٰ کے سامنے سچی توبہ کرو۔ امید ہے کہ تمہارا رب تمہارے گناہوں کومعاف کردے گا۔

یہ ایک آیت ہے سورہ تحریم کی۔ اس میں خدا تعالیٰ نے اپنے مؤمن بندوں کو اپنی رحمت کاملہ سے ایک عجیب وغریب نسخہ اکسیر کا دیا ہے جس سے لوہا بھی سونا ہو جائے۔

کیمیا کی تحقیق

دیکھئے لوگ کیمیا کی تلاش میں اپنا عزیز مال اور وقت ضائع کرتے ہیں۔ حالانکہ کیفیت اس کی یہ ہے کہ حکماء اس کے وجود ہی میں مختلف الرائے ہیں بعض کہتے ہیں کہ کیمیا کا وجود ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں پس اس کا وجود مشکوک ہوا تو یقینی نفع کو یعنی مال اور وقت کو ایک موہوم توقع میں برباد کر دیتے ہیں اور اگر مان بھی لیا جائے کہ کیمیا کا وجود ہے تو آپ نے بہت کم سنا ہوگا کہ کسی نے کیمیا بنائی ہو اگر چہ اس قسم کے واقعات بہت مشہور ہیں، لیکن اس کا وقوع ثابت ہونا بہت مشکل ہے۔ بہرحال اس کا وجود مشکوک ہی رہا اور اس کے وقوع میں احتمال ہی رہا اور احتمال وہ چیز ہے کہ اس کی بنا پر بچنا بہت ضروری ہے منفعت موہوم واجب السعی نہیں اور مضرت موہوم واجب الاحتراز ہے بالخصوص جب کہ اس میں کوئی فوری مضرت ہو کیمیا بھی ایسی ہی چیز ہے اس کی وجہ سے یقینی نفع کو نقصان پہنچتا ہے۔

کیمیا ناجائز ہے

اسی لئے فقہاء نے اس کو ناجائز کہا ہے حتیٰ کہ فقہا نے لکھا ہے کہ اگر کسی متولّی وقف کی نسبت یہ معلوم ہو کہ وہ کیمیا کی لت میں ہے تو اس کو موقوف کر دیا جائے۔

تمام جرائم میں مضرت ہے

اسی طرح جتنے جرائم قانونی ہیں سب میں مضرت ہے اگر چہ مضرت فوری نہ ہو بلکہ اس کے مال میں ضرر ہو دیکھئے جوا کھیلنے میں فوری نفع ہے اور اس وجہ سے وہ طبعاً مطلوب ہے مگر مآل اس کا ہمیشہ تباہی و بربادی ہوتا ہے۔

ایک عجیب راز

اور یہاں سے ایک عجیب راز معلوم ہو گیا ہوگا۔ ایک وجدانی شبہہ کے رفع کا کہ اکثر لوگوں کو گناہوں کے چھوڑنے میں گرانی ہوتی ہے اور کہتے ہیں کہ اس قدر نفع اور لذت کی چیز ہے لیکن شریعت اس کو منع کرتی ہے۔

مسلمان روشن خیالوں کی عجیب رائے

حتیٰ کہ ہمارے روشن خیال حضرات تو علماء کو رائے تک دینے لگے ہیں کہتے ہیں کہ ترقی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ سُود حلال نہ ہو جائے اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی ترقی کے مانع نماز ہے کہ ایک شخص اسلام کی طرف راغب ہوتا ہے مگر جب وہ دیکھتا ہے کہ نماز بھی گلے پڑے گی تو اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ اسلام لانے سے رُک جاتا ہے نماز کو اسلام کی برادری سے علیحدہ کرنا چاہیئے افسوس یہ مسلمانوں کی رائے ہے۔

مِنّت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کُنی   مِنّت شناس از و کہ بخدمت بداشتت

(یہ احسان مت رکھ کہ تو بادشاہ کی خدمت کر رہا ہے بلکہ اس کا احسان مان کہ اس نے تجھ کو اپنی خدمت پر رکھ لیا ہے)۔

تو خدا تعالیٰ کا ہم پر احسان ہے کہ ہم کو نورِ اسلام دیا ہمارا کیا احسان ہے۔

صاحبو! اس آیت میں اور اپنی حالت میں ذرا غور کرو استبدال کی یہ بھی صورت ہے کہ جو آج کل ہو رہی ہے کہ مسلمان اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں اور غیر قومیں اسلام کی طرف جھکتی چلی جا

رہی ہیں تو گویا موجودہ حالت تمہید ہے استبدال کی۔

تدبیر اندیشہ مذکور سے بچنے کی

اگر اس اندیشے سے بچنے کی فکر ہے تو اس کی تدبیر یہی ہے کہ اپنے اس رویہ کو چھوڑ و اور وہ حالت پیدا کرو کہ جیسے ایک غلام کی حالت ہوتی ہے خدا تعالیٰ سے جو ہمارا تعلق ہے وہ آقا اور نوکر کا سا نہیں ہے بلکہ ہمارا تعلق خدا سے سید اور غلام اور محبّ اور محبوب کا ہے پس ہم کو ان ہی دو تعلقوں کو غلبہ دینا چاہیئے۔ کہ اپنے کو مملوک اور اس کو مالک اور اپنے کو محبّ اور اس کو محبوب سمجھیں لیکن ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ ہم تو محبّ نہیں بنتے کہ ہم پر حقوق واجب ہوں۔

سب مسلمان اللہ کے محبّ ہیں

تو میں کہوں گا کہ حضرات اب آپ کیا محبّ نہیں بنیں گے۔ محبّ تو آپ اس دن ہو چکے جس دن مسلمان کہلائے کیونکہ یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ **الشئی اذاثبت ثبت بلوا زمه** کہ جب کوئی چیز ثابت ہوتی ہے اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ اور اسلام کے لوازم سے ہے محبّ ہونا فرماتے ہیں وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (اور ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ سے انتہائی قوی محبت ہے) اور شدّتِ محبت ہی کا نام عشق ہے پس آپ تو عاشقِ خدا ہو چکے۔

شریعت اسلامی کے تمام احکام عقل کے مُطابق ہیں

صاحبو! مجھے اس موجودہ رفتار سے سخت اندیشہ ہے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ ایک جانب تو احکام اسلامیہ کے استحسان کو مانتے جاتے ہیں اور ان پر مضامین لکھتے ہیں کوئی نماز کی حکمت بیان کرتا ہے کوئی روزے کی حکمت بیان کرتا ہے ایک ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں جو یہ تعلیم ہے کہ اگر کسی برتن کو کتا چاٹ جائے تو اس کو سات مرتبہ دھو ڈالو جس میں ایک مرتبہ مٹی سے صاف کرو۔ ایک مدت تک میں سوچتا رہا کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ مٹی سے صاف کرنے کو کہا گیا آخر غور کرنے اور مٹی کے اجزاء کو دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مٹی میں ایک جز نوشادر کا بھی ہوتا ہے اور وہ کتے کی لعابِ دہن کی سمیت کو دفع کر دیتا ہے۔ ایک عیسائی نے لکھا ہے کہ شریعتِ اسلامی کے تمام احکام عقل کے مطابق ہیں یعنی کوئی حکم خلاف عقل نہیں اگرچہ بعض احکام احاطہ عقل سے باہر ہوں اور عقل ان کی لم دریافت نہ کر سکے اُدھر تو ان اجانب کی مدح سرائی کا یہ حال ادھر ہمارے مسلمان بھائیوں کی یہ حالت نہ دین سے واقفیت نہ متابعت اور اعتراض کرنے کو آمادہ

ہیں اسلامی تعلیم کے خلاف مضامین شائع کرتے ہیں کہ روزہ میں یہ خرابی ہے اور نماز سے ترقی رکتی ہے۔ اگر یہی رفتار ہے تو عجب نہیں کہ ایک صدی کے اندر اندر بہت سے مسلمان بالکل دائرہ اسلام سے خارج ہو جائیں اور غیر مسلم مسلمان ہو جائیں، صاحبو! حیرت کی بات ہے مجھے خدا تعالیٰ کا وہ قول یاد آتا ہے فرماتے ہیں وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ (سورۃ محمد:۳۸) (اگر تم روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ دوسری قوم پیدا کر دے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے) کہ یہ نہ سمجھو کہ مدار دین کا اور اس کی ترقی اور اشاعت کا تم پر ہے۔ یاد رکھو اگر تم اسلام سے روگردانی کرو گے خدا تعالیٰ تمہارے بجائے ایک دوسری قوم بھیجے گا جو تمہاری طرح نہ ہوگی تم کو تو احسان مند ہونا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نے تم کو ایسی نعمت دی قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ (حجرات:۱۷) (کہہ دیجئے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ تم مجھ پر اپنے اسلام کا احسان مت رکھو بلکہ اللہ تعالیٰ تم پر احسان جتلاتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت کی)۔

محبّ ہونے کا علم ضروری نہیں

اور اگر کہیے کہ ہم کو تو اپنا عاشق ہونا معلوم بھی نہیں پھر ہم کیونکر عاشق ہوئے تو سمجھیئے کہ کسی وصف کے حاصل ہونے کے لئے یہ ضرور نہیں ہے کہ اس کا علم یا اس کی طرف التفات بھی ہو۔ دیکھئے اگر ایک شخص مرے اور دس ہزار کی جائیداد چھوڑ جائے یا بنک میں دس ہزار روپیہ چھوڑے اور ایک نابالغ لڑکا وارث چھوڑے تو باپ کے مرنے کے بعد اس لڑکی کے لئے وصفِ مالکیت ثابت ہوا لیکن اس لڑکے کو خبر بھی نہیں تو ہماری بھی یہی حالت ہے کہ ہم کو عشق ہے اگر چہ خبر نہیں اور اس کی طرف التفات نہیں گویا وہ حالت ہے کہ۔

یک سبد نانے ترابر فرق سر　　　تو ہمے جوئی لب نادر بدر

(کہ ایک ٹوکرا بھرا ہوا روٹیوں کا سر پر رکھا ہوا ہے اور بھیک مانگتا پھرتا ہے)۔

اپنے محبّ ہونے کی اطلاع کا طریقہ

اور طریقہ خبر ہونے کا یہ ہے کہ۔

سالہا تو سنگ بودی دل خراش　　　آزموں رایک زمانے خاک باش

در بہاراں کے شود سر سبز سنگ　　　خاک شو تاگل بر دید رنگ رنگ

(برسوں تک تو پتھر کی طرح دل کو تکلیف دینے والا رہا۔ آزمائش کے طور پر تھوڑی

دیر کے لئے مٹی بن جا۔ بہار کے موسم میں بھی پتھر کب سرسبز ہوتا ہے۔ تو مٹی مرکب بن جا تا کہ تجھ میں رنگ برنگ کے پھول)۔

کہ آزمانے ہی کے لئے ایک تھوڑی مدت خاک ہوجاؤ تو آپ اگر اپنی دولت کی خبر چاہتے ہیں تو اپنے ادراک سے خبر لیجئے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ آنکھ ہو کیونکہ مثلاً اگر ایک نابینا مادرزاد رنگ کی حقیقت پوچھے تو اس سے یہی کہا جائے گا کہ رنگ تو تمہارے کپڑے ہی میں موجود ہے مگر اس کے لئے صرف ہاتھ کافی نہیں نہ محض سُن لینے سے اس کی حقیقت معلوم ہوسکتی ہے اگر اس کو دریافت کرنا چاہو تو اول آنکھ پیدا کرو۔

قرآن میں باطل تاویلیں کرنے والوں کی مثال

اسی طرح جو لوگ قرآن پاک میں تاویلیں کرتے ہیں اور اپنی رائے قرآن پاک کے معنے بیان کرتے ہیں تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ہاتھ سے رنگ کا دریافت کرنا جس طرح محض ہاتھ سے رنگ دریافت نہیں ہوتا اسی طرح محض رائے سے قرآن کے مقصود تک نہیں پہنچا جاسکتا۔

بر ہوا تاویل قرآن میکنی پست و کژ شد از تو معنی سنی

چوں ندارد جانِ تو قندیلہا بہر بنیش میکنی تاویلہا

کردۂ تاویل لفظِ بکر را خویش را تاویل کُن نے ذکر را

(تو اپنی خواہش کے موافق قرآن کے معنی بیان کرتا ہے تیری وجہ سے اچھے معنی خراب ہو گئے ہیں جب کہ تیرے پاس روشنی کی قندیلیں نہیں ہیں تو اس کے دیکھنے کے لئے تاویلیں کر رہا ہے تو نے لفظ بکر کی تاویل کی یعنی نئی تاویلیں کر رہا ہے حالانکہ تجھے اپنی خواہشات کو بدل کر قرآن کے موافق کرنا چاہیئے قرآن کو نہیں بدلنا چاہیئے)۔

صاحبو! اپنے اندر تصرف کرو کلام اللہ میں تصرف نہ کرو اپنی آنکھیں کھولو اور اس سے حجاب اٹھاؤ پھر دیکھو تم کو کیا کنز مکنوں نظر آتا ہے اور وہ۔

حبِّ دنیا حجاب ہے

حجاب حُبِّ دنیا ہے میں بقسم کہتا ہوں کہ یہ مال وجاہ کی محبت بہت بڑا حجاب ہے اسی کی محبت تھی کہ بنی اسرائیل کے علماء باوجودیکہ ان کو آپ کا نبی ہونا معلوم تھا لیکن نہ لاتے تھے جانتے تھے پر مانتے نہ تھے۔ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ۔ لیکن باوجود اتنی معرفت کے ان کو حقیقت نظر نہ آتی

تھی کیونکہ حبِ مال وجاہ کا حجاب آنکھوں پر پڑا ہوتا تھا اور جب حقیقت معلوم نہیں ہوتی تو دل میں وقعت اور عظمت نہیں ہوتی۔ دیکھئے اگر کوئی آگ میں کود ے تو اگر چہ کہا جائے گا کہ یہ آگ کو جانتا تھا لیکن یہ نہ کہا جائے گا کہ آگ کی حقیقت اس کی نظر میں تھی۔

تمام جرائم کے ارتکاب کا سبب

اور جتنے جرائم اس قسم کے لوگ کرتے ہیں اس کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ان کو اصلی حقیقت اس چیز کی معلوم نہیں ہوتی اکثر عورتیں اور بعض مرد بھی کنوئیں میں گر جاتے ہیں لیکن گرنے کے بعد جب ان کو کنوئیں کی حقیقت معلوم ہوتی ہے اس وقت کوئی ان سے پوچھے کہ کنوئیں میں گرنے کی بابت اب آپ کا کیا فتویٰ ہے لکھنو میں ایک صاحب نے کسی بات پر طیش میں آکر سنکھیا کھالیا۔ کھا تو گئے لیکن جب کھانے کے بعد اس کی حقیقت معلوم ہوئی تو آنکھیں کھلیں پھر یہ حالت تھی کہ لوگوں سے التجائیں کرتے تھے کہ کسی طرح مجھے اس سے نجات دلواؤ تو بنی اسرائیل کو اگر چہ معرفت تھی لیکن آپ کی حقیقت ان سے مخفی تھی اس لئے کہ حجابات مرتفع نہ ہوئے تھے اور ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شُد صد حجاب از دل بسُوئے دیدہ شُد

(جب غرض آتی ہے ہنر پوشیدہ ہوجاتا ہے دل سے سینکڑوں پردے آنکھوں پر پڑ جاتے ہیں)

حجاب حُبِ دنیا کے دُور کرنے کا طریقہ

پس آپ ان حجابوں کو دور کر دیجئے حقیقت بالکل قریب ہے بلکہ حقیقۃ الحقائق جل وعلا کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ہم شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں) حضرت بایزید بُسطامیؒ نے خداوند تعالیٰ کو خواب میں دیکھا عرض کیا کہ یَارَبِّ دَلِّنِیْ عَلٰی اَقْرَبِ طُرُقٍ اِلَيْکَ کہ اے خدا مجھے آپ تک پہنچنے کا وہ رستہ بتلا دیجئے جو سب سے زیادہ قریب کا ہے سبحان اللہ کیسے سچے رہبر تھے کہ ہمارے لئے کتنا سہل رستہ تحقیق کر گئے یہ آج جو لوگ آسانی سے منزلیں طے کرتے چلے جا رہے ہیں انہیں حضرات کا طفیل ہے غرض خواب میں عرض کیا کہ اَے خدا مجھے قریب کا رستہ بتلا دیجئے ارشاد ہوا کہ یابا یزید دع نفسک وتعال کہ پندار اور خود بینی کو چھوڑ دو پھر راستہ سیدھا ہے بے خطر چلے آؤ اس مضمون کا عارفِ شیرازیؒ نے ترجمہ کیا ہے فرماتے ہیں ؎

میانِ عاشق ومعشوق ہیچ حائل نیست تو خود حجابِ خودی حافظ از میاں بر خیز

(عاشق اور معشوق کے درمیان میں کسی چیز کا پردہ نہیں ہے حافظ تو خود ہی پردہ بنا ہوا

ہے تو ہی درمیان سے ہٹ جا)۔

حقیقت میں سچ کہا ہے صاحبو! اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ آپ کے پاس دولتِ حبِّ خداوندی ضرور ہے۔

کفّار کی حق تعالیٰ سے محبت کی دلیل

بلکہ اہل تدقیق (باریک بین) تو کہتے ہیں کہ کفار کو بھی خدا تعالیٰ سے محبت ہے کیونکہ قرآن پاک میں کفار کو محرومی دیدار کی دھمکی دی گئی ہے اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُوْنَ کہ ان کو خدا کا دیدار نصیب نہ ہوگا اور محرومی دیدار سے اسی وقت دھمکی ہو سکتی ہے کہ جب ان کو خدا سے محبت ہو اور محرومی کی خبر سے ان کو تکلیف پہنچے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک بدیہی ثبوت بھی ہے کہ ہم لوگ اپنے خیال میں جس کو دین سمجھتے ہیں اگر کسی کو اس کے خلاف دیکھتے ہیں تو ہم کو اس پر کس قدر طیش آتا ہے کہ ہم اس کے درپے آزار ہو جاتے ہیں اور دل کو اس سے نفرت ہو جاتی ہے آخر یہ نفرت اور وحشت کیوں ہے اس لئے کہ وہ طریق جس کو ہم دین سمجھتے ہیں ہمارا محبوب ہے کیونکہ وہ ہمارے خیال میں خدائی رستہ ہے جو کہ خدا نے ہم کو بتلایا ہے پس ہماری محبت کی ایسی مثال ہے جیسے کہ راکھ کے نیچے چنگاری دبی ہوتی ہے کہ اگر اس کو چھیڑا اور کریدا نہ جائے تو وہ نظر بھی نہیں آتی لیکن وہی چنگاری جب راکھ سے باہر نکلتی ہے تو شہر کے شہر جلا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے اور اگر کسی کو اب بھی شک رہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر براہ راست خدا سے محبت معلوم نہیں ہوتی تو اس شخص کو کسی سے تو محبت ہوگی۔ کم از کم اپنی جان سے تو ضرور اس کو محبت ہوگی ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محبت کسی نہ کسی کمال کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے علم و فضل حسنِ صورت حسنِ سیرت اور تیسرا مقدمہ یہ ہے اور مسلم ہے کہ ہر کمال ظلّ کمالِ خداوندی ہے تو ہر شخص اگرچہ وہ کسی کا عاشق ہو واقع میں کمالِ خداوندی کا عاشق ہے اور یہی معنی ہیں محبت خدا کے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے دیوار پر دھوپ دیکھی اور اس نور کی وجہ سے وہ دیوار کا عاشق ہو گیا اس صورت میں ہر شخص جانتا ہے کہ یہ شخص واقع میں دیوار کا عاشق نہیں آفتاب کا عاشق ہے کیونکہ دیوار کا عشق ایک کمال کی وجہ سے پیدا ہوا تھا یعنی نُور اور وہ کمال واقع میں آفتاب کا کمال ہے نہ کہ دیوار کا یہی وجہ ہے کہ جب آفتاب چھپ جاتا ہے اور اس سے وہ نور زائل ہو جائے عشق بھی زائل ہو جاتا ہے اسی کو کہا ہے ؎

عشق با مُردہ نہ باشد پائیدار　　عشق را باحیّ و باقیوم دار

عشق ہائے کز پے رنگے بود　　عشق نبود عاقبت ننگے بود
عاشقی بامُردگاں پائندہ نیست　　زانکہ مُردہ سوئے ما آیندہ نیست

(مرنے اور فنا ہونے کے ساتھ عشق ومحبت مضبوط نہیں ہونے، عشق اس ذات کے ساتھ قائم کر جو زندہ اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے جو محبتیں رنگ وروپ کی وجہ سے ہوتی ہیں وہ عشق نہیں ہے اس کا انجام تو شرمندگی ہے مردوں کے ساتھ عشق کرنا قائم نہیں، اس لئے کہ مرنے والا مر کر پھر ہماری طرف آنے والا نہیں ہے)۔

ہر شئی کا کمال ظلّ کمال خداوندی ہے

علیٰ ہذا جس چیز کا بھی جو کمال ہے وہ واقع میں کمال خداوندی کا ظل ہے خود اس کا ذاتی نہیں دیکھئے ہر چیز کمال کے ساتھ اگر ایک وقت متصف ہے تو دوسرے وقت اس سے خالی بھی ہے تو اس خلو کی یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک وہ کمال خدا تعالیٰ کی جانب سے عطا نہیں ہوا اسی طرح جب اس کے ساتھ اتّصاف ہوتا ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ ادھر سے فیضان ہو گیا اس لئے ایک بزرگ لکھتے ہیں ۔

حسنِ خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ　　پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ

(تُو نے اپنی خوبی کو خوبصورتوں کے چہروں سے ظاہر کر دیا ہے مگر تو عاشقوں کی نظروں میں تماشا بن گیا)۔

عشق کمال سے ہوتا ہے

اس کے یہ معنی نہیں کہ نعوذ باللہ خدا کو حسینوں کے ساتھ اتحاد ذاتی ہے یا اس نے ان میں حلول کیا ہے کیونکہ یہ عقیدہ تو ایمان کے بالکل خلاف ہے اور کفر ہے کوئی عامی بھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا اگر ذرا سمجھ سے کام لے چہ جائیکہ کسی صاحبِ دل کے کلام کے یہ معنے ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس ذات مجمع الصفات کے مظہر ہیں اور اس مسئلہ کو زیادہ تفصیل کی اس موقع پر ضرورت نہیں یہ فن کا مستقل مسئلہ ہے۔ غرض جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ عشق کمال سے ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ہر کمال واقع میں کمال خداوندی ہے اگر چہ وہ دوسرے کے اندر نظر آئے۔

عاشق پر معشوق کے کیا حقوق ہیں

تو یہ بات بلا شک ثابت ہو گئی کہ ہر عاشق خدا کا عاشق ہے اس کے معلوم کر لینے کے بعد اب یہ دیکھئے کہ عاشق خدا کا عاشق ہے اس کے معلوم کر لینے کے بعد اب یہ دیکھئے کہ عاشق کو

معشوق سے کس قسم کا تعلق ہوتا ہے اور اس کے دل میں معشوق کی کتنی عظمت اور وقعت ہوتی ہے کیا اگر کسی عاشق کو اس کا معشوق حکم کرے کہ تم میرے پاس آؤ یا گرمی کے چلچلاتے ہوئے دو پہر میں چار کوس تک برہنہ پا جلتے ہوئے ریت پر چلنے کا حکم کرے تو وہ عاشق انکار کرے گا یا اس سے اس حکم کے مصالح پوچھے گا ہرگز نہیں اور اگر کوئی مدعی معشوق کے حکم پر لم اور کیف کرے تو کیا اس کو اس دعوے میں سچا کہا جائے گا کبھی نہیں ظاہر ہے کہ اگر اس کو سچا عشق ہوگا تو اس کے بُلانے پر دوڑا ہوا آئے گا بلکہ اگر کوئی روکنا بھی چاہے تو ہرگز نہیں رُکے گا اور کہے گا کہ مجھ میں امتثال کی وہ حرارت بھری ہے کہ یہ روک اس کے سامنے کچھ بھی نہیں غرض کسی قسم کے کسی اَمر و نہی میں اس کو ذرا بھی پس و پیش نہ ہوگا لوگ اس کی حرکات پر اس کو دیوانہ بتلائیں گے پاگل کہیں گے مگر اس کو ان خطابوں سے ذرا عار نہ ہوگی بلکہ وہ نہایت خوش ہوگا اور کہے گا کہ

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم　　مستِ آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر غریب و مفلس ہیں یا اگر دیوانہ ہیں تو کیا ہوا، ہم اس ساقی اور اس حقیقی پیمانے کے مست و عاشق ہیں)۔

لیکن وہ نہایت مسرور ہیں اس واسطے کہ ان کا یہ مذہب ہے کہ

عذل العوا ذل حول قلبی التائه　　وهوی الا حبه منه فی سودائه

(کہ ملامت گر کی ملامت تو قلب کے باہر ہے اس کے گرداگرد چکرا کر رہ گئی ہے اور محبت سویدائے قلب تک پہنچ کر جا گزیں ہو چکی ہے)۔

الحاصل جب معلوم ہوا کہ عاشق کو معشوق کے ساتھ یہ برتاؤ چاہیئے اور ہم خدا کے عاشق ہیں جیسا ابھی ثابت ہوا تو ہم کو بھی اس کے ساتھ یہی برتاؤ رکھنا چاہیئے اور اس کے احکام کے امتثال میں بے چون و چرا گردن جھکا دینی چاہیئے۔

درویش اور طالب علم میں فرق

مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ہر طالب علمی کہ چون و چرا نکند و ہر درویشے کہ چون و چرا کند ہر دو را در چراگاہ باید فرست۔

(جو طالب علم استاد سے اپنی معلومات پوچھ کر نہ بڑھائے، اور جو درویش اپنے پیر سے جھک جھک کرے دونوں اس قابل ہیں کہ ان کو جنگل کی طرف بھگا دیا جائے)۔

وجہ یہ ہے کہ طالب علم اور تعلم کے وقت طلب فن میں ہے اور حصول فن کے لئے لازمی ہے کہ

سوالات کرے اور قیل وقال سے مسئلے کی تہ تک پہنچے اور سالک سلوک کرتے وقت عمل میں مشغول ہے اس کے لئے جرح وقدح (بحث مباحثہ) موجب حرمان (محرومی کا سبب) اور سبب ہلاکت ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک حکیم کے مطب میں کچھ مریض بھی علاج کرانے کو آئیں اور کچھ لوگ طلب فن کے لئے درسیاتِ طب پڑھنے بھی آئیں پس اگر ان طالبین فن میں سے کوئی شخص درس کے وقت بالکل خاموش بیٹھا رہے اور کسی قسم کا سوال نہ کرے تو وہ طبیب اس کو نالائق کہہ کر درس سے اٹھا دے گا لیکن اگر کوئی مریض نسخہ لکھواتے وقت کسی قسم کی چون و چرا کرے اور ادویہ یا ان کے اوزان کی حکمت دریافت کرنے لگے تو اس کے ساتھ بھی وہی برتاؤ ہوگا غرض طالب علم کا گڑبڑ کرنا اور حکمت و مصلحت دریافت کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ بے موقع نہیں اور عوام کا چون و چرا کرنا بُرا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ بے موقع ہے لیکن یہ مرض کچھ ایسا عام ہوا ہے کہ ہر شخص احکام کی حکمتیں دریافت کرنے کے درپے ہے اور اپنے کو حکمتیں سمجھ لینے کے قابل سمجھتا ہے۔

ایک پٹواری کا حکمت میراث کا سوال

ایک شخص نے جو کہ پٹواری گری کرتے تھے میرے پاس ایک مسئلہ فرائض کا بھیجا صورتِ مسئلہ یہ تھی کہ ایک شخص مرا اور اس نے ایک بھتیجا اور ایک بھتیجی چھوڑی میں نے جواب دیا کہ بھتیجے کو حصہ پہنچے گا اور بھتیجی محروم ہوگی کہنے لگے کہ آخر اس کی کیا وجہ بھتیجی بھی تو اس بھتیجے کی بہن ہی ہے اس کو کیوں نہیں ملے گا میں نے کہا کہ جناب پٹواری گری کرتے ہیں اس کو چھوڑیئے اور آ کر درسیات شروع کیجئے تین چار برس تک عربی کی کتابیں پڑھیئے اس کے بعد پھر دریافت کیجئے تو بتلا دیں گے۔ راز اس میں وہی ہے طالب علم طالبِ فن ہوتا ہے اور عوام محض عمل کے لئے مسئلہ دریافت کرتے ان کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کہ حکم مسئلہ کا معلوم ہو جائے وبس، دوسرے ایک راز اس میں یہ بھی ہے کہ طالب علم کو یہ تمیز ہوتی ہے کہ کون سی بات دریافت کرنے کے قابل ہے اور کون سی نہیں اس لئے وہ جو کچھ دریافت کرتا ہے سمجھ بوجھ کر کام کی بات پوچھتا ہے برخلاف عوام کے کہ ان کو اس کی تمیز نہیں ہوتی۔

نماز پنجگانہ کی دلیل پوچھنے والے کی حکایت

ایک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ نماز پانچ وقت کی کیوں مقرر ہوئی میں نے بطور نظیر کے ان سے پوچھا کہ اول یہ بتلایئے کہ آپ کی ناک چہرے پر کیوں لگائی گئی کمر پر کیوں نہیں لگائی گئی جب اس ترتیب کے وجوہ اور مصالح سب آپ کو معلوم ہو جائیں تو اس کے بعد اوقات

نماز کی تعیین کے مصالح دریافت کیجئے گا غرض جس کو فن سے مناسبت نہیں ہوتی اس کا بولنا ہمیشہ بے موقع ہوتا ہے اور اس لئے وہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

حضرت امام ابو یوسفؒ کی حکایت

ایک مرتبہ امام ابو یوسفؒ بیٹھے ہوئے کچھ بیان فرمار ہے تھے اور پوچھ بھی رہے تھے ان ہی میں ایک شخص بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا آپ نے فرمایا کہ بھائی تم بھی کچھ پوچھو۔ عرض کیا اب پوچھوں گا۔ بیان میں آپ نے فرمایا کہ جب آفتاب غروب ہو جائے تو افطار میں دیر نہ کرے اس شخص نے کہا اگر اجازت ہو تو میں بھی کچھ بولوں امام صاحب نے فرمایا کہو تو کہتا ہے کہ اگر کسی روز آفتاب ہی غروب نہ ہو تو کیا کریں امام صاحب نے فرمایا کہ تمہارا خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔

ایک خاموش رہنے والی دلہن کی حکایت

اسی طرح مشہور ہے کہ ایک دلہن بالکل بولتی ہی نہ تھی اس کی ساس نے اس سے کہا دلہن تم بھی بولا کرو تم خاموش کیوں رہتی ہو دلہن نے کہا کہ بہت اچھا اب بولوں گی چنانچہ ایک روز بولی۔ ساس کو خطاب کر کے کہنے لگی کہ اماں بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر تمہارا لڑکا مر گیا تو میرا نکاح کسی دوسرے سے بھی کر دو گی، ساس نے کہا کہ دلہن بس تم خاموش ہی رہا کرو۔ تمہارے لئے وہی بہتر ہے۔ تو دیکھئے تمیز نہ ہونے کی وجہ سے بات بھی پوچھی تو کیسی خوبصورت کہ ساس کا کلیجہ ہی ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔

مسائل کے دلائل سمجھنے کے لئے علوم اصطلاحیہ کی ضرورت

اسی طرح فرض کرو کہ ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ مثلث کے تین زاویے مل کر دو قائموں کی برابر ہوتے ہیں تو جس شخص کو اقلیدس سے مناسبت نہ ہو اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آ سکتا کہ کیونکہ تین زاویے دو قائموں کی برابر ہوں گے اگر چہ اس کو سمجھانے کے لئے کوئی اقلیدس ثانی ہی پیدا ہو ہاں اگر اس کو سمجھنے کا شوق ہے تو اول اقلیدس حاصل کرے اس کے بعد نہایت آسانی سے یہ مسئلہ اس کو حل ہو جائے گا کیونکہ وہ علوم متعارفہ اور اصول موضوعہ سے واقف ہو گا۔ بلکہ جب اقلیدس سے مناسبت ہو جائے گی تو اپنے اس پہلے سوال پر ہنسے گا اور کہے گا کہ واقعی میرا سوال قبل از وقت تھا میں اس سے بھی زیادہ واضح مثال دیتا ہوں اگر چہ وہ ایک گونہ فحش مثال ہے لیکن اس سے یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ میں آ جائے گی کہ قبل از وقت کی چیز سمجھ میں نہیں آ سکتی فرض کرو کہ ایک بہت

بڑا ماہر حکیم ایک چار برس کے بچے کو جماع کی لذت اور اس کا طریقہ سمجھانا چاہے یہ ممکن ہے کہ وہ بچہ آرے اور بلے (ہاں) کہہ دے لیکن اس کی حقیقت کبھی اس کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ البتہ وہی بچہ جب تھوڑے دن کے بعد جوان ہوگا اور سنِ بلوغ کو پہنچے گا تو بغیر کسی کی تعلیم کے خود بخود لذتِ جماع کی حقیقت ذوقی کے طور پر اس کو معلوم ہو جائے گی اور اگر خود نہ بھی معلوم ہوئے تو تھوڑا سا اشارہ کافی ہوگا لیکن طالب علم بھی اگر کسی وقت طلبِ عمل میں ہو تو اس وقت اس کو بھی مناسب نہیں کہ اس عمل کی حکمتیں دریافت کرے مثلاً ایک طالب علم کو نماز میں کوئی شبہ ہوا اور اس نے کسی عالم سے اس کے متعلق مسئلہ دریافت کیا تو اس وقت اس کو مناسب نہیں کہ اس عالم کے جواب میں چون و چرا کرے اور علل دریافت کرنے کی دِرپے ہو بلکہ اس وقت سن کر تسلیم کرے اور اسرار کے دریافت کو کسی دوسرے وقت پر اُٹھا رکھے اور اگر اس وقت دریافت کرے گا تو مجیب اگر حکیم ہے تو بھی اس کو جواب نہ دے گا اور اگر نرا خلیق ہے تو جواب کے لئے تیار ہو جائے گا چنانچہ اس وقت عوام کے اخلاق کو زیادہ تر علماء کے اخلاق ہی نے خراب کیا ہے کہ اکثر علماء کو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ جواب سائل کے مذاق کے موافق ہو اُدھر علماء کی یہ شفقت ادھر سائلین کا یہ جہل کہ ان کو یہ خبر نہیں کہ کون سی بات ضابطے کی رو سے ہم کو پوچھنی چاہیئے اور کون سی بات میں بغیر لم اور کیف کے سر تسلیم جھکا دینا چاہیئے غرض دونوں کی بدولت عوام تباہ ہوئے۔

احکام شرعیہ کے ساتھ ہمارا مشرب عاشقانہ ہونا چاہیئے

صاحبو! شریعت کے احکام کے ساتھ ہمارا بالکل وہ مذہب ہونا چاہیئے جو عاشق کا معشوق کے ساتھ اور مملوک کا مالک کے ساتھ ہوتا ہے مشہور ہے کہ ایک شخص نے ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا کہ تیرا کیا نام ہے اس نے کہا کہ جو آپ مقرر کریں پھر آقا نے پوچھا کہ تو کیا کھایا کرتا ہے غلام نے کہا جو آپ کھلائیں اسی طرح لباس کے متعلق سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ جو کچھ آپ پہنائیں وہی لباس ہے تو صاحبو! کیا خدا سے جو علاقہ ہمارا ہے وہ غلامی نہیں ہے۔ بلکہ اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہم کو حقیقی غلامی حاصل ہے۔ دیکھو انسانی غلامی سے انسان ایک وقت میں نکل بھی سکتا ہے۔ یعنی جب کہ آقا غلام کو آزاد کر دے برخلاف ہماری غلامی کے کہ یہ طوق ہماری گردن سے کبھی نکل ہی نہیں سکتا کیونکہ اس غلامی سے آزادی کی یہی صورت ہے کہ نعوذ باللہ ہم بندے نہ رہیں اور خدا خدا نہ رہے اور یہ غیر ممکن تو ہماری آزادی بھی غیر ممکن نتیجہ یہ نکلا

کہ ہماری آزادی محال عقلی ہے اور ہم ہمیشہ کے لئے غلام ہیں تو ہم کو غلام ہی کا برتاؤ بھی کرنا چاہیئے اور کسی حکم کے امتثال میں گرانی نہ ہونی چاہیئے اور میں کہتا ہوں کہ احکام کے دشوار معلوم ہونے سے ان میں کسی قسم کا شبہ کرنا تو بالکل ہی لغو ہے کیونکہ احکام کا نفس پر گراں گذرنا یہی تو دلیل ہے اس حکم کے خداوندی حکم ہونے کی کیونکہ جو حکم نفس کے موافق ہو اس کو تو نفس خود ہی اپنے لئے تجویز کر لیتا ہے اُس میں کسی دوسرے کے حکم کرنے کی کیا ضرورت تو خدا کی جانب سے تو وہی احکام مقرر ہوں گے جو کہ نفس پر بار ہوں تاکہ خدا تعالیٰ دیکھیں کہ جو کچھ کرتے ہو اس سے اپنے نفس کا خوش کرنا منظور ہے یا خدا کا اور اس خوش کرنے میں بھی ہماری ہی مصلحت ہے نہ کہ خدا کی ؎

من نکر دم خلق تا سُودے کنم　　　بلکہ تا بر بند گاں جُو دے کنم

(میں نے مخلوق کو اپنے لئے پیدا نہیں کیا بلکہ اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ اپنے بندوں پر سخاوت کریں)۔

اتنا وسیع نظام عالم ہمارے ہی فائدے کے لئے ہے اور ہمیں کو نفع پہنچانا مقصود ہے اور ہر ہر طرح ہماری ہی مصلحتوں پر نظر ہے البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہماری مصالح حال کی بھی جن کو ہم نے اختراع کر کے مصلحت کا لقب دیا ہے ان احکام میں رعایت ہو لہٰذا ہم کو بھی یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ فی الحال ہماری کیا مصلحت ہے بلکہ اگر مصالح حال پر نظر ہوتی تو احکام بتلانے کی ہی کیا ضرورت تھی جب ہم نے مصالح کو اختراع کیا تھا ان کے مناسب تجاویز بھی خود ہی سوچ سکتے تھے۔

احکام میں سختی ان کے من اللہ ہونے کی دلیل ہے

غرض احکام کی سختی وسوسہ کا سبب ہوتی ہے لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سختی ہی ان احکام کے من اللہ ہونے کی دلیل ہے دیکھئے جب بچہ کا دودھ چھڑاتے ہیں تو کیسی کچھ مصیبت ہوتی ہے کتنی تکلیف بچہ کو پہنچتی ہے اور وہ دودھ پینے کے لئے کیا کچھ ضد یں کرتا ہے لیکن اس کی ایک نہیں سنی جاتی بلکہ کبھی ایلوا لگا کر کبھی کسی دوسری تدبیر سے اس کو دودھ پینے سے روکا جاتا ہے وجہ یہی ہوتی ہے کہ ماں باپ بچے سے زیادہ اس کی مصلحتوں کو جانتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس وقت اس کی مرضی کے موافق کیا گیا تو جوان ہو کر تباہ ہو گا اور ساری عمر اسی بلا میں مبتلا رہے گا بعینہٖ یہی حالت انسان کے نفس کی ہے ارشاد ہے۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (کہ اگر حق ان کی خواہشوں کے تابع ہو جائے تو زمین و آسمان سب خراب اور برباد ہو جائیں) بس ہمارے لئے یہی

شفقت ہے کہ ہماری ایک نہ سنی جائے جس طرح بچے کی رائے کو نہیں سنا جاتا اور محض اس وجہ سے کہ جوان ہو کر جو اجزائے بدن حرارت سے تحلیل ہوتے ہیں ان کے لئے صرف دودھ بدل ما یتحلل نہیں ہو سکتا بچے کی ضد کو مسترد کر دیا جاتا ہے حالانکہ بچے اور اس کے ماں باپ کا علم باوجود متفاوت ہونے کے پھر بھی کسی درجے میں متقارب ہے کیونکہ دونوں متناہی ہیں اور متناہیین کا تقارب ظاہر ہی ہے۔

مخلوق اور خالق کے علم میں کوئی مناسبت نہیں

برخلاف بندے کے علم اور خدا کے علم کے کہ دونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں بلکہ تمام کائنات کے علم کو بھی خدا کے علم سے کوئی تناسب نہیں ہے کیونکہ مجموعہ کائنات کا علم کیسا کچھ بھی ہو پھر بھی متناہی تو ضرور ہوگا برخلاف علم خداوندی کے کہ وہ غیر متناہی ہے خوب کہا ہے۔

اگر آفتابست یک ذرہ ایست　　دگر ہفت دریاست یکقطرہ ایست

چہ سلطانِ عزت علم بر کشد　　جہاں سر بجیب عدم در کشد

(اگر وہ آفتاب ہے تو تُو اس کے مقابلہ میں ذرہ کی حیثیت ہے اگر وہ سات دریا کے برابر ہے تو تُو قطرہ جیسا ہے۔ جب بادشاہ اپنی عزت کا جھنڈا بلند کرتا ہے تو ساری دنیا عدم کے گریباں میں سر چھپا لیتی ہے)۔

مسئلہ وحدت الوجود در حقیقت حالی ہے

اور یہی وہ کیفیت ہے جس کو اہل فن نے وحدت الوجود کہا ہے وحدت الوجود کے جو معنے عوام میں مشہور ہیں کہ میں بھی خدا اور تو بھی خدا اور در و دیوار بھی خدا یہ معنی بالکل غلط ہیں اور بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی بالکل ہی موجود نہیں یہ بھی بالکل غلط ہے اور قرآن و حدیث کے بالکل خلاف ہے ارشاد خداوندی ہے۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (اللہ تعالیٰ ہر چیز کے پیدا کرنے والے ہیں اور وہی ہر چیز کے ذمہ دار ہیں) حقیقت میں یہ حالی مسئلہ ہے قالی نہیں وہ حال یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی ذات پیش نظر آتی ہے اس وقت دوسروں کا اور اپنا وجود کالعدم معلوم ہوتا ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک شخص اگر کسی خیال میں منہمک ہو تو اس کو دوسری تمام چیزوں کی طرف مطلق التفات نہیں ہوتا اگر کوئی اس کو آواز دیتا ہے تو وہ نہیں سنتا بلکہ بعض اوقات خاص خیالوں میں اس قدر انہماک ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی سر کے پاس آ کر آواز دے تو مطلق خبر نہیں ہوتی اس کیفیت میں وہ شخص محاورے میں مجازاً کہہ سکتا ہے کہ **لاموجود الااللہ**

مرالفلافی لیکن ظاہر ہے کہ یہ کہنا واقع کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنی کیفیت کے اعتبار سے ہے اسی طرح وحدۃ الوجود بھی ایک اصطلاح ہے صوفیہ کی کہ وہ اپنی اس قسم کی کیفیت کو وحدۃ الوجود کے عنوان سے مجازاً تعبیر کرتے ہیں جس طرح قرآن وحدیث کے محاورات میں مجاز کا استعمال ہوتا ہے اسی طرح اصطلاح تصوف میں بھی کیونکہ وہ بھی قرآن وحدیث ہی سے مستنبط ہے تو خلاصہ وحدۃ الوجود کا یہ نکلا کہ یہ وجودات متکثرہ گویا کہ نہیں ہیں پس حکم وحدۃ

خلاصہ وَحدت الوجود

مجازاً ہوا اسی کو ان اشعار میں حل کیا ہے ۔

اگر آفتابست یک ذرہ نیست   وگر ہفت دریاست یک قطرہ نیست

چو سلطانِ عزت علم بر کشد   جہاں سر بجیب عدم در کشد

بلکہ ان اشعار ہی میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ موجودات کچھ ہیں ضرور کیونکہ آفتاب اور دریا کے ساتھ است کا حکم کیا گیا ہے باقی آگے جو کہا ہے کہ جہاں سر بجیب عدم در کشد اس سے بھی یہی مراد ہے کہ اس کا وجود کالعدم ہو جاتا ہے ایک دوسرے موقع پر اس سے بھی زیادہ صاف عنوان سے بیان کیا ہے لکھتے ہیں ۔

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید   خجل شد چو پہنائے دریا بدید،

کہ ایک قطرہ ابر سے انا کذ او کذا کہتا چلا مگر دریا کی وسعت دیکھ کر شرمندہ ہو گیا اور باوجودیکہ اپنے اندر نورانیت اور شفافی سب کچھ پاتا تھا لیکن کہتا ہے ۔

کہ جائیکہ اوہست من کیستم   گر اوہست حقا کہ من نیستم

(اگر جس جگہ وہ موجود ہے میں کون ہوتا ہوں درحقیقت اگر وہ ہے تو میں قابل شمار نہیں ہوتا)۔

اس کے بعد شیخ نتیجہ نکالتے ہیں کہتے ہیں کہ

ہمہ ہر چہ ہستند ازاں کمتر اند   کہ باہستیش نام ہستی برند

کہ اگرچہ سب موجود ہیں لیکن ذاتِ باری کے سامنے سب کی ہستی ہیچ ہے۔ زیادہ وضوح کے لئے اس کو ایک اور مثال میں سمجھو مثلاً کسی گاؤں میں جہاں سب جاہل ہوں ایک شخص قل ہواللہ کا حافظ ہو اور تمام گاؤں کے لوگ اس کو حافظ کہتے ہوں اتفاق سے اسی گاؤں میں کوئی ماہر قاری آ جائے جس کو علاوہ حفظ قرآن شریف و مشق سبعہ میں بھی مہارت ہو اور اس قاری کے سامنے کوئی شخص اس قل ہواللہ کے حافظ صاحب کہہ کر پکارے تو اندازہ کیجئے کہ اس کی کیا حالت ہو

گی شرم سے گڑ جائے گا اور اپنے کو اس قاری کے سامنے ہیچ تصور کرے گا اور اسی پر کیا منحصر ہے ہر شخص کے تمام دعاوی انانیت اس وقت تک ہیں کہ جب تک اپنے اوپر نظر ہے جس وقت کسی اپنے سے بڑے پر نظر پڑے اس وقت معلوم ہو کہ ہمارے کمالات کیا وقعت رکھتے ہیں ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک گاؤں کا چودھری اپنے بیٹے کے ساتھ چلا جا رہا تھا رستہ میں بادشاہ کا لشکر پڑا دیکھا اس کی صولت اور حشمت دیکھ کر ڈر گیا اور آگے جانے کی ہمت نہ ہوئی لڑکے نے کہا ابا آپ کیوں ڈرتے ہیں اگر بادشاہ ہے تو کیا ہوا آپ بھی تو اپنے گاؤں کے چودھری ہیں چودھری نے جواب دیا کہ بھائی میں اگرچہ چودھری ہوں لیکن میری حکومت صرف اسی قطعہ گاؤں تک ہے اور وہ بھی جب کہ مجھ سے کوئی بڑا وہاں موجود نہ ہو یہ بادشاہ ہے اس کی حکومت سارے ملک پر ہے اس کے سامنے کوئی چیز بھی نہیں اس پر شیخ شیرازی فرماتے ہیں ۔

تو اے غافل از حق چنا در دہی   کہ برخویشتن منصبے مے نہی

(غافل تو اللہ تعالیٰ سے ایسی طرح معاملہ کر رہا ہے کہ تو نے اپنے لئے بھی ایک خاص درجہ مقرر کر رکھا ہے)۔

تحصیلدار اُسی وقت تک تحصیلدار ہے کہ گورنر کے سامنے نہ ہو لیکن اس کے سامنے آنے کے بعد اس کی تحصیلداری ہیچ ہے اگر گورنر کے سامنے کوئی اس کو حضور کہہ دے تو عرق عرق ہو جائے گا بس یہی حالت وحدۃ الوجود کی ہے میں بہ قسم کہتا ہوں کہ جس وقت حضور خداوندی ہوتا ہے اپنی تعظیم سے بلکہ اپنے کو موجود کہنے سے شرم آتی ہے اور جس قدر حضور خداوندی میں ترقی ہوگی اس کیفیت میں ترقی ہوتی جائے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سادگی

چنانچہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم جو سب سے زیادہ اعلم باللہ ہیں بلکہ آپ کا ارشاد ہے: انا اعلمکم باللّٰہ (تفسیر الکشاف: ۱۳۹) (میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا علم رکھنے والا ہوں) آپ کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے کہ باوجود سردار عالم ہونے کے کس قدر سادگی آپ کے ہر ہر انداز میں تھی بیٹھنے میں بھی آپ نے کوئی ممتاز جگہ نہیں بنائی حتی کہ لوگ جب زیارت کو آتے تو صحابہؓ سے دریافت کرتے مَنْ مُحَمَّدٌ فِیکُمْ (تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں) صحابہؓ جواب دیتے کہ ھٰذا الْاَبْیَضُ الْمُتَّکِئُ (یہ جو گورے گورے سہارا لگائے بیٹھے ہیں) اور سہارا لگانے کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھے کہ حضور کوئی گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے عربی محاورے میں ہاتھ پر سہارا لگا لینے کو بھی

اِتکا کہا جاتا ہے یہ ضروری نہیں کہ تکیہ وغیرہ ہی ہو چلنے میں یہ حالت تھی کہ ہمیشہ مے جلے چلتے تھے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ باوجودیکہ آپ کی شان یہ ہے کہ ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''۔

بات یہی تھی کہ حضور کو ذات باری کی عظمت ہمیشہ پیش نظر تھی ۔غرض آپ کے کسی انداز سے بھی امتیاز اور بڑائی کی شان نمایاں نہیں ہوتی اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے تو مدینے کے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان نہیں سکے حضرت صدیق اکبرؓ سے مصافحہ کرتے تھے کیونکہ ان کے کچھ بال پک گئے تھے جس کی وجہ سے وہ سب سے بڑے معلوم ہوتے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کا ادب دیکھئے کہ برابر خود ہی مصافحہ کرتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہیں ہونے دی اسی طرح دوسرے صحابہ بھی خاموش دَم بخود بیٹھے رہے کیونکہ سب حکیم تھے اگر آج کل کوئی شیخ مجلس کے سوا غلطی سے کسی دوسرے سے مصافحہ کرلے تو جملہ حاضرین غُل مچانا شروع کردیں اور جس سے مصافحہ کرلیا ہے اس کی تو ایسی بُری گت بنے کہ الامان حتیٰ کہ جب دُھوپ آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد مبارک پر شعاعیں پڑنے لگیں تو حضرت صدیق اکبرؓ کپڑا تان کر کھڑے ہوگئے اس وقت حاضرین نے پہچانا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں اسی طرح ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے انی اکل کمایا کل العبد کہ میں غلام کی طرح کھاتا ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکڑوا بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ صاحبو! یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں اس کی قدر اس وقت ہوگی کہ جب اپنے اوپر یہ کیفیت غالب ہو اور یہی راز ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کھانا کھاتے میں کوئی لقمہ گر جائے تو مٹی صاف کر کے کھالو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانا جلدی جلدی تناول فرمایا کرتے آج اس کو سخت عیب سمجھا جاتا ہے کہتے ہیں کہ فلاں شخص اس طرح کھاتا ہے کہ گویا کبھی اس کو کھانے کو نہیں ملا وجہ یہ ہے کہ جو چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش نظر تھی ہم اس سے محروم ہیں، صاحبو! میں پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی والی ملک کسی معمولی سے آدمی کو بلا کر حلوا کھلانے کو دے اور کہے کہ میرے سامنے بیٹھ کر کھاؤ تو ذرا غور کیجئے کہ یہ شخص کس طرح کھائے گا ظاہر ہے کہ اس کے ہر لقمہ کا انداز یہ ہوگا کہ اس سے معلوم ہوجائے کہ بڑی رغبت اور شوق سے کھا رہا ہے اور یہی انداز اس وقت محبوب ہے اس کو طمع کہنا ہرگز درست نہیں اور اگر فرض کرو یہ طمع ہی ہے تو سمجھ لو کہ

چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دیں   خاک برفرقِ قناعت بعد ازیں

(جب دین کے بادشاہ یعنی اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ سے مانگوں کمی نہ کروں تو اس کے بعد میرے قناعت کو اچھا سمجھنے اور نہ مانگنے پر افسوس ہے)۔

ہر عیب کہ سلطاں بہ پسندد ہنر است

(جس عیب کو بادشاہ پسند کرتا ہے وہ ہنر بن جاتا ہے)۔

اور اگر کھاتے ہوئے اتفاق سے کوئی لقمہ اس کے ہاتھ سے گر جائے تو یہ کیا کرے گا ظاہر ہے کہ اس کو اٹھائے گا۔ اور صاف کر کے کھا جائے گا۔ علیٰ ہذا یہ بھی سوچو کہ بادشاہ کے سامنے کس انداز سے بیٹھ کر کھائے گا کیا اسی طرح جیسے اپنے گھر میں بیٹھ کر کھاتا تھا کبھی نہیں بلکہ نہایت ادب سے بیٹھ کر کھائے گا تو جب شاہانِ دنیا کے سامنے ان تین باتوں کا لحاظ ضروری ہے تو کیا خداوند جل وعلا کے سامنے ضروری نہیں، آج کل کی تہذیب نِری لفاظی رہ گئی ہے جس میں اصل حقیقت کا نام ونشان بھی نہیں ہے بہتر ہے کہ اس میں ہ کی جگہ عین بدل دیا جائے کہ اسم بھی مسمّیٰ کے مطابق پڑے۔

کھانے کے آداب تعلیم فرمانے میں حکمت

صاحبو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے آداب کی تعلیم جو فرمائی اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح باطنی حالات کا اثر ظاہری اعضا پر پڑتا ہے یوں ہی ظاہری ہئیت کا اثر بھی انسان کی اندرونی حالت تک پہنچتا ہے اگر ظاہری ہئیت پر رعونت وتکبر برستا ہے تو دل تک بھی اس کا چھینٹا ضرور پہنچے گا اور یہ ملکہ بد دل میں ضرور پیدا ہونا شروع ہوگا اور اگر ظاہری حالت منکسرانہ ہے تو دل میں بھی انکسار وخشوع وتذلیل کے آثار نمایاں ہوں گے اور سبب اس کا یہ ہے کہ جب کسی شخص نے اپنے ظاہر کو اتباع سنت سے آراستہ کیا اور راہِ سنت پر گام زن ہوا تو اس نے کسی قدر قرب کا قصد کیا اور وعدہ ہے کہ **من تقرب الِيَّ شبراً تقربت اليه ذراعاً ومن تقرب اِليَّ ذراعاً تقربت اليه باعاً** (مسند احمد ۲:۴۱۳، کنز العمال: ۱۱۷۹) کہ جو میری طرف تھوڑا سا بھی بڑھتا ہے میں اس کی طرف بہت سا بڑھتا جاتا ہوں اور ظاہر ہے کہ خدا کا قرب اس سے زیادہ ہوگا کہ قربِ باطنی میسر ہو جائے تو لازم آ گیا کہ درستی ظاہر سے قربِ باطنی نصیب ہوتا ہے مولانا اسی کو فرماتے ہیں ۔

تشنگاں گر آب جو یند از جہاں　　آب ہم جوید بعالم تشنگاں

یہ وہ پانی ہے کہ پیاسے کے ڈھونڈھے نہیں ملتا بلکہ وہ خود پیاسے تک پہنچتا ہے یہ شرط ہے کہ پیاس ہو ورنہ خدا پر بار نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ لوگوں کے سر مڑھیں ارشاد ہے **اَنُلۡزِمُكُمُوۡهَا وَاَنۡتُمۡ لَهَا كٰرِهُوۡنَ** یعنی کیا ہم رحمت کو تمہارے سر مڑھ دیں باوجود یہ کہ تمہارے دلوں میں اس سے کراہت ہے خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ اصل مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تو اس قدر خشوع وخضوع بڑھا ہوا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ذاتِ خداوندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت

پیشِ نظر تھی اور جب یہ ہے تو ہم کو بھی احکام سن کر بس یہی چاہیئے کہ۔

زباں تازہ کردن باقرارِ تو نینگیختن علّت از کارِ تو

(تیری یاد سے زباں کو تر و تازہ رکھنا چاہے اور کوئی عذر تیری اطاعت سے مجھے روک نہیں سکتا)

مقتضاءِ عبدیت

اور قطع نظر اس کے یہ مقتضاء عبدیت کا ہے ہمارے لئے مصلحت عقلاً بھی یہی ہے اور واقعی اگر یہ کاوش ہمارے لئے مضر نہ ہوتی تو حضو صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو اجازت دیتے ممانعت نہ فرماتے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ممانعت فرمائی۔

حضرات صحابہ کو مسئلہ تقدیر میں گفتگو سے ممانعت

دیکھئے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین جو کہ حضور کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور جن کی فطرتیں بالکل سلیم تھیں جب ان حضرات نے مسئلہ قدر میں گفتگو کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل روک دیا اور بہت خفا ہوئے اور فرمایا کہ اگلی قومیں اسی کھود کرید کی بدولت ہلاک ہوئیں اور مضر ہونے کا سبب یہ ہے۔

بہت سے امور بغیر مشاہدہ حل نہیں ہوتے

جس طرح بہت سے امور اِستدلال سے حل ہوتے ہیں اسی طرح بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں کہ ان میں استدلال کا گزر نہیں ان کے لئے مشاہدہ اور معاینہ کی ضرورت ہے اور وہ ہم کو نصیب نہیں تو ایسی باتوں میں لِمَ وکیف دریافت کرنے کا بدیہی یہ نتیجہ ہے کہ ہم تباہ ہوں اور خسر الدنیا والآخرۃ ہماری حالت ہو۔ مجھے اس کے مناسب ایک حکایت یاد آئی مشہور ہے کہ ایک لڑکے نے اپنے نابینا استاد کی دعوت کی اور کہا کہ میں آپ کو کھیر کھلاؤں گا۔ استاد صاحب نے چونکہ کھیر کو نہ کبھی دیکھا تھا نہ ابھی تک کھانے کا اتفاق ہوا تھا اس لئے لڑکے سے پوچھا کہ بھائی کھیر کیسی ہوتی ہے لڑکے نے جواب دیا کہ کھیر سفید ہوتی ہے استاد نے کہا کہ سفید کس کو کہتے ہیں اس نے کہا جیسے بگلہ مگر استاد صاحب نے کبھی بگلہ بھی نہ دیکھا تھا اس لئے اس کی بابت بھی پوچھا اس نے ہاتھ سے بگلے کی ہیئت بتائی استاد صاحب نے ہاتھ سے مس کر کے دیکھا تو فرمانے لگے کہ بھائی یہ کھیر تو بہت ٹیڑھی ہے کیسے کھاؤں گا۔ تو جیسے اس نابینا کے سمجھنے کی غلطی کی وجہ یہی تھی کہ معائنہ کی چیز کو بیان سے سمجھنا چاہتا تھا یہی حالت ہماری بھی ہے۔

اسرار احکام معلوم کرنے کا طریقہ

ہاں اگر سمجھنا ہو تو اول قلب میں نور پیدا کرو خود بخود یہ کیفیات پیدا ہوں گی اور ہر چیز کی سینکڑوں حکمتیں نظر آنے لگیں گی۔ دیکھو اگر کوئی معمولی شخص کسی والی ملک سے کہے کہ مجھے اپنے خزانے کے جواہرات دکھادو تو اس کی سخت غلطی ہے اور کبھی یہ شخص کامیاب نہیں ہوسکتا۔ البتہ کامیابی کی یہ صورت ہے کہ پہلے صاحب جواہرات سے ایک خاص تعلق پیدا کرے اور اس کے خواص میں داخل ہو جائے اس کے بعد بغیر درخواست ہی کبھی وہ مہربان ہوگا تو خود دکھلا دے گا اسی کو کہتے ہیں۔

بینی اندر خود علوم انبیاءؑ　　بے کتاب و بے معید و اوستا

(تو اپنے اندر انبیاء علیہم السلام کے علوم کو بغیر کتاب اور مددگار کے اور بغیر استاد کے دیکھے گا)۔

علم چوں بر تن زنی مارے بود　　علم چوں بر دل زنی یارے بود

(تو علوم سے اگر نفس کی موافقت میں کام لے تو وہ سانپ کے جیسا بن جاتا ہے اور جب تو علم کو روحانیت پر چلائے تو وہ تیرا دوست بن جائے گا)۔

تو دل پر مؤثر بناؤ اس کے بعد دیکھو کن علوم کا انکشاف ہوتا ہے اب لوگ چاہتے ہیں کہ ساری باتیں استاد کے سامنے بیٹھ کر حل کر لیں حالانکہ یہ محض فضلِ خداوندی سے ہوتا ہے اور وہ بھی جب کہ خدا تعالیٰ چاہیں کہ فضل اسی خاص طریقے سے ہو کیونکہ کبھی کسی خاص شخص کے بارے میں یہی فضل ہوتا ہے کہ اس کو اسرار پر مطلع نہ کیا جائے جیسا کہ بعض کے لئے مطلع ہونا فضل ہوتا ہے اور وجہ اس فرق کی یہ ہے کہ بعض آدمیوں کو جو کچھ اسرار معلوم ہونے لگتے ہیں تو ان کو ناز ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بعض بعض اپنے کو اکابر کی برابر سمجھنے لگتے ہیں لہٰذا اس لئے یہی مناسب ہے جب ہر ایک کے لئے مصلحت جُدا ہے تو خود کچھ بھی تجویز نہ کرو۔

تو بندگی چو گدایاں بشرطِ مُزد مکن　　کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

(تو فقیروں اور مزدوروں کی طرح مزدوری حاصل کرنے کے لئے عبادت کر کیونکہ جو مالک ہے وہ اپنے بندوں کی پرورش کے طریقوں سے خود واقف ہے)۔

واردات میں حکمت

اسی واسطے یہ مذہب ہے کہ بلا اختیار جو وارِد بھی ہو اسی میں خوش رہے اور خود ہرگز کسی خاص وارد کی خواہش نہ کرے گویا یہ مذہب ہونا چاہیئے کہ۔

بُدرو و صاف ترا حکم نیست دم درکش　　کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطافست

(تجھے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ یہ صاف شراب ہے یا نیچے کا میل کچیل ہے کیونکہ جو کچھ بھی ہمارے ساقی کی طرف سے حاصل ہو رہا ہے اس کی عین مہربانی ہے)۔

اگر دُرد پلائیں تب بھی اسی ذوق سے پینا چاہیئے جس طرح مئے صاف پی جاتی ہے کیونکہ اس میں بھی کوئی حکمت ضرور ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر خلافِ مصلحت بھی ملتا تب بھی ہم کو دم مارنے کی گنجائش نہ تھی کیونکہ ہم عبد ہیں ہم کو اس نیت کی بھی مجال نہیں کہ یہ ہمارے لئے مصلحت ہے۔ کیونکہ آخر ہم ہیں کیا چیز کچھ بھی نہیں جو کچھ ملے جتنا ملے جس طرح ملے سب ان کا احسان ہے۔

حضرت لقمانؑ کی حکایت

مشہور ہے کہ حضرت لقمانؑ نے کسی شخص کے ہاں باغبانی کی نوکری کی ایک روز وہ باغ میں آیا اوران سے کہا کہ ایک ککڑی لے کر آؤ آپ ایک ککڑی لائے آقا نے اس کو چھیل کر اس کی قاشیں کیں اور اول ایک قاش حضرت لقمانؑ کو دی آپ لے کر کھا گئے اس کے بعد جو آقا نے کھائی تو معلوم ہوا کہ بالکل کڑوی ہے اس نے حضرت لقمانؑ سے کہا کہ تم نے یہ تلخ ککڑی کھا لی کہا کیوں نہیں کہ یہ تلخ ہے حضرت لقمانؑ فرماتے ہیں کہ جس ہاتھ سے ہزاروں شیریں چیزیں کھائیں اگر ایک دفع تلخ بھی مل جائے تو شکایت نہیں کرنی چاہیئے۔

آنرا کہ بجائے تست ہر دم کرمے　　　عذرش بنہ ار کند بعمرے ستمے

(ایسی ذات جو تجھ پر ہر گھڑی اپنا کرم کر رہی ہے اس کو قابل غور سمجھو اگر کسی وقت اس کی طرف سے تکلیف پہنچے)۔

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

پس اگر کبھی ہماری مصلحت کے خلاف بھی اُدھر سے برتاؤ ہو تب بھی ہمارے اَدب میں فرق نہ آنا چاہیئے۔ صاحبو! عاشق تو ہر حالت میں عاشق ہی رہتا ہے کیا لوگوں کے خیال میں خدا سے برادری کا سا تعلق ہے کہ اس سے کاوش کی جائے۔ دیکھئے عشاق کو تو جان جان کر ستایا جاتا ہے مگر وہ یہی کہتا ہے ۔

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من　　　دل فدائے یارِ دل رنجانِ من

(تیری ناراضی بھی خوشی رکھتی ہے کہ یار پر ہی دل فدا ہے اور کو میری ہی فکر ہے)۔

غرض جو شخص اپنی تربیت چاہتا ہے اور اس کو اسرارِ شریعت پر مطلع ہونے کی ہوس ہوتی ہے اپنے اندر یہ کیفیت پیدا کرے یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب کیا ہم جنید بغدادیؒ بن

جائیں میں کہتا ہوں کہ صاحب آپ جنید بغدادیؒ نہ بنیں لیکن یہ بھی تو نہ ہو کہ بالکل نکمے ہی رہیں غور کیجئے آپ جنید بغدادی کی برابر تو کسی بات میں بھی نہیں مثلاً ایک نماز ہی ہے کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ میں جنید بغدادیؒ کی برابر نماز پڑھتا ہوں ایک بزرگ کی یہ حالت تھی کہ ایک رات قیام کی نیت کی ہے تو نیت باندھ کر ساری رات کھڑے ہی گزار دی ایک رات رکوع کے لئے تجویز کی ہے تو تمام رات رکوع ہی ختم ہوگئی اور فرمایا کرتے تھے کہ افسوس رات بہت جلد ختم ہو جاتی ہے دل نہیں بھرتا یہ حالت تھی کہ ؎

نہ آیا وصل میں بھی چین ہم کو گھٹا کی رات اور حسرت بڑھا گی

پس جب کسی حالت میں بھی ہم ان کی برابر نہیں لیکن پھر بھی ہم کسی بات کو چھوڑ نہیں دیتے نماز بھی پڑھتے ہیں روزہ بھی رکھتے ہیں مثل مشہور ہے کہ "گندم اگر بہم نہ رسد جو غنیمت ست" تو جب ساری چیزیں ہم میں ادنیٰ درجے کی ہیں تو یہ حالت بھی ادنے درجے کی سہی۔

شیخ کامل سے اصلاحی تعلق کی ضرورت

اور اس کا طریق یہی ہے کہ کسی صاحب باطن سے تعلق پیدا کیا جائے اگر صحبت ممکن ہو تو بہت ہی خوش قسمتی کی بات ہے لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم مراسلت تو ضرور رکھنی چاہیئے اور ان پر اپنا پورا حال ظاہر کر کے علاج کی تدبیر دریافت کیجئے۔

شیخ کی رائے پر عمل کی ضرورت

صاحبو! اگر اپنی رائے سے کوئی شخص اپنی اصلاح کی تدبیر سوچ کر چار گھنٹے اس میں مشغول رہنے کے لئے مقرر کرے تو اس میں وہ بات حاصل نہ ہوگی جو کسی ماہر کی تجویز پر نصف گھنٹہ عمل کرنے میں حاصل ہو جائے گی مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں بخار میں مبتلا ہوا ایک طبیب سے رجوع کیا انہوں نے نسخہ تجویز کر دیا جس کے استعمال سے چند روز میں فائدہ ہو گیا۔ میں نے نسخے کو مفید دیکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھا اتفاق سے دوسرے برس پھر کچھ شکایت ہوئی تو میں نے اسی نسخے کو منگا کر استعمال کی لیکن کچھ بھی فائدہ نہ ہوا اس کے آخر پھر اسی طبیب سے رجوع کیا اور ان کے تجویز کردہ نسخے سے صحت ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اول حکیم صاحب کی زبان میں یا قلم میں کوئی خاص اثر رکھا ہوا تھا کہ صحت اس پر موقوف تھی بلکہ وجہ یہ تھی کہ نسخے کی تجویز میں جس طرح مریض کے مزاج کی رعائت کی جاتی ہے زمان اور مکان کی رعایت بھی کی جاتی ہے یعنی ایام ربیع میں ایک نسخہ تجویز کیا جاتا ہے تو ایام خریف میں دوسرا کیونکہ دونوں موسموں کے مزاج بالکل الگ الگ ہیں اسی طرح سرد ملک میں جو دوا مفید ہوگی گرم ملک میں اس کا مفید ہونا ضروری نہیں تو جیسے

بدن کے امراض میں محض اپنی تدبیر اور رائے میں مرض کے زوال کے لئے کافی نہیں ہے یوں ہی نفسانی امراض میں بھی ہوتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ اہل اللہ کی زبان میں بھی اثر ہے۔

اہل اللہ سے محض وابستگی کافی ہے

اور اہل اللہ سے تعلق رکھنے کو جو کہتا ہوں کوئی شخص میری اس تقریر سے یہ نہ سمجھے کہ میں نوکری کرنے یا تجارت میں لگنے کو منع کرتا ہوں اور ترک تعلقات کی رائے دیتا ہوں ہرگز نہیں بلکہ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ کسی اہل دل سے وابستگی پیدا کیجئے۔صاحبو! یہ حضرات نہایت ذی عقل ہوتے ہیں۔ان کو دین کی عقل کے ساتھ دنیا کی بھی کامل عقل ہوتی ہے ان کی نسبت یہ گمان ہرگز نہ کرو کہ وہ اس وابستگی کے بعد تم کو تمہاری اہل وعیال سے چھڑا دیں گے، ہمارے حضرت حاجی صاحب قبلہ قدس سرہ، سے جب کوئی خادم عرض کرتا کہ حضور جی چاہتا ہے کہ ملازمت چھوڑ دوں تو فرماتے کہ بھائی ایسا نہ کیجئو نوکری بھی کرو اور خدا کی یاد میں بھی لگے رہو۔اور وجہ اس ممانعت کی یہ تھی کہ جانتے تھے قلب میں قوت توکل ہے نہیں ظاہری سہارے کو چھوڑ کر خدا جانے کن مصیبتوں میں پھنس جائے اور حالت کیا سے کیا ہو جائے اکثروں کو ایسے واقعات پیش آئے کہ انہوں نے معاش کی تنگی کی وجہ سے نصرانیت یا یہودیت کو اختیار کی ابعض کے دل میں خدا کی شکایت پیدا ہوگئی۔اور وہ یوں دین سے برباد ہو گئے تو اگر نوکری پر لگے رہیں گے تو زیادہ کسی معصیت ہی میں مبتلا ہوں گے کفر وشرک سے تو بچے رہیں گے۔پس یہ حضرات چونکہ چہار طرف نظر رکھتے ہیں اس لئے بقاعدہ مَنُ ابتلے بلیّتین فلیختر اھوزھما (جو شخص دو مصیبتوں میں پھنس جائے اور ایک کو اختیار کرنا ضروری ہو تو اس مصیبت کو اختیار کرے جو آسان ہو)۔

کبھی ضعفاء کو ترک تعلقات کی رائے نہیں دیتے اور جن لوگوں کو گوشہ نشینی اور ترک تعلقات کا حکم انہوں نے کیا ہے وہ ایسے لوگ ہیں جن کو انہوں نے پورے طور سے جانچ لیا ہے اور دیکھ چکے ہیں کہ ان کی قوتِ توکل کامل ہے۔ایسوں کے لئے نہ ترک تعلق کی ترغیب مضر نہ اس پر عمل کرنا نقصان دہ۔تو اہل اللہ سے تعلق پیدا کرتے ہوئے اس کا بالکل خوف نہ کیجئے وہ انشاء اللہ آپ کے قصدِ ترک پر بھی نہ چھوڑنے دیں گے۔

اپنی عقل رہبری کے لئے کافی نہیں

غرض یہ ہے کہ بڑی عقل سے اسرار کو دریافت کرنے کی فکر بے سود فکر ہے اس کی تمنا ہے تو خدا کے ساتھ لگاؤ پیدا کرو دیکھو تجربہ کاروں کا قول ہے ۔

آزمودم عقل دور اندیش را   بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

کہ اول ہم نے عقل سے کام لیا وہ تھوڑی دور چلے مگر تھک کر رہ گئے آخر اس کو چھوڑا اور دیوانگی اور عشق کا دامن پکڑا اس نے منتہا تک پہنچا دیا۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ عقل بالکل بے کار ہے۔ عقل کار آمد ضرور ہے لیکن ایک حد تک کام دیتی ہے اس کے بعد معطل ہو جاتی ہے عقل کی حالت گھوڑے کی سی ہے دیکھو اگر کسی کا محبوب ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہو اور یہ عاشق اس کے پاس پہنچ کر عاجز ہو جائے گا آگے جہاں سے پہاڑی زینہ شروع ہوا ہے وہاں گھوڑا نہیں چل سکتا اب اگر یہ عاشق آگے بھی جانا چاہے تو اس کی کیا صورت ہے بجز اس کے کہ ؎

ذر ابجا بالِ محبت پری

یعنی عشق کا جوش اپنے اندر پیدا کرے اور راہ طے کرتا چلا جائے۔ غرض عقل سے کام لینا چاہیئے لیکن صرف اس قدر کہ فلاں شخص مقتدا بنانے کے قابل ہے اور فلاں شخص نہیں۔ مریض کو عقل سے کام لینا ہے لیکن محض انتخاب معالج میں کیونکہ ایسا نہ کرے گا تو کثرت مدعین طبابت سے وہی حالت ہو گی کہ ؎

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

(مختلف قسم کی تعبیروں کی وجہ سے میرا خواب ہی برباد ہو گیا)

مگر انتخاب کے بعد پھر چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔ جس رستہ معالج ڈال دے اس پر بے خوف وخطر چلا جائے ورنہ اگر وہاں بھی ایں چون ست وآں چراست سے کام لیا تو ایک قدم بھی نہ سرک سکے گا اور صدہا الجھنیں پیش آئیں گی اس لئے کہ معمولی عقل بھی ایک فتوے پر قائم نہیں رہتی صبح کچھ رائے دیتی ہے شام کو کچھ دن کو کچھ رات کو کچھ بعضوں کو دیکھا ہے کہ آج اہل سنت و جماعت میں داخل ہیں کل تشیع پر مائل ہیں صبح کو قدری ہیں شام نہیں ہوئی کہ جبری بن گئے۔ یہ انقلاب اور تبدیلیاں اسی باعث ہیں کہ عقل ایک ٹھکانے نہیں رہنے دیتی دربدر خاک بسر پھراتی ہے۔ گویا اس کی یہ حالت ہے ؎

بیزارم ازاں کہنہ خدائی کہ تو داری　　　ہر روز مرا تازہ خدائے دگرے ہست

(میں تیری اس پرانی خدائی سے جو تو رکھتا ہے بیزار ہوں میرے لئے ہر روز تازہ خدا ہونا چاہیئے)

علوم ظاہری کا ماحصل

ابن العربی کا ایک خط اپنی کشکول میں علامہ بہاء الدین عاملی نے نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے ایک معاصر عالم کو لکھا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ آپ ایک روز بیٹھے رو رہے تھے آپ کے کسی شاگرد نے وجہ پوچھی تو آپ نے وجہ بیان کی کہ میں اتنے سال سے ایک دعوے کو دلیل عقلی سے صحیح سمجھے ہوئے تھا آج ایک مقدمہ اس دلیل کا مخدوش معلوم ہوا تو میں اس لئے رو رہا

ہوں کہ اتنے زمانے تک جہل میں مبتلا رہا اور اب بھی اطمینان نہیں کہ جواب جو ثابت ہوا وہ بھی صحیح ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ تم نے اپنے علم ظاہری کی قوت دیکھی اب چاہیئے کہ دوسرا علم حاصل کرو جس کا طریقہ یہ ہے کہ خلوت اور دوام ذکر اختیار کرو بس اس قسم کا مضمون لکھا ہے۔ امام رازیؒ اتنے تبحر کے بعد جب کہ ان کو کچھ حقیقت شناسی کا رائحہ نصیب ہوا اس وقت یوں کہتے ہیں ؎

نهاية اقدام العقول عقال وغاية سعي العٰلمين ضلال
وَلم نستفد من بحثنا طول عمرنا سوى ان جمعنا فيه قيل يقال

(اور ہماری ساری عمر کی بحثا بحثی نے ہمیں اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچایا کہ ہم نے یہ باتیں لکھ کر جمع کر لی ہیں کہ یوں کہا گیا ہے اور یوں کہا جائے گا)۔

کہ ساری عمر کے مباحث اور علوم کا نتیجہ جو اخیر میں کھلا تو یہ تھا کہ قيل كذا و قال فلان كذا (اس طرح کہا گیا ہے اور فلاں نے اس طرح کہا ہے)۔

شیخ کامل کی علامات اور اس کے انتخاب کا طریقہ

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ انتخاب جو کیا جائے تو کس معیار پر کیا جائے کیونکہ آج کل عوام الناس نے عجیب وغریب معیار تراش رکھے ہیں مثلاً اگر کسی شخص کا دربار نہایت عالی ہو لوگوں کی آمد ورفت اس کی طرف زیادہ ہو سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بڑا بزرگ ہے خصوصاً اگر امراء اور رؤسا کی جماعت بھی اُدھر مائل ہو تب تو گویا ان کی بزرگی پر رجسٹری ہوگئی حالانکہ میں نے ایک نہایت کامل اور ماہر فن جامع شریعت وطریقت شیخ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ جس درویش کے پاس زیادہ تر دنیاداروں کا ہجوم ہو اور علماء وصلحاء کا رجوع کم ہو تم ادھر متوجہ نہ ہو کیونکہ دنیاداروں کا گرنا اور دینداروں کا پرہیز اس درویش کے نقص کی دلیل ہے اس لئے کہ الجنس يميل الى الجنس (ہر چیز اپنی جنس کی طرف جاتی ہے)۔

کبوتر با کبوتر باز با باز

تو وہ درویش بھی دنیادار ہے۔ اور بعض لوگوں کے نزدیک معیار بزرگی اس کے علاوہ ایک دوسرا امر ہے اور وہ اس سے ذرا دقیق ہے۔ وہ یہ ہے کہ اکثر کم سمجھ لوگ یوں جانتے ہیں کہ جس شخص میں کشف وکرامات زیادہ ہو خوارق کا صدور اس سے زیادہ ہو وہ سب سے بڑا بزرگ ہے۔ حالانکہ یہ معیار بھی بالکل لغو ہے کیونکہ کشف وکرامت کا صدور کثرتِ ریاضت ومشاقی وصحت قوائے جسمانی ونفسانی پر موقوف ہے جس میں یہ سب باتیں جمع ہوں گی اسے کشف ہونے لگے گا اگرچہ وہ کافر ہی ہو ایسے واقعات بکثرت سننے میں آئے اور نہ بھی سنتے تب بھی یہ بات ظاہر تھی۔ دیکھو دجال جو کہ

مدعی الوہیت ہوگا کیسے کیسے شعبدے اس سے ظہور پذیر ہوں گے بارش تک کر کے دکھلا دے گا۔ زمین کے خزانے اس کے ہمراہ چلیں گے۔ پس ظاہر ہوا کہ خوارق کا صدور بھی صحیح معیار نہیں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے محض عبدیت کے لئے انسان کو بھیجا ہے

اب صحیح معیار دریافت کرنے کے لئے اول یہ سمجھو کہ انسان کے لئے سب سے بڑا کمال اس کی وہ حالت ہے جس کے لئے اس کو دنیا میں بھیجا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ کشف وکرامت کے لئے انسان کو دنیا میں نہیں بھیجا گیا کیونکہ اگر یہ مقصود ہوتا تو دنیا میں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی عالم ارواح میں اس پر بہت کچھ منکشف تھا نیز مرنے کے بعد کافر تک کو بہت سے مغیبات منکشف ہو جائیں گے ارشاد ہے وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (الزمر:۴۷) (اور خدا کی طرف سے وہ معاملہ پیش آئے گا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا) پس معلوم ہوا کہ دنیا میں اس کو کسی دوسری بات کے حاصل کرنے کو بھیجا گیا ہے اور وہ حالت عبدیت ہے یعنی دنیا میں انسان کو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ امتثال اوامر ونواہی کر کے عبدیت حاصل کرے کیونکہ جب تک اس عالم میں نہ آیا تھا تو محض روح تھا اور روح بوجہ مجرد ہونے کے نہ قیام پر قادر تھی نہ قعود پر نہ رکوع پر نہ سجود پر تو روح کو اس عالم میں وہ ترقی کرنا جو ان عباداتِ خاصہ پر موقوف ہے ممکن نہ تھا اور یہ صفتِ عبدیت بکمالہا اس میں پیدا نہ ہوتی۔ اور جب صفتِ عبدیت مطلوب ہے تو جس کو اس سے تعلق ہو وہ مطلوب ہوگا اسی معیار کی نسبت مولانا روم علیہ الرحمۃ ارشاد فرماتے ہیں ۔

کارِ مرداں روشنی و گرمی ست — کارِ دو ناں حیلہ و بے شرمی ست

(مردوں کا کام یہ ہے کہ ان کی روشنی یعنی علم حقیقی اور گرمی یعنی محبت موجود ہے اور کمینوں کا یہ کام ہے کہ ان میں بہانہ بازی اور بے شرمی ہو)۔

دو چیزیں اس شعر میں علامت کے طور پر بیان فرمائی ہیں۔ ایک روشنی دوسرے گرمی روشنی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں سے بیٹھے ہوئے کلکتہ اور بمبئی نظر آنے لگے بلکہ یہ معنے ہیں کہ دل میں عرفان اور علم حقیقی پیدا ہو جائے اور گرمی سے مراد محبت ہے حاصل یہ ہوا کہ جس کو محبوب حقیقی سے محبت ہو اور معرفت حاصل ہو وہ مرد ہے۔ لیکن محبت قلبی صفات میں سے ہے جن کا احساس نہیں ہو سکتا۔

محبت کے لوازم

اس لئے اس کے کچھ لوازم بیان کئے جاتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے۔ ایک تو اس کی یاد کسی وقت دل سے نہیں اترتی سوتے ہوئے خواب بھی دیکھتا ہے تو محبوب ہی نظر آتا ہے اور دوسرے اس کے ہر حکم کو گوشِ قبول سے سنتا اور نہایت شوق سے آمادۂ امتثال رہتا

ہے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ عاشق سے محبوب کے کسی حکم میں بھول چوک یا نافرمانی کا ظہور ہو کیونکہ بھول ہمیشہ اس کام میں ہوا کرتی ہے جس کی جانب پوری توجہ اور التفات نہ ہو اور جو چیز ہر وقت دل پر مستولی ہو اس میں بھول کا ہونا عادۃً ممکن نہیں۔ اسی طرح نافرمانی اس کے حکم کی ہوتی ہے جس کی وقعت اور محبت دل میں نہ ہو۔ جب ہر دم کی یاد اور کامل اطاعت علامات محبت سے ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قابلِ انتخاب وہ ہے جس کو روشنی علم و معرفت اور گرمی یعنی محبت خداوندی حاصل ہو۔

شیخ کامل کی صفات

تو خلاصہ مقتدا کی صفات کا یہ نکلا کہ اس کو بقدر ضرورت علم دین ہو اگرچہ وہ اصلاحی مولوی نہ ہو دوسرے یہ کہ اس کو کسی شیخ کامل کی صحبت نصیب ہوئی ہو کیونکہ گرمی امر مکتسب نہیں بلکہ موہوب امر ہے اور عادۃ اللہ ہے کہ وہ اسی طرح حاصل ہوتا ہے کہ کسی گرمی والے کے پاس رہے اور اس کی ہدایت کے بموجب عمل کرے اور یہی وہ چیز ہے کہ جو سینہ بسینہ چلی آتی ہے نہ مولوی بن کر حاصل ہوتی ہے نہ مورخ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ دنیا میں اس کے ماسوا بھی اکثر کام ایسے ہیں کہ جو سینہ بسینہ چلے آتے ہیں مثلاً باورچی گری کا کام کہ اگر کوئی ساری خوانِ نعمت حفظ کر لے مگر جب تک کسی کامل استاد کے پاس نہ رہے تو اس کو باورچی گری نہیں آسکتی اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کتاب میں دیکھ کر کُرتہ اچکن وغیرہ کی کاٹ تراش بالکل ازبر کر لے تو اس کو درزی کا کام نہیں آسکتا۔ تصوف کے سینہ بہ سینہ ہونے کے یہی معنی ہیں نہ یہ کہ اس کے مسائل سینہ بسینہ ہیں کیونکہ مسائل تو تمام کتابوں میں مدوّن ہیں بلکہ وہی ایک نسبت ہے جس کو گرمی سے تعبیر کیا ہے کہ سینہ بسینہ چلی آتی ہے، ایک صفت یہ ہے کہ وہ باعمل ہو یہ تو علامات کامل ہونے کی ہیں۔

مکمل ہونے کی علامات

اور مکمل ہونے کی علامات دوسری ہیں اور وہ بھی نہایت ضروری ہیں کیونکہ مریض کو اپنے مرض دور کرنے کے لئے ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ خود بھی تندرست ہو اور طبیب بھی ہو تو اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کے پاس بیٹھنے سے دل میں ایک سکون اور راحت پیدا ہو اور خدا تعالیٰ کی محبت بڑھے دنیا کی محبت کم ہو اگرچہ یہ باتیں فوراً نہ پیدا ہوں بلکہ کچھ دنوں کے بعد ہوں دوسرے اگر اس سے اپنا مرض بیان کیا جائے تو جواب سے دل کو تسلی ہو یوں معلوم ہو کہ یہ ہمارے مرض کو بالکل سمجھ گیا خوب کہا ہے ؎

وعدۂ اہلِ کرم گنجے بود (اہل کرم کا وعدہ خزانہ رہا یعنی خالص ہے)

پس جب ایسا شخص میسر ہو جائے تو ضرور ہے کہ اس کی صحبت اختیار کی جائے۔

بیعت کے منافع

اگر چہ اس سے بیعت نہ ہو کیونکہ بیعت ہونا چنداں ضروری نہیں ہے لیکن یہ بھی نہ سمجھنا چاہیئے کہ بیعت بالکل بے سود ہے۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ بیعت بالکل بیکار ہے اس کی کیا ضرورت ہے کہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ہی کام کرے میں نے کہا کہ صاحب آپ نے کبھی علاج بھی کرایا ہے۔ کہ نہیں کہنے لگے کہ بے شک ضرورت کے وقت علاج کرایا ہے میں نے پوچھا کہ کسی ایک طبیب سے رجوع کیا ہے یا اس طرح کہ آج ایک سے کل دوسرے سے پرسوں، تیسرے سے کہنے لگے کہ کسی ایک ہی کی طرف جس پر اطمینان ہوا رجوع کیا ہے پھر میں نے پوچھا کہ اس میں آپ نے کیا مصلحت سوچی کہنے لگے کہ روز روز طبیب بدلنے سے کسی ایک کو بھی توجہ اور شفقت مریض پر نہیں ہوتی کیونکہ کوئی ایک بھی اس کو اپنا مریض نہیں سمجھتا میں نے کہا کہ بس یہی حکمت اور نفع ہے بیعت ہونے کا کیونکہ بیعت ہونے کے بعد مرشد کو اپنا سمجھنے لگتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے کہ یوں کہتا ہے ؎

من غم تو میخورم تو غم مخور

(میں تمہارا غم پیتا ہوں (غمخوار ہوں) تم غم مت کرو)

مرید کو ہر وقت یہ تسلی رہتی ہے کہ میرا ایک شفیق میرے ساتھ موجود ہے اور مرشد کو یہ لاج ہوتی ہے کہ یہ میرا شخص ہے یہ مصلحت ہے بیعت میں ہاں اگر زرے نذرانے کی بیعت ہو تو کسی درجے میں بھی مفید نہیں آج کل یہ حالت ہے کہ بعضے فخر کرتے ہیں کہ میرے ایک لاکھ مرید ہیں معاذ اللہ گویا ایک فوج جمع کی ہے۔ غرض اگر اس قسم کی پیری مریدی نہ ہو تو اس میں بے حد نفع ہے۔ کلام بہت دور پہنچ گیا۔

نسبت مع اللہ کی فضیلت

میں بیان کر رہا تھا کہ نسبت مع اللہ ایسی چیز ہے کہ جب یہ دل میں جگہ کر لیتی ہے تو خس وخاشاک ماسوا سب بہہ جاتے ہیں بس نہ کوئی شبہہ رہتا ہے نہ مُزاحم ؎

عشق آں شعلہ ست کو چوں بر فروخت　　　ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(عشق ایسا شعلہ ہے جب وہ روشن ہوتا ہے سوائے محبوب سب کو خاکستر کر دیتا ہے)

اور اس کی یہ خاصیت ہوتی ہے ؎

تیغ لا در قتل غیر حق براند　　　در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

ماند الّا اللہ و باقی جملہ رفت　　　مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

(لاَاِلٰہَ اِلاَّ اللہ میں لفظ لا ایک تلوار کی طرح ہے اس تلوار کو اللہ تعالیٰ کے سوا تمام معبودوں کے قتل کرنے پر چلانا چاہے اور پھر دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اول میں لا لگانے کے بعد دوسرا کیا باقی رہ گیا صرف اِلاَّ اللہ باقی رہ گیا اور باقی سب چلا گیا۔ اے عشق تجھ کو مبارک بادی کہ تو ہر شرک کے دور کرنے والا ہے)۔

تو جب یہ تمام وساوس منقطع ہو جائیں گے تو کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا اور معلوم ہو جائے گا کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے کیا تعلق ہے اس کے بعد کوئی حکم ناگوار نہ گزرے گا کیونکہ عاشق کو کوئی حکم محبوب کا ناگوار نہیں ہوتا بلکہ یوں چاہے گا کہ کسی طرح ہر وقت ادھر سے کچھ ارشاد ہی ہوتا رہے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ وہ ایک طبیب پر عاشق ہو گیا تھا آخر بیمار پڑا لوگ اس طبیب کو علاج کے لئے لائے تو یہ مریض یوں تمنا کرتا تھا کہ مجھے کبھی شفا نہ ہوتا کہ اسی بہانے سے روزانہ یہ طبیب میرے پاس چلا تو آیا کرے۔ صاحبو! واقعی یہ آگ بہت غضب کی چیز ہے کہ عاشق تو عاشق معشوق کو بھی متوجہ کر دیتی ہے۔

عشق را نازم کہ یوسف را ببازار آورد ہمچو صنعازا ہدیٰ ازیر زنار آورد[1]

(مجھے عشق پر ناز ہے کہ جو حضرت یوسف علیہ السلام کو بازار میں لے آیا ہے جیسا کہ عشق ہی ایک زاہد کو شہر صنعاء میں زنار کے نیچے لے آیا تھا یعنی عشق کی وجہ سے مذہب تک بدل گیا)۔

دیکھئے اس مریض کا مرض ہی تھا کہ جس نے طبیب کو بھی کھینچ ہی لیا آج کل کے عقلاء اس کو نہ سمجھیں گے کیونکہ یہ محض ذوقی ووجدانی امر ہے چند ہی روز ہوئے کہ سفر الہ آباد پیش آیا ہمراہ میرے ایک دوست بھی تھے وہ چونکہ شاعر بھی ہیں ایک موقع پر اپنے کچھ اشعار پڑھ رہے تھے کہ ان میں یہ شعر بھی پڑھا

کیا بیٹھا ہے سینے پر زانو کو دھرے قاتل ہاں پھیر بھی دے خنجر کیا دیر لگائی ہے

اس مجمع میں ایک مولوی صاحب بھی تھے جن کی کتابیں عربی کی سب تمام تھیں لیکن شعر سے بالکل مناسبت نہ تھی انہوں نے جو یہ شعر سنا تو نہایت تعجب سے کہا کہ اس شعر کا کیا مطلب ہے یہ تو بالکل لغو معلوم ہوتا ہے کیونکہ نہ تو محبوب حقیقی نے کسی کے گلے پر خنجر پھیرا نہ ان شاعر کے مرشد نے کبھی ایسا کیا البتہ طمانچہ شاید کبھی کسی کو مار دیا ہو لیکن سینے پر زانو رکھ کر تو کبھی نہیں بیٹھے۔ غرض ان کو ہر چند سمجھایا گیا لیکن اخیر تک ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا وہ اس کو برابر غلط ہی کہتے رہے اور لوگ ہنسا کئے تو دیکھئے شعر سے مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے وہ ایک صاف شعر کو نہ سمجھ سکے تو اسی طرح جن

---

[1] زنا سے مراد خلاف وضع دناموس نہ کہ خلاف شرع کیونکہ عشق میں ننگ دناموس ونخوت وکبر سب زائل ہو جاتا ہے۔

لوگوں کو یہ نسبت حاصل نہیں ہے ان کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ کیا بات پیدا ہو جاتی ہے لیکن ایسے لوگوں کو اہل محبت پر طعن کرنا ہرگز زیبا نہیں غرض محبت ایک عجیب چیز ہے ذرا غور کر لیجئے کہ اگر ایک مردار عورت سے محبت ہو جاتی ہے تو کیا حال ہوتا ہے کہ اس کے درشت اور نازیبا کلمات بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں اور بے جا فرمائشیں بھی پوری کی جاتی ہیں اور دل پر ناگواری نہیں ہوتی۔

توبہ کی ضرورت

یہ سب تمہید تھی اس آیت کے متعلق جس کی اس وقت تلاوت کی گئی تھی کیونکہ اس میں حکم ہے توبہ کا اور توبہ بوجہ اس کے کہ گناہ میں لذت ہے انسان پر گراں ہوتی ہے لیکن اس کو چھوڑنا نہ چاہیئے کیونکہ گرانی اس کی صرف ابتداء میں ہے چند روز کے بعد تمکین حاصل ہو جاتی ہے پھر کچھ گرانی نہیں رہتی چونکہ تمہید بہت طویل ہوگئی ہے نیز ضروری مضامین اکثر بحمداللہ اس میں آگئے ہیں اور وقت بھی زیادہ گزر گیا ہے اس لئے میں آیت کا صرف ترجمہ کر کے مضمون کو ختم کرتا ہوں نفس مضمون آیت کے متعلق خدا تعالیٰ نے چاہا تو کسی دوسرے موقع پر بیان ہو جائے گا۔ سو آیت میں خدا تعالیٰ نے توبہ کا حکم دیا ہے فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو خدا کی جانب رجوع کرو خالص رجوع۔ ترجمہ پر غور کیجئے اور خدا تعالیٰ کے احسان وعنایت کو ملاحظہ فرمائیے کہ یوں نہیں فرمایا کہ بالکل گناہ ہی نہ کرو بلکہ یہ فرمایا کہ اگر گناہ ہو جائے تو توبہ کرو۔ صاحبو! اس میں کوئی دقت نہیں ہے اس سے تو ہمت نہ ہارنی چاہیئے۔ دیکھئے شریعت کی آسانی کو ملاحظہ فرمائیے کہ اول تو یہ ہے کہ بد پرہیزی کر کے بیماری نہ پڑو اور اگر بیمار پڑ جاؤ تو دوا پی لو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ توبہ سے کیا فائدہ کیونکہ پھر گناہ ہوگا۔ میں جواب میں کہا کرتا ہوں کہ یہ قانون امراض ظاہری میں کیوں نہیں چلایا جاتا کہ علاج سے کیا فائدہ جب کہ اگلے بھادوں میں پھر بخار کی آمد ہوگی۔

اب میں ختم کرتا ہوں انشاءاللہ تفصیل اس آیت کی دوسرے وقت ہو جائے گی اور اگر نہ بھی ہوئی تو جس کو طلب ہوگی جزئیات کی تفصیل اس کو خود ہی تلاش سے معلوم ہو جائے گی، دیکھئے جو شخص سکول کے حالات معلوم کرنا چاہے اگر اس کو طلب ہے تو خود ہی سکول میں داخل ہونے کی فکر کرے گا اور وہاں داخل ہو کر سب حالات خود بخود معلوم ہو جائیں گے۔ اَب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیقِ عمل دے۔ آمین۔

اوّل الاعمال

یہ وعظ

تو بہ اول الاعمال ہے اس کے متعلق وعظ شب ۱۹ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ کو شیخ فیاض محمدؔ سوداگر (نیل گنج کانپور) کی کوٹھی میں چوکی پر کھڑے ہو کر دو گھنٹے بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تین سو مرد کے علاوہ مستورات بھی تھیں۔ حکیم محمد مصطفےٰ بجنوریؒ نے قلمبند فرمایا۔

دُعاء وخطبہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡم، بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا وَمَا لَهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ ۝ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً وَّفِی الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ نَصِیۡبٌ مِّمَّا كَسَبُوۡا ؕ وَاللّٰهُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ۝ وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ ۚ وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰی ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ اِلَیۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّعۡجِبُكَ قَوۡلُهٗ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَیُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیۡ قَلۡبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الۡاَرۡضِ لِیُفۡسِدَ فِیۡهَا وَیُهۡلِكَ الۡحَرۡثَ وَالنَّسۡلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الۡفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِیۡلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ فَحَسۡبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ۝ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ۝

(البقرہ: ۲۰۰ تا ۲۰۸)

ترجمہ: سو بعض ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں دے دیجئے۔ اور ایسے شخص کو آخرت میں کوئی حصہ نہ ملے گا اور بعضے آدمی ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچائیے ایسے لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا ان کے اس عمل کی بدولت اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کئی روز تک پھر جو شخص دو دن میں جلدی کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو شخص دو دن میں تاخیر کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اس شخص کے واسطے جو ڈرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین کرو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے اور بعضا آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو صرف دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزیدار معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر مانتا ہے اپنے دل کی بات پر حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔ اور جب پیٹھ پھیرتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں فساد کرے اور تباہ کردے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتے۔ اور جب اس سے کوئی کہتا

ہے کہ اللہ سے ڈر تو نخوت اس کو اس گناہ پر آمادہ کر دیتی ہے سو ایسے شخص کی کافی سزا جہنم ہے اور وہ بُری آرام گاہ ہے اور بعضا آدمی ایسا بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہے اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

یہ چند آیتیں جو اس وقت پڑھی گئیں مجھ کو ان کے مدلول لفظی سے ایک مدعا کا مستنبط کرنا اصل مقصود ہے اولاً اس مدلول کو سمجھنا چاہیئے ۔ پھر اس مستنبط کو اور اس مدلول کی تقریر میں بھی ان آیات کے جمیع اجزا کی تفسیر مقصود نہیں۔ بلکہ ان کے مجموعہ میں ایک خاص مضمون مذکور ہے جو مدلول لفظی ہے ان آیات کا اس سے بیان کرنا ہے اور وہ مضمون بلا ان تمام آیتوں کے پڑھے پورا نہیں ہوتا۔ اس واسطے یہ سب آیتیں پڑھی گئیں، وہ مضمون اس مجموعہ آیات میں سے بعض اجزا میں مقصوداً مذکور ہے اور دیگر اجزا اس کے متعلق ہیں اس وقت ان متعلقات کا بیان مقصود نہیں ہے اس وقت اولاً صرف انہی اجزاء کے متعلق کچھ عرض کروں گا جن میں وہ مضمون مقصوداً مذکور ہے۔ ثانیاً اول سے اس مدعا کو مستنبط کروں گا اور وہ مضمون مدلول ایک خاص تقسیم ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے مومن اور کافر کے اعتبار سے فرمائی ہے۔

مکلفین کی چار قسمیں

اور اصل تقسیم یوں ہے کہ مکلّف کی دو قسم ہیں مومن اور کافر اور ان میں سے ہر ایک دو دو قسم پر ہے تو چار قسمیں ہوئیں۔ خلاصہ یہ کہ ایمان اور کفر کے اعتبار سے مکلّف کی چار قسمیں ہیں یہ مضمون ان آیات کے بعض اجزا میں مذکور ہے جہاں جہاں لفظ مِن ہے وہاں ایک ایک قسم ہے آیت میں تین جگہ مِن ہے اور ایک جگہ مِنهُم ہے اس کا حاصل بھی یہی ہے۔ کہیں مِن مظہر پر داخل ہے اور کہیں مضمر پر اور معنی من الناس اور منهم کے ایک ہی ہیں۔ غرض چار قسمیں کی گئی ہیں۔ مقسم وہی مکلّف ہے باعتبار ایمان اور کفر کے تقسیم اول یہ ہے کہ مکلّف یا مومن ہے یا کافر اور دونوں کی دو دو قسمیں ہیں۔ تو کل قسمیں یہ ہوئیں مطلق مومن اور مطلق کافر اور مومن کامل اور کافر شدید۔ اول مطلق مومن اور مطلق کافر کا بیان ہے اور ان دونوں میں سے مقدم ہے کافر کا بیان اور اس کے بعد بطور مقابلہ مومن کا بیان ہے۔ مطلق کافر کا بیان یہ ہے۔ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا یعنی ایک قسم ان میں سے وہ لوگ ہیں جو صرف دنیا کے طالب ہیں ان کی

نسبت ارشاد ہے مَالَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ آخرت میں ان کا کچھ بھی حصہ نہیں، یہاں نکرہ ہے بعد نفی کے جس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ذرا بھی حصہ ان کے واسطے آخرت میں نہیں ہوگا اس میں کافر کی ایک حالت تو دنیا کی بیان ہوئی۔ اور ایک آخرت کی جو کہ دنیاوی حالت پر بطور نتیجہ متفرع (کسی چیز سے نکلنے والا (ثمرہ) ہے اور مومن کا ذکر گو آگے صریح آتا ہے۔

مطلق مومن کی شان

مگر اتنی بات یہیں سے معلوم ہو سکتی ہے کہ جب مومن کافر کا مقابل ہے تو اس کی دنیاوی حالت اس کے دنیاوی حالت کے مقابل ہوگی اور اخروی اس کی اُخروی کے مقابل ہوگی یعنی مطلق مومن کی شان یہ ہوگی خواہ وہ فاسق وفاجر ہی کیوں نہ ہو کہ نہ تو وہ دنیا میں محض دنیا کا طالب ہوگا اور نہ آخرت میں اس کے واسطے مَالَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ ہوگا۔

مومن کے لئے خلود فی النّار نہیں

یعنی ہر مومن کی نجات ضرور ہے گو اخیر میں ہو اور اولاً جزا وسزا اعمال کی بھگتنی پڑے چنانچہ حدیث میں اس معنی کی تصریح موجود ہے لَا یَبْقٰی فِی النَّارِ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ مِّنْ اِیْمَان ؟ (سنن ابن ماجہ: ۵۹، سنن الترمذی: ۱۹۹۸ بلفظ آخر) (نہیں باقی رہے گا دوزخ میں کوئی ایسا شخص جس کے دل میں ذرہ بھر بھی ایمان ہو) کہ دوزخ میں کوئی وہ شخص نہیں رہے گا۔ دوزخ اس کے رہنے کا مکان نہیں ہے۔ مکان اصلی اس کا جنت ہے مگر بعارض دوزخ میں آ گیا ہے، غرض جس کے دل میں ذرا سا بھی ایمان ہے جس کی وجہ سے اس کو کافر نہ کہہ سکیں اس کے واسطے بھی جنت ثابت ہے اور خُلُوْدُ فِی النَّار نہ ہوگا۔ اور کبھی نہ کبھی دوزخ سے نکال لیا جائے گا حتی کہ اس قدر ضعیف اور قلیل الایمان شخص بھی جس کے دل میں اس قدر تھوڑا حصہ ایمان کا ہوگا۔ جس کا پتہ انبیا اور ملائکہ کو بھی نہ لگے گا۔ اور اس کی اطلاع فقط اللہ تعالیٰ کو ہوگی۔ وہ بھی نکال لیا جائے گا۔ چنانچہ ایک حدیث ہے جو شفاعت کے بارہ میں وارد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ اخیر میں فرمائے گا کہ سب لوگ شفاعت کر چکے انبیاء بھی اور ملائکہ بھی اور مومنین بھی۔

حدیث شفاعت میں ایک لطیف تحقیق

اور جس جس کو شفاعت کا حق تھا سب کر چکے یہ لفظ ہے حدیث کا کہ۔ بَقِیَ اَرْحَمُ

الرَّاحِمِینَ یعنی اب شفاعت حق تعالیٰ کی باقی رہی اس کو شفاعت مجازاً فرمایا۔ دراصل تو رحمت ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو کسی دوسرے سے سفارش کرنا نہیں ہے یہ فرما کر ایک لپ بھر کر دوزخیوں کی جنت میں داخل کر دیں گے یہ لپ بھر کنا یہ ہے تعداد کثیر سے۔ اس حدیث میں غور کرنا یہ ہے کہ تھوڑے تامل سے بخوبی واضح ہوسکتا ہے کہ اس سے میرے اس دعوے کا اثبات ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے قلب میں اتنا خفیف ایمان ہوگا جس کا پتہ کسی شفاعت کرنے والے کو حتی کہ انبیا اور ملائکہ کو بھی نہ چلے گا اور ان کو بھی نجات ہوگی۔ یہ بات ذرا غامض (پوشیدہ کلام) معلوم ہوتی ہے مگر تھوڑی تقریر کے بعد غامض نہ رہے گی وہ تقریر یہ ہے کہ نص قطعی موجود ہے اس پر کہ کافر کی کبھی مغفرت نہ ہوگی چنانچہ سورہ بینہ میں ہے اِنَّ الَّذِینَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَالْمُشْرِکِینَ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِیْنَ فِیْهَا (جو لوگ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کافر ہوئے وہ دوزخ کی آگ میں ڈالے جائیں گے جہاں ہمیشہ رہیں گے) اور اس مضمون کی آیتیں صدہا قرآن شریف میں موجود ہیں چنانچہ عقیدہ اہل سنت کا یہی ہے کہ کافر کے لئے خلود فی النار ضرور ہوگا۔ اور اس کی کبھی مغفرت نہ ہوگی۔ تو اب یہ لوگ جن کو حق تعالیٰ نے اخیر میں دوزخ سے نکالا وہ اس دلیل سے مومن تو ضروری ہیں تو اب دیکھنا یہ ہے کہ کسی نے ان کی سفارش کیوں نہیں کی کیونکہ مومنین کے لئے سفارش کی اجازت ہو چکی، اس کی وجہ اگر ہوسکتی ہے تو یہی کہ یہ لوگ اس قدر ضعیف الایمان ہوں گے کہ کسی کو ان کے ایمان کا احساس نہ ہوسکے گا باوجود یہ کہ سب حدید البصر ہیں مومن کے لئے حدیث میں وارد ہے اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّه یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ (سنن الترمذی: ۳۱۲۷، کنز العمال: ۳۰۷۳۰) یعنی مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کیونکہ وہ نور خدا سے دیکھتا ہے۔

کسی چیز کا علم دینا حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے

جب مومن کی نظر دنیا میں ایسی تیز ہے تو آخرت میں جو کہ عالم ہے کشف حقائق کا کیسی ہوگی پھر جب مومن کی یہ نظر ہے تو انبیاء اور ملائکہ کی نسبت کیا خیال ہوسکتا ہے مگر اس پر بھی ان لوگوں کا ایمان ایسے اہل نظر سے بھی مخفی رہا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ کسی چیز کا علم دینا حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ دنیا کا ہو یا آخرت کا مومن کو بھی تو فراست حق تعالیٰ ہی نے دی ہے۔ اس قصہ میں حق تعالیٰ نے ان کے ایمان کو مخفی رکھا۔ اگر چاہتے تو یہ بھی ظاہر کر دیتے مگر اپنی رحمت خاص دکھلانے کے لئے ایسا کیا۔

ادنیٰ مومن کو بھی حقیر نہ سمجھو

غرض یہ ثابت ہوا کہ بعضوں کا ایمان اتنا خفیف ہوگا کہ انبیاء کو بھی پتہ نہ چل سکے گا اس

واسطے وہ شفاعت بھی نہ کریں گے اس سے معلوم ہوا کہ اگر اتنا ضعیف ایمان بھی ہو کہ ایسے حقیقت شناسوں کو بھی پتہ نہ لگے گا تب بھی بخشش ہو جائے گی یہ مومن کی اخروی حالت کا مقابلہ ہے۔ کافر کی اخروی حالت سے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مومن کو خواہ کسی درجہ کا ہو حقیر نہ سمجھو خواہ وہ کیسے ہی گناہوں میں مبتلا کیوں نہ ہو ہاں اس کے افعال کو برا سمجھو۔

اپنے تقدس پر ناز کی مذمت

بعضوں کو تقدس کا ہیضہ ہو جاتا ہے کہ چار نفلیں پڑھیں اور اپنے آپ کو بزرگ سمجھنے لگے۔ اور دوسروں کو حقیر کسی کو نظر ہی میں نہیں لاتے اور اگر ذرا سا عیب کسی میں دیکھتے ہیں تو اسی پر طعن کرنے لگتے ہیں اپنا ذرا سا ہنر بڑا معلوم ہوتا ہے اور دوسروں کا ذرا سا عیب بہت بڑا عیب دکھائی دیتا ہے حالانکہ چاہیئے اس کا عکس کہ دوسروں کے تو ہنر کو دیکھے اور اپنے عیب کو اور جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ ہمیشہ غلطی میں مبتلا ہوتا ہے۔

گنہگار مومن کی مثال

اگر دوسرے مومن میں کوئی عیب ہے تو اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے ایک حسین شخص ہے کہ اس کا منہ کالا کیا ہوا ہے وہ حقیقت میں تو حسین ہے اور بدصورتی عارضی ہے جس کی نظر صحیح ہوگی وہ دونوں حالتوں کو الگ پہچان لے گا اور اس عارضی بدصورتی کی وجہ سے اس کو حسین ہونے سے خارج نہ کرے گا اور یوں سمجھ لے گا کہ یہ وہی حسین ہے لیکن حماقت سے اس نے منہ کالا کر لیا ہے اور بمقابلہ اس کے اگر اپنے اندر لاکھ ہنر ہوں اور بہت سے اوصاف حمیدہ رکھتا ہو تو اپنی ایسی مثال سمجھے کہ درحقیقت تو یہ کالا کلوٹا ہے مگر اس نے پوڈر مل رکھا ہے اگر دونوں کو دھویا جائے تو دونوں کی حالت برعکس ہو جائے تو صاحب نظر نے سیاہی کو بدصورت سمجھا نہ کہ اس حسین کو۔ اسی طرح مومن حسین ہے اور گناہ کالک اگر اس کالک کو توبہ سے دھوئے تو اچھا خاصا خوبصورت نکل آئے اور اپنی نسبت یہ سمجھے کہ ممکن ہے کہ ہماری طینت ہی خراب ہو اور پوڈر تقویٰ کامل رکھا ہو اور جو کچھ حالت اچھی نظر آتی ہے وہ سب تصنع اور تلبیس ہو اس واسطے اپنی طرف گمان نیک کرنے میں اور دوسرے کو حقیر سمجھنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے دوسرے کو کبھی حقیر نہ سمجھے ہر مومن میں شان مقبولیت ہے چنانچہ اس کا ظہور کبھی نہ کبھی ہوگا اور ضعیف سے ضعیف مومن بھی بالآخر دوزخ سے نکال لیا جائے گا غرض کسی مومن پر مَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ صادق نہیں آسکتا یہ شان صرف کافر کی ہے۔

کافر کی دو حالتیں

تو کافر کی حالتیں دو ہوئیں دنیا میں یہ کہ وہ فقط طالب دنیا ہو اور آخرت میں یہ کہ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ کا مصداق ہو اب سمجھ میں آ گیا ہوگا۔

کفر ذرا سا بھی موجب خلود فی النار ہے

اس جزو آیت میں معنی فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ میں مطلق کافر کا ذکر ہے اور اس کے درجات کا بیان نہیں کیونکہ ضعیف سے ضعیف کفر کا بھی یہ حکم مشترک ہے کہ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ یعنی آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہرگز اس کی نجات نہیں ہو سکتی اور راز اس میں یہ ہے کہ کفر اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس درجہ قبیح ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی خوبی مؤثر نہیں کہ اس پر کوئی حصہ آخرت میں اس کو ملتا اور وہ حقیقت بغاوت ہے جس کا یہ اثر مسلم ہے پس یہاں ایک اور مسئلہ بھی حل ہو گیا خصوص ایسے لوگوں کے مذاق پر تو بالکل صاف ہو گیا جن کا مذاق یہ ہے۔

کافر کی مثال باغی سلطنت کی ہے

اور آج کل ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہے جو کہتے ہیں کہ ہم نظائر سے سمجھتے ہیں ہر بات کو اور اس بنا پر یہ لوگ مدعی عقل کے ہیں اگر اس طرز کی عقل سے کام لیتے تو یہ مسئلہ خود حل ہو جاتا وہ مسئلہ یہ ہے کہ یہ لوگ شبہ کرتے ہیں کہ فرض کرو ایک کافر میں بہت خوبیاں ہیں اور یہ صرف فرضی بات نہیں بلکہ اس کی نظیریں موجود ہیں مثلاً وہ موحد ہے توحید کے متعلق اس کا عقیدہ ٹھیک ہے مگر رسالت کا منکر ہے اور خلیق بھی بہت ہے اور معاملہ کا بھی صاف ہے وغیرہ وغیرہ اس پر علماء اسلام یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ جہنم میں جائے گا اور خلود فی النار ہوگا اور کبھی نجات نہ ہوگی علماء کی نسبت کہتے ہیں کہ بہت متشدد ہیں اتنے اوصاف کو صرف ایک غلطی کی وجہ سے مٹا دیا۔ تقریر اس شبہ کے حل کی یہ ہے کہ اگر کسی نے بادشاہ سے بغاوت کی تو ظاہر بات ہے کہ وہ بغاوت کرنے والا کوئی معمولی آدمی نہ ہوگا بلکہ کوئی بڑے حوصلہ کا اور اعلیٰ ڈگری یافتہ قابل شخص ہوگا اور بڑا زبان آور ہوگا کہ اپنی تقریر اور تحریر سے ایک مجمع کو اپنا مسخر کیا ہوگا تن تنہا تو ایک شخص اتنا بڑا کام کر ہی نہیں سکتا پھر وہ اتنا بڑا کام کر ہی نہیں سکتا پھر وہ اتنا بڑا تو قابل ہے اور بہت سے اوصاف کا جامع ہے اور عیب ہے تو صرف یہ کہ باغی ہے اور فساد کرتا ہے میں ان عقلاء سے پوچھتا ہوں کہ اس کی سزا کیا ہوگی باتفاق ممبران پارلیمنٹ سزائے موت تجویز ہوگی پارلیمنٹ مجمع عقلاء ہی کا نام ہے تو بلفظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ

تمام عقلاء کے نزدیک سزائے موت ہی کا وہ مستحق قرار دیا جائے گا مگر اس پر کوئی صاحب یہ اعتراض نہ کریں گے کہ اس شخص میں ایک ذرا سا عیب ہے یعنی بغاوت کی ہے اور ہنر بہت زیادہ ہیں صناع ہے اور تعلیم یافتہ ہے اور جامع فنون ہے اور خاک بلا ہے کیا وجہ ہے کہ ایک بغاوت سے سب کمالات مٹ گئے اور خیر پارلیمنٹ کے فیصلہ پر تو اعتراض کرنے یہ کہاں جائیں گے کوئی ان ہی سے پوچھے کہ ایسے شخص کی سزا کیا ہونا چاہیئے تو یہ معترض صاحب خود بھی یہی کہیں گے کہ ایسے شخص کی یہی سزا ہے کیوں صاحب بڑے تعجب کی بات ہے کہ دنیا کی گورنمنٹ کو اپنے باغی کے کمالات کو ایک بغاوت کی وجہ سے کالعدم سمجھنے کا اختیار ہو اور خدائے احکم الحاکمین کو نہ ہو حیرت ہے بلکہ اتنا فرق بھی ہے کہ دنیا میں جو کمالات اس باغی میں تھے وہ عطا کردہ گورنمنٹ نہ تھے پھر بھی حبط کالعدم سمجھ لئے گئے اور پھر اس کو حق بجانب کہا جاتا ہے اور حق تعالیٰ کے باغی کے کمالات خود حق تعالیٰ ہی کے دیئے ہوئے ہیں پھر اسی کے مقابلہ میں اس نے اسی خداداد ذہن اور علم سے کام لیا جس ہانڈی میں کھایا اسی میں چھید کیا کیونکہ حق تعالیٰ کے مقابلہ میں تو بندہ کی یہ شان ہے کہ ؎

نیا ور دم از خانہ چیزے نخست تودا دی ہمہ چیز من چیز تست

(میں اپنے گھر سے کوئی چیز نہیں لایا۔ یہ تو سب آپ کا دیا ہوا ہے میری کیا حقیقت ہے)۔

سب چیز خدا تعالیٰ کی دی ہوئی اور پھر اسی کے مقابلہ میں صرف کی جائے جیسے کہ سپاہی کو ہتھیار دیئے جائیں اور وہ ان سے اسی آقا کا مقابلہ کرنے لگے جس نے ہتھیار دیئے تو یہ کس قدر نمک حرامی ہے اور اس صورت میں یہ شخص بدر جہا اس سے زیادہ سزا کا مستحق ہے جو دوسرے کے دیئے ہوئے ہتھیاروں سے مقابلہ کرنے لگے۔

کافر کی سب خوبیاں بے سُود ہیں

غرض یہ شبہ محض بے اصل ہے کہ کافر کی کسی خوبی کا اعتبار کفر کے ہوتے ہوئے ہوسکتا ہے کافر کے واسطے چاہے وہ تمام اوصاف کا مجموعہ ہو عقلاً یہی حکم ہونا چاہیئے کہ اس کی سب خوبیاں بے سود ہیں اور نتیجہ یہی ہے کہ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں) بعضے لوگ انکار توحید پر تو اس سزا کے ترتیب کو موافق عقل کے سمجھتے ہیں مگر انکار رسالت پر شبہ کرتے ہیں کہ مقصود اعتقاد رسالت سے بھی اعتقاد توحید ہی ہے کہ انبیا اسی واسطے آئے ہیں پس جب مقصود حاصل ہے تو طریق کے انکار سے کیا ضرر پس اصل دین یعنی توحید اس میں موجود ہے محض ایک رسالت کے متعلق اس کا خیال غلط ہے سو یہ غلطی ایسے شخص کو معاف ہونا چاہیئے اس کا جواب یہ ہے کہ منکر توحید کی نسبت تو

اس سزا کا استحقاق تم کو بھی مسلم ہے صرف منکر رسالت کے شبہ ہے سو ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ جو شخص منکر رسالت ہوگا وہ منکر توحید بھی ہوگا پس اب منکر رسالت کے استحقاق پر بھی شبہ نہ رہا۔

منکر رسالت منکر توحید ہے

اب صرف انکار رسالت کا مستلزم انکار توحید ہونے کا اثبات باقی رہا سو سنئے کہ توحید کیا چیز ہے صرف ذات ہی کا ماننا نہیں ہے ذات مع الصفات والکمالات کا ماننا ہے اور اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی کہے فلاں ملک کے بادشاہ کا میں قائل ہوں اور اس کو بادشاہ مانتا ہوں اور جب اس سے پوچھیں کہ وہ ہے کیسا تو کہے کہ ایک عجیب الخلقت حیوان ہے جس کی آنکھیں گدی پر ہیں اور چار ہاتھ ہیں اور ایک دُم ہے تو کیا اس کو اس بادشاہ کا قائل کہا جائے گا کہ خدا کا قائل ہونا وہ معتبر ہے جو مع اس کے جملہ کمالات کے ہو ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ صدق بھی منجملہ کمالات کے ہے جس کا مقابل کذب نقص اور عیب ہے اگر کوئی خدا کو جھوٹا مانے تو وہ خدا ہی کا منکر ہوگا۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ قرآن میں ارشاد حق ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، تو اب رسالت کا انکار صدق خدا کا انکار اور صدق خدا کا انکار خود خدا کا انکار ہے اور یہی مدعا تھا اب صرف یہ بات رہ گئی کہ محمد رسول اللّٰہ جس قرآن میں ہے۔

قرآن کے کلام اللہ ہونے کی دلیل

کیا وہ قرآن کلام حق ہے سو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر اس کے کلام اللہ ہونے میں شبہ ہو تو اپنے موقع پر اس کے دلائل عقلیہ موجود ہیں مثلاً فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (اچھا تو لے آؤ بنا کر ایک سورت اس جیسی) یہ دعویٰ عرب جیسی جوشیلی اور غیور قوم کے سامنے کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ ہرگز ایسا نہ کر سکو گے پھر اگر ایسا نہ کر سکو گے اور ایمان نہ لاؤ گے تو اس وعید کو سن رکھنا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ذرا بچتے رہو دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں کوئی ادنیٰ غیرت والا بھی مخالف کے منہ سے یہ تہدیدیں سن نہیں سکتا مثلاً ایک خوشنویس بہت سے خوشنویسوں کے مجمع میں ایک لوح لکھ کر ڈال دے اور دعویٰ کرے کہ کوئی ایسا لکھ نہیں سکتا تو اس وقت اس مجمع کا غیرت سے کیا حال ہوگا۔ ان میں سے کوئی شخص بھی تا بہ امکان اپنی قوت کو اٹھا نہ رکھے گا اور ضرور لکھ کر دکھلائے گا خاص کر جبکہ اس نے یہ بھی کہہ دیا ہو کہ اگر نہ لکھ گیا تو سب کو غلامی کا طوق پہننا پڑے گا اگر اس صورت میں نہ لکھ سکیں تو ضرور یہ بات مان لینے کی ہوگی کہ سب عاجز

ہیں ایسے ہی قرآن شریف میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس کی مثل کوئی بنا نہیں سکتا اور پھر نہ بنا تو اب قرآن شریف کے معجز ہونے میں کیا کلام رہا اور اگر کوئی کہے فصحائے عرب میں اس کا مثل بنانے کی قدرت تو تھی مگر بنایا نہیں ہم کہیں گے کہ قدرت اور کون سے موقع کے لئے ہے جب ایسی تہدیدوں کے سامنے بھی اس سے کام نہ لیا گیا تو یہ صاف دلیل قدرت کے نہ ہونے ہی کی ہے اور یہ دعویٰ ایسے وقت کیا گیا تھا جب کہ اکیلے حضور ﷺ ایک طرف تھے اور تمام عرب ایک طرف تھا اور پھر قیامت تک کے لئے دعویٰ کیا گیا لَنْ تَفْعَلُوْا میں کیونکہ لَنْ تَفْعَلُوْا صیغہ استقبال مؤبد کا ہے جس کی کوئی حد نہیں بیان کی گئی اس کا ترجمہ یہ ہوا کہ قیامت تک بھی تم نہیں کر سکو گے یہ بات عرب کے لئے ایسی تھی کہ جان دے دینا اس کے مقابلہ میں سہل تھا جاہلیت کے قصے دیکھئے کہ بات کی پچ میں قبیلے کے قبیلے کٹ مرے اور صدیوں تک میل نہ ہوا پھر کیسے یہ بات مان لی جائے کہ ایسے غیرت دلانے والے لفظ کے بعد بھی کوئی کوشش ان لوگوں نے اٹھا رکھی ہوگی کہتے تو رہے کہ لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (اگر ہم چاہیں ہم بھی کہہ لیں اس جیسا) یعنی اگر ہم چاہتے تو اس کی مثل بنا لیتے مگر معلوم نہیں کہ یہ لَوْ نَشَآءُ کب کام آئے گا اس پر تو مجھے ایک قصہ طالب علم کا یاد آتا ہے جو کسی شاہزادی سے نکاح کرنا چاہتے تھے مگر کہاں شاہزادی اور کہاں یہ کسی نے پوچھا کہ میاں کچھ کامیابی کی بھی امید ہے کہا ہاں آدھا سامان تو ہو گیا ہے آدھا باقی ہے کیونکہ نکاح کے دو جزو ہیں ایجاب اور قبول سو میں تو ایجاب کے لئے تیار ہوں اس کا قبول کے لئے راضی ہونا باقی ہے تو کیا عقلاء کے نزدیک یہ آدھا سامان ہو گیا اسی طرح ان کے اس کہنے سے کہ ہم چاہتے تو ایسی کتاب بنا لیتے کیا کتاب بن گئی اگر بن گئی تو کوئی پیش کرے یا اب کوئی بنا لے لیجئے استدلال عقلی سے قرآن کا کلام الٰہی ہونا ثابت ہو گیا پس وہ شبہ متعلق قرآن کے بھی جاتا رہا اور تمام شبہات مرتفع ہو کر مطلق کافر کے مخلد مؤبد فی النار ہونے کا استحقاق ثابت ہو گیا غرض یہ جزو آیت کا یعنی مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ مطلق کافر کی شان میں ہے۔

مکلفین کی دوسری قسم

دوسری قسم مکلّف کی اس دوسرے جملہ میں ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک گروہ آدمیوں کا وہ ہے جو کہتا ہے اے اللہ ہم کو دنیا میں بھی نیکی دیجئے اور آخرت میں بھی ترجمہ ہی سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مومن مطلق کی شان میں ہے کیونکہ اعتقادِ آخرت ہر مومن میں مشترک ہے۔

آیت فی الدنیا حسنۃً سے ترقی دنیا مراد نہیں

اور یہاں ایک بات پھر یاد آئی کہ اس آیت کو آج کل کے تعلیم یافتہ بہت پڑھتے ہیں اور اپنا ایک مدعا اس سے ثابت کرتے ہیں وہ مدعا کیا ہے ترقی دنیا کہتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم تو یہ ہے کہ آخرت کی ترقی کے ساتھ دنیا میں بھی ترقی کرو اور خشک مغز مولوی دنیا کی ترقی کو بالکل روکتے ہیں، یاد رکھئے کہ آیت ہی میں اس کا جواب موجود ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے من الدنیا حسنۃً نہیں فرمایا بلکہ فی الدنیا حسنۃً فرمایا ہے اگر من الدنیا حسنۃً فرمایا ہوتا تو یہ معنی ہو سکتے تھے کہ دنیا کی وہ حالت دیجئے جو اچھی ہو جس کو بلفظ دیگر ترقی کہہ سکتے ہیں جس کے ثبوت کے لئے یہ آیت پیش کی جایا کرتی ہے اور فی الدنیا حسنۃً کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں بھی ہم کو اچھی چیز دیجئے اور اس اچھی چیز کا جزو دنیا ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں بلکہ لفظ حسنہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی دنیا کی چیز نہیں کیونکہ یہی لفظ حسنۃ آگے بھی موجود ہے اور ظاہر یہی ہے جو کہ معنی اس کے وہاں ہیں وہی یہاں بھی ہوں گے اور ظاہر ہے کہ وفی الآخرۃ حسنۃً میں مراد ترقی مصطلح (اصطلاح اور محاورہ شدہ) نہیں ہے بلکہ نیکی مراد ہے تو اس دعا میں دنیا کی اچھی حالت نہیں مانگی بلکہ دنیا میں نیکی مانگی اور دنیا میں وہ نیکی اعمال صالحہ ہیں اور آخرت میں وہ نیکی ان کی جزا ہے تو حسنہ دنیا میں جس کی طلب کی گئی ہے وہ انگریزی پڑھنا نہیں ہوئی بلکہ توفیق اعمال صالحہ ہوئی اور میری اس تقریر کا مطلب یہ نہیں کہ میں انگریزی پڑھنے کی ممانعت اس آیت سے ثابت کرتا ہوں پڑھے، اور دس گونی پڑھیئے

چشم ما روشن ودل ما شاد (ہماری آنکھیں روشن اور دل خوش)۔

ہاں اس کے واسطے کچھ حدود ہیں ان کے اندر رہیئے اور ان سے تجاوز نہ کیجئے اور وہ حدود ممنوعات شرعیہ ہیں ان میں نہ پڑے پھر انگریزی جتنی چاہے پڑھئے مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ قرآن میں اس کو داخل نہ کیجئے اور ماموراتِ شرعیہ میں سے نہ سمجھئے قرآن ایسی چیزوں سے ساکت تو ہو سکتا ہے جس سے غایت سے غایت اباحت (جائز) نکل آئے باقی ایسی چیزیں مدلولات قرآنیہ میں سے نہیں ہیں۔

قرآن کی بے ادبی

ورنہ خدا خیر کرے ہر چیز قرآن ہی میں داخل ہو جائے گی لوگ اس کو بڑا ہنر سمجھتے ہیں کہ ہر چیز کو قرآن میں سے نکالیں۔ حالانکہ یہ قرآن کی بے ادبی ہے آج کل ایسے مذاق کے لوگ بہت ہیں جنہوں نے ملعوبہ بنالیا ہے۔ قرآن کو حالانکہ قرآن طب روحانی ہے اس میں وہی چیزیں داخل ہیں جن کو روحانی

علاج سے تعلق ہے تعجب ہے کہ اس میں وہ چیزیں تلاش کی جاتی ہیں جو اس کے مبحث سے خارج ہیں۔

قرآن میں ہر چیز تلاش کرنے کی مثال

دیکھئے طب اکبر ایک کتاب ہے جو فن طب میں ہے اس میں اگر کوئی کہے کہ جوتیاں سینے کا بیان نہیں ہے تو اس پر اعتراض نہیں ہوتا اور یہی جواب دیا جاتا ہے کہ وہ اس فن کی کتاب نہیں ہے اسی طرح قرآن کی نسبت دعویٰ ہے کہ وہ اپنے فن کی کامل کتاب ہے کسی قسم کا نقص اس میں نہیں ہے اور کوئی کتاب بھی اس کے برابر کامل نہیں ہے مگر اس میں وہ باتیں تلاش کرنا جن کو اس فن سے کوئی علاقہ نہ ہو ایسا ہی ہے جیسے طب اکبر میں جوتیاں سینے کی ترکیب کو ڈھونڈنا۔ اگر طب اکبر میں یہ صنعت بھی ہوتی یا اب کوئی یہ صفت بڑھادے کہ ہر باب کے بعد ایک صنعت بھی لکھ دے مثلاً دردِ سر کے بعد اینٹیں بنانے کی ترکیب لکھ دے پھر سرسام کے بیان کے بعد مکان بنانے کی کچھ ترکیبیں لکھ دے پھر مالیخولیا کا بیان آجائے اس کے آگے ایک بیان ہو۔ جوتیاں سینے کا وعلیٰ ہٰذا۔ ہر بیان کے بعد ایک صنعت بھی بڑھادے بلکہ ہر دو چار سطر کے بعد ایک سطر کسی صنعت کی بھی اس میں ہو چاہے کلام مرتبط ہو یا نہ ہو تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا رائے قائم کی جائے گی۔ یہی کہا جائے گا اور سب دیکھنے والے ہنسیں گے کہ طب میں جوتی کی صنعت کیوں آگئی اور کوئی بھی اس کو پسند نہ کرے گا حالانکہ آج کل کے مذاق کی موافق تو یہ اضافہ بہت ہی معقول ہے اور اس سے کتاب کی خوبی بڑھنا چاہئے کیونکہ پہلے صرف طب اکبر سے طبی معلومات حاصل ہوتی تھیں۔ اب بہت سے صنائع اور حرفوں کا بھی علم ہوگا لیکن کوئی بھی اس کو پسند نہیں کرتا۔ پھر نہ معلوم کہ کلام اللہ میں اس ملغوبہ کو کیوں پسند کیا جاتا ہے ذرا اس مثال کو ذہن میں حاضر کرکے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ کس قدر بیہودہ حرکت ہے کلام اللہ کی عظمت کیا اسی کی مقتضی ہے کہ اس طرح سے اس کے ساتھ بے ادبی کی جاوے پس کلام اللہ طب روحانی ہے اور چیزوں کا اس میں ٹھسنا کمال نہیں بلکہ نقص ہے اور اس کے بارہ میں جو یہ جملہ پیش کیا جاتا ہے۔

جَمِیعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرآنِ لٰکِنْ تَقَاصَرُ عَنْہُ اَفْھَامُ الرِّجَالِ

(قرآن کریم میں جملہ علوم ہیں لیکن۔ لوگوں کی عقلیں وہاں تک پہنچنے سے عاجز ہیں)

جمیع العلم فی القرآن کا جواب

اس سے مراد علوم مقصود یعنی علوم دین ہیں اور پھر علوم دین میں کے بھی اصول گو کہیں فروع

بھی ہیں مگر جملہ فروع نہیں یہی تو وجہ ہے کہ حدیث میں حضور ﷺ فرماتے ہیں ۔ اُوتِیتُ مِثلَ الْقُرْآنِ (مجھے قرآن کے اس کا مثل (حدیث) بھی دیا گیا ہے) چنانچہ میں گدھے کو حرام کرتا ہوں دیکھ لیجئے اس کی حرمت قرآن میں نہیں ہے صرف حدیث سے ثابت ہے غرض اصول اور مہمات دین تو سب کے سب مذکور ہیں قرآن میں اور بعض فروع بھی ہیں فروع کے احاطہ کا اہتمام نہیں کیا گیا اور آج کل اسی کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہر ہر فرع بھی قرآن ہی سے نکالی جائے بلکہ دین تک بھی اس کا حصہ نہیں رہا دنیا کی باتیں بھی قرآن ہی سے نکالنا چاہتے ہیں اور اس کو قرآن کا بڑا کمال سمجھتے ہیں، اخباروں میں ایسے مضمون چھپتے ہیں مثلاً ایک سوال نوجوانوں کا یہ شائع ہو رہا ہے کہ داڑھی کا ثبوت قرآن میں کہاں ہے اور چونکہ یہ بات ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ہے

داڑھی کا ثبوت

قرآن کا کمال یہ ہے کہ ہر بات اسی میں نکل آئے اس واسطے جواب دینے والے بھی سوال کرنے والوں کا اتباع کرتے ہیں اور یہی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن ہی سے داڑھی کا ثبوت دیں سو یہ جواب صحیح نہیں بلکہ جواب صحیح اس کا یہ ہے کہ اَدِلّہ (دلیل) کا حصر قرآن میں نہیں ہے شریعت میں چار دلیلیں ہیں کتاب یعنی قرآن اور سنت یعنی حدیث اور اجماع اور قیاس مجتہد تمام مسائل شرعیہ کے لئے ۔ان چاروں میں سے کوئی نہ کوئی دلیل ضرور ہونا چاہئیے اور علماء اس کے ذمہ دار ہیں اور اس کے ذمہ دار نہیں کہ ہر بات کو قرآن ہی سے ثابت کریں یہ جواب نہایت محقق اور باقاعدہ ہے اور کہیں دھوکہ دینے والا نہیں مگر یہ جواب پھیکا ہے رنگین نہیں ایسے جواب آجکل پسند نہیں آتے آجکل تو ایسے جوابوں کی قدر ہے کہ ایک دوست نے داڑھی کا ثبوت قرآن سے دیا کہ دیکھو قرآن شریف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے لَا تَاخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَاْسِيْ (تم نہ میری داڑھی پکڑو اور نہ سر پکڑو) یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کی داڑھی پکڑ لی تو ہارون علیہ السلام نے کہا کہ میری داڑھی نہ پکڑو اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کے ڈاڑھی تھی بس یہ ثبوت ہو گیا قرآن سے میں نے کہا کہ یہ ثبوت وجود لحیہ کا ہے یا وجوب لحیہ کا ظاہر ہے کہ وجوب کا ثبوت تو نہیں ہے صرف وجود کا ہے تو اس کے لئے ناحق اتنا تکلف کیا اپنی ہی داڑھی پکڑ کر دکھادی ہوتی کہ دیکھو یہ ہے پس مشاہدہ سے وجود لحیہ کا ثبوت ہو جاتا سو اگر وہ شخص یہ شبہ کرتا تو آپ کیا جواب دیتے کہنے لگے کہ اس کو اتنی سمجھ کہاں تھی ۔مگر طالب علموں کو تو شرم آئے گی ۔ایسی بات سے جس پر ایسے

اشکال پڑیں جن کا جواب خود اپنے ذہن میں نہ ہو اس جواب میں خرابی یہ ہے کہ اس میں ایک غلط مقدمہ کا تسلیم کر لینا لازم آتا ہے وہ مقدمہ یہ ہے کہ دلیل منحصر ہے قرآن میں حالانکہ یہ مقدمہ غیر مسلم ہے تمام علماء اسلام کے نزدیک دلیلیں چار ہیں اور عقلاً بھی یہی ثابت ہے غرض یہ مقدمہ غلط ہے اور اس کو تسلیم کر لینا بالکل دین کو منہدم کر دینا ہے۔ایک جگہ کہیں اس سے کام نکال لیا جائے اور تمام دین کو برباد کر دیا جائے یہ کام عالم سے نہیں ہو سکتا اس واسطے جو علمی مذاق رکھتا ہے وہ جواب وہی دے گا جو محقق ہے اور جس پر کہیں غبار نہ ہو گو وہ پھیکا ہو اور رنگین جواب کو کبھی اختیار نہ کرے گا کیونکہ وہ جیسی جلدی پسند آنے والا ہوتا ہے ویسی ہی جلدی ختم ہو جانے والا بھی ہوتا ہے مگر مذاق ایسا بگڑا ہے کہ ایسی چال کو پسند کرتے ہیں اور ہر چیز کو ثبوت قرآن سے مانگتے ہیں۔

خیر یہ تو سوال کرنے والوں کی چال ہے۔زیادہ افسوس اس کا ہے کہ مجیب بھی ان کے متبع بن جاتے ہیں اور لگے یا نہ لگے مگر ہر چیز کا ثبوت قرآن سے دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ طریقہ سخت خطرناک ہے اور ہر جگہ چلنے والا نہیں جیسا کہ بیان کیا گیا غرض سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ہر چیز کو قرآن میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں تو انگریزی پڑھئے، مگر اس کو قرآن میں نہ ٹھونسئے اور اٰتِنَافِی الدنیا میں داخل نہ کیجئے اور پھر پڑھئے بھی تو اس طور سے کہ حدود کے اندر رہیئے اور باتوں کو بھی ہم نے چھوڑا مومن تو رہتے مصیبت تو یہ ہے کہ اعمال کی خرابی کو تو کیا رویا جائے اب تو ایمان بھی بگڑنے لگے۔

انگریزی پڑھنے کی شرط

عقائد بھی اکثر انگریزی پڑھنے والوں نے خراب کر لئے اب تو ایمان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اب تو یہی حد کافی ہے کہ ایمان بچا لیجئے اسی حد کا خیال رکھنے کے بعد میں انگریزی کو منع نہیں کرتا غرض انگریزی پڑھئے مگر اس کو قرآن میں داخل نہ کیجئے اور اپنے مطلب کے لئے قرآن میں تحریف نہ کیجئے غرض حسنہ کی یہ تفسیر غلط ہے ورنہ من الدنیا حسنةً ہوتا بلکہ مراد حسنہ سے اعمال صالحہ ہیں جو فی الدنیا ہیں، من الدنیا نہیں اور اگر یہ فی اور من کا فرق کسی کے نزدیک حجۃ نہ ہو تو یہ کہتے ہیں کہ اصل مقصود ہمارا یہ ہے کہ اس دعوے کی مراد اس سے ترقی دنیا ہے کوئی دلیل نہیں سو جو لوگ حسنہ کی تفسیر ترقی دنیا لیتے ہیں یہ ان کا دعویٰ ہے اور دلیل مدعی کے ذمہ ہوتی ہے ہمارے واسطے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اس پر دلیل پیش کریں کہ حسنہ سے مراد وہ ہے جو ہم لیتے ہیں کیونکہ ہمارا ترجمہ لغت کے ساتھ شرع کے موافق ہی ہے نئی تفسیر انہوں نے نکالی ہے لہٰذا دلیل انہیں کے ذمہ ہے مگر خیر تبرعاً ہم نے ایک دلیل پیش کر دی۔

ترقی دین کی دعا

قرآن شریف میں فی الدنیا کا لفظ ہے نہ کہ من الدنیا کا تو حسنۃ کے معنی نیک کام کے ہوئے تو معنے یہ ہوئے کہ اے اللہ ہم کو دنیا میں نیک کام کی توفیق دیجئے اور آخرت میں ان کی جزا دیجئے بلکہ اشارۃً ترقی متعارف کی نفی ہے اس کا قرینہ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ہے ورنہ اس کے بڑھانے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ وَفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً کافی تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی مانگنے کے ساتھ دوزخ میں لے جانے والی برائی سے بچنے کی بھی دعا ہے جس میں وہ ترقی بھی داخل ہے جو موجب معصیت ہو غرض اس آیت میں ترقی دین ہی کی ہے اور ظاہر ہے کہ دین کی دعا کرنا یہ شان مومن کی ہے اتنا تو بہت ہی صاف ہے البتہ اس میں مومن کے درجہ کا بیان نہیں کہ ادنیٰ ہے یا کامل مگر میرا مدعا ہر طرح محفوظ ہے کہ اقسام اربعہ مکلفین میں سے اس آیت میں ایک قسم یعنی مومن مطلق کا بیان ہے جیسا کہ اس سے اوپر کافر مطلق کا بیان تھا باقی دو قسمیں آگے آتی ہیں بیچ میں چند جملے اور ہیں جن کا مضمون مقام کے ساتھ گو مرتبط ہے مگر اس کو تقسیم سے تعلق نہیں اس لئے میں اس کے بیان کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

مکلفین کی تیسری قسم

لہٰذا آگے کی آیتوں سے بقیہ اقسام اور اُن کے احکام بیان کرتا ہوں تیسری قسم یہ ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ترجمہ یہ ہے کہ بعض آدمی وہ ہیں جن کی بات دنیا کے بارہ میں آپ کو اچھی معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو اپنی قلبی حالت پر گواہ بناتا ہے حالانکہ وہ بڑا جھگڑالو ہے وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ترجمہ یہ ہے۔ اور جب وہ یہاں سے جاتا ہے تو اس کا کام یہ ہے کہ زمین میں قتل اور غارت کرنے کی کوشش کرتا ہے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا اور اس کی حالت یہ ہے) وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ یعنی جب اس کو اس پر نصیحت کی جاتی ہے اور خدا کا خوف دلایا جاتا ہے تو اس کو گناہ کرنے پر حمیت اور عار مجبور کرتی ہے یعنی باوجود یہ کہ گناہ ہونا اس کے قلب میں ثابت ہو جاتا ہے مگر حمیت اور عار اور ضد سے گناہ کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ کہ اس کے لئے جہنم کافی ہے اور وہ بری جگہ ہے اس کی شان اور نزول سے معلوم ہوا ہے کہ یہ آیت مطلق کافر کے بارہ میں نہیں ہے کیونکہ یہ آیت اخنس نام منافق کے بارہ میں اتری ہے ایک مقدمہ تو یہ ہے اور دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ ملایئے کہ منافق اشد ہے کافر مجاہر سے اور اسی واسطے منافق کا عذاب مطلق

کافر سے اشد کیونکہ یہ دھوکہ دیتا ہے اس لئے قرآن شریف میں منافق کے بارہ ہے وارد ہے یعنی منافقین اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ دوزخ کے سب سے نیچے طبقے میں ہوں گے ہر دو مقدموں کے ملانے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس آیت میں معمولی کافر کا ذکر نہیں ہے بلکہ اشد کافر کا ہے نیز جن اعمال کا اس آیت میں ذکر ہے وہ نہایت شدید جرائم ہیں مثلاً فساد فی الارض اور اہلاک حرث والنسل یعنی قتل وغارت سب جانتے ہیں کہ یہ شدید جرائم ہیں چنانچہ خود حق تعالیٰ نے بھی فرمایا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ یعنی خدا تعالیٰ کو یہ اعمال پسند نہیں اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آیت مطلق کافر کے بارہ میں نہیں ہے بلکہ شدید کافر کے بارہ میں ہے شدید ہونا تو تقریر مذکور سے معلوم ہوا باقی یہ کہ یہ شخص کافر ہے سو اس کا پتہ مال سے چلتا ہے وہ مال یہ ہے فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ یعنی اس کے لئے جہنم کافی ہے جو بری جگہ ہے یہ حکم کافر ہی کا ہوسکتا ہے نہ کہ مومن کا غرض آیت کے اس ٹکڑے میں کافر شدید کا ذکر ہے نہ مطلق کافر کا جیسا کہ اوپر کافر مطلق کا ذکر آچکا ہے یہ تین قسمیں ہوگئیں۔

مکلفین کی چوتھی قسم

اسکے بعد یہ آیت ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ یہ عطف دور سے چلا آرہا ہے اور یہ جملہ علیحدہ نہیں ہے اس واسطے میں نے دور سے آیت کو شروع کیا وہیں سے وَمِنَ النَّاسِ کا سلسلہ چلا آرہا ہے قرآن شریف روزمرہ پڑھا جاتا ہے مگر پڑھنے والے کی نظر کبھی نہیں جاتی اس پر کہ یہ سب ایک ہی سلسلہ میں مرتب ہیں اول کی دو قسموں پر تو نظر پڑ بھی جاتی ہے کیونکہ ان کا عطف قریب قریب ہے اور یہ دو قسمیں جملہ مستانفہ معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ان کا عطف بعید ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان قسموں کو ماقبل سے کوئی تعلق نہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ سب جملے باہم مرتبط ہیں اور ایک ہی مقسم کی چاروں قسمیں آیت میں موجود ہیں۔ غرض چوتھی قسم یہ ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ یشری بمعنی بدیع کے ہے تو ترجمہ یہ ہوا کہ ایک قسم آدمیوں کی وہ ہے جو اپنی جان کو خدا تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے بیچ ڈالتے ہیں ان کا کام تو یہ ہے اور حق تعالیٰ کا ان کے ساتھ برتاؤ یہ ہے۔ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ اس کی شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ہی اشخاص کی شان میں ہے جو کمال درجہ ایمان پر پہنچے ہوئے تھے جن کو مومن کامل کہنا چاہئے اور لفظ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ بھی بتاتا ہے کہ آیت مطلق مؤمن کے بارے میں نہیں ہے بلکہ بڑے مومن کے بارے میں ہے کیونکہ

رؤف مبالغہ کا صیغہ ہے رافت خود شدت رحمت کو کہتے ہیں اور اس سے مبالغہ کا صیغہ بنا تو اور رحمت میں شدت ہوگئی پس ایسی رحمت اسی شخص کے واسطے ہو سکتی ہے جو بدرجہ کمال اس کا مستحق ہو اور وہ مومن کامل ہی ہے اور لفظ بالعباد بھی بتاتا ہے کہ مومن کامل ہی مراد ہے کیونکہ اعلیٰ درجہ کا کمال عبدیت ہی ہے تو کل قسمیں مکلفین کی چار ہوئیں یہ تو مدلول لفظی تھا ان آیات کا اب اس مدعائے مستنبط کو بیان کرتا ہوں تقریر مذکور میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ ایمان کے مراتب بھی مختلف ہیں اور کفر کے مراتب بھی مختلف ہیں ایک کفر کامل (کامل تو کیوں کہوں کیونکہ کفر تو بدترین عیب اور بدترین نقص ہے اس کی جگہ میں لفظ کفر شدید اختیار کرتا ہوں) دوسرا غیر شدید اور ظاہر ہے کہ آخری وہ درجہ جس کو کامل اور شدید کہا جائے انتہائی درجہ ہوتا ہے پھر اس کے مقابل جو سب میں اول ہو ابتدائی کہلاتا ہے جیسے درسیات میں ہدایہ امور عامہ وغیرہ کو کہا جاتا ہے کہ اخیر کی کتابیں ہیں اور اسی کو دوسرے لفظ میں کہہ سکتے ہیں کہ انتہائی کتابیں ہیں اور میزان کو کہا جاتا ہے کہ پہلی کتاب ہے اسی کو ابتدائی کتاب بھی کہہ سکتے ہیں غرض کمال کو انتہا اور پہلے درجہ کو ابتدا کہتے ہیں اور جب کفر میں یہ مراتب ہیں تو ضرور ایک مرتبہ اخیر ہوگا جس کو میں نے شدت کفر کہا تھا اور ایک درجہ سب سے کم ہوگا جس کو ابتدا کہہ سکتے ہیں غرض کفر میں دو مرتبے نکلے ابتدا اور انتہا اور ایسے ہی ایمان میں بھی ابتدا اور انتہا ہوئی اور مجھ کو اس وقت صرف ایمان کے ان مراتب کا بیان مقصود ہے اور یہی ہے وہ مضمون مستنبط جس کی تمہید کو گو طول تو ہوا مگر ضرورت کی وجہ سے ہوا کیونکہ ایمان کے ان مراتب کا ثابت کرنا اس سب بیان پر موقوف تھا غرض تقسیم مذکور تو مکلفین کی قرآن سے ثابت ہوئی اور اس کے ساتھ ایک مقدمہ عقلی ملایا گیا جو بہت ظاہر ہے پس اس طرح سے آیت میں ابتدائی اور انتہائی درجہ کا بیان ہو گیا اور سوق کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اوّلاً بیان ہے ابتدائی مرتبہ کا اس کے بعد انتہائی کا اور ذکر مراتب میں اسی طرح تدریجاً ترقی کیا کرتے ہیں اور کمال کو بعد میں بیان کیا کرتے ہیں اکثر عادت یہی ہے گو یہاں قرآن میں کوئی لفظ صریح نہیں اس ترتیب کے بارہ میں مگر ایسی ترتیب بلغاء کی عادت ہے اور قرآن بلیغ ہے تو قرآن میں بھی یہی ترتیب ہونا بہت قرین قیاس ہے پھر اقسام کی حقیقت میں نظر کرنے سے بھی یہی ترتیب واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ اول مطلق کا درجہ مذکور ہو۔ پھر کمال کا پس اس طور پر آیت کے مجموعی مضمون سے یہ دعویٰ مستنبط ہو گیا کہ کفر کی طرح

ایمان کے مراتب

ایمان میں بھی یہ مراتب ہیں یعنی ابتدائی اور انتہائی اور اس وقت میری بحث کا تعلق صرف ایمان سے ہے میں درجات کفر سے تعرض نہ کروں گا غرض ایمان کا ایک درجہ تو ابتدائی ہوا اور ایک

انتہائی اور آگے کی ایک آیت سے یہ دلالت بہت ہی واضح ہو جائے گی اور وہ آیت یہ ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً یہ صاف ہے اس بارہ میں کہ دو مرتبے ہیں اسلام میں کیونکہ اس میں خطاب ہے ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں اور ان کو حکم ہے دخول فی السّلم کافة کا معلوم ہوا کہ ایمان کے بعد بھی کوئی مرتبہ باقی ہے جس کو دخول فی السلم کافة کہہ سکتے ہیں اور اس سے پہلے یہ مرتبہ حاصل نہیں، غرض ایمان کے دو درجے ہونا بہت ہی صراحت کے ساتھ ثابت ہو گیا۔ ایک مطلق جو ابتدائی درجہ پر بھی صادق ہے اور چونکہ تفاوت ایمان کا اعمال سے ہوتا ہے چنانچہ بعض اعمال سے نفس ایمان کا وجود ہوتا ہے مثلاً کلمہ شریف کا پڑھنا اور بعض اعمال سے کمال ایمان ہوتا ہے جیسے دوسرے اعمال پس ایمان میں ان دو درجوں کے ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ ایمان سے جن اعمال کا تعلق ہے ان اعمال میں دو درجے ہیں ایک اول الاعمال دوسرا آخر الاعمال پس اب اس مدعا کو اس دوسرے مختصر عنوان سے یوں ادا کر سکیں گے۔

مسلمان کو اعمال میں ترقی کی ضرورت

اعمال متعلقہ ایمان میں کچھ ابتدائی ہیں اور کچھ انتہائی اور دلائل سے ثابت ہے کہ دونوں کا حاصل کرنا ضرور ہے تو یہ معنے ہوئے کہ مسلمان کو ابتداء سے انتہا کی طرف ترقی کرنا چاہیئے یعنی ایمان لانے کے بعد اس مرتبہ تک پہنچنا چاہیئے جس کو اخیر کہہ سکیں اب اس کا بیان کرنا باقی رہا کہ کون سا عمل ابتدائی ہے اور کون سا انتہائی ابتدا اور انتہا مقرر کر دینے سے چیز کا احاطہ بھی ہو جاتا ہے پس یہاں دو دعوے ہوئے ابتدائی عمل کے تعین اور انتہائی عمل کے تعین ان دونوں دعوؤں میں سے ہر ایک کو پورے طور سے بیان کرنے کے لئے تو یہ مجلس کافی نہیں تھی۔ لہٰذا میں اس مجلس میں صرف ابتدائی درجہ بیان کرتا ہوں اور درجہ تقدیم ظاہر ہے کیونکہ بدون ابتداء کے اوسط اور انتہا کچھ بھی متحقق نہیں ہو سکتی تو گویا یہ بیان باقی ماندہ دو درجوں کے لئے موقوف علیہ ہے اور کوئی یوں نہ سمجھے کہ جب بقیہ اعمال اس پر موقوف ہیں تو بدون اس کے تمام اعمال بیکار ہی ہیں تو جن لوگوں کو اب تک یہ ابتدائی درجہ معلوم نہیں تھا ان لوگوں کی محنتیں بیکار ہی ہیں۔

کمال اعمال علم پر موقوف نہیں

جواب اس کا یہ ہے کہ کمال اعمال اس کے علم پر موقوف نہیں ہاں خود اس کے علم پر موقوف ہے اور اس کا علم ہو جانے سے چال با قاعدہ ہو جاتی ہے جیسا کہ درسیات پڑھنے میں اس کا علم ہو

جانے سے کہ میزان ابتدائی کتاب ہے اور شمس بازغہ مثلاً انتہائی کتاب ہے چال باقاعدہ ہو جاتی ہے اور اس کا جاننے والا جلد جلد ترقی کرتا ہے اور نہ جاننے والا بھی کبھی نہ کبھی درسیات پر عبور کر لے گا مگر دیر بہت لگے گی اور وقت بہت ضائع ہو گا اسی طرح اول الاعمال کو نہ جاننے سے چال بے ڈھنگی رہے گی اور گو کبھی نہ کبھی توسط اور منتہیٰ سب حاصل ہو جائیں مگر دیر بہت لگے گی اور ترقی سست ہو گی اور یہ ترتیب میں از طرف خود نہیں بیان کرتا ہوں بلکہ دلائل سے ثابت کروں گا۔

دلیل اس کی قرآن میں موجود ہے چنانچہ معلوم اور ثابت ہے کہ عمل صالح بدون ایمان کے صحیح نہیں ہوتا یہ ایک مقدمہ ہوا اور یہ ایسا مقدمہ ہے کہ مسلم ہے اس کے دلائل بہت مشہور اور معلوم ہیں اس واسطے میں ان کو بیان نہیں کرتا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ ایمان کیا ہے غور سے دیکھئے تو ایمان فرد ہے توبہ کا یعنی ایمان نام ہے توبہ عن الشرک والکفر کا اور یہ پہلے مقدمہ میں ثابت ہے کہ ایمان شرط صحت ہے تمام اعمال کی اور ایمان ایک قسم ہے توبہ کی تو توبہ شرط ابتدائی ہوئی تمام اعمال کی اور یہی ہے اول الاعمال بلا اس کے کسی قسم کی ترقی نہیں ہو سکتی۔

توبہ اوّل الاعمال ہے

اب یہاں ذرا سا شبہ ہو سکتا ہے کہ توبہ کا شرط ابتدائی ہونا ثابت تو بیشک ہو گیا مگر وہ مطلق توبہ نہیں ہے بلکہ توبہ عن الشرک والکفر ہے۔ اور یہ ایک فرد ہے توبہ کا تو بعض افراد توبہ کا ابتدائی ہونا ثابت ہوا اور درجے توبہ کے دو ہیں توبہ عن الکفر اور توبہ عن المعاصی یہ البتہ محتاج اثبات رہا کہ یہ دوسری قسم بھی آیا شرط ابتدائی ہے یا نہیں تو بات یہ ہے کہ گویا توبہ اس فرد توبہ کے درجے میں تو شرط نہیں یعنی شرط امتیاز نہیں لیکن شرط کمال ضرور ہے چنانچہ موٹی بات ہے

طاعت بلا توبہ سے انشراح قلب نہیں ہوتا

جس غلام سے آقا کی نافرمانیاں ہوں اور پھر وہ اس کو راضی کرنا چاہے تو پچھلی خطاؤں سے معافی مانگ کر خدمت کرے تب تو وہ خدمت قابل شمار ہے ورنہ کچھ بھی اثر اس خدمت کا نہیں ہو سکتا اور اگر آقا اپنی متانت اور مخیری کی وجہ سے کچھ زبان سے کہے بھی نہیں اور خدمت اس سے چھین بھی نہ لے تب بھی وہ خدمت ایسی ہو گی کہ بلی کے گوہ کی طرح دبی دبائی رہے گی کہ نہ غلام کا دل خوش ہو گا نہ آقا کا اور کانٹا سا دونوں کے دل میں کھٹکتا رہے گا حجاب دونوں کا جب ہی رفع ہوتا ہے جب کہ معاملہ صاف ہو جائے اور پچھلی تقصیرات کی معافی ہو جائے بلا اس کے طبعی بات ہے کہ

انقباض رہتا ہے آپس کے معاملات میں تو یہ ہے ہی خداوند عالم کے معاملات میں بھی یہی ہے آزما لیجئے وظیفہ پڑھئے اور توبہ نہ کیجئے تلاوت بھی کیجئے۔ مگر دل کو دیکھئے کیا حالت ہے دل خود بخود اندر سے گھٹتا ہوگا اور ایک توبہ کر کے گڑگڑا کر پھر وظیفہ پڑھئے اور تلاوت کیجئے پھر ٹٹولئے دل کو میں بقسم کہتا ہوں کہ زمین آسمان کا فرق ہوگا اس وقت فرحت اور شگفتگی اور سرخروئی ہوگی اور امید قوی ہوگی فضل کی اور اس وقت دل شرمایا شرمایا ہوگا۔

گناہ کی خاصیت

بلکہ گناہ میں خاصہ ہے کہ حق تعالیٰ کی یاد سے دل گھبراتا ہے جیسے مجرم حاکم کے سامنے جانے سے گھبراتا ہے چاہے وہ کچھ بھی نہ کہے اور جس کے ذمہ جرم نہ ہو اس کو حاکم کے سامنے جاتے وقت طرح طرح کی شگفتگی اور امنگ اور امید اور انبساط اور انشراح ہوتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے چنانچہ ایک صاحب کا قول ہے۔

اَحَبُّ مَنَاجَاتِ الْحَبِیْبِ بِاَوْجُہٍ وَّ لٰکِنْ لِسَانُ الْمُذْنِبِیْنَ کَلِیْلٌ

(میں محبوب سے مختلف طریقوں سے مناجات کرنا چاہتا ہوں مگر مجرموں کی زبان سلی ہوئی ہے)۔

اور یوں کوئی بے حیا ہی ہو جائے تو اس کا علاج ہی کیا ہے جس میں ذرا حیا اور خجلت ہے اس کی تو آنکھ نہیں اٹھ سکتی اِلَّا بِوَجْھِہٖ لَیْسَ فِیْہِ حَیَآءٌ (مگر جس آنکھ میں شرم وحیا نہ ہو) یہ خاصیت طبعیہ ہے عصیان کی کہ بلا اس کے ترک کئے طاعت غیر قابل اعتبار ہوتی ہے۔ یہ تو عقل سے ثابت ہوا اور اس کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے جہاں حق تعالیٰ نے صفات مومنین کی بیان فرمائی ہیں اور چند اعمال کو ایک جگہ جمع کیا ہے وہاں سب سے مقدم توبہ کو فرمایا ہے۔

توبہ عبادات پر مقدم ہے

وہ آیت یہ ہے اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی) یہ تو معاملہ کا بیان ہوا کہ حق تعالیٰ نے مؤمنین سے بیع وشرا کا معاملہ کیا ہے اور بدلین کا ذکر بھی ہے آگے ان کی اس حالت کی تفصیل ہے وہ یہ ہے اَلتَّآئِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ (وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں عبادت کرنے والے حمد کرنے والے ہیں)

اس میں تائبوں کو مقدم کیا سب صفات پر حتی کہ عابدوں پر بھی۔ قرآن شریف ابلغ کلام ہے اس کی ترتیب کے اندر بھی ضرور کوئی بات ہے وہ یہی ہے کہ توبہ مقدم ہے تمام صفات پر اور تمام صفات کمال اور جمیع عبادات کا لطف اور کمال بھی توبہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ ایک آیت اور یاد آئی اس میں بھی یہی مضمون ہے وہ یہ ہے عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓىٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓىٕحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا (اگر پیغمبر (ﷺ) تم عورتوں کو طلاق دیدیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دیدے گا جو اسلام والیاں ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں توبہ کرنے والیاں عبادت کرنے والیاں روزہ رکھنے والیاں ہوں گی کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں) اس میں بھی تائبات مقدم ہے عابدات پر اس سے ثابت ہوتا ہے کہ توبہ عبادات پر مقدم ہے اور ظاہر ہے کہ توبہ بھی عمل ہے اور عبادات بھی اعمال ہیں اور یہ عبادات سے مقدم ہے تو توبہ اول اعمال ہوئی اس آیت پر ایک شبہ ہے وہ یہ کہ اس میں تائبات کا لفظ عابدات پر تو مقدم ضرور ہے جس سے توبہ کا مقدم ہونا عبادت پر نکلتا ہے مگر اول اعمال ہونا توبہ کا اس سے نہیں نکلتا کیوں کہ آیت میں اس سے بھی مقدم چند الفاظ ہیں اور وہ یہ ہے مسلمات مومنات قانتات ترتیب کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ چوتھا مرتبہ تائبات کا ہے توبہ کا اعمال اوّل ہونا جب مستفیض ہوتا جب کہ آیت التّائبون کی طرح اس میں بھی سب سے مقدم التّائبات ہوتا اس کا جواب بہت ظاہر ہے کیونکہ میں نے تصریح کر دی ہے کہ توبہ کے اول اعمال ہونے کے معنے یہ ہیں کہ بجز ایمان واسلام کے سب اعمال پر مقدم ہے اور ان دونوں کا مقدم ہونا تو مسلم ہے ان کے بغیر تو اعمال کیسے بھی اچھے ہوں مگر ایسے ہوتے ہیں جیسے ایک باغی ہو کہ سلطنت کی امداد بھی کرتا ہے اور رفاہ عام کے کام بھی بہت کرتا ہے مگر ہے باغی تو یہ سب کام اس کے بیکار ہیں اسی طرح ایمان واسلام ہے کہ کوئی عمل بدون ان کے صحیح بھی نہیں نورانیت تو الگ رہی اب ایک شبہ اور ہے کہ مسلمات اور مومنات کا تقدم تو تائبات پر صحیح ہو گیا مگر آیت میں ایک لفظ قانتات بھی تائبات پر مقدم ہے جس سے توبہ کا اول اعمال ہونا پھر باطل ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قنوت فعل قلب ہے یہ بھی توبہ سے مقدم ہے اس واسطے کہ توبہ ندامت کو کہتے ہیں اور ندامت جب ہی ہوگی جب کہ قنوت ہے کیونکہ جب تک نرمی، جھک جانا، عجز قلب میں نہ ہو تو کسی فعل پر ندامت کیوں ہونے لگی اور یہی ترجمہ ہے قنوت کا تو توبہ ہمیشہ قنوت کے بعد ہوگی تو عقلاً ثابت ہو گیا کہ توبہ کی شرط قنوت ہے اس واسطے قانتات کو بھی اس آیت میں تائبات پر مقدم کیا تو حاصل یہ ہوا توبہ کے اول الاعمال ہونے کا کہ اعمال مامور بہا میں سے جن

اعمال پر توبہ مبنی نہیں ہے ان سب سے مقدم توبہ ہے سوقنوت چونکہ توبہ کے لئے شرط عقلی ہے لہٰذا وہ تو توبہ پر مقدم ہوئی ان کے سوا باقی اعمال پر توبہ مقدم ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی طاعت صحیح نہ ہوگی ۔ بلا توبہ کے گو بعض افراد توبہ کے ایسے بھی ہیں جو شرط صحت ہیں تمام اعمال کے لئے اور وہ توبہ عن الکفر ہے چنانچہ سب جانتے ہیں کہ بلا اس کے کوئی عمل بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔

توبہ عن المعاصی شرط کمال ہے

لیکن باقی افراد توبہ کے یعنی توبہ عن المعاصی (گناہوں سے توبہ) محققین کے نزدیک شرط کمال ہیں یعنی نورانیت کسی عمل کی بلا اس کے نہیں ہوتی گو عمل قبول ہو جائے جیسے ایک باورچی ہو کہ وہ آقا کی نافرمانی کرتا ہے اور آقا اس سے کشیدہ ہے لیکن آقا مخیر ایسا ہے کہ کھانا اس کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھالیتا ہے یہ صفت رحم اور عفو کی ہے مگر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آقا دل میں کشیدہ ہے اور خود باورچی کا دل بھی رکا ہوا ہے کھانا کھلاتا ہے مگر کھل کر بات بھی نہیں کرسکتا اور جب یہ ہے کہ جب اس کو محبت ہو آقا سے ورنہ اگر ضابطہ کا نوکر ہے تب تو غیرت چہ کُنی (غیرت کیا کہتی ہے کہ آدمیوں کے سامنے آئے) است کہ پیش مرداں بیاید اس کو اپنی نوکری پوری کرنے کا خیال ہوگا آقا انبساط (خوشی) کے ساتھ کھانا کھائے یا انقباض کے ساتھ اسے تنخواہ لینے سے مطلب خیر ایسے آدمی کا تو ذکر نہیں ذکر اس کا ہے جس کو غیرت اور محبت ہو سو ایسا شخص آقا کے سامنے غیر مطیع ہونے کی حالت میں خدمت میں حلاوت اور انبساط اور شگفتگی اور راحت فرحت اور نشاط بدون توبہ اور تقصیرات کے معافی ملے ہوئے نہیں پاسکتا اور یہ بات ثابت ہے کہ خدمت اس کی ویسے بھی قبول ہوگئی جیسے آقا نے کھانا کھا تو لیا ہے اور پھینک نہیں دیا۔ اس کو یہ حکم نہیں کیا کہ توبہ کر کے پھر دوبارہ پکائے اور اس نفس عمل کی مقبولیت پر نص موجود ہے میں اپنی طرف سے نہیں کہتا ہوں **مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ** (پس جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا) اس میں حق تعالیٰ نے شرط نہیں کی توبہ کی برخلاف اس کے ایمان کو بہت جگہ شرط بنایا ہے صحت اعمال کے لئے اور توبہ عن معاصی کو کہیں شرط نہیں کیا۔

بلا توبہ کے عمل میں نورانیت نہیں ہوتی

جس سے یہ حاصل ہوا کہ نفس عمل تو قبول مگر نورانیت اس میں نہیں ہوسکتی اور اسی نورانیت نہ ہونے کو بعض نصوص میں حبط سے تعبیر فرما دیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے **مَنْ فَاتَتْهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ فَقَدْ وُتِرَ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ** (سنن النسائی ۱:۲۳۸، مسند احمد ۲:۵۴) (جس شخص کی عصر کی نماز

فوت ہوگئی تو گویا اس کے اہل وعیال تباہ ہو گئے) اور ایک روایت میں اس کی تفسیر ہے حَبِطَ عَمَلُه ' (یعنی اس کے اعمال ہی ضائع ہو گئے) اور حبط عمل ظاہراً خاصہ کفر ہے مگر یہاں ایک عمل فرعی کو بھی حابط فرمایا اسی طرح اور بعض اعمال کو بھی حابط فرمایا ہے معتزلہ وخوارج کو اسی سے دھوکہ ہوا اور قائل ہو گئے کہ مرتکب کبیرہ خارج مِنَ الایمان یا کافر ہے۔

حبط اعمال کا مفہوم

مگر محققین کے نزدیک دوسری نصوص کی دلیل سے مراد حبط کمال ہے جو خاصہ کفر ہے اسی طرح ایک اور حدیث میں بھی عدم ایمان سے مراد عدم ایمان کامل ہے اور موجود ہے وہ حدیث یہ ہے لَايَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِيْ وَهُوَمُؤْمِنٌ وَلَايَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَمُؤْمِنٌ (صحیح بخاری ۳:۱۷۸، صحیح مسلم، الایمان ب ۲۴ رقم:۱۰۰) جس کا حاصل یہ ہے کہ زنا کرتے وقت ایمان باقی نہیں رہتا اور چوری کرتے وقت ایمان باقی نہیں رہتا اس سے بھی ایک باطل کے دھوکہ کو قوت ہوئی مگر اہلسنت کا اتفاق ہے اس بات پر کہ اس سے ایمان نہیں جاتا اور اس کا ماخذ حدیث کا صریح لفظ ہے لَاتُكَفِّرُهُ بِذَنْبٍ (مجمع الزوائد ۱:۱۰۶) یعنی مسلمان کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ سمجھو اور اس کے بعد دوسرا یہ جملہ ہے جو اس سے بھی زیادہ اوضح فی المقصود ہے۔ لَاتُخْرِجُهُ عَنِ الْاِيْمَانِ یعنی اس کو مومن ہونے سے خارج مت کرو۔

حدیث کی بلاغت

کیا بلاغت ہے حدیث کی اللہ اکبر آخر حق تعالیٰ نے نبی کو اعلم الخلق بنایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو معلوم تھا کہ اس باب میں دو قسم کے اہل بدعت ہوں گے ان دونوں کے روکے کے لئے یہ دو جملے فرمائے چنانچہ ایک فرقہ ان میں کا خوارج ہے۔ اور ایک معتزلہ۔ لاتکفرہ میں رد ہے خوارج کا کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ گناہ کرنے سے مومن مومن نہیں رہتا بلکہ کافر ہو جاتا ہے اور لاتخرجہ عن الایمان میں رد ہے معتزلہ کا کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہے گو کافر بھی نہ ہو وہ ایک واسطہ بین الکفر والایمان کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا شخص لامومن ولا کافر ہے دیکھئے کیسا صریح رد ہے۔ دونوں پر ورنہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ لاتکفرہ بذنب ہی کافی تھا پھر اس جملہ لاتخرجہ عن الایمان کی کیا ضرورت تھی مگر ان دونوں فرقوں کے پیدا ہو جانے کے بعد قدر معلوم ہوتی ہے حدیث کی بلاغت کی کہ ان کے وجود سے ہی ان کا صریح بطلان کر دیا گیا غرض

جن اعمال کی نسبت وارد ہے کہ وہ حابط ہیں۔

کمال ایمان معصیت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا

اہلسنت والجماعت کے نزدیک اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے عمل ایسے باطل ہو جاتے ہیں جیسے کفر کرنے سے تمام اعمال باطل ہو جاتے ہیں کیونکہ حبط اعمال اس معنی کو خاصہ کفر کا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حبط کمال ہو جاتا ہے نہ حبط ذات یعنی ان کے کرنے سے ایمان کامل نہیں رہتا اور اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ایمان کا کمال معصیت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا اور اس کے نقصان سب اعمال میں نقص ہوگا اور ایسا ہو جائے گا جیسا دھندلا چراغ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر کمال ایمان حاصل نہ ہو تو اعمال کو چھوڑ بیٹھو کیونکہ اگر برقی روشنی اور عمدہ چراغ نہ بھی ہو تو دھندلا چراغ کچھ تو ہے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ گھر میں اندھیرا ہے کچھ نہ کچھ تو کام دیتا ہی ہے اس لئے کبھی کسی نیک عمل کو حقیر سمجھ کر نہ چھوڑنا چاہیئے۔

ذکر ریائی عدم ذکر سے بہتر ہے

ایک بزرگ سے کسی نے کسی کی نسبت کہا کہ فلاں شخص ذکر ریائی کرتا ہے جواب دیا کہ تو ذکر ریائی بھی نہیں کرتا تو کیا منہ لے کر کہتا ہے وہ ٹمٹماتا ہوا چراغ لے کر تو پل صراط سے پار ہو جائے گا اور تو تو اس سے بھی محروم ہے اسی کی نسبت کہا ہے ؎

سوداؔ قمار عشق میں شیریں کے کوہ کن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشقباز — اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

ریائی ہی سہی اس سے یہ تو امید ہوسکتی ہے کہ کبھی ذکر غالب آ جائے اور ریا ندارد ہو جائے چنانچہ بکثرت ایسا ہوا ہے کہ کسی نے اعمال شروع کئے تھے کسی غرض سے لیکن اعمال غالب آ گئے اور وہ غرض اڑ گئی اور وہ غرض اڑ گئی اور عمل محض رہ گیا۔

اعمال صالحہ کی مثال

اعمال شرعیہ کی مثال مشک کی سی ہے کہ اور چیزوں میں اس کو ملا دیا جائے تو اس وقت تو اس کی خوشبو مغلوب ہو جاتی ہے اور چیزوں کی بو غالب معلوم ہوتی ہے مگر مشک کی خوشبو رچنے والی اسقدر ہوتی ہے کہ بعد چندے سب چیزوں کی بو ہوا ہو جاتی ہے اور مشک ہی مشک رہ جاتا ہے اسی طرح اعمال شرعیہ اور ذکر اللہ میں اثر ہے کہ یہ چیزیں رچنے والی ہیں ان کے ساتھ اور چیزیں مل بھی

جائیں تب بھی اکثر بقا انہی کو رہتی ہے۔ غرض کسی عمل کو معصیت کی وجہ سے چھوڑنا تو نہ چاہیئے وہ کامل نہ سہی ناقص ہی سہی عدم سے تو اچھا ہے ہاں یہ چاہیئے کہ کوشش کرے کہ وہ معصیت نہ رہے اور عمل خالص رہ جائے پھر اس کی برکات دیکھیں کہ کیسی ہوتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ معصیت سے حبط ذات عمل نہیں ہوتا ہاں حبط کمال ہوتا ہے یہاں ایک شبہ طالب علمانہ ہے وہ یہ کہ قرآن میں من واذیٰ کی نسبت وارد ہے کہ ان سے صدقہ حبط ہو جاتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں لَاتُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (مت ضائع کرو اپنی خیرات احسان رکھ کر اور ایذا دے کر) یعنی اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور معطی لہ، کو تکلیف پہنچا کر باطل نہ کرو یہ آیت بالکل صریح ہے اس باب میں کہ صدقہ باطل ہو جاتا ہے من واذیٰ سے تو یہ بات صحیح نہ رکھی کہ معاصی سے حبط عمل نہیں ہوتا بلکہ ثابت ہو گیا کہ بعض معاصی بھی حابط ہیں حل اس کا یہ ہے کہ مقصود ہمارا یہ ہے کہ معصیت فی نفسہٖ حابط عمل نہیں یعنی معصیت من حیث ہی معصیت کے لئے خاصہ لازمہ حبط عمل نہیں ہے۔

من واذیٰ کے حابط صدقہ ہونے کا راز

باقی اگر بعض معاصی کی نسبت وارد ہوا کہ یہ حابط ہیں تو یہ حکم ان کی خصوصیت ہوگی اور انہی تک محدود رہے گا علی العموم ہر معصیت کے لئے حبط ثابت نہ ہوگا۔ پس ممکن ہے کہ ریا انہیں معاصی میں سے ہو اور من واذیٰ (احسان جتلانا اور تکلیف پہنچانا) بھی انہیں میں سے اور من واذیٰ کے حابط ہونے میں تو درحقیقت ایک راز بھی ہے وہ یہ کہ صدقہ انفاق یعنی خرچ کرنے کو کہتے ہیں یہ ایک عمل ہے جس کی فضیلت شریعت میں بہت کچھ وارد ہے مگر یہ خوب سمجھ لیجئے کہ اس میں نفس انفاق مقصود بالذات نہیں یعنی یہ غرض نہیں کہ روپیہ والے کے ہاتھ سے روپیہ نکل جائے ورنہ فقیر کو دینا اور سمندر میں پھینک دینا برابر ہوتا بلکہ مقصود اصل غریب کو راحت پہنچانا ہے اور جب صدقہ دینے کے بعد فقیر پر احسان جتلایا گیا یا اور کسی طرح تکلیف پہنچائی گئی تو غرض اصلی محفوظ نہ رہی تو اس صورت میں خود انفاق کی روح ہی موجود نہیں تو اصل عمل ہی کا وجود حقیقی نہ ہوا صرف صورت رہ گئی اس لئے یہاں حبط کہا گیا بخلاف اس صورت کے مثلاً ایک شخص چوری کرتا ہے اور نماز بھی پڑھتا ہے یہاں ایک طاعت کے ساتھ ایک معصیت جمع ہے اور اس معصیت اور طاعت میں کوئی علاقہ نہیں طاعت بجائے خود طاعت ہے اور معصیت معصیت ہے یہاں یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ نماز معصیت کی وجہ سے حبط ہو جائے گی یا مثلاً نماز انفاق مع المن والاذیٰ ہی کے ساتھ جمع ہو جائے کہ من واذیٰ بنص

قرآنی حابط ہے مگر صرف انفاق کے لئے نہ نماز کے لئے یہ فرق ہے باہم معاصی کے درمیان میں کہ بعض بخصوصہا معاصی حابط ہیں جن میں نص موجود ہے ورنہ ذات معصیت کا مقتضیٰ حبط نہیں ہے غرض یقینی ہے یہ بات کہ معصیت حابط ذات عمل نہیں ہاں حابط نورانیت ہے۔

اعمال میں بے ترتیبی کی مثال

پس عمل کی نورانیت کے لئے توبہ عن المعاصی شرط ہے یہ بیان تفصیل کے ساتھ اس واسطے کیا گیا کہ آج کل بے ترتیبی بہت ہو رہی ہے لوگ نماز وغیرہ پڑھتے ہیں اور بہت سے اعمال نوافل کرتے ہیں مگر کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس کے کمال کی بھی کوئی شرط ہے کہ بلا اس شرط کے کمال ہوتا ہی نہیں اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص ناظرہ قرآن شریف پڑھے اور الف بے نہ پڑھے لیکن بہت سی محنت کر کے قرآن شریف یاد کر لے سو یہ یقینی بات ہے کہ وہ ماہر قرآن نہ ہوگا کیونکہ ترتیب درست نہیں اور اس نے ابتدا درست نہیں کی کتنی بڑی غلطی ہے کہ ایک مکان بہت بڑا بنایا جائے اور اس کی بنیاد کمزور چھوڑ دی جائے اسی طرح کتنی بڑی غلطی ہے کہ ابتدائی عمل کی خبر نہیں جس پر تمام اعمال کی بنیاد ہے اور وہ عمل توبہ ہے وجہ اس کی بے حسی ہے کہ توبہ کی ضرورت ہے لیکن میں جب کہ مشاہدہ کرا چکا ہوں کہ اعمال صالحہ سے جو کہ بلا توبہ کے ہوں قرار اور سکون اور راحت اور شگفتگی نہیں ہوتی تو پھر کیا۔

اعمال میں نورانیت نہ ہونے کا سبب

صاحبو، اعمال میں فقط مصیبت اٹھانا ہی مدنظر ہے کیا نماز اسی واسطے پڑھی جاتی ہے کہ ہاتھ پیر کو تکلیف پہنچے اور نیند خراب ہو اور بہت سے کاموں میں حرج ہو۔ نہیں بلکہ مقصود اس کی حلاوت حاصل کرنا ہے۔ نماز کے اندر حلاوت ایسی ہے کہ کسی چیز میں بھی نہیں اس کا پتہ اس سے چل سکتا ہے کہ کسی محبوب کے سامنے کھڑے ہونے کا موقع مل جائے تو اس وقت کیا لطف آتا ہے جس کے بیان کی میں ضرورت نہیں سمجھتا حق تعالیٰ محبوب حقیقی ہیں ان کے سامنے کھڑے ہونے میں جو لذت ہوگی وہ تو حاصل ہونے ہی سے معلوم ہو سکتی ہے مگر ہماری نماز کے ساتھ چونکہ اس کی شرط موجود نہیں اس واسطے گو مدت سے نماز پڑھتے ہیں مگر نورانیت نہیں اور ہماری حالت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

ایک چور کا قصہ ہے کہ وہ ایک گھر میں چوری کرنے گیا گھر والا بہت کم سوجھ تھا اس کو کھٹکا جو معلوم ہوا تو اس نے روشنی کرنے کے لئے چقماق سے آگ جھاڑی چقماق نے چنگاری دی مگر چور نے کیا کیا کہ اس کے اوپر انگلی رکھ دی وہ سمجھا کہ چنگاری از خود بجھ گئی پھر دوبارہ جھاڑی پھر چور

نے یہی کیا غرض گھنٹے گزر گئے اور آگ ہی نہ جلی اور چراغ روشن نہ ہوا آخر وہ تھک کر بیٹھ رہا کہ خدا جانے آج چقماق کیسی آگ دیتا ہے کہ جلتی ہی نہیں بس چور نے خوب فراغ کے ساتھ اپنا کام کیا یہی حالت ہمارے اعمال کی ہے کہ ان سے نور پیدا ہوتا ہے اور چنگاریاں جھڑ جاتی ہیں مگر شیطان موجود ہے انگلی سے ان چنگاریوں کو دبا دیتا ہے ورنہ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ اعمال صالحہ مسلمان ہر وقت کرتا ہے تو گویا ہر وقت ایک ایک چنگاری جھڑتی ہے اگر یہ ایک ایک چنگاری بجھا دی گئی ہوتی تو اب تک تو اتنی ہو جاتیں کہ ایک عالم جل اٹھا ہوتا مگر کچھ بھی نہیں ہنوز روز اول ہے ہم سچ مچ تیلی کے بیل ہیں کہ ساری عمر چلے اور وہیں کے وہیں موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ کام طریقہ سے نہیں کرتے اور اعمال کی شرائط کو پورا نہیں کر لیتے۔

اعمال کی بنیاد

چنانچہ توبہ سب کے لئے شرط اول ہے اور اعمال کی بنیاد ہے اس کو صحیح نہیں کر لیتے اس واسطے کسی عمل میں پائیداری نہیں آتی اس کا مطلب یہ نہیں کہ نماز چھوڑ کر توبہ کر و اور جب توبہ سے نمٹ لو تب نماز شروع کرو۔

توبہ ترک معصیت کا نام ہے

بلکہ مطلب یہ ہے کہ دونوں کو کرو جب نماز پڑھتے ہو تو توبہ بھی کرو اور توبہ تو کوئی ممتد چیز نہیں جس کے لئے کسی نماز کو چھوڑنا پڑے توبہ ارادہ ترک معصیت کا نام ہے یہ جب آدمی چاہے تو ایک منٹ میں ہو جائے شکایت اسی کی ہے کہ اس سے غفلت کیوں ہے جب اعمال کئے جاتے ہیں اور ان کے واسطے مشقت اٹھائی جاتی ہے اور حرج کیا جاتا ہے تو ان کو اس طرح کیوں نہ کیا جائے کہ کامل کہلاویں اور وہ طریقہ یہی ہے کہ معاصی سے توبہ بھی کر لو اب بہت لوگوں کو یہ بات توبہ سے مانع ہوتی ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ یہ گناہ ہم سے چھوٹے گا نہیں۔ اس وقت توبہ کریں گے اور تھوڑی دیر میں پھر اس کو کریں گے تو اس توبہ سے کیا فائدہ سمجھ لیجئے کہ یہ وسوسہ شیطانی ہے کہ اس خیال میں ڈال کر توبہ سے محروم رکھتا ہے۔ ان لوگوں نے توبہ کے قانون پر خیال نہیں کیا۔

توبہ کا قانون

قانون توبہ یہ ہے اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّاذَنْبَ لَهٗ (سنن ابن ماجہ:۴۲۵۰، کنز العمال:۱۰۱۴۹)
یعنی جب آدمی گناہ سے توبہ کر لیتا ہے تو وہ ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسا گناہ کیا ہی نہیں تو اگر توبہ ٹوٹ بھی گئی تو پھر

کر لے پھر گناہ معاف ہو گیا پھر ٹوٹ گئی پھر کر لی۔ پھر ٹوٹ گئی پھر کر لی اس پر اگر یہ خیال کیا جائے کہ کہاں تک معافی ہوا کرے گی اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو بھی اپنی طرح سمجھا ہمارا تو دستور یہ ہے کہ کہتے ہیں ایک خطا خطا دو خطا خطا تیسری مادر بخطا وہاں یہ نہیں ہے اللہ جل جلالہ کی شان تو بڑی ہے۔

اہل اللہ کی شانِ عفو

اہل اللہ کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ان کو کوئی ہزار دفعہ ستائے پھر ان سے معافی مانگ لے تو خوش کے خوش ان کا تو قول یہ ہے کہ ؎

کفر است در طریقت مَا کینہ داشتن　　　آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

(راہ طریقت میں دل میں کینہ رکھنا کفر کی بات ہے، آئینہ کی طرح سینہ کو صاف شفاف رکھنا چاہیئے)۔

توبہ کی فضیلت

جب بندگانِ خدا کی یہ شان ہے تو خدا کی شان تو پوچھو ہی مت اس کا بیان حدیث میں اس طرح ہے مَاأَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفِرَ وَلَوْ عَادَفِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (مشکوٰۃ المصابیح: ۲۳۴۰، الدر المنثور ۲: ۸۷) یعنی وہ شخص مُصر علیٰ المعصیت نہیں ہے جو استغفار کرتا ہے اگر چہ ایک دن میں ۷۰ مرتبہ اس گناہ کو لوٹ لوٹ کر کرتا ہو اور حدیث قدسی میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر ابن آدم میرے پاس زمین بھر کر گناہ لے کر آئے گا بشرطیکہ شرک نہ کیا ہو تو میں اس کے جواب میں اس سے زیادہ مغفرت لے کر آؤں گا کس قدر امید دلانے والی حدیث ہے حق تعالیٰ کی بارگاہ دنیا کے لوگوں کی سی بارگاہ نہیں ہے دنیا کے لوگ جو بار بار قصور کرنے سے ناراض ہو جاتے ہیں اس کی وجہ یا تو غصہ سے مغلوبیت ہوتی ہے یا کوئی خوف ہوتا ہے مثلاً ذاتی یا ملکی نقصان کہ اگر پاداش نہ دی جائے گی تو مجرم کی جرأت بڑھے گی اور نقصان پہنچے گا اور حق تعالیٰ کے یہاں ان دونوں میں سے ایک بھی بات نہیں تو اگر حق تعالیٰ برابر معافی دیئے جائیں تو کیا بعید ہے۔ اور کیا تعجب ہے حق تعالیٰ نہ توبہ توڑنے سے ڈرتے ہیں نہ کثرت گناہ سے ڈرتے ہیں اللہ میاں تنگ نہیں ہیں اور توبہ توڑنے یا گناہ کرنے سے اللہ میاں کا بگڑا کیا۔

گناہ کی مثال تو بد پرہیزی کی سی ہے اگر بچہ نے بد پرہیزی کی تو باپ کا کیا بگڑا ہاں باپ کو رحم آئے گا کہ اس نے اپنی جان ہلاکت میں ڈالی اور یہی چاہے گا کہ کسی طرح اس کا تدارک ہو جائے یہی گناہگار کی اور حق تعالیٰ کی مثال ہے کہ گناہ کرنے سے حق تعالیٰ کا اس نے کچھ نہیں بگاڑا۔ ہاں حق

تعالیٰ کو اس پر رحم آتا ہے اور یہی چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس کے وبال سے وہ بچ جائے بلکہ بچہ اور باپ کی مثال سے اتنا فرق بھی ہے کہ بچہ کی بد پرہیزی سے باپ کو تو رنج بھی ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی ذات پر رنج وانفعال کا تحقق محال ہے کیونکہ واجب الوجود انفعال وتاثر سے پاک ہے۔

حق تعالیٰ کے افعال اختیاری ہیں

رحم فرمانا اور بات ہے حق تعالیٰ کے افعال اختیاری ہیں ترحم بمعنے دل پگھلنے کے وہاں صادق نہیں آ سکتا تو نہ ترحم وہاں بمعنی دل پگھلنے کے ہے اور نہ غضب وقہر وہاں بمعنی جوش میں آ جانے کے ہیں گنہگار پر حق تعالیٰ کو جوش نہیں آتا یعنی بے بسی نہیں ہے جیسے ہم کو کوئی امر ناگوار دیکھ کر بے اختیار جوش آ جاتا ہے کہ اگر ہم چاہیں بھی کہ جوش نہ آئے تو یہ ہماری قدرت میں نہیں حق تعالیٰ کی ذات میں اس معنی کے غضب کا تحقق نہیں ہے بلکہ اختیار محض سے اور باپ میں رنج کا ہونا طبعی ہے اور غیر اختیاری ہے یہ فرق ہوا حق تعالیٰ کے معاملہ میں بندہ کے ساتھ اور باپ کے معاملہ میں بچہ کے ساتھ جس کا حاصل یہ ہے۔

ترحم مخلوق اور ترحم باری تعالیٰ میں فرق

کہ حق تعالیٰ کا ترحم گنہگار پر باپ سے بھی بڑھا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ بندوں میں بڑی سے بڑی رحم دلی یہ ہے کہ کوئی معافی مانگے تو معافی دے دیں یا کوئی چیز مانگے تو اس کو وہ دے دیں اور اس سے کشیدہ نہ ہوں نہ یہ کہ بجائے کشیدہ نہ ہونے کے اور خوش ہوں اور حق تعالیٰ کے یہاں یہ ہے کہ جتنا کوئی زیادہ مانگے اور لپٹ کر مانگے اتنا ہی اس سے خوش ہوتے ہیں اور نہ مانگنے سے ناخوش ہوتے ہیں۔

دعا کی فضیلت

حدیث میں ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُلِحِيْنَ فِي الدُّعَآءِ (فتح الباری ۱۱:۹۵، الدر المنثور ۵:۳۵۶) یعنی حق تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں اور حدیث میں ہے مَنْ لَّمْ يَسْئَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ (سنن الترمذی:۳۳۷۳، مشکوٰۃ المصابیح:۲۲۳۸) (جو خدا سے نہیں مانگتا اس پر اس کو غصہ آتا ہے) اور یہ چاہیئے ہیں کہ بندہ دل وجان سے دعا مانگے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيْبُ الدُّعَآءَ عَنْ قَلْبٍ لَاهٍ (مسند احمد ۲:۱۷۷، الترغیب والترھیب ۲:۴۹۱) (اللہ تعالیٰ نہیں قبول فرماتے بے دلی سے کی گئی دعا) اور حدیث میں ہے اُدْعُوا اللّٰهَ وَ اَنْتُمْ

مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَۃِ (سنن الترمذی: ۹۷۶، ۳۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۲۴۱) یعنی دعا اس طرح مانگو کہ قبولیت کا یقین رکھتے ہو بندوں کی حالت تو یہ ہے کہ زیادہ مانگنے سے تنگ دل ہوتے ہیں اور ہونا ہی چاہیئے کیونکہ ان کے مملوکات اور عطایا محدود ہیں کہاں تک کسی کے سوال کو پورا کر سکتے ہیں اور حق تعالیٰ ایسی باتوں سے اور خوش ہوتے ہیں کہ خوب مانگا جائے اور قبولیت کا وثوق کر کے مانگا جائے کیونکہ وہاں مملوکات وعطایا کی کوئی حدوانتہا ہی نہیں غرض حق تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو حق تعالیٰ کی شان تو وَرَاءُ الْوَرَاءِ ثُمَّ وَرَآءُ الْوَرَاءِ (بڑی ارفع اور اعلیٰ ہے) انبیاء واولیاء کی بھی اپنے اوپر قیاس کرنا ناجائز ہے مولانا فرماتے ہیں۔

جملہ علم زیں سبب گمراہ شد ۔۔۔ کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
(دنیا اسی خام خیالی کیوجہ سے گمراہ ہوگئی) ۔۔۔ (کہ انہوں نے اللہ کے اولیاء کو پہچانا نہیں)
ہمسری با انبیاء برداشتند ۔۔۔ اولیا راہم چو خود پنداشتند
(خدا کے پیغمبروں کی برابری اور ہمسری کا دعویٰ کیا) ۔۔۔ (اور اولیاء اللہ کو اپنے ہی جیسا گمان کیا)
گفتہ اینکہ مابشر ایشاں بشر ۔۔۔ ما و ایشاں بستۂ خوابیم وخور
(اور کہنے لگے ہم بھی انسان وہ بھی انسان) ۔۔۔ (وہ بھی کھاتے پیتے ہیں ہم بھی کھاتے پیتے ہیں)
ایں ند انستند ایشاں از عمیٰ ۔۔۔ درمیاں فرقے بود بے منتہا
(ان بیوقوفوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ) ۔۔۔ (ان میں ہم میں بڑا فرق ہے)
کار پاکاں راقیاس از خود مگیر ۔۔۔ گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
(بزرگانِ دین اور نیک لوگوں کے کاموں کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو اگرچہ دیکھنے میں تمہارا اور ان کا کام یکساں ہو جیسے لکھنے میں شیر اور شیر یکساں ہیں)
شیر آں باشد کہ مردم میخورد ۔۔۔ شِیر آں باشد کہ مردم می خورند
(شیر (جانور) ہوتا ہے جو آدمیوں کو کھاتا ہے، شِیر (دودھ) وہ ہوتا ہے جس کو آدمی کھاتے پیتے ہیں)

جب مقربان خدا کی یہ حالت ہے کہ ان کو اپنے اوپر قیاس نہ کرنا چاہیئے تو پھر خدا کو کس طرح اپنے اوپر قیاس کر سکتے ہیں۔

بار بار توبہ سے پشیمانی کی ضرورت نہیں

غرض وہ تنگ ہونے والے نہیں ہیں تو یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ بار بار توبہ کرنے سے معافی نہ ہو

گی یادرکھو اگر ہزار دفعہ بھی توبہ ٹوٹ جائے گی تب بھی معافی ہوسکتی ہے اور یہ صرف شیطانی فکر ہے کہ وہ اس خیال کے ذریعہ سے توبہ سے روکتا ہے البتہ خود توبہ میں پھر اس گناہ کرنے کی نیت نہ رکھو یہ تو واہیات ہے اس وقت تو خالص دل سے یہی نیت کرلو کہ اب کبھی یہ گناہ نہ کریں گے اور خوب گڑگڑا کر معافی مانگو لیکن اگر اس کے بعد توبہ ٹوٹ جائے پھر کرلو پھر ٹوٹ جائے پھر کرلو۔ وہاں کا اعلان یہ ہے ۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ گر کافر و گبرو بت پرستی باز آ

(جو کچھ بھی تجھ سے غلطی ہوگئی ہو اس سے باز آ جا خواہ کافر، اور ملحد بت پرست ہی کیوں نہ ہو وہ اپنی ان حرکات سے باز آ جائے)۔

اور یہ صرف شاعری نہیں ہے بلکہ اس شعر میں بالکل حدیث مذکور کا مضمون ہے مَا اَصَرَّ مَن اسْتَغْفَرَ وَاِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (الدر المنثور ۲:۱۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۳۴۰) (یعنی اگر کسی شخص سے گناہ پر گناہ ہو جائے خواہ دن میں ستر مرتبہ بھی ہو پھر سچے دل سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں) گویا بالکل ترجمہ ہے اس حدیث کا۔ شعر:

ایں درگہہ ما درگہہ نو میدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

آخر وہ خدا ہیں ۔صاحب کسی مخلوق پر ان کو قیاس کیسے کر سکتے ہیں، مختار مطلق اور غیر مختار میں تو بڑا فرق ہے۔ پھر قادر مطلق کا حتک ہونا چہ معنی خدا تعالیٰ کو لوگوں نے کیا سمجھا ہے اللہ توبہ ہے۔

مستورات کے لئے تعلیم جدید مضر ہے

آج کل کی تصنیف ایک کتاب دیکھی آج کل لوگوں کو تعلیم نسواں میں شغف ہے وہ کتاب اسی مضمون میں تھی اور ایک عورت ہی کی لکھی ہوئی تھی میں تعلیم نسواں کے مسئلہ کے خلاف نہیں ہوں۔ بلکہ اس سے متفق ہوں مگر صرف تعلیم دین کے بارہ میں اور آج کل لوگ تعلیم جدید کے درپے ہیں گو کہیں کہیں تعلیم دین کا بھی کچھ نام لگالیا ہے مگر درحقیقت تعلیم جدید ہی مقصود ہے سو اس زہریلی تعلیم نے کامل العقول کی تو عقل کو غارت کیا دماغ ان کے ایسے ہوگئے کہ صحیح بات سمجھ ہی میں نہیں آتی تو ناقصات العقل پر کیا اثر کرے گی جو اثر ظاہر ہوگا ظاہر ہے مشہور ہے ماشاء اللہ کریلا اور نیم چڑھا سو اس کتاب کا قصہ یہ ہے کہ ایک بی بی نے کتاب چھاپی جس میں عورتوں کے لئے تعلیم جدید کی ضرورت پر بحث کی تھی (خدا جانے کیا ضرورت ہے شاید عورتیں بھی نوکری کریں گی)۔

ایک طوفان بے تمیزی چل پڑا ہے کہ غور اور تامل سے کوئی بھی کام نہیں لیتا بس تعلیم کا نام آیا

اور اس کی حمایت کے لئے تیار ہوئے حالانکہ یہ بہت ہی موٹی بات ہے کہ ہر چیز سے ایک غایت اور غرض ہوا کرتی ہے اور بلا اس کے کسی کام کا کرنا بیوقوفی میں داخل ہوتا ہے تو عورتوں کو تعلیم جدید دینے سے کیا غرض ہے مثلاً تاریخ اور جغرافیہ پر کون سا کام ان کا موقف ہے اگر ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ شاہجہاں بادشاہ فلاں سنہ میں پیدا ہوا تھا تو کون سا کام بن گیا اور نہ معلوم ہو تو کون سا کام رہ گیا اور اگر یہ معلوم ہو گیا کہ فلانا دریا فلاں جگہ سے نکلا اور فلاں جگہ تک بہا ہے کون سا کام چلا۔ ہاں ریلوں کے جنکشن اور جابجا کے راستے معلوم ہونے سے شاید یہ نتیجہ تو ہو سکے کہ کبھی بھاگنا چاہیں تو دقت نہ ہو یہ سمجھ میں آتی ہوئی باتیں ہیں اور تعلیم جدید کی مضرتیں مشاہدہ میں آچکی ہیں اگر ذرا بھی توجہ کریں تو تسلیم میں کوئی تامل نہ رہے چنانچہ ایک صاحب سے میں نے اسی قسم کی باتیں کیں جن کی بی بی یہ تعلیم پاتی تھیں ان پر ایسا اثر ہوا کہ فوراً وہ تعلیم چھڑوادی۔

دینی مکاتب میں تاریخ جغرافیہ پڑھانے کی مذمت

بعض مکاتب میں بھی یہ جنون ہے جو اصل میں موضوع تھے قرآن شریف کے لئے مگر ان میں بھی تاریخ اور جغرافیہ داخل کرلیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم نہیں ہوتی پہلے قرآن شریف پڑھالو پھر جو چاہو سو کرنا یہ خلط ٹھیک نہیں اور یہ تعلیم نسواں کا فیصلہ ایک میری ہی رائے پر نہیں ہے بلکہ ایک جنٹ صاحب نے بھی اس پر تقریر کی تھی جو مسلمان تھے اور عالم بھی تھے انہوں نے تعلیم کی بہت حمایت کی اور کہا تعلیم کو میں نے اپنے خاندان کے لئے عام کیا ہے مگر عورتوں کے لئے صرف مذہبی تعلیم کو اختیار کیا ہے خیر یہ گفتگو تو طرداً آ گئی اس کتاب کا قصہ یہ ہے کہ میں نے جو اس کو دیکھا تو اس کے پہلے ہی ورق میں یہ مضمون نکلا کہ مسلمانوں نے عجیب بات سیکھی ہے الفاظ تو دیکھئے کس قدر موحش ہیں یہ لفظ کہ (مسلمانوں نے) کس مطلب کو ادا کر رہا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ متکلم مسلمان نہیں ہے جیسے کسی مسلمان صاحب بہادر نے لوگوں سے کہا تھا عید کا دن تھا لوگ ان سے ملنے گئے تو کہا ویل آج تم لوگوں کا عید ہے بڑی خوشی کا بات ہے ان کے ان الفاظ سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ وہ ان میں داخل نہ تھے ایسے ہی مسلمانوں کا لفظ بتاتا ہے کہ متکلم ان میں شریک ہونا نہیں چاہتا خیر وہ بی بی لکھتی ہیں کہ مسلمانوں نے عجیب بات سیکھی ہے کہ ہر کام کے لئے بس دعا کرتے ہیں ہمت نہیں کرتے اللہ میاں ان کے جواب میں کہتے ہیں کہ مجھے کیوں تنگ کیا مجھے کچھ اور کام بھی ہے میں نے تمہیں سب سامان دے دیا، کرو، اور کھاؤ میرے پاس وہ کتاب فخریہ بھیجی گئی تھی اور مقصود تھا کہ کچھ تعریف میں بھی لکھ دوں میں نے یہ تعریف لکھ دی کہ اس کتاب میں کفریہ کلمات بھرے ہوئے ہیں۔

عورت کی تصنیف پر مصنفہ کا نام اور پتہ نہ ہونا چاہیئے

ایک بی بی کا ایک رسالہ میرے پاس آیا اس میں کچھ اور واہیات تو نہ تھی صرف اتنی بات تھی کہ مصنفہ نے اس میں اپنا نام اور پتہ صاف صاف لکھا تھا کیا ہو گیا کہ لوگوں کے مذاق ہی بدل گئے۔ غیرت کہاں گئی عورت کا نام اور پتہ لکھنا غیرت کے بالکل خلاف ہے ہمارے یہاں قصبات میں تو یہ رواج ہے کہ درزی سے زنانے کپڑے نہیں سلواتے اور مرد دھوبی سے زنانے کپڑے نہیں دھلواتے یہ ناجائز نہ سہی مگر غیرت اور شرم کی بات تو ضرور ہے اور غور فی النتائج سے ناجائز بھی کہا جائے تو کیا بعید ہے اس سے بڑے بڑے واقعات ہوتے ہیں۔

عورت کی ہر چیز عورت ہے

عورت کی تو ہر چیز عورت ہے، خیر اس رسالہ کا مضمون تو اچھا تھا صرف اتنی بات تھی کہ مصنفہ نے اپنا نام ونشان پورا لکھا تھا میں نے اس پر تقریظ لکھی مگر یہ چاہا کہ تقریظ ہی میں اس نام ونشان کا لکھنے کا پورا انسداد کردوں چنانچہ میں نے یہ کیا کہ وہ نام کاٹ کر تو یہ لکھ دیا کہ راقمہ ایک اللہ کی بندی اور تقریظ میں یہ الفاظ لکھے کہ یہ کتاب مجھ کو پسند ہے خاص کر اس کا یہ التزام کہ مصنفہ نے اپنا نام نہیں لکھا اب اگر وہ میری تقریظ چھاپیں گی تو نام نہ لکھنا ضرور ہوگا۔ اور نام لکھیں گی تو میری تقریظ درج نہ ہوگی۔ خدا جانے یہ کیا خبط ہے کہ مصنفہ کا نام اور پتہ مبشرح ہو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم سے خط وکتابت بھی ہو سکتی ہے تعلیم جدید کی حمایت تو بہت کی جاتی ہے مگر مفاسد دیکھ لیجئے باوجود ان مفاسد کے علماء اس کے طرفدار کیسے ہو سکتے ہیں یہ حکایت تو درمیان میں آ گئی۔

کفریہ کلمات

مقصود پہلی حکایت تھی کس قدر خرافات ہے کہ دعا سے منع کیا اور ایسے الفاظ کے ساتھ کہ خدا کہتا ہے مجھے کیوں تنگ کیا۔ قطع نظر مضمون غلط ہونے سے گفتگو کا طریقہ ایسا ہے خدائے تعالیٰ کی عظمت کہاں گئی کفر ہے یہ اعتقاد حق تعالیٰ کی نسبت کہ تنگ کر دیا۔ غرض حق تعالیٰ کسی بات سے تنگ نہیں۔ تنگ ہونے کے لفظ پر یہ قصے درمیان میں آ گئے تھے) حدیث میں ہے۔

لَوْاَنَّ اَوَّلَكُمْ وَ اٰخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ وَرَطْبَكُمْ وَ يَابِسَكُمْ اِجْتَمَعُوْا فِي صَعِيْدٍ وَّاحِدٍ ثُمَّ سَاَلْنِيْ كُلٌّ مَّآاَرَادَمَانَقَصَ مِنْ مُلْكِيْ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ (الترغیب والترھیب ۲:۴۶۶) (یعنی اگر اول سے لے کر آخر تک سارے جن وانس اور خدا کی ساری مخلوق مل کر بھی مجھ

سے سوال کریں تو میری حکومت اور میری رحمت کے خزانے میں مچھر کے پر کے برابر بھی کمی نہیں ہو گی) پھر کیا وسوسہ ہے توبہ کے قبول ہو جانے میں اور اس کی گنجائش کہاں رہی کہ توبہ بار بار ٹوٹے گی تو کہاں تک معافی ہوگی وہاں کا تو قانون ہی یہ ہے۔ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ۔ توبہ کرو اور گناہوں کے چھوڑنے کا پختہ ارادہ کرلو۔ یہ بڑی کوتاہی ہو رہی ہے جس میں بھی مبتلا ہوں کہ توبہ نہیں کرتے اور اعمال صالحہ کا ارادہ کرتے ہیں اعمال صالحہ میں بیشک نور ہے مگر معاصی کی ظلمت اس کو دھندلا کر دیتی ہے توبہ کر کے چار پانچ ہی دن میں دیکھو گے کہ طاعت کا نور محسوس ہوگا۔

معصیت اور عدم توبہ کا اثر

معصیت اور عدم توبہ کا اثر یہ ہے کہ طاعت میں ظلمت آ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ اعمال کرتے ہیں مگر کسی قسم کی نورانیت محسوس نہیں ہوتی معصیت وہ چیز ہے جس سے ظلمت ضرور پیدا ہوتی ہے اہل ادراک کو اس کا احساس فوراً ہوتا ہے یہاں پر دو قصے میں عرض کرتا ہوں ایک میں ثبوت ہے معصیت میں اثر واقعی ہونے کا۔ اور ایک میں ثبوت ہے اس اثر کے ادراک کا پہلا قصہ یہ ہے کہ بعض صحابہؓ نے غزوہ احد میں پشت دی جس پر حضور ﷺ ناراض ہوئے پھر اللہ تعالیٰ نے معافی دلا دی اس وقت اس پورے قصے کا بیان مقصود نہیں صرف وہ جزو عرض کرتا ہوں جو میرے مقصود کے متعلق ہے۔

طاعت پر بھی معصیت کا اثر ہوتا ہے

وہ یہ ہے کہ اس پر یہ آیت اتری۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (یقیناً تم میں سے جن لوگوں نے پشت پھیر دی تھی جس روز کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئیں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دے دی ان کے بعض اعمال کے سبب سے اور یقین جانو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا) یعنی جن لوگوں نے پشت دی اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو شیطان نے ڈگمگا دیا بوجہ ان کی بعض خطاؤں کے اس سے ثابت ہوا کہ خطاؤں سے ان پر شیطان کا یہ اثر ہوا تھا کہ ہمت ہار دی اور پشت پھیری یہاں غور کرنا ہے کہ وجہ پشت پھیرنے کی ضعف قلب ہوتا ہے وہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ضرور پیدا ہوا اور اس کے پیدا ہونے کی علت خدائے تعالیٰ نے بَعْضِ مَا كَسَبُوْا فرمائی یعنی گناہوں کی وجہ سے پیدا ہوا اور حضور ﷺ کا ساتھ دینا امر مامور بہ اور طاعت تھا اس سے محرومی ہوئی اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ بھی ملایئے کہ اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ

كَمَنْ لَّاذَنْبَ لَه' یعنی توبہ کے بعد گناہ کا اثر نہیں رہتا آیت مذکور کے ساتھ اس مقدمہ کے ملانے سے یہ نتیجہ اچھی طرح نکلتا ہے کہ بَعْضِ مَاکَسَبُوْا کا اثر اس حالت میں ہوا کہ توبہ نہیں ہوئی تھی تو اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ طاعت پر بھی اثر معصیت کا ہوتا ہے لیجئے یہ بات قرآن شریف سے ثابت ہوگئی کیونکہ سب جانتے ہیں کہ صحابہ طاعت سے کسی وقت بھی غافل نہ تھے لیکن بوجہ بَعْضِ مَاکَسَبُوْا کے وہ طاعات نور سے خالی تھیں جن سے قوت قلب نہ پیدا ہوئی میں نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا وہ نص سے ثابت ہوگیا اس قصہ سے تو ثبوت ہوا اثر فی الواقع کا۔ ادراک اثر کا ثبوت اس میں نہیں ہے کیوں کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو یہ بات محسوس نہ ہوئی کہ یہ نتیجہ کس بات کا ہے جب وحی آئی تب معلوم ہوا کہ یہ نتیجہ بعض خطاؤں کا ہے۔

ادراک اثر معصیت کی ایک حکایت

اور ایک قصہ ادراک اثر معصیت کے متعلق عرض کرتا ہوں کتاب عوارف المعارف میں کہ ایک بزرگ نے چاہا کہ خلوت میں اللہ اللہ کروں ذکر کرنے بیٹھے مگر لا الٰہ الاّ اللّٰہ زبان سے نہ نکلتا تھا دل منقبض ہوگیا اور زبان بستہ ہوگئی عجیب بات ہے ہم کو کبھی یہ بات پیش نہیں آتی حالانکہ دن رات گناہ کرتے ہیں اللہ والوں کے ساتھ معاملہ ہی اور ہوتا ہے راز اس میں یہ ہے کہ وہ ذکر کے ساتھ حضورِ قلب بھی چاہتے ہیں اور حضورِ قلب خطا کے ساتھ جمع نہیں ہوتا تو اس کے ساتھ ان کی زبان بھی بند کر دی جاتی ہے تا کہ وجہ بند ہونے کی سمجھ میں آجائے انہوں نے دعا کی کہ منکشف کر دیجئے کہ کیا خطا ہوئی اور لرز گئے اور کانپ گئے یہ حالات ہیں اہل اللہ کے اہل ظاہر کیا جانیں کیا گزرتی ہے ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست　　حالِ شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند

(تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہیں چبھا تم ان لوگوں کی حالت کیا جانو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)۔

تردد اس وجہ سے زیادہ ہوتا ہے کہ حالات مشتبہ ہوتے ہیں کسی حالت کی نسبت یہ تعین کر لینا مشکل ہے کہ یہ حالت بُری یا اچھی ہے کبھی بستگی زبان کا سبب محمود ہوتا ہے ابھی حال کا قصہ سناتا ہوں جس سے حیرت ہوگی اور یہ بھی معلوم ہوگا۔

اہل اللہ کی بصیرت

اہل اللہ کی نظر کس قدر گہری ہوتی ہے، ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں ایک

بار مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور بھی بہت سے شاغلین ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں حاضر تھے سب لوگ حضرت سے اپنے حالات کہتے اور حضرت اس پر کچھ ارشاد تلقین فرماتے تھے مگر مولانا کوئی حال نہ بیان کرتے۔ ایک دفعہ حضرت نے خود پوچھا کہ آپ کچھ حال نہیں کہتے تو مولانا رونے لگے اور کہا۔

تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبر کامل (بدقسمت لوگوں کو شیخ کامل سے نفع نہیں ہوتا)

حال کیا کہوں وہ تو در کنار مجھ سے ذکر تک بھی نہیں ہوتا جب بیٹھتا ہوں زبان جیسے جکڑ جاتی ہے اور قلب پر ایسا بوجھ ہو جاتا ہے کہ بارہ تسبیح بھی پوری نہیں ہوسکتیں حضرت نے بالبدیہہ فرمایا مبارک ہو یہ حالت ثقل وحی کا نمونہ ہے انشاء اللہ علوم نبوت سے آپ کو حصہ ملے گا یہ وہ زمانہ تھا کہ مولانا نے علوم وحقائق میں ایک سطر بھی نہیں لکھی تھی اس وقت کون سا ظاہراً قرینہ ایسا موجود تھا جس سے اندازہ کیا جاسکے کہ اس کی تعبیر یہ ہے اور ایسا ہونے والا ہے یہ شیخ کامل کا کام تھا یہ قصہ درمیان میں اس پر آگیا تھا کہ بعضے حالات بظاہر مذموم ہوتے ہیں اور درحقیقت محمود۔ جیسے یہ مولانا کی حالت تھی اور اس کا عکس بھی ہوتا ہے کہ کوئی حالت بظاہر محمود ہو اور درحقیقت مذموم۔ ایسے موقع پر بصیرت کی ضرورت ہے اہل اللہ اس واسطے ڈرتے ہیں اور محمود حالات میں بھی اطمینان نہیں کرتے خیر وہ بزرگ ذکر کرنے بیٹھے مگر کلمہ زبان سے نہ نکلا تو انہوں نے سوچا کہ مجھ سے کیا قصور ہوا۔

اہل اللہ کسی وقت بیکار نہیں رہتے

سوچنے کے لفظ پر ایک اور حکایت یاد آئی۔ اہل اللہ کسی وقت بیکار نہیں رہتے ہر وقت اپنے حالات کی نگرانی رکھتے ہیں۔ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ کہیں چور پکڑے جارہے تھے یہ بھی کہیں وہاں موجود تھے یہ بھی پکڑ لئے گئے انہوں نے دل میں سوچا کہ یا اللہ میں نے کیا قصور کیا جو چوروں میں داخل کرلیا گیا۔ الہام ہوا کہ تم نے دعا مانگی تھی کہ ایسا سامان کردیجئے کہ مجھے دو روٹی اس وقت اور دو روٹی اس وقت مل جایا کریں اور عافیت کو نہیں کہا تھا سو ہم نے اس کا سامان کردیا۔ اب دو روٹی اُس وقت اور دو روٹی اس وقت مل جایا کریں گی۔

انہوں نے توبہ کی کہ یا اللہ غلطی ہوئی اپنی رحمت سے معاف کردیجئے توبہ کا کرنا تھا کہ حاکم کا پروانہ پہنچا کہ فلاں شخص رہا کیا جائے وہ بے قصور ہے ان لوگوں کو دعا میں بھی ادب سکھلایا جاتا ہے۔ یہ قصہ سوچنے کے متعلق یاد آگیا ان بزرگ نے سوچا کہ یہ کس بات کا وبال ہے کہ کلمہ زبان سے نہیں نکلتا الہام ہوا کہ فلاں دن ایک کلمہ دین کے خلاف بطور استہزاء (تمسخر، مذاق) تم نے کہا تھا آج یہ اس کی ظلمت ہے بس گر پڑے سجدے میں اور زار زار رونے لگے بس کلمہ زبان پر جاری ہو گیا توبہ کا یہ اثر

ہے اور گناہ کا یہ اثر ہے کہ نورانیت تو کہاں بعض اوقات توفیق بھی نہیں ہوتی طاعت کی اور ایک تیسرا اثر اور ہے گناہ کا وہ یہ کہ ایک گناہ سے دوسرا گناہ پیدا ہوتا ہے۔ طاعت کی نورانیت گئی اور اس طاعت سے محرومی ہوئی اور اس پر بھی بس نہیں اس گناہ کی بدولت اور گناہ پیدا ہوتے ہیں گناہ سے بچنے کی ہمت نہیں رہتی۔ وقت زیادہ جاچکا ہے اس واسطے میں بیان کو مختصر کرتا ہوں۔ اتنی تقریر سے یہ تو معلوم ہوگیا ہوگا کہ توبہ کی کس قدر ضرورت ہے حق تعالیٰ نے بہت جگہ اس کی تصریح بھی فرمائی ہے۔

گناہ کی شدّت

اور اس حکایت کے سننے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ گناہ کس قدر بُری چیز ہے کہ بلا اس سے توبہ کئے عبادات کالعدم ہوتی ہیں اور کوئی اثر ان کا نہیں پیدا ہوتا اور قرآن سے بطور استنباط بھی اس کی ضرورت ثابت ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا۔ اور حدیث لَایَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ (صحیح بخاری ۳: ۱۷۸، صحیح مسلم الایمان ب ۲۴، رقم: ۱۰۰) موجود جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گناہ اس قدر شدید چیز ہے کہ ایمان کو بھی کھو دیتا ہے یہ اگرچہ مبالغہ ہے اور معنی حقیقی مراد نہیں یعنی زنا سے کفر نہیں ہوتا اور ایمان سے خروج نہیں ہوجاتا اور احکام ارتداد کے جاری نہیں ہوتے جیسا کہ یہ بحث کتب فن میں مبسوط (مفصل) ہے اور بقدر ضرورت میں نے بھی اس کو بیان کردیا تاہم زنا کے ساتھ ایمان کا جمع نہ ہونا کسی معنے کر تو حدیث میں ہے ہی وہ یہی ہے کہ کمال ایمان اور نورانیت ایمان جاتی رہتی ہے اس سے گناہ کی شدت جیسی کچھ ثابت ہوتی ہے ظاہر ہے اور کشف سے اور وجدان (دریافت کرنا) وغیرہ سے بھی ثابت ہے کہ بلا توبہ کے اعمال میں برکت نہیں تو کیسے افسوس کی بات ہے کہ اعمال میں محنت تو پوری کی جائے مثلاً نماز کے لئے نیند چھوڑ کر اٹھا جائے وضو کیا جائے بہت سے کاموں کا حرج کیا جائے لیکن ثمرہ حاصل نہ ہو (یعنی ثمرہ کامل اور اگر ناقص حاصل ہوا تو کیا ہوا کیونکہ کالعدم ہے) اور یہ نتیجہ کاہے کا ہے ذراسی فروگذاشت کا کہ اعمال سے قبل توبہ نہ کرلی۔ عقل مند سے تو یہ بات بہت بعید ہے کہ جب کام کرے اور محنت اتنی ہی کرے جتنی سے بدرجہ اکمل اس کا ثمرہ حاصل ہوسکتا ہے اور ایک ذراسی بات کو نظر انداز کرکے محنت رائیگاں کردے اس بات کو ضرور کرنا چاہیئے اور اہتمام کے ساتھ کرنا چاہیئے تاکہ اس محنت کی راحت پاکر دل تو خوش ہو۔ مجھے مقصود تھا ثابت کرنا اس بات کا کہ اول اعمال توبہ ہے اور بحمداللہ وہ ثابت ہوگیا۔

نگرانیٔ نفس کی ضرورت

صاحبو! سارے کاموں کے ساتھ اس کا بھی اہتمام کیجئے کہ روز توبہ کیا کیجئے اول تو اہتمام

کیجئے اس کا گناہ وہی نہ ہوں اور حتی الامکان پوری نگرانی کیجئے نفس کی کہ گناہ نہ کرنے پائے اور کبھی اس کی باگ ڈھیلی نہ کیجئے وہ اپنے کام سے کسی وقت غافل نہیں ہے اس کو کبھی مردہ نہ سمجھئے تجربہ کر لیجئے کہ کیسا ہی نفس کسی بات میں آپ کے قابو میں آگیا ہو مگر جب ذرا ڈھیل دی جائے گی تو پھر شرارت سے نہ چوکے گا آپ کو چاہیئے کہ آپ بھی ایسے ہی مستعد اور ہوشیار ہیں کہ کبھی اس کی نگرانی سے نہ چوکیں اور اس کا اہتمام رکھیں کہ گناہ نہ ہونے پائے۔ پھر اس کے ساتھ اس کا بھی اہتمام کیجئے کہ اور توبہ کیجئے۔ کیونکہ بعض وقت گناہ اسی طرح سے ہو جاتا ہے کہ خبر بھی نہیں ہوتی اور اس کو غنیمت سمجھئے کہ حق تعالیٰ نے ایک سبیل ایسی بھی رکھ دی ہے جس سے وہ گناہ مٹ جاتا ہے اس کی قدر جب معلوم ہوتی کہ یہ سبیل حق تعالیٰ نے نہ رکھی ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ جب گناہ ایک دفعہ ہو گیا تو وہ لازم ذات ہو گیا کہ مٹ ہی نہیں سکتا اور جب آدمی مرتا تو دیکھتا کہ نامہ اعمال میں وہ رخنے موجود ہیں جن کا خیال بھی نہ تھا اور اب یہ ہے کہ سو دفعہ گناہ ہو جائے بے خبری میں یا خبر کی حالت میں بلکہ قصداً بھی کر و اور توبہ کر لو بس وہ ندارد ہوا۔ یہ انعام کس درجہ قابل قدر ہے اب تو چاہیئے کہ بلا گناہ کئے بھی آدمی توبہ کر لیا کرے احتیاطاً ہی سہی اس میں حرج ہی کیا ہے۔

توبہ کا طریقہ

اب رہا یہ کہ توبہ کا طریق کیا ہے۔ سو حدیث میں وارد ہے اور اس طریق سے توبہ کامل درجہ کی ہوتی ہے وہ یہ کہ دو رکعت نفل پڑھو پھر حق تعالیٰ سے دعا مانگو کہ اے اللہ میرے گناہوں کو معاف کر دیجئے دیر تک حق تعالیٰ کے سامنے الحاح وزاری کرو۔ رونا نہ آئے تو رونے کی صورت بنا کر مانگو اس پر وعدہ حق تعالیٰ کا کہ توبہ کو قبول کرتے ہیں۔ وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ (اور وہی ہے جو قبول کرتا ہے توبہ اپنے بندوں کی) اور ایک آیت میں اس سے بھی زیادہ بلیغ لفظ ہے۔ أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ (کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے) خوب سمجھ لیجئے کہ حق تعالیٰ کا وعدہ جھوٹا نہیں ہے۔

گناہ کے دو اقسام

اور ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ گناہوں میں تفصیل ہے اور ان کے اعتبار سے توبہ کے طریق میں بھی تفصیل ہے وہ یہ کہ گناہ دو قسم کے ہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد قسم ثانی بلا صاحب حق سے

معاف کرائے معاف نہیں ہوتے توبہ کے قبول ہونے کا وعدہ ہونے کا یہ مطلب نہ سمجھو کہ کسی کا مال مارلیا اور نماز پڑھ کر توبہ کرلی۔ اور چھوٹ گئے۔

مالی حقوق کی اہمیت

مالی حقوق ادا کرو تب ہی معاف ہوں گے اور اگر ایسا اتفاق ہوا کہ بضرورت قرض لیا تھا پھر اس کے ادا کرنے کی گنجائش نہیں ہوئی تو حق تعالیٰ قلب کو دیکھتے ہیں اگر نیت میں فتور نہیں ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ جتنی گنجائش ہوتی ہے ادا کر دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ حلوے اور مٹھائیاں اڑاؤ اور جب قرض مانگا جاتا ہے تو جواب دے دو کہ ہے نہیں۔ نہیں بلکہ ایک روپیہ کا حلوا کھاؤ تو ایک تو قرض میں بھی دے دو تو اگر نیت سالم ہے تو امید ہے کہ جو ادا ہونے سے رہ گیا ہوگا وہ قیامت کے دن معاف کر دیا جائے قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے ایک روایت لکھی ہے کہ مومنین سے حق تعالیٰ قیامت کے دن حقوق باہمی کی معافی اس طرح کرائیں گے کہ صاحب حق کو بڑے بڑے محل جنت کے دکھلائے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ اگر تم اپنے بھائی کا حق معاف کر دو تو تم کو یہ محل ملیں۔ پھر کون ہے کہ معاف نہ کر دے۔

غیر مالی حقوق کا طریق معافی

دیکھئے حقوق العباد وہ چیز ہیں کہ جنت میں جانے سے مانع ہوں گے کہ تاوقتیکہ ان سے سبکدوشی نہ ہو جائے جنتی شخص بھی جنت میں نہ جا سکے گا اور ان کو حق تعالیٰ براہ راست خود معاف نہ کریں گے بلکہ صاحب حق سے اس ترکیب سے معاف کروائیں گے یہ بھی محض رحمت ہے جب حاکم چاہے تو معافی ہو ہی جاتی ہے اور بعض حقوق العباد غیر مالی ہیں ان میں کوئی چیز ادا کرنے کی نہیں ہے ہاں اس کی ضرورت کہ صاحب حق سے معافی حاصل کرو اس کی خوشامد درآمد کر کے یا اس کے ساتھ سلوک کر کے یا گڑگڑا کر یا جس طرح ممکن ہو اس صورت میں اگر آپ نے اپنے امکان بھر کوشش کر لی اور وہ معاف نہیں کرتا تو اب وہ گنہگار ہے بعض لوگ ایسے سنگدل اور بے رحم ہوتے ہیں کہ قصوروار کا قصور کسی طرح معاف ہی نہیں کرتے اور اسی کو فخر اور شان سمجھتے ہیں کہ وہ خوشامد کر رہا ہے اور ان کی ناہاں نہیں ہوتی یہ تکبر ہے سمجھ لینا چاہیئے کہ تم بھی خدائے تعالیٰ کے قصوروار ہو کہیں تمہارے ساتھ بھی یہی معاملہ نہ کیا جائے کہ تم معافی چاہو اور معافی نہ دی جائے تب کیا ہوگا۔

غرض حقوق العباد اگر حقوق مالیہ ہیں تو ان سے توبہ یہ ہے کہ ان کو ادا کیا جائے یا معاف کرایا جائے اور اگر حقوق مالیہ نہیں ہیں تو ان سے توبہ یہ ہے کہ صاحب حق سے معاف کرایا جائے۔

حقوق اللہ کی دو اقسام

اور قسم اول یعنی حقوق اللہ میں تفصیل یہ ہے کہ وہ دو قسم ہیں۔ منہیات یعنی وہ امور جن سے منع کیا گیا ہے اور مامورات جن کو طاعات بھی کہتے ہیں یعنی وہ امور جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے نہ کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔ ان میں سے قسم اول تو توبہ کرنے سے معاف ہو جاتے ہیں مثلاً کوئی شراب پیتا ہے یا زنا میں مبتلا ہے پھر توبہ کر لے تو یہ سب معاف ہو جاتے ہیں اور قسم دوم یعنی طاعات اگر رہ گئیں تو ان کے لئے صرف توبہ کافی نہیں بلکہ ان کو ادا کرنا چاہیئے اور اگر ادا کرتا رہا مگر کچھ رہ گئیں تو امید ہے کہ حق تعالیٰ معاف کر دیں اور بعض کا فدیہ بھی دینا چاہیئے جیسے روزے کسی کے ذمہ رہ گئے یا نمازیں کچھ رہ گئیں تو وصیت کر جانا چاہیئے جیسے حج اگر رہ گیا۔ تو ضرور ہے کہ حج بدل کے لئے وصیت کر جائے اور اگر نہ فدیہ ہو سکا نہ وصیت کا موقع ملا مثلاً مرگ مفاجات ہو گئی تو حق تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں مگر اپنی طرف سے فدیہ اور وصیت کی فکر اور عزم سے غفلت نہ چاہیئے۔ یہ تفصیل ہے بطور کلی اقسام گناہ کی اور توبہ کی۔

غیبت اور اس کا علاج

اور گناہ کی ایک جزئی خصوصیت کے ساتھ بھی قابل بیان ہے جس سے غفلت بہت شائع ہے وہ گناہ غیبت ہے اس کا ایک کفارہ استغفار بھی ہے۔ مگر یہ جب ہے کہ جس کی غیبت کی گئی ہے وہ مل نہ سکے ورنہ اس سے معاف کراؤ۔ غرض معاصی کیسے ہی خطرناک ہوں مگر لا علاج نہیں کسر ہے تو ہمت کی ہے۔

ابقاء توبہ کی تدبیر

یہ جو کچھ بیان ہوا طریقہ ہے احداث توبہ کا یعنی توبہ کرنے کا اس کے بعد ضرورت ہے ابقاء توبہ کی سو اس کی تدبیر یہ ہے کہ تھوڑی دیر مراقبہ کیا جائے عذاب الٰہی کا اور اس کے لئے میں وہ وقت بتاتا ہوں جو بالکل فاضل ہے تاکہ آپ کے کسی کام میں بھی حرج نہ ہو وہ سونے کا وقت ہے۔

مراقبہ عذاب

جب آپ سونے کو لیٹتے ہیں تو معاً نہیں سو جاتے بلکہ کچھ دیر لوٹنے پوٹنے کے بعد نیند آتی ہے

یہ بیکار وقت اس کام میں لگایئے کہ عذاب الٰہی کا تصور کیجئے اور اپنے دن بھر کے گناہوں کو یاد کیجئے اور سوچئے کہ مجھ سے ان گناہوں کی باز پرس ہوگی تو کیا جواب دوں گا اور یہ عذاب تیار ہوگا تو اس سے نجات کیونکر ہوگی اس سے خوف پیدا ہوگا اور توفیق ہوگی توبہ کی بس توبہ کر کے سو جایئے پھر صبح کو یاد رکھیئے کہ رات حق تعالیٰ سے یہ یہ عہد کیا تھا اور نگرانی رکھئے کہ اس کے خلاف نہ ہونے پائے اگلے دن رات کو پھر ایسا ہی کیجئے کہ اگر دن میں کچھ عہد شکنی ہوگئی ہے تو عذاب الٰہی کو یاد کر کے اس سے توبہ کیجئے اور صبح کو پھر یاد رکھئے غرض اسی طرح چند روز کیجئے دیکھیں تو کب تک توبہ ٹوٹتی ہے اور کیسے ابقاء توبہ نہیں ہوتا بقدر ضرورت توبہ پر بحث ہوگئی اور توبہ کی ضرورت اور شرط اور کیفیت اور احداث اور ابقاء سب کا بیان ہوگیا۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ حقائق کا انکشاف اور ہمت عمل کی عطا فرماویں۔

واقعہ

بعد ختم وعظ لوگوں نے مصافحہ کرنا چاہا تو فرمایا میں تھک گیا ہوں مصافحہ سے معاف رکھا جائے ایک شخص نے اصرار کیا اور کہا ایک ہاتھ اُدھر کو پھیلا دیجئے اور ایک ادھر کو اس میں کیا تکلیف ہوگی فرمایا کہہ تو دیا مگر تم کو کرنا پڑے تو معلوم ہو اچھا میں تم کو اس کام کے لئے وکیل کرتا ہوں بجائے میرے تم سب سے مصافحہ کرلو تا کہ معلوم تو ہو کہ اس میں بھی کچھ تعب ہوتا ہے۔

واقعہ دیگر

اشتہار میں اعلان اس وعظ کا اور آئندہ کے وعظ کا جو جمعہ کے دن ہونے والا تھا دونوں کا جمع کر دیا گیا تھا۔ فرمایا اگر اشتہار میں اعلان اسی ایک وعظ کا کیا جاتا تو مجمع زیادہ ہوتا اور نفع عام ہوتا اور دوسرے کے اعلان کی سہل تدبیر یہ تھی کہ اس وعظ کے ختم کے وقت زبانی کہہ دیا جاتا کہ جمعہ کے دن پھر وعظ ہوگا۔ اب چونکہ دو وعظوں کا اعلان ایک دم ہو گیا اس واسطے بہت سے آدمی اس خیال سے اس پہلے وعظ میں نہیں آئے کہ ابھی ایک بیان تو باقی ہے وہ سن لیں گے۔

الافتضاح

یہ وعظ

جامع مسجد تھانہ بھون میں ۱۸ صفر ۱۳۳۲ھ کو دو گھنٹے بیٹھ کر بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد ایک سو پچاس تھی۔ مولانا محمد عبداللہ صاحبؒ نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ (دَائِمًا اَبَدًا کَمَا یُحِبُّ وَیَرْضٰی) اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. یٰاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ (الانفطار:۶)

ترجمہ: اے انسان تجھ کو کس چیز نے تیرے رب کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے جس نے تجھے پیدا کیا۔

ہمارا کوئی وقت گناہ سے خالی نہیں

ان آیات سے مجھ کو ایک فائدہ عملیہ قصداً وعلمیہ تبعاً مستنبط کرنا مقصود ہے اور وہ فائدہ اولاً بلا دلیل قلب پر وارد ہوا تھا اور ظاہری سبب اس کا ایک خاص حکایت ہے اور اس کی ورود کے ساتھ ہی بعض دوستوں کے سامنے اس کا ذکر بھی کیا تھا میں نے چاہا کہ اور مسلمان بھی اس سے منتفع ہوں تو بہتر ہے کہ حلوہ تنہا کھا جانا بہتر نہیں ہے اور اس سے زیادہ کون حلوہ ہوگا کہ دین کی کوئی بات حاصل ہو جائے اس لئے آج میں اس کو بیان کرتا ہوں ہر چند کہ وہ فائدہ قلب میں اولاً بلا دلیل آیا لیکن یہ چاہا کہ کتاب اللہ سے اگر مستنبط ہو تو اچھا ہے غور کیا تو اس آیت میں اس کی تصریح پائی اس لئے اس آیت کو اختیار کیا یہ حاصل ہے آج کے بیان کا۔ اب سمجھنا چاہیئے کہ وہ فائدہ عملیہ جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں اس کی ضرورت ہر مسلمان کو ہر وقت ہے۔ چنانچہ اس کی تعیین کے بعد اس کی ضرورت کا علم ہو جائے گا۔

ہماری کوئی ساعت گناہ سے خالی نہیں

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ کم وبیش انسان ہر وقت گناہ میں مبتلا رہتا ہے صغیرہ ہو یا کبیرہ حتیٰ کہ اگر کوئی ایسی ساعت ہو کہ انسان اس میں یہ سمجھے کہ گناہ نہیں کرتا تو یہ سمجھنا کہ گناہ نہیں یہ خود ایک

گناہ ہے اگر حق تعالیٰ کے تعلقات پر نظر کی جائے اور پھر جو تعلقات مابین المخلوق ہیں اور ان کی وجہ سے جو آپس میں ایک دوسرے پر سے حقوق ہو جاتے ہیں ان کی طرف نظر کی جاوے پھر تعلقات بین الحق والخلق (اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیانی تعلقات) پر نظر ڈالی جائے اور پھر حقوق بین العباد و حقوق الخالق میں موازنہ کیا جائے۔

قانونِ شریعت اللہ کی بڑی رحمت ہے

تو اگر قانون شریعت نہ ہوتا اور محض عقل ہی پر دار و مدار ہوتا تو محال عقلی تھا کہ انسان کسی وقت گناہ سے خالی ہو تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دیکھو ہم اگر بیس روپیہ ماہوار کے نوکر ہوتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اور نیز خود اس کے نزدیک بھی اس کے کتنے حقوق ہوتے ہیں ایک ادنیٰ سی خدمت باورچی گری ہے یا گھر میں کوئی ماما ہے زیادہ سے زیادہ اس کی تنخواہ چار روپیہ ماہوار ہوگی اور ترقی ہوئی تو کھانا بھی ہوگیا۔ بہرحال آٹھ روپیہ ماہوار ہوئے یعنی تقریباً چار آنہ روزانہ اس چار آنہ میں شب و روز اس کو حاضر رہنا پڑتا ہے جس کے چوبیس گھنٹہ ہوتے ہیں تو ایک پیسہ اور کچھ کوڑیوں میں ڈیڑھ گھنٹہ پڑتا ہے اس پر یہ ناز ہے کہ بیحد زجر و توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) اور مواخذات (جواب طلبی) اس سے کرتے ہیں اور ان مواخذات کو وہ بھی تسلیم کرتا ہے کبھی کہتے ہیں کہ کھانا تو نے دیر میں پکایا ہے کبھی پکا پکایا کھانا پسند نہیں آیا تو اس کو پھینک دیتے ہیں کبھی کہتے ہیں نمک پھیکا ہے غرض اس بیچارے کی جان ایک مصیبت میں آجاتی ہے اور پھر معاوضہ اس پر اس قدر قلیل۔

حق تعالیٰ شانہ کے لامحدود احسانات

اب حق تعالیٰ کی نعمتوں کو دیکھئے کہ ہر وقت اور ہر ساعت میں بے انتہا نعمتیں ہیں چنانچہ ارشاد ہے وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکو گے) پس جب اس قلیل اور محدود معاوضہ میں اس قدر حقوق ہیں تو ان غیر متناہی اور غیر محدود نعمتوں کے مقابلہ دیکھ لیجئے کہ کس قدر حقوق ہوئے اور یہ بھی غور فرمالیجئے کہ ہم ان کو کتنا ادا کر رہے ہیں اور اگر کچھ ہم کرتے بھی ہیں تو وہ بھی نعمت ہے بلکہ سب سے بڑی نعمت ہے اس کے مقابلہ بھی کچھ ہونا چاہیئے وعلیٰ ہذا مسلسل پس ثابت ہوا کہ ہم ہر وقت اور ہر وقت سراسر مقصر (قصوروار) ہیں یہ تو ظاہری کلام ہے اور امر حقیقی یہ ہے کہ حقوق ہوتے ہیں مقابلہ میں کمالات کے یا احسانات کے چنانچہ حکام کے جو حقوق ہیں وہ احسانات کی وجہ سے ہیں کہ وہ رعایا کی حفاظت کرتے ہیں اور محب (محبت رکھنے والا) جو محبوب (محبت رکھنے والا) کے حقوق اپنے ذمہ جانتا ہے کہ رگ رگ اور ریشہ ریشہ اپنے اس

کے حقوق میں گندھا ہوا سمجھتا ہے حتیٰ کہ اگر وہ محبوب بھی ان حقوق کی نفی کرے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا ہے تو یہ کس شے کے حقوق ہیں اس کے ایک کمال کے کہ وہ جمال ہے پس حقوق ہمیشہ کبھی مقابلہ میں احسان کے ہوتے ہیں اور کبھی مقابلہ میں کسی کمال کے اگر جزئیات کا تتبع (پیروی کرنا) کیا جائے تو امید ہے کہ یہ کلیہ منقوص (ناقص ہونا) نہ ہوگا اب غور کیجئے کہ حق تعالیٰ کے اندر دونوں امر علی سبیل الکمال موجود ہیں احسانات کا بیان تو اُوپر کی تقریر سے معلوم ہوا کہ وہ غیر متناہی ہیں کمالات لیجئے کہ وہ واجب الوجود ہیں اور مُستجمع (جمع کرنیوالے) ہیں تمام صفات کمال کو اور وہ کمالات بھی بوجہ وجوب وجود کے غیر متناہی ہیں پس احسانات غیر محدود اور کمالات بھی غیر متناہی اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہی وہ شے حقوق کی موجب ہیں پس حقوق بھی غیر متناہی ہوں گے اور انسان زماناً متناہی ہے پس متناہی حقوق غیر متناہی کیسے ادا کر سکتا ہے۔ پس عقلاً تو انسان سے حقوق کا ادا ہونا محال ہوا دیکھو وہ عقل جس کی آج کل کے عقلاء پرستش کرتے ہیں تمہاری کیسی سخت دشمن نکلی کہ وہ صاف لفظوں میں فتویٰ دے رہی ہے کہ آدمی ہر وقت مجرم ہے پس اگر مدار کار عقل پر ہوتا تو یہ تم کو ضرور جہنم میں لے جاتی اس لئے کہ تم کسی صورت سے جرائم سے بری نہیں ہو سکتے اور یہاں سے ضرورت ثابت ہوتی ہے شریعت کی اور اس کی خوبی معلوم ہوتی ہے۔

شریعت اور عقل

واللہ اگر ہماری حس درست ہوتی تو حق تعالیٰ کی اس رحمت و منت کو سوچ سوچ کر مر جاتے کہ ہم کو شریعت مقدسہ کے ذریعہ سے رہبری فرمائی آپ نے عقل کا فتویٰ تو دیکھ لیا کہ وہ آپ کو ہر وقت مجرم قرار دیتی ہے اب اس کے متعلق شریعت کا حکم بھی سنئے ارشاد ہے **لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا** دیکھو کتنا بڑا تفاوت ہے اس عقل کی کسی نے کہا ہے۔

آز مودم عقل دور اندیش را — بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

یعنی عقل کو تو ہم آزما چکے کہ وہ تو ہم کو ہلاک کرنے والی ہے اب آج سے ہم اپنے آپ کو دیوانہ بناتے ہیں تاکہ کوئی صورت سلامتی کی نکلے۔ فی الحقیقۃ اگر شریعت مقدسہ نہ ہوتی تو یہ عقل ہم کو یقیناً ہلاک کر دیتی۔ پس ثابت ہوا کہ عند العقل انسان کا گناہ سے خالی رہنا محال ہے اور اگر اس کے ساتھ ایک مقدمہ **خُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا** ملا لیا جائے تو اس محال میں اور زیادہ قوت ہو جائے گی۔

قویٰ بہیمیہ اور قویٰ ملکیہ میں کشاکشی

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان کے اندر حق تعالیٰ نے قویٰ متضادہ (متضاد قوتیں)

رکھے ہیں قویٰ بہیمیہ اور قویٰ ملکیہ سے اس کو مرکب فرمایا ہے جس کی طرف حدیث شریف میں لمۃٌ من الملک ولمۃٌ من الشیطان سے اشارہ ہے ان قویٰ میں باہم کشاکشی ہوتی ہے قویٰ بہیمیہ (حیوانا سے منسوب قوتیں) اس کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور قویٰ ملکیہ (فرشتوں سے منسوب قوتیں) اپنی طرف سخت منازعۃ (لڑائی جھگڑا) ہوتی ہے، عارفین اسی کو دیکھ کر لرزاں وترساں (کانپتے اور ڈرتے رہنا) ہیں کہ کبھی کچھ حالت ہوتی ہے اور کبھی کچھ۔

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما — گہ خندہ زند دیوز ناپاکی ما

ایمان چو سلامت بلب گور بریم — احسنت بریں چستی و چالاکی ما

حقیقت میں ہماری حالت ایسی ہے جیسے ایک گھڑی ہوتی ہے کہ اگر اس کے پرزے اور بال کمانی سب درست ہوں تو وہ ٹھیک چلتی ہے ورنہ کبھی سست ہو جاتی ہے، کبھی تیز۔

یزید پر لعنت کرنے کا حکم

ایک شخص نے مجھ سے پوچھا تھا یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے میں نے کہا کہ اگر وہ مستحق لعنت بھی ہو تب بھی کلام اس میں ہے کہ تم کو لعنت کرنا مناسب ہے یا نہیں سو تم کو یزید پر لعنت کرنا اس وقت سزاوار ہے جب کہ تم کو یہ معلوم ہو کہ یزید سے بہتر ہو کر مروں گا ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر تو دیکھو کہ کس حالت میں ہو اور کیا کیا خرابیاں اپنے اندر بھری ہوئی ہیں پھر کس منہ سے یزید پر لعنت کرتے ہو ہاں اگر بایزید ہو کر مرو تو یزید پر لعنت کرو جب باایمان یہاں سے چلے جاؤ گے اور قبر میں کچھ کام تو ہوگا نہیں بے فکری سے یزید پر لعنت کیا کیجیو اور ابھی تک تو یہی خبر نہیں کہ تم کس حالت میں مرو گے۔ ممکن ہے یزید سے بھی بدتر حالت میں ہو کر مرو یہ جواب سن کر وہ شخص خاموش ہو گئے اور کہنے لگے کہ میری تسلی ہو گئی غرض انسان ہر وقت کشاکشی میں رہتا ہے۔

گہ چنیں بنمایدو گہ ضد ایں — خبر کہ حیرانی نبا شد کار دیں

(کبھی ایک حالت طاری ہوتی ہے اور کبھی اسکی ضد اس لئے تجھے دین کے کام میں حیرانی نہیں ہونی چاہئے)

گویا یہ انسان ایک اکھاڑہ ہے کہ اس میں دو پہلوان کشتی کرتے ہیں کبھی یہ غالب ہوتا ہے کبھی وہ۔

شیطان، نفس اور روح کی کشاکشی

اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ تم کو بلقان اور طرابلس کی لڑائی کی کیا فکر ہے تمہارے اندر خود ایک بلقان اور ترک یعنی شیطان اور نفس اور روح موجود ہیں جو باہم لڑتے رہتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

اے برادر عقل یک دم باخود آر دمبدم در تو خزاں است و بہار

(اے بھائی عقل کو اپنے پاس رکھ ہر گھڑی تیرے اندر بہار بھی ہے خزاں بھی)۔

ع موسیٰ و فرعون در ہستی تست

(موسیٰ اور فرعون خود تیرے اندر موجود ہیں یعنی خیر وشر کی قوتیں)

مطلب یہ نہیں ہے کہ موسیٰ اور فرعون خارج میں نہیں تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم خارجی فرعون و موسیٰ کے قصے سے عبرت حاصل کرو اور اس سے سمجھو اور نتیجہ نکالو کہ تمہارے اندر بھی ایک چیز موسیٰ اور فرعون کے مشابہ ہے ایسا نہ ہو کہ تم تو ان ظاہری فرعون و موسیٰ میں لگے رہو اور تمہارے اندر کا فرعون یعنی نفس تمہارے موسیٰ یعنی روح پر غالب آجائے اور تم اس بہار و خزاں میں مشغول ہوتے ہو۔

اصلی آثار

ارے تمہارے اندر بڑی بھاری بہار اور خزاں ہے اس کو دیکھو جیسے مولانا نے حکایت لکھی ہے۔

صوفئے در باغ از بہر کشاد صوفیا نہ روئے بر را نو نہاد

(یعنی ایک صوفی دوستوں کے ساتھ باغ میں پہنچے اور وہاں مراقب ہو کر بیٹھ گئے)۔

ایک دوست نے کہا فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (پس اللہ کی رحمت کے آثار دیکھو کہ وہ زمین کو مردہ ہونے کے بعد کس طرح زندہ کرتا ہے) صوفی نے کہا کہ اصل ان آثار کی باطن میں ہے اسی آیت سے وہ زیادہ نظر کے قابل ہے۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ تو زغنچہ کم ندمیدۂ در دل کشا چمن درآ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو)

غرض تمہارے اندر خود ایک باغ ہے اس میں آثار رحمت کے دیکھو اور یہ باغ تو آثار الآثار ہیں اصلی آثار قلب میں ہیں۔

حکایت حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ

ہاں جس کی آنکھیں ادھر کی کھلی ہوئی نہ ہوں وہ ادھر کی بھی کیوں بند کرے ان ہی آنکھوں آثار قدرت کو عبرت کی نظر سے دیکھے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ دیوبند ایک مرتبہ سرہند حضرت مجدد صاحبؒ کے مزار پر تشریف لے گئے تھے طلبہ بھی ساتھ تھے میں بھی تھا مولوی صاحب مراقب ہو کر آنکھیں بند کر کے مزار کے پاس بیٹھ گئے بعض طالب علم بھی اسی طرح آنکھیں بند کر کے

بیٹھے میں نے کہا کہ میاں باطن کی آنکھیں تو پھوٹی ہوئی ہیں ہی ظاہر کی بھی کیوں پھوڑتے ہو ادھر کچھ نظر آئے تو ادھر کی آنکھیں بند کریں ورنہ خوامخواہ دیکھنے والوں کو دھوکہ ہوتا ہے کہ شاید یہ صاحب کشف ہوں۔

ذکرِ جہر میں شبہ ریا کا جواب

بقول حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے کہ ایک شخص کو حضرت نے ذکر جہر کی تعلیم کی اس نے کہا کہ حضرت اس میں تو ریا ہوگی کوئی ذکر خفی یا شغل تعلیم فرما دیجئے حضرت نے فرمایا کہ اس میں زیادہ ریا ہے اس لئے کہ اگر زبان سے پکار کر اللہ اللہ کرو گے تو ہر کوئی جانے گا کہ اللہ اللہ کر رہا ہے کوئی نئی بات نہیں ہے اور جب گردن جھکا کر چپکے مراقب ہو کر بیٹھو گے تو دیکھنے والے سمجھیں گے کہ خدا جانے شاہ صاحب یہاں بیٹھے بیٹھے کہاں کہاں کی سیر کر رہے ہیں۔

انسان کے اندر ہر شئے کا نمونہ

غرض انسان کے اندر ہر شئے کا نمونہ ہے موسیٰ و فرعون بھی ہیں اور ان میں ہمیشہ جنگ رہتی ہے اسی واسطے ارشاد فرمایا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ یعنی ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے اور اسی وجہ سے یہ انسان ملائکہ سے بڑھ جاتا ہے اس لئے کہ ان میں منازعت ہی نہیں ہے جو مانع اطاعت ہو اور اس میں ہر وقت منازعت رہتی ہے پس اس کی اطاعت بڑا کمال ہے پس اس تقریر سے واضح ہو گیا ہوگا کہ انسان نہایت ضعیف ہے اس ضعف کی وجہ سے یہ اکثر مغلوب ہو جاتا ہے اور نفس و شیطان کا اس پر غلبہ ہو جاتا ہے اور گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے کبھی آنکھ سے گناہ ہو گیا کبھی ہاتھ سے کبھی زبان سے اور دل کہ جس پر مدار ہے وہ تو ہر وقت ہی کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا رہتا ہے۔

خود کو مقدس سمجھنا دھوکہ ہے

اسی واسطے امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ اے شخص تو جو دھوکہ میں ہے کہ لوگ جو مجھ کو مقدس جانتے ہیں تو میں ضرور کچھ ہوں گا تو ذرا اپنے قلب کو تو دیکھ کہ اس میں کس قدر خرافات بھری ہوئی ہے۔ واقعی انسان اگر اپنے اندر غور کر کے دیکھے تو اس کو صاف معلوم ہو کہ ہم ہر وقت کسی نہ کسی معصیت میں ہیں غرض یہ قضیہ (معاملہ) بالکل بدیہی (واضح) ہے کہ انسان ہر وقت مبتلائے معصیت ہے اگر حکام ظاہری کی طرح حق تعالیٰ بھی ہمارے ساتھ قانونی برتاؤ فرماتے تو کوئی صورت ہماری نجات کی نہ تھی لیکن کیا رحمت ہے کہ ہمارے ساتھ ضابطہ کا برتاؤ نہیں کیا گیا بلکہ یہ ارشاد ہے کُلُّکُمْ خَطَّاؤُنَ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ (مسند احمد ۳: ۱۹۸، سنن الترمذی: ۲۴۹۹)

یعنی اے لوگو تم سب خطا کار ہو اور بہترین خطا کار توبہ کرنے والے ہیں، بہر حال یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ گناہ توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں۔

گناہوں سے بچنے کے اہتمام کی ضرورت

لیکن اس سے کوئی ذہین یہ نہ سمجھے کہ جب گناہوں سے خالی رہنا محال ہے تو ہم گناہ کیا کریں اس لئے کہ اول تو عقل سلیم خود بتلا رہی ہے کہ گناہ سے خالی نہ رہنا اس بات کو مقتضی (چاہنا) نہیں ہے کہ ہم قصداً اور گناہ بھی کیا کریں یہ تو اور زیادہ جرم کو بڑھانا ہے۔

دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ کا ارشاد جگہ جگہ تقویٰ کی تعلیم ہے اور تقویٰ کے معنی گناہ سے بچنا ہے۔ پس عقلاً و نقلاً اس کا اہتمام ضروری ٹھہرا کہ گناہ سے بچیں۔ پس حاصل تمام تر تقریر کا یہ ٹھہرا کہ انسان سے ہر وقت گناہ ہوتا ہے اور اس کے ذمہ حتی الوسع (جہاں تک ممکن ہو) اس سے بچنے کا اہتمام ضروری ہے۔

گناہوں سے بچنے کا طریق

اب رہی یہ بات کہ اس سے بچنے کا کیا طریق ہے سو وہ کرنے کی بات ہے کہنے کی نہیں بہت امور اس قسم کے ہیں کہ وہ لکھنے اور کہنے سے سمجھ میں نہیں آتے عمل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں دیکھو اگر کسی کو کتاب خوان نعمت جس میں قسم قسم کے کھانے پکانے کی ترکیبیں لکھی ہیں حفظ ہو مگر پکائی نہیں تو اس سے اس کے منہ میں وہ کھانے نہیں آئیں گے اس کے لئے تو یہ ضروری ہے کہ تمام سامان جمع کرو اور مشقت اٹھا کر اس کو اس کی ترکیب کے موافق پکاؤ اس وقت مزہ آئے گا پس جو بات کرنے کی ہے اس کے نرے جاننے سے کچھ نہیں ہوتا۔

حقیقتِ تصوّف

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے اگر کوئی طالب علم زیادہ تقریر کرتا تو فرما دیتے کہ یہ کام کرنے کے ہیں تقریر سے یہ شبہات حل نہ ہوں گے اسی طرح مشائخ نے جب دیکھا کہ گناہ سے بچنا ضروری ہے، پس اس کے طریقے قرآن و حدیث سے سمجھ کر انہوں نے لکھ دیئے جن پر عمل کرنے سے مقصود حاصل ہوتا ہے اور تصوف اسی کا نام ہے۔ نرے علمی مسائل مثلاً وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، تنزلات ستہ کے جاننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اب اگر کوئی ان مسائل کو یاد کر کے مجلس کو گرم کرے تو اس سے وہ صوفی نہ بنے گا۔ شیخ فرماتے ہیں

قدم باید اندر طریقت نہ دم ۔۔۔ کہ اصلے ندارد دمے بے قدم

کارکن کار بگذار از گفتار کاندریں راہ کار دار دکار

(طریقت میں قدم رکھنا یعنی عمل کرنا چاہے اس لئے کہ بغیر قدم رکھے (عمل کئے) دعویٰ کی کچھ اصل نہیں۔ عمل کرو دعویٰ کو ترک کرو اس طریق میں عمل اور کام ہی کی ضرورت ہے)۔

کام کرنا چاہیئے نری باتوں سے کیا ہوتا ہے لیکن لوگوں کو ان باتوں کے کرنے اور سننے کا شوق ہے اس لئے کہ اس میں مزہ ہے۔ میں نے ہندوؤں تک کو کہتے سنا ہے کہ مثنوی شریف میں بڑا لطف آتا ہے۔ پس اگر مدار باتوں ہی پر ہے تو ہندو بھی صوفی بن جائیں گے۔ یاد رکھو تصوف یہ نہیں تصوف کی تعریف ہے تعمیر الظاہر والباطن اور یہ تعمیر ہوتی ہے کام کرنے سے اور وہ نفس پر نہایت گراں ہے لیکن نفع ہمیشہ اسی شے سے ہوتا ہے جس میں نفس پر گرانی ہو، دیکھو غالب اور ذوق کے کلام میں گو مزہ آتا ہے لیکن اس سے کوئی نفع نہیں۔ اور حکیم محمود خاں صاحب نے جو نسخہ لکھ کر دیا ہے اس میں کچھ بھی مزہ نہیں لیکن دونوں میں فرق جب معلوم ہوگا کہ کوئی مریض ہو اور اس کو اشعار بھی سنائے جائیں اور وہ نسخہ پلایا جائے اشعار سنانے سے دل تو اس کا کچھ بہل جائے گا لیکن اصل مرض کو کچھ بھی نافع نہ ہوگا اور نسخہ پلانے سے تمام رطوبات فضلیہ اعماق بدن سے نکلیں گے اور اس میں اس کو تکلیف سخت ہوگی لیکن نتیجہ کیا ہوگا کہ دولت صحت سے مالا مال ہو جائے گا۔

پختگی مدتوں کے بعد حاصل ہوتی ہے

اسی طرح معالجہ باطنی ہے کہ وہ لوہے کے چنے چبانا ہیں، تکبر نکالو تواضع پیدا کرو، حرص نکالو بجائے اس کے قناعت پیدا کرو حب جاہ دور کرو ذلت وخواری اپنے پیش نظر کرو مدتوں کے بعد پختگی آتی ہے۔

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی کے دل کی صفائی اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک دروازہ نہ کھٹکھٹائے بہت سے سفر کرنے چاہئیں تاکہ کچا پن جاتا رہے)۔

اگر علم ہی مقصود ہوتا تو بسیار سفر کی کچھ بھی ضرورت نہیں اس لئے کہ چند مسائل یاد کرے بس قصہ ختم ہوا بسیار سفر کی ضرورت تو عمل ہی کے اندر ہے کہ ایک شخص چاہتا ہے کہ میں عمل کروں چنانچہ عمل کرتا بھی ہے لیکن بعض وقت طبع غالب ہو جاتی ہے اور قویٰ ملکیہ اور قویٰ بہیمیہ میں منازعت ہوتی ہے اس وقت ایسی کش مکش میں ہوتا ہے کہ جس پر گزرے وہی جانتا ہے۔ بعض دفعہ تو تیلی کے بیل کی طرح کہ جہاں تھا وہاں ہی اپنے کو دیکھتا ہے لیکن طالب صادق کو چاہیئے کہ ایسے وقت ہمت نہ ہارے اور عمل کو نہ چھوڑے برابر کام کرتا رہے۔ مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں۔

اندریں رہ مے تراش و میخراش   تا دم آخر دمے فارغ مباش

تا دم آخر دمے آخر بود   کہ عنایت باتو صاحب سر بود

(اس راستہ میں آخر دم تک تراش وخراش (محنت ومشقت) سے فارغ مت رہ تاکہ میرا آخری سانس آخر وقت تک شاید اللہ کی مہربانی سے کارآمد ہو جائے)۔

یعنی کہیں ٹھیرو مت برابر چلتے رہو کوئی نہ کوئی وقت ایسا ضرور ہوگا کہ حق تعالیٰ کی عنایت تم پر ہو جائیگی۔

نِرا علم کافی نہیں

مشائخ نے ایسے ایسے معالجات اور تدبیریں لکھی ہیں کہ جس سے کتابیں مدوّن (مرتب) ہوگئی ہیں اگر نِرا علم کافی ہوتا تو اس تطویل کی کیا ضرورت تھی آج کل لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ رنگین باتوں اور قصوں اور حکایتوں کو بہت پسند کرتے ہیں چنانچہ جس وعظ میں ایسے مضامین نہ ہوں اس وعظ کو پھیکا کہتے ہیں اور جو واعظ حکایتیں اور قصے بیان کرے اس کا وعظ بہت اچھا شمار کیا جاتا ہے۔

وعظ کا اصل مقصود

حالانکہ حکایات اور قصص بذاتہا مقصود نہیں ہیں ان سے عبرت ونصیحت حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے جیسے مولانا نے ایک قصہ مثنوی شریف کے شروع میں بیان کیا ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں ۔

بشنوید اے دوستاں ایں داستاں   خود حقیقت نقد حال، ست آں

نقد حال خویش را گرپۓ پریم   ہم ز دنیا ہم زعقبےٰ برخوریم

(اے دوستو میری داستاں سنو، حقیقت حال میرے حال کی خود گواہ ہے اگر اپنی موجودہ حالت پر غور وفکر کرتے رہو تو دونوں جہاں میں کافی نفع ہو)۔

دیکھو ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود حکایت سے اپنی حالت کی اصلاح ہے لیکن ہمارے بھائیوں نے آج کل ہر شئے کا خلاصہ نکالا ہے، چنانچہ وعظ کا خلاصہ حکایات اور شعر اشعار نکالنا ہی حضرت کا مقصود ہے نِری حکایات اور اشعار سے کیا ہوتا ہے ہاں اگر کوئی برجستہ شعر یا تمثیل کے طور پر حکایت آجائے تو مضائقہ نہیں لیکن پھیر پھار کر تکلف کرکے کوئی حکایت یا شعر لانا یہ بُرا ہے جیسے کسی واعظ نے قل ھواللہ شریف میں امام حسین علیہ السلام کی شہادت بیان کی تھی۔ جوڑ یہ لگایا تھا کہ یہ سورۃ اس نبی پر نازل ہوئی جن کے نواسہ میدان کربلا میں شہید ہوئے ہیں اور یہ کہہ کر تمام قصہ شہادت کا انہوں نے وعظ میں بیان کیا تو جناب ایسی حکایتیں اور بیان کرنے سے کیا نفع ہے حاصل یہ ہے کہ جس طرح کتب طب میں تمام امراض

کے معالجات مدوّن کئے گئے ہیں اسی طرح مشائخ اور طبیبانِ باطن نے امراضِ باطنیہ کے معالجات اور تربیت باطن کے طرق مدوّن کئے ہیں چنانچہ ان کتب میں سے قوت القلوب اور رسالہ مکیہ وغیرہ ہے۔

گناہوں سے بچنے کا طریقہ

اور ان طرق (طریقے) کی تدوین (مرتب کرنا) میں بزرگوں نے ہمیشہ ان چیزوں کا اہتمام کیا ہے جو کارآمد ہیں سو چونکہ ان مقاصد میں ایک مقصود بلکہ اعظم المقاصد (سب سے بڑا مقصد) گناہ سے بچنا بھی ہے ان حضرات نے اس کے لئے بھی طریقے لکھے ہیں مثلاً ایک طریقہ یہ لکھا ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچا کرو چند روز میں ایک ندامت طاری ہو گی اور یہ مضمون دل میں وارد ہوگا کہ اللہ اکبر مجھ پر ہر دم بے شمار نعمتیں ہیں اور میری یہ حالت کہ ایسے منعم (نعمت عطا کرنے والا) کی نافرمانی میں مبتلا ہوں اور اثر اس کا یہ ہوگا کہ گناہ چھوٹ جائیں گے ایک اور طریقہ لکھا ہے کہ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی کا مراقبہ کیا جائے علاوہ اس کے اور بھی مراقبات وطرق لکھے ہیں کہ کسی سے حیا کا غلبہ ہو جاتا ہے کسی سے اپنا ہیچ ہونا ذہن نشین ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے رہبر بن جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ طرق محصور ہوں ممکن ہے کہ علاوہ ان کے اور طریقہ بھی اس مقصود کے لئے ہو۔ پس اگر کسی اللہ کے بندہ کے ذہن میں اللہ تعالیٰ کے سمجھانے سے کوئی سہل طریقہ آجائے تو کیا وجہ ہے کہ اس طریقہ کو بھی اس فہرست میں داخل نہ کیا جائے خصوصاً جب کہ طریق کا اس زمانہ میں انفع ہونا ثابت ہو۔ اب میں عرض کرتا ہوں کہ میرے قلب میں اسی قسم کا ایک طریقہ حق تعالیٰ نے وارد کیا ہے جس کو میں مفصلاً عرض کروں گا۔ اس تمام تر تقریر سے تعیین (مقرر ہونا) اجمالی تو مقصود کی ہوگئی۔

خصوصیت اور تعلق زیادہ ہونے کا اثر

اب تفصیل سے پہلے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں اس سے ہی وہ مضمون میرے قلب میں وارد ہوا ہے اور وہ واقعہ اگرچہ ایک سرسری قصہ ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ کسی چھوٹی بات سے بڑی بات اپنے بندوں کو سمجھا دیں تو کچھ عجیب نہیں ان کی قدرت ایسی ہے کہ چھوٹے ظرف میں بڑی شے سما دیتے ہیں جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ ہوتا ہے۔ پس جب مظروف میں عظمت ہو تو تم کو مظروف ہی پر نظر رکھنا چاہیئے ظرف سے کیا لینا ہے وہ قصہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے مدرسہ میں بچوں کی نگرانی کا یہ قانون مقرر کیا ہے کہ ایک تنخواہ دار نگران ان پر مسلط کر دیا اور اس کو یہ ہدایت کی ہے کہ تم ان بچوں سے مواخذہ کسی بات کا نہ کرو بلکہ جو امر خلاف قاعدہ یہ کریں اس کو بقید تاریخ و وقت و مکان

لکھ لیا کرو۔ ایک نقشہ ان کو دے دیا کہ اس کی خانہ پوری کر دیا کرو اور ایک وقت معین پر ہم کو معائنہ کرا دیا اس قاعدہ کے اجراء سے بچوں پر بہت اچھا اثر ہوا اور بہت حصہ ان کی شرارت کا کم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ہمارے ساتھ جوان بچوں کو تعلق وخصوصیت تھی اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

اور اس قانون سے پہلے باوجود اس کے کہ ہم کو ان کی شرارتوں پر اطلاع ہوتی تھی اور مواخذات بھی ہوتے تھے لیکن باز نہ آتے تھے اور وہ تعلق وخصوصیت زجر کے اثر کو کافی نہیں ہونے دیتا تھا۔ اور اس قانون کے بعد رُک گئے اور نیز تعلق میں بھی کوئی کمی نہیں آئی تو اس کا راز یہ سمجھ میں آیا کہ جس کے ساتھ خصوصیت اور تعلق زیادہ ہوتا ہے اس کے مطلع ہونے سے آدمی اس قدر نہیں شرماتا جس قدر غیر کے اطلاع ہونے سے حیا آتی ہے۔ دیکھو بعض اوقات باپ سے شرم نہیں آتی اور نوکر سے آتی ہے۔

ایک عجیب وغریب علم

غرض اس قصہ سے دو باتیں سمجھ میں آئیں ایک تو یہ کہ درمیانی واسطہ ہونے سے شرم زیادہ بڑھ گئی اس لئے شرارت کم ہوگئی، دوسرے یہ کہ ہم سے جوان کے تعلقات ہیں جرائم کے ارتکاب کو انہوں نے ان تعلقات کے تکدر (خراب ہونا) کا موجب نہیں جانا اسی واسطے وہ تعلق زاجر (منع کرنیوالا) نہ ہوا اور نہ ضرور باز رہتے اس واقعہ سے معاً قلب میں ایک علم عجیب وغریب وارد ہوا وہ یہ ہے کہ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ حق تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ اور قادر مطلق ہیں پھر باوجود اس کے جو اعمال لکھنے کے لئے یا عذاب کے لئے جو فرشتے مقرر فرماتے اس کی کیا وجہ ہے بظاہر تو یہ امر خلاف عقل معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ لکھنے کی تو جب ضرورت ہوتی جب کہ خود علم نہ ہوتا اور نیز دوسروں کے واسطہ سے سزا دینے کی جب حاجت تھی جب کہ بالذات قدرت نہ ہوتی اور وہاں دونوں امر مفقود ہیں پھر اس کی کیا ضرورت ہے چنانچہ معتزلہ نے تو اسی بنا پر کتابت اعمال کا صاف اِنکار ہی کر دیا ہے۔ اور اہل سنت کی اس مسئلہ میں تحمیق (احمق بنانا) کی ہے اور جن نصوص میں کتابت یا وزن اعمال کی خبر دی گئی ہے ان کا یا تو انکار کیا ہے اور یا ان میں تاویل کی ہے۔

علّت سے متعلق ہمارا مذہب

اہل سنت کی طرف سے حقیقی جواب تو یہ ہے کہ نصوص میں جب وارد ہوا ہے تو حق ہے گو ہم کو اس کی علّت معلوم نہیں اور نہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے ہمارا تو یہ مذہب ہے ۔

زباں تازہ کردن با قرار تو   نینگیختن عِلّت از کارِ تو !

(آپ کا ذکر کرنا چاہیئے نہ آپ کے کاموں کی علّت)

بندوں کے ناز کا سبب

باقی حکمت کے مرتبہ میں اس قصہ سے جو بات حق تعالیٰ نے میرے قلب پر وارد فرمائی وہ یہ ہے کہ بندوں کو اپنے مالک تعالیٰ شانہٗ سے بے نہایت تعلق و خصوصیت ہے کہ اس قدر کسی سے نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے اور یہ خصوصیت اس درجہ پر ہے کہ اس کی وجہ سے بندوں کو ایک ناز ہوگیا ہے۔

محبت کا مدار دیکھنے پر نہیں

ایک شخص نے مجھ سے پوچھا تھا کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہم کو کیسے محبت ہوگئی ہم نے ان کو دیکھا تو ہے نہیں۔ میں نے کہا کہ محبت کا مدار دیکھنے پر نہیں ہے۔ دیکھو اپنی جان سے کیسی محبت ہے بلکہ حق تعالیٰ سے جان سے بھی زیادہ تعلق ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق اول ہوا ہے اور اس تعلق کی ہی وجہ سے اپنی جان سے تعلق ہوا (لان بینهما علاقة العلية) لیکن ہم کو غایت تعلق و قرب کی وجہ سے اس کا احساس نہیں ہے اس کی مثال محسوسات میں موجود ہے مگر اس سے پہلے اول یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ یہ فلسفی مسئلہ ہے اور نیز مشاہدہ ہے انسان کی قوت باصرہ ادراک (دیکھی ہوئی چیز کو معلوم کرنا) مبصرات میں مستقل نہیں ہے بلکہ بواسطہ کسی خارجی نور کے ادراک کرتی ہے خواہ وہ نور شمس کا ہو یا چراغ کا یا نجوم کا اسی واسطے تاریک مکان میں خواہ کتنا ہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں کچھ بھی نظر نہیں آتا پس اولاً ہم کو ادراک اس نور کا ہوتا ہے اس کے واسطے سے دوسری اشیاء ہم کو نظر آتی ہے۔ اب سمجھئے کہ ہم نے مثلاً دیوار کو دیکھا تو ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اول ہم نے دیوار کو دیکھا ہے اور دیوار کے سواء کوئی شئے ہم کو نظر نہیں آتی حالانکہ اول ادراک ضوء شمس (سورج کی روشنی) کا ہوا اور اس کے واسطہ سے دیوار نظر آئی مگر ہم اس نور کی غایت قرب کی وجہ سے اس کو مدرک اول نہیں جانتے مرئی اول دیوار ہی کو جانتے ہیں اور جو اصلی علّت رویت کی تھی وہ غایت قرب کی وجہ سے مدرک نہیں ہوتی لیکن وہ ضیاء کہہ سکتی ہے انا اقرب الیک من الجداد یعنی اے دیکھنے والے میں تجھ سے دیوار کے نسبت قریب تر ہوں۔ پس معلوم ہوا کہ غایت قرب بھی بعض اوقات مانع ادراک ہو جاتا ہے۔ پس ایسا ہی تعلق و قرب ہم کو ذات باری تعالیٰ سے ہے کہ وہ اس قدر قوی ہے کہ غایت قوت کی وجہ سے اس کا ہم کو ادراک نہیں ہوتا اور تمام اشیاء کے ادراک کا وہ واسطہ ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کا غایت قرب

اسی واسطے ارشاد ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ یعنی ہم انسان کے رگِ جان سے زیادہ

قریب تر ہیں اور فرماتے ہیں نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ یعنی ہم تمہارے تم سے بھی زیادہ قریب ہیں لیکن تم بصیرت نہیں رکھتے، غرض حق تعالیٰ کے ساتھ جان سے بھی زیادہ محبت ہے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محبت اگر ہوسکتی ہے تو وہ خدا ہی کے ساتھ ہے۔ اور کسی شے کے ساتھ محبت نہیں ہو سکتی۔ پس اس غایت قرب کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں کو اپنے خالق تعالیٰ شانہ، پرایک قسم کا ناز ہے جیسے بچہ کو غایت تعلق کی وجہ سے ماں پر ناز ہوتا ہے کہ شرم کم ہو جاتی ہے پس فی نفسہٖ تو اس سے بڑھ کر کوئی طریقہ گناہ سے بچنے کا نہ تھا کہ بندہ اپنے خالق سے شرما کر گناہ کو چھوڑ دیتا لیکن ناز نے اس شرم کا اثر کم کر دیا اور نیز ہمارا قصور فہم بھی عارض ہو گیا اس لئے یہ طریقہ کافی نہ ہوا اور یہ قرب حاجب عن العصیان (گناہوں سے روکنے والا قرب) نہ ہوا۔ اس لئے ضرورت ہوئی ایسے طریقہ کی کہ جو اس کا تدارک (پورا کرنا) وتلافی کر سکے۔

اعمال لکھنے کے لئے فرشتوں کے مقرر کرنے کا سبب

اور وہ طریقہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے اعمال کی کتابت کے لئے فرشتے مقرر فرما دیئے اور پھر ہم کو اس کی خبر کر دی گویا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اعمال کی صرف ہم کو ہی خبر نہیں بلکہ فرشتوں کو بھی خبر ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے اِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ كِرَامًا كَاتِبِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ. (بلاشبہ تم پر تمہارے سب اعمال یاد رکھنے والے معزز لکھنے والے مقرر ہیں جو تمہارے سب اعمال کو جانتے ہیں) پس یہ معلوم ہو کر ہمارے افعال کی ملائکہ کو بھی خبر ہے نہایت غیرت اور شرم آئے گی اور اس کا استحضار اگر تام ہو جائے تو بالیقین گناہ سے احتراز ہو جائے اسی طرح گناہ پر سزا خود بھی دے سکتے تھے مثلاً گناہ کرتے ہی ایسا درد پیدا ہوتا کہ بیقرار ہو جاتا لیکن یہ طریقہ بھی کافی نہ ہوتا۔ دیکھ لیجئے اگر باپ بیٹے کو سزا دے تو وہ زاجر نہیں بخلاف اس کے کہ استاد یا غیر اس کو سزا دے کہ وہ کافی ہوتا ہے اس لئے سزا دینے کے لئے بھی ملائکہ کو مقرر فرمایا پس یہ ہے وہ مضمون جو میں نے اس تقریر نگرانِ اطفال کے قصہ سے سمجھا ہے جس پر بے ساختہ مجھ کو یہ شعر یاد آتا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

(اچھا یہ ہوتا ہے کہ دوستوں کی باتیں دوسروں کی باتوں کے دوران بیان کر دی جائیں)

علماء محققین ہی نے مقاصد قرآن کو سمجھا ہے

پس یہ مضمون اولاً تو میرے ذہن میں اس قصہ سے وارد ہوا تھا مگر میں متجسس تھا کہ کسی آیت

میں مل جائے تو بہتر ہے غور کیا تو ان آیات میں اس کو پایا چنانچہ ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ یعنی اے انسان تجھ کو اپنے رب کریم کے ساتھ کس شے نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے۔ بعض اہل حال کو یہ آیت سن کر حال طاری ہو گیا ہے اور انہوں نے جواب میں کہا ہے غَرَّنِیْ کَرَمُکَ یعنی آپ کے کرم نے ہم کو مغرور کر دیا ہے علماء و محققین نے اس پر انکار بھی کیا ہے لیکن ان کا انکار بھی بیجا نہیں ان کا منصبی کام ہے اور حق یہی ہے کہ علماء محققین ہی نے مقاصد قرآن کو سمجھا ہے بلکہ انتظام شروع تو اس کو مقتضی ہے کہ محض ظاہری علماء کے علوم کو بھی محض صوفیہ کے علوم پر مقدم رکھا جائے اور احادیث سے مطلقاً حضرات علماء کے مناقب مفہوم ہوتے ہیں۔

شریعت کی حفاظت علماء حضرات سے وابستہ ہے

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے زمانہ میں ایک عالم نے کسی صوفی کا رد لکھا تھا شاہ صاحب کو جوش آیا اور ارادہ جواب لکھنے کا کیا اسی وقت ان کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت مکشوف ہوئی اور ان کو منع کیا۔ شاہ صاحب اس کو لکھ کر آگے لکھتے ہیں کہ مجھ کو زیادہ گوشۂ خاطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علماء کی طرف معلوم ہوا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ شریعت کی حفاظت اور عالم کے انتظام کا قیام ان ہی حضرات سے وابستہ ہے اور نرے صوفی آزاد ہوتے ہیں جو چاہتے ہیں کہہ اٹھتے ہیں جو لوگ اس کی حقیقت تک نہیں پہنچتے وہ گمراہ ہوتے ہیں اور جو صوفی علم شریعت نہیں رکھتے وہ تو خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں مولانا فرماتے ہیں۔

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند   از سخنہا عالم را سوختند
نکتہا چوں تیغ پولا داست تیز   چوں نداری تو سپر واپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا   کز بریدن تیغ را بنود حیا

(بڑے ظالم تھے وہ لوگ جنہوں نے آنکھیں بند کر کے ایسی باتوں سے ایک عالم کو ویران کر دیا۔ بہت سے نکتے تلوار کی طرح تیز ہیں اور سپر سے مراد فہم یعنی اگر فہم نہ ہو تو دور رہو اس کے سامنے بدون سپر کے نہ آؤ کیونکہ ایمان اگر اس کے سامنے نہ پڑے گا یہ اس کو قطع کر دے گا)۔

اہلِ حال پر انکار نہیں

خلاصہ یہ کہ علماء نے اس پر یہ انکار کیا ہے جواب میں غَرَّنِیْ کَرَمُکَ (تیرے کرم نے

ہمیں مغرور کردیا) کہنا درحقیقت در پردہ اعراض (پوشیدہ طور پر روگردانی ہے) ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا اس مقام الکریم فرمانا اس لئے ہے کہ کرم تو غرور سے مانع ہونا چاہیئے۔اس لئے کہ محسن کے کرم کو دیکھ کر زیادہ شکر ادا کرنا چاہیئے تو کرم تو مانع عن الغرور ہوا اور ان صاحب حال کے حال سے لازم آتا ہے کہ انہوں نے کرم کو حامل علی الغرور قرار دیا ہے گو مُراد ان صاحب حال کی یہ نہ ہو، پس علماء کا انکار اس معنی پر ہے اور حال پر انکار نہیں ہے۔حال بالکل صحیح ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ امر تو صحیح ہے کہ کرم فی الواقع مقتضی اسی کو ہے کہ کریم کی اطاعۃ اور خضوع وخشوع اور زیادہ ہو لیکن چونکہ ہماری عقول ناقص ہیں اس لئے ہم نے اس کو مقتضی برعکس سمجھا ہے چنانچہ جس کے ساتھ کرم کیا جاتا ہے عادت یوں ہی ہے کہ اس کو ایک ناز سا ہو جاتا ہے اسی واسطے کسی شاعر نے کہا ہے۔

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ (تیرے کرم نے ہمیں گستاخ کردیا)

پس اس کے موافق غرنی کرمک کے معنی یہ ہوئے کہ اے اللہ آپ کے کرم سے تو چاہیئے تھا کہ ہم پگھلتے اور زیادہ انقیاد اور خضوع ہم میں پیدا ہوتا لیکن ہماری عقل الٹی ہے کہ جو سبب خضوع وخشوع کا تھا وہ ہمارے لئے سبب ناز اور غرور کا ہو گیا اور یہ مقصود نہیں ہے کہ کرم فی الواقع سبب غرور کا ہے گویا غرنی کرمک سے ایک واقعہ بھی بتلا دیا کہ سبب ہماری غفلت اور غرور کا نقصان عقل کے سبب کرم ہے اور یہ بھی بتلا دیا کہ ایسا نہ ہونا چاہیئے۔بہرحال غرنی کرمک کے دو محمل ہیں ایک کے اعتبار سے اس کے معنی صحیح ہیں اور دوسرے کے اعتبار سے گستاخی اور بے ادبی ہے لیکن چونکہ لفظ موہم ہے اس لئے صحو میں (بیہوشی میں ہوش آنا) تو مطلقاً یہ قابل احتراز ہے باقی صاحب سکر معذور ہے اور منشا ایسے الفاظ کے صدور کا حالت سکر میں غایت تعلق ہے۔

غایت تعلق کا اثر

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس وقت تک کسی قدر اجنبیت رہتی ہے اسی وقت تک تکلف رہتا ہے اور جب خصوصیت بڑھ جاتی ہے تو برتاؤ میں سادگی بڑھ جاتی ہے اور وہاں تکلف کرنا دلیل بے تعلقی کی سمجھی جاتی ہے دیکھو اللہ تعالیٰ سے چونکہ بیحد تعلق ہے اسی واسطے اس کے نام کے ساتھ القاب آداب مثل جناب اور حضور کے نہیں بڑھاتے خالی اللہ کہتے ہیں۔مدارس میں دیکھو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو صرف ابوحنیفہؒ کہتے ہیں۔کوئی مولانا مقتدانا نہیں بڑھاتا بلکہ اگر کوئی بڑھائے تو نازیبا معلوم ہوتا ہے۔

زعشق نا تمام ماجمال یار مستغنی است   بآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

دل فریبانِ نباتی ہمہ زیور بستند   دلبر ماست کہ حسنِ خدا داد آمد

(ہمارے ناکمل عشق سے دوست کا حکم بے پرواہ ہے۔ چمک، رنگ ڈاڑھی میں کنگھے کی حسین چہرے کو ضرورت نہیں، نباتات کے محبوب نے سب زیور باندھے ہیں مگر ہمارا محبوب تو حسنِ خداوندر کھتا ہے)

امام صاحب کی علوشان اس سے مستغنی ہے کہ ان کو کوئی مولانا یا مولوی لکھے سب سے بڑھ کر حق تعالیٰ ہیں ان کے ساتھ دیکھو مخلوق کا کیا برتاؤ ہے۔ جب کہتے ہیں اللہ میاں مینہ برسادے، اللہ میاں رزق دیدے ہاں جن پر ادب کو غلبہ ہوا ہے وہ البتہ ایسے کلمات سے احتراز کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہٗ کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کرنا

مجھے یاد ہے کہ میرے استاد جناب مولانا محمد یعقوب صاحب تفسیر پڑھاتے ہوئے حق تعالیٰ کے لئے مفرد کے الفاظ استعمال نہیں فرماتے تھے مثلاً کہتے تھے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ سنتے سنتے مجھے بھی عادت ہوگئی بعض لوگ اس پر یہ شبہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جمع کا صیغہ کا استعمال تعدد کا توہم ہے اس لئے توحید ظاہر کرنے کے لئے مفرد کا صیغہ بولنا چاہیئے۔ بات یہ ہے کہ جمع کا صیغہ تعظیم کے لئے خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَا وغیرہا شاید یہ خیال ہو کہ غیر متکلم میں کہیں نہیں آیا۔ ایک موقعہ پر خطاب میں بھی آیا ہے ارشاد ہے رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا بعض مفسرین نے کہا ہے کہ معنی اس کے تکرار کے ہیں رب ارجعنی رب ارجعنی اس تکرار کو ایک صیغہ میں جمع کر دیا ہے مگر یہ محض تکلف ہے اقرب مفسرین کا دوسرا قول ہے کہ حق تعالیٰ مخاطب ہیں اور جمع تعظیم کی وجہ سے ہے۔ بہر حال توحید کا مقتضی تو یہی ہے کہ مینھ برسادے کہا جائے اور تعظیم اس کو چاہتی ہے کہ برسادو کہا جائے دونوں باتیں جائز ہیں۔ ؎

وللناس فیما یعشقوق مذاهب (اور لوگوں کا اپنا اپنا ذوق رہے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے صیغہ واحد کا استعمال موہم بے ادبی ہے

باقی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں چونکہ اس قدر بے تکلفی نہیں، اس لئے ہماری زبان میں مفرد کا صیغہ جو موہم (شک میں ڈالنے والا) بے ادبی ہے کوئی استعمال نہیں کرتا۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے ؎ با خدا دیوانہ باش و با محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوشیار (اللہ تعالیٰ سے دیوانہ ہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوشیار)

لیکن دیوانہ باش کا یہ مطلب نہیں کہ گستاخی تک نوبت پہنچ جائے۔ بعضے لوگ بقصد ایسی باتیں کرتے ہیں کہ جن سے حق تعالیٰ کی شان میں بے ادبی ہوتی ہے. بہت بچنا چاہیئے۔ اہل حال کی تقلید نہ کرنا چاہیئے اس لئے کہ وہاں حال تو ہے تمہارے اندر کون سا حال ہے تمہاری وہی مثل ہوگی۔

آنچہ مردم میکند بوزینہ ہم (انسان کو دیکھ کر بندر بھی ویسی ہی حرکتیں کرتا ہے)

ناز راروئے بباید ہمچو درد — چوں نداری گرد بد خوئی مگرد

زشت باشد چشم نابینا و باز — عیب باشد روئے ناز یباو ناز

پیش یوسف نازش و خوبی مکن — جز نیازو آہ یعقوبے مکن

(ناز کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے اگر تم ایسا حسین چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی تو نہ کرو، جیسے نابینا آنکھ کے لئے خوبصورت چشم بری ہے اور بدصورت چہرہ کے لئے ناز ونخرہ برا ہے، یوسف علیہ السلام جیسے حسین کے سامنے اپنے ناز اور خوبی کا اظہار نہ کرو ان کے سامنے تو سوائے نیاز اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی آہ کی طرح اور کچھ نہ کرو)۔

اہل حال کی تقلید کرنا گستاخی ہے

غرض ناز کرنا اور اہل حال کی تقلید کرنا جب کہ حال کا کوئی اثر قلب میں نہ ہو سخت گستاخی اور بے ادبی ہے باقی بے تکلفی دوسری بات ہے وہ ہر مومن کو اپنے خالق کے ساتھ ہے مخلوق سے خواہ کسی قسم کا علاقہ ہو۔ مگر پھر بھی ایک حجاب ہوتا ہے اور خالق تعالیٰ شانہ، سے جو تعلق ہے اس میں کچھ بھی حجاب نہیں ہے اور یہ تعلق کسی مخصوص شخص کو نہیں سب ہی کو ہے، حتیٰ کہ گنواروں کو بھی ہے چنانچہ ہم نے مکہ معظمہ میں ایک ثقہ سے سُنا ہے کہ یہاں بدوی آتے ہیں طواف کرتے ہیں، پھر دعا کرتے ہیں "اے اللہ بخش دے اور ضرور بخشے گا اور کیا وجہ ہے کہ نہ بخشے گا" غرض وہ خوب سر ہو کر اللہ سے مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ بھی ایسی دعا کرنے والوں کو چاہتے ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُلْحِيْنَ فِي الدُّعَا (فتح الباری ۱۱:۹۵، الدر المنثور ۵:۳۵۶) یعنی بیشک اللہ چاہتا ہے ان لوگوں کو جو دعا میں اصرار کرنے والے ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ وہ بدوی چونکہ جاہل ہیں اس لئے ان کا اس طرح کہنا عفو ہے باقی جو آداب وحدود سے واقف ہیں وہ جان کر اس طرح سے کہیں گے تو گردن ناپی جائے گی ان کو الحاح ادب کے ساتھ ہونا چاہیئے اور اس کا اثر خود ہمارے برتاؤ میں بھی ظاہر ہے۔ دیکھو نادان بچہ باپ کے ساتھ کیسی ضد کرتا ہے کبھی اس کے اوپر

خلاف ادب ایک کلمہ بھی کہہ دے تو کیسا ناگوار ہوتا ہے اور اس کو سزا دی جاتی ہے۔ غرض حق تعالیٰ کے ساتھ ہر ایک کو ایک بے تکلفی ہے کہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر نہیں ہے اس لئے کہ اول تو حق تعالیٰ کے ساتھ جو تعلق ہے وہ فطری ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو علاقہ ہے وہ مکتسب ہے اور دوسرے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں اور متاثر ہونے والے ہیں قلت ادب سے متاذی ہو سکتے ہیں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالی محبت و تعلق کے ساتھ نہایت ادب کو مقتضی بھی ہے۔ اور حق تعالیٰ واجب الوجود ہیں انفعال اور تاثر سے منزہ ہیں ان کو کسی کے ادب یا بے ادبی سے کوئی اثر نہیں ہوتا اور اسی واسطے حق تعالیٰ نے اپنے دربار کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں فرمایا جب چاہو آؤ اور اللہ تعالیٰ کو پکارو یاد کرو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پکارنے کے آداب

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ارشاد ہے۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ یعنی اے ایمان والو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دولت خانوں میں بلا اجازت مت جاؤ آگے اس کی علت ارشاد ہوتی ہے إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ اس لئے کہ یہ بات نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تکلیف دینے والی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے لئے کسی القاب آداب کی بھی ضرورت نہیں جس طرح چاہو پکارو، چنانچہ نرا نام پاک اللہ اللہ پکارتے ہیں کہتے ہیں کہ اللہ ایسا ہے، اے اللہ پانی برسا دے، اللہ رزق دیدے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پکارنے کے آداب ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ادب کا منشاء

چنانچہ حدیث میں قصہ وارد ہے کہ ایک اعرابی آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دولت خانہ میں تشریف فرما تھے۔ اور اس نے باہر سے آکر پکارنا شروع کیا۔ ''یا محمد'' (صلی اللہ علیہ وسلم) یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوئی اور اسکے بعد یہ آیت نازل ہوئی إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ یعنی جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ خود ان کے پاس تشریف لاتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔ اس آیت میں ادب بارگاہ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) تعلیم کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دولت خانہ کے اندر تشریف رکھتے ہوں تو پکارنا اور بلانا بے ادبی ہے، چاہیئے کہ صبر کرو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود دولت کدہ

سے برآمد ہوں اس وقت جو چاہو عرض کرلو یہاں سے ظاہر بینوں کو یہ شبہ ہوگا کہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب حق تعالیٰ سے زیادہ کرنا چاہیئے اور ادب کا مبنی ہے عظمت چنانچہ جس کی عظمت ہمارے دل میں زیادہ ہوتی ہے اس کا ادب زیادہ کرتے ہیں ۔ تو نعوذ باللہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ سے عظمت میں زیادہ ہیں بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے زیادہ ادب کا منشاء آپ کا بشر اور مخلوق ہونا ممکن ہونا ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو ادب و تعظیم کے اندر کچھ کمی ہو اور آپ کو اس سے تکلیف ہو اور اس سے ان لوگوں کا ایمان تباہ ہو جائے اور حق تعالیٰ متاثر نہیں پھر عظمت کے ایسے مرتبہ میں ہیں کہ ان کو کسی کے آداب والقاب کی ضرورت نہیں ہے صرف نام پاک اللہ خود دال ہے عظمت پر اور نیز علاقہ کا حق تعالیٰ کے ساتھ اتنا قوی ہونا کہ اس کے ہوتے ہوئے تکلف کے القاب و آداب اس کے نام پاک کے ساتھ لانا مغائرہ اور بے ادبی ہے الحاصل حق تعالیٰ کے ساتھ ہر شخص کو بے حد تعلق ہے اور اسی بنا پر بے تکلفی ہے اور اس غایت بے تکلفی کی وجہ سے اس قدر ناز ہو گیا کہ وہ کم فہموں میں بے ادبی کے درجہ کو پہنچ گیا اور اس خصوصیت اور بے تکلفی کا اثر ہم میں یہ ہو گیا ہے کہ خدا کے دیکھتے ہوئے اگر خلوت میں گناہ کرتے ہیں تو نہیں شرماتے اور دوسرے لوگوں کے سامنے شرماتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے ۔ پس اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک مخلوق کو ہم پر مسلط کر دیا ہے کہ وہ ہمارے اعمال کو دیکھتے ہیں اور لکھتے ہیں اور پھر اس کی ہم کو اطلاع بھی کر دی ۔ چنانچہ ارشاد ہے ۔

کراماً کاتبین صفت ہے

اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ یعنی بیشک تم پر نگہبان مسلط ہیں جو کریم الذات ہیں اور لکھنے والے ہیں جانتے ہیں وہ شے جو تم کرتے ہو اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کراماً کاتبین ان کا نام نہیں ہے جیسا کہ عوام میں مشہور ہے بلکہ ان کی یہ صفت ہے اور اس صفت کا یہ بھی اثر ہے کہ وہ مخلوق کریم کسی سے کہتے نہیں صرف لکھنے والے اس سے شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید وہ لکھتے ہوں لیکن ہمارے کرتوت کی ان کو خبر نہ ہو پریس کی طرح کوئی شے ان کے پاس ہوگی کہ جب کوئی عمل ہم سے ہوا اور وہاں منطبع ہو گیا ۔ اس کا جواب دیتے ہیں يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ یعنی جو کچھ کرتے ہو وہ اس کو جانتے بھی ہیں ۔ صاحبو اگر یہ مضمون پیش نظر ہو جائے کہ فرشتے ہمارے اعمال کو دیکھ رہے اور لکھ رہے ہیں واللہ کوئی گناہ نہ ہو ۔

شرم کا مبنی

بڑے شرم کی بات ہے کہ ایک پاک مخلوق جو کہ ہماری جنس بھی نہیں مگر ذی شعور ذی عقول ہیں ہماری نافرمانیاں اور ناپاکیاں دیکھے اور لکھے اور بالخصوص غیر قوم جو ہمارے ہم جنس نہیں ہیں ان سے تو اور بھی زیادہ شرمانا چاہیئے۔ دیکھو اگر ہم پر کسی غیر قوم کی حکومت ہوتی ہے تو ہم کو بہ نسبت اپنی قوم کے ان سے زیادہ خوف ہوتا ہے یہ تو آیت کا حاصل ہوا اور جو مبنی شرم کا اس آیت کی تقریر میں بیان کیا گیا ہے یعنی مخلوق کو اطلاع ہونا ہمارے اعمال کی اس کی تقویت کے لئے اور بھی بعض مخلوقات کے ہمارے اعمال پر مطلع ہونے کا مضمون بیان کیا جاتا ہے کہ اور بھی ایک دوسری جماعت ہے جو ہمارے افعال پر مطلع ہوتی ہیں۔

چنانچہ شرح الصدور میں احادیث نقل کی ہیں کہ مُردوں پر ہمارے اعمال پیش ہوتے ہیں یہ بھی بڑے شرم کی بات ہے کہ ہمارے باپ دادے، بھائی خویش واقارب جو برزخ میں پہنچ گئے ہیں ان کو ہماری کرتُوت کی اطلاع ہو اور تیسری ایک مخلوق اور ایسی ہی ہے اور وہ نباتات، جمادات، حیوانات ہیں کہ ان کو بھی ہمارے گناہوں کی اطلاع ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا یعنی اس دن یعنی قیامت کے دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی کہ مجھ پر فلاں شخص نے فلاں وقت میں فلاں گناہ کیا تھا۔

کشف کوئی مطلوب شئی نہیں

اور حدیث میں آیا ہے کہ قبر میں جو مُردوں کو عذاب ہوتا ہے سواءِ جن وانس کے اس کا سب کو ادراک ہوتا ہے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے پر سوار تھے۔ قبرستان میں گزر ہوا گھوڑا بدکا آپ نے فرمایا کہ مردوں کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ گھوڑے کو اس کا انکشاف ہوا ہے۔ یہاں سے ایک اور بات بھی سمجھنا چاہیئے کہ بہت لوگ کشف کے طالب ہوتے ہیں۔ اس قصہ سے معلوم ہوا کہ کشف کوئی شے مطلوب نہیں ہے اس لئے کہ اس میں جانور بھی شریک ہیں اور جانور تو جانور شیطان کو بھی کشف ہوتا ہے چنانچہ قرآن شریف میں غذوۂ بدر کے قصہ میں آیا ہے کہ شیطان کفار کے ساتھ آیا جب مسلمانوں کا لشکر نظر آیا تو پیچھے ہٹ گیا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ فَلَمَّا تَرَاءَ تِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْٓ اَرٰى مَالَا تَرَوْنَ یعنی جس وقت کافروں اور مسلمانوں کی دونوں جماعتوں نے ایک دوسری کو دیکھا تو شیطان الٹے پاؤں ہٹا اور کہا کہ وہ شے دیکھتا

ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ اس کی تفسیر میں آیا ہے کہ اس غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کے واسطے پانچ ہزار فرشتے آئے تھے اور شیطان کو نظر آئے اس لئے وہ بھاگ گیا اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں بڑے بڑے صحابہ تھے ان میں اکثر کو فرشتے نظر نہیں آئے۔ معلوم ہوا کہ کشف کوئی کمال مقصود نہیں، عبادت اور مجاہدہ ریاضت سے اگر کسی کو یہ کشف ہی مطلوب ہو تو وہ بڑی غلطی میں ہے۔

نافرمانی کا اثر

بہر حال ہمارے گناہوں کی اطلاع ان سب کو ہوتی ہے۔ ایک اطلاع بطور اثر کے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جس دن میں نافرمانی کرتا ہوں اس روز گھوڑا مشکل سے سولدی دیتا ہے اور سب سے زیادہ قابل شرم بات یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارے نامۂ اعمال پیش ہوتے ہیں۔ آپ کو ہمارے اعمال شیئہ سے کیسا رنج ہوتا ہوگا اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے حال پر بیحد شفقت ہے تمام عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمارے ہی غم میں صرف ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اب بھی ایسی حرکات کریں کہ جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچے۔

حکایت مرزا قتیل

مجھے یہاں مرزا قتیل کا قصہ یاد آیا۔ مرزا قتیل شاعر تو ہے ہی اور اس کے کلام میں تصوف کا رنگ بھی ہے کسی صاحب دل کو ان کا کلام دیکھ کر ان کے ساتھ اعتقاد ہو گیا اور ان کے ملنے کے لئے سفر کیا جب ان کے وطن میں آیا تو دیکھا کہ مرزا صاحب بیٹھے ہوئے داڑھی منڈوا رہے ہیں۔ ان بزرگ کو بہت افسوس ہوا کہ میں نے ناحق ہی اتنا لمبا سفر کیا یہ شخص تو ضروریات دین کا بھی پابند نہیں ہے لیکن جی میں آیا کہ اس کو امر بالمعروف کرنا چاہیئے یہ سوچ کر کہا کہ ''آ گا ریش مے تراشی'' (آ گا داڑھی کتراتے ہو) مرزا بولے اور بزعم خود تصوف کے قاعدہ پر بولے ''بلے ریش مے تراشم و لے دل کسے نمے خراشم'' (ہاں میں ڈاڑھی کتراتا ہوں کسی کا دل نہیں دکھاتا) ان بزرگ نے کہا ''بلے دل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مے خراشی'' مرزا قتیل گو رند تھا لیکن اہل دل تھا یہ سن کر آنکھیں کھل گئیں ایک آہ بھر کر بیہوش ہو گیا اور ان بزرگ کے ہاتھ چومتا تھا اور بزبان حال کہتا تھا۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کر دی　　مرا با جانِ جاں ہمراز کر دی

(اللہ تعالیٰ تم کو جزائے خیر عطا فرمائیں کہ تو نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے

محبوب حقیقی سے ہمراز کردیا)

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے گناہوں کی اطلاع بجز ہمارے اور بہت مخلوق کو ہے اور اس کی ہم کو خبر بھی دیدی گئی ہے تا کہ ہم شرمائیں مگر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اس پر بھی ہم کو شرم نہیں آتی ہاں جن حضرات پر توحید کا غلبہ ہے ان کی نظروں سے تو تمامی مخلوقات کا وجود ہی مرتفع ہوگیا ہے ان کی پیش نظر تو ہر وقت عظمت حق ہے۔

چو سلطاں کہ عزت علم برکشد   جہاں سربجیب عدم درکشد

ہمہ ہر چہ ہستند از اں کمتراند   کہ باہستیش نام ہستی برند

(جب بادشاہ ظلم کرنا شروع کرتا ہے دنیا کو عدم کے گریبان میں کھینچ دیتا ہے سب جو کچھ بھی ہیں اس سے کمتر ہیں کہ اس کے ساتھ زندگی کا نام اونچا ہے)۔

وہ تو یہ کہتے ہیں واللہ ماسمت الاعیان رائحۃ الوجود بس البتہ وہ عظمت حق کے سامنے ہر وقت شرم سے گڑے جاتے ہیں مرے جاتے ہیں اور اسی کا مشاہدہ ان کے لئے مانع من (گناہوں اور کشیدگی سے بچنے کا سبب) العصیان والمخالفۃ ہوجاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے سب طرح کے نسخے بیان فرمادیئے ہیں کسی کو کچھ نافع ہے۔ کسی کو کچھ ایسا مطلب ہے کہ جس سے کوئی محروم نہیں ہے۔ بعض تو وہ تھے جن کو علم الٰہی سے تاثر ہوتا ہے ان کے لئے تو یہی کافی ہے ان کے لئے تو یہ ارشاد ہے۔ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ الخ بعض کو اس سے اثر ہوتا ہے کہ فرشتے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے لئے یہ ارشاد ہوا وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ الخ بعض وہ ہیں جو جزا وسزا ہونے سے خائف ہیں ان کے لئے ارشاد ہوا اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۔ اب یہاں پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ فرشتے تو ہر وقت ساتھ نہیں رہتے۔ چنانچہ جب پائخانہ میں جاتے ہیں تو فرشتے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور نیز مردوں کو بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر وقت علم ہو۔ اس لئے اس (اور اس جواب سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پاخانہ کے وقت کے اعمال پر مطلع نہ ہونا فرشتوں کا تسلیم کرلیا گیا ہے بلکہ یہ جواب ہے، باقی اس وقت کے اعمال پر بھی فرشتے مطلع ہوجاتے ہیں اب یہ کہ کیونکر مطلع ہوجاتے ہیں سو حق تعالیٰ کسی طریق سے مطلع فرمادیتے ہیں۔ ۱۲ منہ) کی ہم کو یہ بھی خبر دیدی کہ قیامت کے دن جب کہ تمام اولین وآخرین جمع ہوں گے وہاں اعلان کیا جائے گا، کما قال تعالیٰ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ غرض جو مخلوق

گناہوں کے جاننے سے باقی رہ گئی تھی وہ سب وہاں دیکھیں گے اور سنیں گے۔ اب آخرت کی نسبت شبہ ہوسکتا ہے کہ وہ بہت دور ہے۔

آخرت کے دو درجے

بات یہ ہے کہ آخرت کے دو درجے ہیں زمان آخرت اور مکان آخرت، سوزمان آخرۃ بھی گو کچھ دور تو نہیں ہے لیکن خبر اس کی نسبت بعید ہونے کا گمان ہوسکتا ہے لیکن مکان آخرت تو بالفعل ہی موجود ہے اس لئے اس آسمان دنیا سے آگے مکان آخرت ہی ہے۔ تو اگر ذہن میں یہ مضمون جمالو کہ چھت پر گویا ایک کثیر مخلوق ہم کو دیکھ رہی ہے تو یہ مراقبہ بھی انشاء اللہ گناہ سے بچنے کے لئے کافی ہوگا۔ اور آسمان کے چھت ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً (اور تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنانا) غرض یہ ہے کہ جس طرح ہو سکے گناہ سے بچو۔

دعاوخاتمہ

اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ حق تعالیٰ ہم سب کو گناہوں سے بچائے۔ (آمین)۔

العبره بذبح البقره

یہ وعظ

مجاہدۂ نفس کی ضرورت اور اسکی اہمیت پر مسجد خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون میں ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ بعد نمازِ جمعہ منبر پر بیٹھ کر چار گھنٹے بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد پچاس تھی۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ (دَائِمًا اَبَدًا كَمَا يُحِبُّ وَيَرْضٰى ١٢) اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۞ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۞ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاۗءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۞ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَاِنَّآ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۞ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۭ قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۭ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۞ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۞ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۭ كَذٰلِكَ يُحْىِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۞

(البقرہ: ۶۷ تا ۷۴)

ترجمہ: اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ تم ایک بیل ذبح کرو وہ لوگ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخرہ بناتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ نعوذ باللہ جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے کیا اوصاف ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو نہ بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو پٹھا ہو دونوں عمروں کے درمیان سو اب کر ڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے کہنے لگے درخواست کر

دیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے یہ بیان کردیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو کہنے لگے ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں کیونکہ ہم کو اس بیل میں اشتباہ ہے اور ہم ان شاء اللہ ضرور ٹھیک سمجھ جائیں گے موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ نہ ہل چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جاتی ہے اور نہ اس سے زراعت کی آبپاشی کی جائے سالم ہو اس میں کوئی داغ نہ ہو کہنے لگے کہ اب آپ نے پوری بات فرمائی اور پھر اس کو ذبح کیا اور کرتے ہوئے معلوم ہوتے نہ تھے اور جب تم لوگوں نے ایک آدمی کا خون کر دیا۔ پھر ایک دوسرے پر اس کو ڈالنے لگے اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم مخفی رکھنا چاہتے تھے اس لئے ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو اس طرح حق تعالیٰ مُردوں کو زندہ کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس موقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو ایسے واقعات کے بعد پھر بھی تمہارے دل سخت ہی رہے تو ان کی مثال پتھر کی سی ہے یا سختی میں ان سے زیادہ اور بعضے پتھر تو ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں اور ان ہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں جو شق ہو جاتے ہیں پھر ان سے پانی نکل آتا ہے اور ان ہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں جو خدا کے خوف سے اوپر نیچے کو لڑھک آتے ہیں اور حق تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں۔

قربانی کی ضرورت

یہ چند آیات ہیں سورہ بقرہ کی جن سے مجھے ایک ضروری مضمون بیان کرنا ہے بعض احباب نے اس عرصہ میں درخواست کی تھی کہ کچھ بیان کر دیا جائے کسی خاص مضمون کی فرمائش نہ تھی بلکہ عام درخواست تھی جس کا منشاء صرف یہ تھا کہ بہت دنوں سے یہاں بیان نہیں ہوا۔ میں نے اس وقت پختہ وعدہ نہیں کیا بلکہ یہ کہہ دیا تھا کہ کوئی مضمون ذہن میں آ گیا تو کچھ عرض کر دوں گا کیونکہ عادت یہی تھی کہ میں تکلف کر کے بیان نہیں کرتا بلکہ ازخود اگر کوئی مضمون ذہن میں آ جاتا ہے بیان کر دیتا ہوں اور جی بھی یہی چاہتا ہے کہ تکلف کر کے بیان نہ کیا جائے کیونکہ اس سے اثر بھی نہیں ہوتا اور تعب بھی بہت ہوتا ہے اس کے بعد میرا خود بھی جی چاہا کہ کوئی مضمون آ جائے تو اچھا ہے کیونکہ درخواست خلوص پر مبنی تھی اس کے پورا ہونے کو میرا خود دل چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک مضمون ذہن میں آ گیا جو بہت کام کا

مضمون ہے اور عام ضرورت کا ہے پھر جی چاہا کہ کوئی مضمون اس وقت کے مناسب بھی بیان ہو جائے تو اچھا ہو (کیونکہ عام ضرورت سے خاص وقت موجود کی ضرورت اشد ہوتی ہے) چنانچہ بحمد اللہ یہ خیال بھی پورا ہو گیا اور اس کے لئے مجھے دوسرے مضمون کے اختیار کرنے کی ضرورت نہ پڑی بلکہ پہلے ہی مضمون کی تقریر اس طرح ذہن میں آئی جس میں ضرورت وقت سے میری مراد خصوص یہ وقت حاضر نہیں بلکہ ایک وقت محدود مراد ہے جو کہ ممتد ہے جس میں عید الاضحیٰ اور قربانی کے ایام بھی داخل ہیں اور ضرورت وقت سے مراد یہی قربانی کی ضرورت ہے جو عنقریب آنے والی ہے۔

وعظ کے تین پہلو

تو یہ مضمون جو اس وقت بیان ہو گا اس میں تین پہلو ہیں:

(۱) یہ کہ وہ مضمون ضروری ہے اور عام ضرورت کا ہے۔

(۲) پہلو یہ ہے کہ وہ مضمون قربانی کے مناسب ہے۔

(۳) پہلو یہ ہے کہ جو قصہ ان آیات میں مذکور ہے اس کو مضمون عام سے تعلق ہے اور اس کے واسطہ سے قربانی سے بھی تعلق ہے کیونکہ جس چیز سے ایک چیز کو تعلق ہوا کرتا ہے اس کے متعلق کو بھی اس سے تعلق ہوا کرتا ہے پس مضمون عام کو قربانی سے تعلق ہے اور قصہ مذکورہ فی الآیات کو مضمون عام سے تعلق ہے تو قربانی کو بھی اس قصہ سے تعلق ہو گا۔

اب میں پہلے اس مضمون عام کو بتلانا چاہتا ہوں جو عام ضرورت کا ہے تا کہ تعین (مقصد واضح ہونا) مقصود کے بعد انطباق سہل (مطابق ہوتا) ہو جائے سو وہ مضمون مقصود یہ ہے کہ نفس کشی کی ضرورت ہے یعنی مجاہدہ نفس کی اس کی عام ضرورت ظاہر ہے کیونکہ نفس سب کے ہے ایسا کون ہے جس کے نفس نہیں اور مجاہدہ واصلاح نفس کی بھی سب کو ضرورت ہے۔ ایسا کون ہے جو اصلاح نفس سے مستغنی ہو اور سامعین سے میں اتنی درخواست کرتا ہوں کہ وہ نفس کشی کا لفظ سن کر اس کی تفسیر اپنے ذہن سے کچھ کچھ نہ گھڑیں اور نہ اس کی ضرورت ہے بلکہ اس کی حقیقت وہی ہے جو شریعت نے بتلائی ہے ہم کو اپنی رائے کو اس میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس کی تحقیق عنقریب اپنے موقعہ پر اسی وقت ہو جائے گی اور یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ بعض لوگ نفس کشی اور مجاہدہ کے لفظ سے یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ بس نفس کو خوب بھوکا مارے نہ کھانے کو دے نہ پینے کو نہ اچھا کپڑا پہنے نہ کسی سے ملے جلے نہ کسی سے بات کرے بیوی بچوں کو بھی چھوڑ دے اور حقوق نفس کو بالکلیہ ترک کر دے نہ لیٹے نہ سووے رات بھر جاگتا رہا کرے۔ حالانکہ نفس کشی کی یہ تفسیر بالکل غلط ہے۔

تصوف اور فقہ کی اصطلاحات جُدا ہیں

اور منشا اس غلطی کا یہ ہے کہ لوگ اس فن کو حاصل نہیں کرتے (یعنی فنِ تصوف کو جس میں مجاہدہ و اصلاح نفس سے بحث کی جاتی ہے ۱۲) اور نہ اس کی تحصیل کو ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بھی ایک فن ہے۔ جیسے فقہ و حدیث ایک فن ہے جس طرح فقہ وغیرہ میں خاص اصطلاحات ہوتی ہیں جن کو تحصیل فن ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے اسی طرح تصوف کی بھی اصطلاحات ہیں جو فقہ وغیرہ کی اصطلاحات سے جدا ہیں، ان کی حقیقت بدون تحصیل فن کے واضح نہیں ہوسکتی اور تصوف کی جدا اصطلاحات ہونے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ شریعت سے بھی جدا ہیں۔ نہیں بلکہ فنون مدونہ کی اصطلاحات سے جدا ہونا مراد ہے۔ اور اگر وہ اصلاحات شریعت سے بھی جدا ہوتیں جب بھی مضائقہ نہ تھا لِاَنَّہٗ لَامُشَاحَۃَ فِی الْاِصْطَلَاحِ (اصطلاحات مقرر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے) آخر نحو و صرف وغیرہ کی بہت سی اصطلاحات ہیں جن کو شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔

تصوف کے اصطلاحات کی دو قسمیں

مگر واقعہ یہ ہے کہ تصوف کی اصطلاحات دو قسم پر ہیں ایک وہ جو مقاصد کے متعلق ہیں وہ تو شریعت سے الگ نہیں ہیں بلکہ مقاصد میں اصطلاحات تصوف کی حقیقت وہی ہے جو شریعت میں مذکور ہے اور دوسرے وہ اصطلاحات ہیں جو امور زوائد کے متعلق ہیں وہ شریعت سے جدا ہوسکتی ہیں جیسے تجدد امثال توحید وجودی۔ شغل رابطہ وغیرہ مگر مجاہدہ نفس کشی امور زوائد میں سے نہیں ہے بلکہ مقاصد میں سے ہے کیونکہ یہ ماموربہ فی الشرع (شرع میں ان کا حکم کیا گیا ہے) ہے نصوص میں جابجا مجاہدہ کا ذکر ہے۔ کہیں بصورت خبر کہیں بصیغہ امر چنانچہ ارشاد ہے وَمَنْ جَاھَدَ فَاِنَّمَا یُجَاھِدُ لِنَفْسِہٖ (جو شخص مجاہدہ کرتا ہے وہ اپنے ہی لئے مجاہدہ کرتا ہے) وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ (جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے قربِ ثواب یعنی جنت کے راستے دکھادیں گے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں پوری مشقتیں برداشت کرو) وغیرہ وغیرہ پس اس کی تفسیر وہی ہونی چاہئے جو شریعت نے بتلائی ہے کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ مقاصد میں تصوف کی اصطلاحات شریعت کی اصطلاحات سے جدا نہیں ہیں پس اب اس غلطی کا منشا جہل کے سوا کچھ نہیں لوگوں نے کتابوں میں خاص خاص لوگوں کے مجاہدات کا ذکر دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ بس یہی اس کی حقیقت ہے حالاں کہ حقیقت شے اور چیز ہے اور اس کا طریق تحصیل دوسری شے

ہے۔ حقیقت ایک ہوا کرتی ہے اور طریق تحصیل مختلف بھی ہو سکتے ہیں (مثلاً بیماری میں پرہیز کرنا مضرات سے ضروری ہے لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ پرہیز کی حقیقت وہی ہے جو فلاں طبیب نے فلاں مریض کو بتلائی تھی کہ ٦ ماہ تک پانی نہ پئے کسی سے میل جول اختلاط نہ کرے اور سوائے دو چپاتیوں کے کچھ نہ کھائے سخت غلطی ہے کیونکہ وہ طریقہ اسی مریض کے ساتھ مخصوص تھا سب کے لئے وہی طریقہ نہیں اور نہ پرہیز کی حقیقت اس طریقہ میں منحصر ہے خوب سمجھ لو۱۲ جامع)۔

مجاہدہ کی تفسیر مخترع

پس لوگوں نے ایک غلطی تو یہ کی کہ مجاہدہ کی تفسیر اپنی طرف سے گھڑی۔ دوسری غلطی یہ کی کہ اس تفسیر مخترع (اپنی طرف سے گھڑنا) کو نصوص میں جاری کیا اور یہ سمجھے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے قرب وثواب یعنی جنت کے راستے دکھادیں گے) وغیرہ میں یہی مجاہدہ مراد ہے جو ہمارے ذہن میں ہے اور یہ معنی طاقت سے باہر تھے تو کہنے لگے کہ دین پر عمل مشکل ہے چنانچہ یہ بات عام طور پر لوگوں کی زبان پر ہے حالانکہ اس میں تکذیب ہے۔ نصوص صریحہ کی حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) جس میں صریح ہے کہ دین میں طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی گئی۔ حدیث شریف میں ہے اَلدِّيْنُ يُسْرٌ کہ دین پر عمل کرنا آسان ہے اور فرماتے ہیں مَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ خدا نے تم پر دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی۔ مگر عوام اس غلطی کی بنا پر ان نصوص کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دین آسان ہے بس یوں خیال کرتے ہیں کہ یہ خاص لوگوں کے واسطے آسان ہوگا سب کے واسطے آسان نہیں حالانکہ نص میں نفساً عام ہے جس سے معلوم ہوا کہ کسی کو بھی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی گئی جس میں عام وخاص کا کوئی تفرقہ نہیں نیز مَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (تم پر خدا تعالیٰ نے دین میں کچھ تنگی نہیں کی) میں خطاب سب کو عام ہے۔ مگر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کیونکہ وہ تو مجاہدہ والا اس کو سمجھتے ہیں جو بیوی بچوں کو چھوڑ دے اور نفس کے ضروری حقوق کو بھی ادا نہ کرے۔ حالانکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (اور ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور بچے بھی دیئے) اور دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَآ

اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّآ اِنَّھُمْ لَیَاْ کُلُوْنَ الطَّعَامَ وَیَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ (اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے بیوی اور بچے بھی ہوتے تھے اور وہ کھاتے پیتے بھی تھے اور بازار میں ضروریات کے لئے چلتے پھرتے بھی تھے اور ظاہر ہے کہ تمام ضروریات کی جڑ اولاد وازواج ہی ہیں ان کے لئے انسان کو سب سامان کرنا پڑتا ہے مگر باانیہمہ (ان سب کے باوجود) انبیاء علیہم السلام ان سے الگ نہ تھے اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ مجاہدہ میں انبیاء سے زیادہ کامل کوئی نہیں ہوسکتا۔ پس ثابت ہوگیا کہ مجاہدہ کی یہ حقیقت ہرگز نہیں کہ بیوی بچوں سے الگ ہوجائے۔

مجاہدہ مخترع کی ایک اور بڑی خرابی

اور ایک بڑی خرابی اس غلطی سے یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس مجاہدہ مخترع میں اگر کوئی کامیاب ہو جائے تو پھر وہ اپنے کو دوسروں سے اکمل وافضل سمجھنے لگتا ہے اور جو لوگ اس طرح مجاہدہ نہیں کرتے ان کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ اول تو اس امتیاز کا منشا وہ غلطی ہے جو اس نے مجاہدہ کی حقیقت سمجھنے میں کی ہے۔ دوسروں کو اس غلطی میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر تسلیم کرلیا جائے کہ مجاہدہ کی حقیقت اس نے صحیح سمجھی پھر بھی اسے اپنے کو افضل واکمل سمجھنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ دیکھنا یہ ہے کہ اس کو جو امتیاز حاصل ہے اس کو کوئی کمال ہے یا دوسروں کا نقص۔

خود کو صاحبِ کمال سمجھنا غلطی ہے

سو ظاہر ہے کہ مجاہدہ شرعاً مامور بہ ہے اور اس کے نزدیک مجاہدہ کی حقیقت وہی ہے جو اس نے اختیار کی تو اس صورت میں اس کا کمال کیا ہوا بلکہ جو کچھ اس نے کیا اپنے نزدیک مامور بہ کو ادا کیا اور مامور بہ کو ادا کر کے اپنے کو صاحبِ کمال سمجھنا سخت حماقت ہے کیونکہ یہ کوئی کمال نہیں یہ تو ایک ضروری فعل تھا جس کو اس نے ادا کیا باقی دوسروں سے امتیاز اس لئے ہوگیا کہ اور لوگ اس مامور بہ میں کوتاہی کر رہے ہیں تو اگر ہوا تو ان میں نقص ہوا اس میں کیا کمال ہوا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص پانچ وقت کی نماز پڑھ کر اپنے کو صاحبِ کمال سمجھے کیونکہ اتفاق سے یہ ایسی جماعت میں جا پھنسا ہے جو پانچ کی جگہ صرف دو ہی وقت کی نماز پڑھتے ہیں، حالانکہ پانچ وقت کی نماز پڑھنا کوئی کمال نہیں یہ تو فی نفسہ ہر شخص پر ضروری ہے اگر اس سے کم کرے گا گنہگار رہوگا مگر امتیاز اس لئے ہوگیا کہ دوسرے لوگ اس واجب میں کوتاہی کر رہے ہیں اور صرف دو ہی وقت کی

نماز پڑھتے ہیں، تو اس سے کہا جائے گا کہ تمہارے اُس امتیاز کا منشا تمہارا کوئی کمال نہیں بلکہ دوسروں کا نقص اس کا سبب ہو گیا ہے اسی طرح اس مجاہدہ کرنیوالے کو سمجھنا چاہیئے کہ میری اس امتیاز کا منشا میرا کوئی کمال نہیں بلکہ دوسروں کا نقص اس کا سبب ہے تو اعتقاد کمال تو لغو ٹھیرا۔ رہا اوروں کے نقص کا اعتقاد تو وہ اس کے نزدیک نقص ہے یہ کہاں سے لازم آ گیا کہ واقع میں بھی نقص ہے اور جو امر واقع میں بھی نقص ہو ممکن ہے کہ کوئی دوسرا کمال اس کی تلافی کر دے۔ ایک خرابی اس معنی غلط کی یہ ہوئی کہ مجاہدہ کی یہ تفسیر سمجھنے کی وجہ سے ہر شخص اس کے لئے جلدی فارغ نہیں ہوتا بلکہ کوئی پنشن کے انتظار میں رہتا ہے، کوئی لڑکوں کی شادی سے فراغت کا منتظر ہے کہ بس ان کاموں سے فارغ ہو کر پھر دنیا سے الگ ہو جائیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک گھر کو تالا لگا دینا مجاہدہ ہے اسی لئے ایسے وقت کے منتظر رہتے ہیں جس میں گھر کو تالا لگا کر بیٹھنا آسان ہو۔ گویا یہ شخص مجاہدہ اس کو سمجھتا ہے کہ ایسا بن جائے جس کو حدیث میں خالی عن الخیر کہا گیا ہے۔

نفس کشی کا مفہوم

لا خیر فی من لا یالف و لا یئولف (مسند احمد۲: ۴۰۰، مجمع الزوائد۱: ۵۸) یعنی اس شخص میں خیر نہیں جو نہ دوسروں سے مانوس ہو نہ دوسرے اس سے مانوس ہوں۔ سو حدیث سے معلوم ہو گیا کہ جس کو آج کل مجاہدہ والا سمجھا جاتا ہے اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لا خیر فرماتے ہیں کہ اس میں کچھ خیر نہیں تو وہ کمال کہاں ہوا بلکہ نقص ہوا۔ ہاں کسی معالجہ کی ضرورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس لئے میں نے کہا تھا کہ مجاہدہ کے معنے اپنی طرف سے نہ گھڑے جائیں بلکہ انتظار کیا جائے اس کے معنے ابھی آتے ہیں اسی طرح نفس کشی کے لفظ سے اس کا ترجمہ کر کے اپنے ذہن میں کوئی حقیقت متعین نہ کریں کیونکہ نفس کشی یہ اصطلاحی لفظ ہے جو فارسی میں ترجمہ ہے مجاہدہ کا مولانا فرماتے ہیں۔

نفس نتواں کشت الاظل پیر دامن آں نفس کش راسخت گیر

(نفس کو بدون پیر کے نہیں مار سکتا اس نفس کش کا دامن مضبوط پکڑ لو)۔

اس شعر سے میرا مقصود حصول مجاہدہ کا طریقہ بتلانا نہیں ہے کیونکہ اس کو تو میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ اس وقت صرف یہ بتلانا ہے کہ نفس کشی اصطلاحی لفظ ہے جو صوفیہ کے کلام میں مجاہدہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر شیخ کو نفس کش کہا جاتا ہے کہ وہ مجاہدہ کا طریقہ بتلاتا ہے اور عنقریب میں اس کی حقیقت بتلا دوں گا اسی تفسیر سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ مجاہدہ کی ضرورت

سب کو ہے اور ہر وقت ہے یعنی اس کی ضرورت عام بھی ہے اور دائمی بھی ہے اور یہاں سے یعنی ضرورت مجاہدہ کے دوام سے بعض سالکین کی غلطی معلوم ہوگئی جو اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ چند روز مجاہدہ حسب قاعدہ طریق کر کے پھر اپنے کو فارغ سمجھ لیتے ہیں اور آئندہ کو مجاہدہ سے بے فکر ہو جاتے ہیں جس کی ابتداء انہماک فی المباحات (مباح چیزوں میں منہمک ہونا) سے ہوتی ہے کہ اول وہ مباحات میں زیادہ مشغول ہوتے ہیں پھر رفتہ رفتہ مکروہات میں انہماک ہونے لگتا ہے پھر محرمات کا ارتکاب بھی ہونے لگتا ہے اور چونکہ اس شخص کو ایک وقت تک حق تعالیٰ سے تعلق خاص رہ چکا ہے جو پہلے مجاہدہ کا اثر تھا تو اب اس کی یہ حالت زیادہ بُری ہوتی ہے۔ اس میں نکس (مردودیت) کا اندیشہ ہے اور اس کی ایسی مثال ہو جاتی ہے جیسے کوئی عاشق مزاج شناس ہو کر محبوب کو ستانے لگے جو شخص مزاج شناس ہی نہیں ہوا اس کی حرکات اس درجہ موجب عتاب نہیں ہوتیں جیسے مزاج شناس کی حرکات موجب عتاب ہوتی ہیں پس عارف جب مکروہات کا ارتکاب کرتا ہے اس پر غیر عارف سے زیادہ قہر وغضب ہوتا ہے اور یہی نکس (مردودیت) ہے اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنۡہُ (اللہ ہم کو اس سے پناہ میں رکھے)۔

مجاہدہ کی ضرورت دائمی ہے

اس لئے سالکین کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ مجاہدہ کی ضرورت دائمی ہے یہ چند روز کا کام نہیں بلکہ عمر بھر کا کام ہے۔ دیکھئے جس طرح بیماری میں دوا اور پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے بیماری سے صحت کے بعد بھی تو پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ صحت کے بعد زیادہ پرہیز کی ضرورت ہے کیونکہ بیماری میں تو معدہ خراب ہوتا ہے، منہ کا مزا بدلا ہوا ہوتا ہے اس لئے مریض کو انواع واقسام غذا کی خواہش خود بھی بہت کم ہوتی ہے اور اگر اس نے بد پرہیزی کی بھی تو بہت جلد ضرر کا احساس ہو جاتا ہے اور صحت کے بعد معدہ میں گونہ قوت آ جاتی ہے بد پرہیزی سے معاً ضرر کا احساس نہیں ہوتا نیز اشتہاء بھی ہر چیز کی ہوتی ہے تو اس وقت سنبھال کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ بعض دفعہ صحت کے بعد بھی پھر مرض کا عود ہو جاتا ہے۔

مجاہدہ کی زیادہ ضرورت کب ہے

اور اطباء نے لکھا ہے کہ عودِ مرض ابتداء مرض سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اسی طرح عارفین نے فرمایا ہے کہ ابتدائی مجاہدہ کے بعد جب نفس اصلاح پذیر ہو جائے تو اس وقت مجاہدہ کی پہلے سے زیادہ

ضرورت ہے کیونکہ ابتداءِ مجاہدہ میں تو بد پرہیزی کے ضرر کا احساس جلد ہو جاتا ہے نیز اس وقت چونکہ قوائے نفسانیہ میں قوت ہوتی ہے اس لئے نفسانی خواہش کا تقاضا شدت کے ساتھ ہوتا ہے تو نفسانی خواہش پر تنبہ بھی جلد ہو جاتا ہے اور مجاہدہ سے فارغ ہونے کے بعد چونکہ تقاضائے نفس کمزور ہو جاتا ہے اس لئے ہوائے نفس کا احساس دیر میں ہوتا ہے۔ مثلاً پہلے تو یہ حالت تھی کہ جہاں غیر محرم پر نظر پڑی فوراً احساس ہو گیا کہ اس نظر میں ہوائے نفس ملی ہوئی ہے اس لئے فوراً متنبہ ہو جاتا تھا اور مجاہدہ سے فارغ ہو کر جب غیر محرم پر نظر پڑتی ہے تو فوراً احساس نہیں ہوتا کہ اس میں ہوائے نفس ملی ہوئی ہے کیونکہ اس وقت تقاضائے نفس کمزور ہے۔ اب اس کو سوءِ نظر میں وہ ہیجان نہیں ہوتا جو پہلے ہوتا تھا اس لئے سالک اس غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس نظر میں ہوائے نفس نہیں ہے پھر وہ اس سے اجتناب (بچنا) کی کوشش بھی نہیں کرتا حتیٰ کہ چند روز میں وہ سوءِ نظر کا عادی ہو جاتا ہے، نیز ابتدا میں اس کے ضرر کا احساس جلدی ہو جاتا تھا کیونکہ قلب میں کیفیات کا رسوخ نہیں ہوا تھا ذرا سی بے اعتدالی سے کیفیت قلبی میں تغیر محسوس ہوتا تھا مجاہدہ کے بعد چونکہ کیفیات قلبیہ میں رسوخ ہو چکا ہے تو اب بعض اوقات کسی بد پرہیزی اور بے اعتدالی سے ضرر کا احساس جلدی نہیں ہوتا جس سے سالک اس غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس فعل میں ہوائے نفس کو کچھ دخل نہیں ہے ورنہ میری قلبی کیفیت میں ضرور فرق ہوتا پھر وہ اس کو غیر مضر سمجھ کر اس سے بچنے کی کوشش نہیں کرتا اور نفس کو ڈھیل دے دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفس اس فعل حرام کا عادی ہو جاتا ہے اور اب کسی وقت سالک کو اس کے ضرر کا احساس بھی ہو جائے تو وہ بعض اوقات نفس کے روکنے پر قادر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ابتدائے مجاہدہ میں جس طرح تقاضائے نفس شدید تھا ویسے ہی نفس میں قوت کف (رکنا) بھی زیادہ تھی اور مجاہدہ کے بعد جس طرح تقاضائے نفس کمزور ہو گیا ہے اسی طرح بعض مجاہدات سے قوت کف بھی کمزور ہو جاتی ہے کیونکہ مجاہدہ اولیٰ سے تمام قویٰ میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ اب آپ کی سمجھ میں آیا کہ فراغ من المجاهده (مجاہدہ سے فارغ ہونا) کے بعد مجاہدہ کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے کیونکہ اس وقت ہوائے نفس کا احساس دیر میں ہوتا ہے اس لئے استرسال (ڈھیل) ہوتا رہتا ہے اور استرسال کے بعد جب ہوائے نفس کا احساس ہوتا ہے تو بعض دفعہ نفس کو روکنے پر قدرت نہیں پاتا کیونکہ اس شخص کی قوت کف کمزور ہو چکی ہے۔

شہوتِ شیخ شباب سے اشد ہے

اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ شہوت شیخ (بوڑھا) شہوت شباب سے اشد ہے کیونکہ جوان

نفس زندہ ہے اس کو شہوت کا احساس بھی جلد ہوتا ہے اور احساس کے بعد اس میں قوت کف بھی زیادہ ہے وہ اپنے نفس کو جلد ہوائے نفسانی سے روک سکتا ہے اور شیخ کا نفس چونکہ مر چکا ہے اس لئے اس کو ہوائے نفس کا احساس جلد نہیں ہوتا بلکہ بہت دیر میں ہوتا ہے تو اس حالت میں استرسال نفس (ڈھیل دنیا) زیادہ ہوتا ہے، پھر اس ڈھیل کے بعد شیخ کو ہوائے نفس کا جس وقت احساس ہوتا ہے تو اب وہ ضبط پر قادر نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس طرح اس کی قوت شہوت کمزور ہے اسی طرح قوت ضبط بھی کمزور ہے۔ اب وہ لاکھ کوشش کرے کہ کسی طرح نفس کو سوء نظر سے روکوں مگر قدرت نہیں ہوتی۔

اور جوان کی جس طرح شہوت کامل اور زندہ ہے اسی طرح اس کی قوت ضبط بھی کامل اور زندہ ہے اسی لئے جوان کو بوڑھے سے زیادہ عفت پر قدرت ہے اور اس کی عفت شیخ کی عفت سے کامل بھی ہوتی ہے کیونکہ نہ اس کو زیادہ استرسال ہوتا ہے اور نہ استرسال کے بعد ضبط دشوار ہوتا ہے۔

پس بڈھوں کو مجاہدہ سے بے فکر نہ ہونا چاہیئے ان کو جوانوں سے زیادہ پرہیز کی ضرورت ہے یہ مضمون حق تعالیٰ نے بدون اعانت کتب کے قلب میں ڈالا تھا اور بحمد اللہ علم عظیم عطا ہوا جس کی قدر وہی لوگ کریں گے جن کو اس کا تجربہ ہوا ہوا ایک بار میں نے یہ مضمون سہارنپور میں بیان کیا تھا، اس وقت ایک بوڑھے میاں وعظ میں موجود تھے۔ وہ اس کو سن کر بہت ہی روئے اس وقت ان کے سامنے اپنے استرسال نفس کا نقشہ کھنچ گیا تھا اور وہ سمجھ گئے کہ میں بہت بڑی غلطی میں مبتلا تھا کہ اپنے کو مجاہدہ سے مستغنی سمجھتا تھا۔ اور اس مرض میں اکثر بوڑھے مبتلا ہیں یہ لوگ اپنے کو مجاہدہ سے مستغنی سمجھتے ہیں حالانکہ بوڑھاپے میں صرف جسم کمزور ہوتا ہے نفس کمزور نہیں ہوتا۔ بوڑھا کچھ کر تو نہیں سکتا مگر لالچ اور حرص اس کو جوانوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

بوڑھوں کو بھی ضرورت مجاہدہ

حدیث میں ہے یَشِیْبُ ابْنُ آدَمَ وَیَشِیْبُ فِیْهِ خَصْلَتَانِ اَلْحِرْصُ وَطُوْلُ الْاَمَلِ (میزان الاعتدال:۸۶۹۱) یعنی انسان بوڑھا ہو جاتا ہے مگر وہ خصلتیں اس میں جوان ہوتی ہیں حرص اور طول امل اس لئے بوڑھوں کو اصلاح نفس کی جوانوں سے زیادہ ضرورت ہے یہ مضمون تو ضمناً آ گیا تھا، میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجاہدہ کے بعد بھی مجاہدہ کی ضرورت رہتی ہے، پس سالکین کان کھول کر سن لیں کہ مجاہدہ کی ضرورت چندروز نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت دائمی ہے چندروزہ مجاہدہ کے بعد اگر تم نے بد پرہیزی شروع کی تو یاد رکھو اس کے بعد عود مرض اس شدت کے ساتھ ہوگا کہ ہلاکت کے قریب پہنچا دے گا پھر بہت کم ہیں جو اس درطہ (حیرت، تعجب) سے نجات پائیں اسی لئے مولانا فرماتے ہیں۔

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تادم آخر دم فارغ مباش

تا دم آخر دم آخر بود　　کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(یعنی تم کو چاہیئے کہ اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ خراش تراش کرتے رہو اور آخری وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت ہو کیونکہ آخری وقت تک کوئی گھڑی ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراہ اور رفیق بن جائے گی یعنی اگر طلب میں لگے رہو گے تو کسی وقت ضرور وصول الی اللہ ہو جائے گا)۔

یعنی اخیر دم تک اس راہ میں تراش وخراش ہی رہنی چاہیئے بس جب سلامتی کے ساتھ موت آجائے گی اس وقت مجاہدہ سے فراغت نصیب ہوگی اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ جب مجاہدہ کے بعد بھی مجاہدہ کی ضرورت ہے تو پھر صاحب مجاہدہ وغیر صاحب مجاہدہ میں کیا فرق ہوا۔ اس کا جواب اوپر کی تقریر میں آچکا ہے یعنی دونوں میں وہی فرق ہے جو بیمار کے پرہیز میں اور بیماری سے صحت پانے والے کے پرہیز میں فرق ہوتا ہے کہ پرہیز کی ضرورت بیمار کو بھی ہے اور صحت پانے والے کو بھی مگر ظاہر ہے کہ بیمار کو سخت ضرورت ہے اور اس کا پرہیز بھی سخت ہوتا ہے اور صحت پانے کے بعد گو قدرے پرہیز کی ضرورت رہتی ہے مگر اب اتنا سخت پرہیز نہیں ہوتا جتنا بیماری کی حالت میں تھا تو کیا یہ فرق تھوڑا ہے کہ غیر صاحب مجاہدہ بیمار ہے اور صاحب مجاہدہ تندرست ہے بیمار ہر وقت خطرہ میں ہے اور تندرست خطرہ سے نکل چکا ہے۔ البتہ تندرستی کے بعد جس طرح حکیم کہہ دیا کرتا ہے کہ اب تم کو ہر چیز سے تو پرہیز کی ضرورت نہیں صرف فلاں فلاں اشیاء سے پرہیز رکھنا کیونکہ وہ تمہاری طبیعت کے خلاف ہیں۔ اسی طرح صاحب مجاہدہ کو یہاں کہا جاتا ہے کہ تم کو بالکل بے فکر نہ ہونا چاہیئے بلکہ تھوڑا بہت پرہیز اب بھی کرنا چاہیئے جو کچھ دشوار نہیں ہے بلکہ معمولی اور سہل ہے۔

ہر عمل کا ظاہر اور باطن

دوسرا مضمون قربانی کے متعلق ہے اور اس کو مجاہدہ سے خاص تعلق ہے کیونکہ جملہ اعمال میں دو چیزیں ہیں ایک روح عمل، دوسری صورت عمل بعبارت دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ ہر عمل میں ایک باطن ہے اور ایک ظاہر ہے۔ اب سمجھو کہ قربانی میں بھی ایک روح یعنی باطن ہے ایک صورت یعنی ظاہر ہے صورت قربانی اراقۃ دم (خون بہانا) ہے اور باطن قربانی مجاہدہ اور نفس کشی ہے۔ مگر یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ باطن کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ باطن جو ظاہر کے ساتھ مقید ہے یہ باطن بدون ظاہر کے معتبر نہیں دوسرا وہ باطن ہے جو ظاہر کے ساتھ مقید نہیں بلکہ اس کے لئے لازم

ہے اس باطن کا تحقق بدون ظاہر خاص کے بھی ہوسکتا ہے کیونکہ لازم کبھی عام ہوتا ہے تو وہ ملزوم کے بغیر متحقق ہوسکتا ہے اور باطن قسم اول کا تحقق بدون اس کے ظاہر کے نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ ظاہر کے ساتھ مقید ہوتا ہے یہاں سے ملاحدہ کا اشکال مندفع ہوگیا جو ظاہر کو مطلقاً لغو اور فضول قرار دے کر ہر عمل میں صرف باطل پر اکتفا کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جب ہر عمل میں ایک روح ہے اور ایک صورت ہے اور روح ہی مقصود ہے تو اس صورت کا مقصود نہ ہونا لازم آگیا۔

ہر عمل میں روح مع الصورت مقصود ہے

مگر یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ روح کے مقصود ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ صورت ہمیشہ غیر مقصود ہوا کرے بلکہ بعض دفعہ روح مع الصورت مقصود ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ انسان میں ایک روح ہے اور ایک اس کی صورت یعنی جسم ہے روح کا مقصود ہونا تو ظاہر ہے چنانچہ کسی کا بیٹا مر جائے تو موت کے بعد گو جسم ہمارے سامنے موجود رہتا ہے مگر روح کے فقدان سے مقصود فوت ہو جاتا ہے اب اس جسم کے بقا سے کچھ تسلی نہیں ہوتی بلکہ اس کو اپنے ہاتھوں زمین میں دفن کر کے اپنے سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ اس سے تو روح کا مقصود ہونا معلوم ہوا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جسم بالکل مقصود نہ ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ روح اس قید کے ساتھ مقصود ہے کہ اس کا اتصال نہ ہو تو اس صورت میں بقاء روح سے کچھ خوشی اور تسلی نہیں ہوسکتی چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی روح کو دوسرے جسم میں منتقل کر دے اور یہ بات مشق سے حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ روح کا بدن کے ساتھ محض تدبیر و تصرف کا تعلق ہے اور حقیقت میں وہ جسم سے منفعل ہے جو لوگ خاص تصرفات کے عادی ہیں ان کو روح کا جسم سے انفعال محسوس ہوتا ہے یہاں تک کہ مشق کر کے بعض دفعہ ایسا شخص اپنی روح کو حقیقۃً اپنے جسم سے منفصل کر دیتا ہے اور دوسرے جسم میں منتقل کر دیتا ہے اور اس کے باپ کو معلوم ہو جائے کہ اس کتے یا بندر میں میرے بیٹے کی روح ہے تو کیا وہ اس وقت بھی اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرے گا جو جسم اصلی کے اتصال (متصل ہونا۔ ملنا) کے وقت کرتا تھا ہر گز نہیں بلکہ اب تو وہ اس کو اپنا بیٹا کہنا بھی گوارا نہ کرے گا نہ اس کو شفقت و محبت سے پیار کرے گا نہ اس کو اپنے ساتھ بٹھلا کر کھلانا پلانا گوارا کرے گا اور اگر کسی کو اسی طرح سے نقل روح میں تردد ہو اور یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی ہو تو وہ یوں سمجھے کہ۔

مسخ شدہ قوم تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہتی

جس وقت بنی اسرائیل میں سے ایک جماعت کو مسخ کیا گیا ہے جن میں بعضے بندر بن گئے

تھے اور بعض سور ہو گئے تھے اور تین دن تک وہ اسی صورت میں رہے اور یہ جو مشہور ہے کہ اس وقت جتنے بندر اور سور ہیں سب انہی کی نسل میں ہیں یہ غلط ہے کیونکہ مسلم شریف کی صحیح حدیث میں ہے کہ وہ لوگ تین دن کے بعد ہلاک ہو گئے تھے کوئی مسخ شدہ قوم تین دن کے بعد زندہ نہیں رہی اور نہ ان سے کوئی نسل چلی ہے بلکہ اس وقت کے بندر اور سور ان بندورں اور سوروں کی نسل سے ہیں جو بنی اسرائیل کے مسخ سے پہلے موجود تھے کیونکہ ان حیوانات کا وجود پہلے بھی تھا۔

بہر حال حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مسخ کے بعد تین دن تک وہ لوگ زندہ رہے تو اب بتلایئے کہ اس مدت میں روح تو یقیناً وہی تھی جو تین دن پہلے قالب انسان میں تھی مگر اس وقت وہ بندر یا سور کے قالب میں تھی اور یقیناً ان میں بعض صاحب اولاد بھی تھے اہل وعیال بھی رکھتے تھے بعضوں کے باپ دادا بھی زندہ ہوں گے تو کیا کوئی شخص ان کے مسخ ہونے کے بعد روح کے باقی رہنے کو کافی سمجھ سکتا تھا اور کیا کسی کو یہ خوشی ہوسکتی تھی کہ میرا بیٹا زندہ تو ہے گو بندر اور سور کے قالب میں ہے یا ان کی اولاد اور بیبیاں اس صورت میں اپنے باپ یا شوہر کے زندہ رہنے سے خوش ہو سکتے تھے کہ خیر روح تو موجود ہے گو جسم کیسا ہی ہو ہر گز نہیں بلکہ یقیناً مسخ ہونے کے ساتھ ہی ان میں رونا پیٹنا پڑ گیا ہوگا اور وہ اسی وقت سے ان کو مثل مردہ کے سمجھ چکے ہوں گے ہر گز کسی کو بھی انہیں اپنا باپ یا بیٹا یا شوہر کہنا گوارا نہ ہوا ہوگا (اور اگر کسی کو یہ تردد ہو کہ واقعہ مدت دراز کا ہے نہ معلوم اس وقت کے آدمیوں نے ان بندروں اور سوروں کے ساتھ کیسا معاملہ کیا ہوگا شاید ان لوگوں نے بقاء روح کی وجہ سے ان کے ساتھ آدمیوں ہی کا سا معاملہ کیا ہو تو میں ان ملحدین سے پوچھتا ہوں کہ تم ایمان سے کہو کیا تم کو اپنی اولاد اور بیوی بچوں کا بندر اور سور ہو جانا گوارا ہے اور کیا تم بقاء روح کی وجہ سے جو کہ تمہارے نزدیک اصل مقصود ہے اس وقت بھی ان کے ساتھ وہی برتاؤ کرو گے جو صورت انسانی میں کرتے تھے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کو کوئی انسان ہر گز گوارا نہ کرے گا۔ پھر آخر اس ناگواری کی وجہ کیا ہے جب تمہارے نزدیک محض روح مقصود ہے اور صورت محض لغو وفضول ہے تو یہاں تم اس قاعدہ پر کیوں نہیں چلتے اور اپنا اور اپنے اہل وعیال کا سور بندر بن جانا تمہیں کیوں ناگوار ہے۔ آخر روح تو جب بھی موجود رہے گی ۱۲ جامع)۔

روح مع الصورت کی عجیب مثال

پھر حیرت ہے مجھے ان ملحدین کی عقل پر کہ انہوں نے اعمال شرعیہ میں مطلقاً روح کو کیونکر کافی سمجھا اور ظاہر کو مطلقاً کیسے فضول قرار دے دیا حالانکہ امور دنیوی میں وہ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کی صورت

کو بیکار نہیں سمجھتے بلکہ روح کے ساتھ صورت کو بھی مقصود سمجھتے ہیں، دیکھئے گناہ چوسنا مقصود ہے مگر اس قید کے ساتھ کہ اس کو منہ میں دیا یا جائے اور پوری پوری کا رس تدریجاً چوسا جائے حالانکہ گنے میں ایک ظاہر ہے ایک باطن، باطن تو وہ مٹھاس ہے جو اس کے اندر ہے اور ظاہر وہ جسم ہے جس کو پوری پوری کر کے چوسا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنے نوکر یا دوست سے کہے کہ میں سہارنپور کا گنا چوسنا چاہتا ہوں اور وہ اس کے سامنے سہارنپور ہی کے گنے کی شکر لا کر رکھ دے کہ اس کو پھانک لیجئے یہ اسی گنے کی روح ہے جسے آپ چوسنا چاہتے ہیں تو کیا وہ اس کو کافی سمجھے گا اور شکر پھانک لینے کو گنا چوسنے کا قائم مقام سمجھے گا، ہرگز نہیں بلکہ یہ کہے گا کہ مجھے گنا چوسنا اس کی خاص صورت کے ساتھ مطلوب ہے شکر کا پھانکنا اس مقصود کے قائم مقام نہیں ہوسکتا جو لطف گنے کے چوسنے میں ہے وہ گڑ کھانے اور شکر پھانکنے میں کہاں ہے۔ پھر حیرت ہے کہ یہاں تو صورت بھی باطن کے ساتھ مطلوب ہو اور اعمال شرعیہ میں صورت مطلوب نہ ہو پس ملحدین کا یہ کہنا کہ نماز کی روح ذکر اللہ ہے بس قلب میں ذکر اللہ کا ہونا کافی ہے صورت صلوٰۃ کی کچھ ضرورت نہیں اور روزہ کی روح شہوت نفسانی کا توڑنا ہے اگر کسی اور طریقہ سے شہوت نفس شکستہ ہو جائے تو روزہ کا مقصود حاصل ہو گیا صورت صوم کی کچھ ضرورت نہیں، زکوٰۃ سے مقصود نفس کو صفت بخل سے پاک کرنا ہے۔ اگر کسی میں طبعی طور پر بخل نہ ہو تو اس کو صورت زکوٰۃ کی ضرورت نہیں یا حج سے مقصود عشق کا حال پیدا کرنا ہے اگر کسی اور طریقہ سے یہ حال پیدا ہو جائے تو پھر حج فرض نہیں یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ہم کہیں گے کہ ان اعمال کی جو تم نے روح بیان کی ہے وہ صورت کے ساتھ مقید ہے اور ان میں روح مع الصورت مطلوب ہے مجرد روح بلا صورت معتبر نہیں (جیسا کہ کھانے کی روح تو بھوک کا دفع کرنا اور پیٹ بھرنا ہے مگر اس کے ساتھ روٹی اور سالن کی صورت بھی مطلوب ہوتی ہے اگر صورت مطلوب نہیں تو پھر ان ملحدین کو گیہوں چبانا اور آٹا پھانک لینا چاہیئے کیونکہ روح اکل تو اس میں بھی موجود ہے ۱۲)۔

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحؒ کا ارشاد

غرض ثابت ہو گیا کہ بعض دفعہ روح مع الصورت مطلوب ہوا کرتی ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک شخص نے نماز کے متعلق کہا کہ اس اٹھک بیٹھک سے کیا ہوتا ہے مقصود تو اور ہی کچھ ہے حاجی صاحب نے فرمایا کہ اسی میں کچھ ہے اور اس کے بغیر تمہارے مراقبے اور مجاہدے سب فضول ہیں اور یہ باطن کی پہلی قسم ہے جو ظاہر کے ساتھ مقید ہے یہ باطن بدون ظاہر کے معتبر نہیں اور ایک باطن ان اعمال میں قسم دوم کا ہے مثلاً نماز کے لئے مطلق ذکر جو دوسرے مادہ میں بھی متحقق ہوتا ہے

اور روزہ کے لئے مطلق کسر شہوت جو دوسرے مادہ میں بھی متحقق ہوتا ہے اور میں نے باطن کے متعلق یہ تفصیل اور تقسیم اس لئے بیان کر دی تا کہ کسی کو اضحیۃ کے متعلق میرے اس قول سے کہ اس کا ایک ظاہر ہے ایک باطن ہے یہ وہم نہ پیدا ہو کہ یہ تو وہی بات ہے جو ملحدین کہا کرتے ہیں اس تفصیل سے ان شاء اللہ یہ وہم رفع ہو گیا ہوگا کیونکہ میں نے بتلا دیا کہ میرے نزدیک باطن کی ایک قسم وہ بھی ہے جو ظاہر کے ساتھ مقید ہے اور ملحدین کے نزدیک کوئی قسم ایسی نہیں یہ فرق ہے ان میں اور صوفیہ میں۔

قربانی کی صورت اور حقیقت

اب سنئے کہ اسی طرح قربانی میں ایک تو صورت ہے یعنی راقات دم (خون بہانا) یہ قربانی کی صورت ہے گوشت خیرات کرنے کا نام قربانی نہیں گوشت تو چاہے تم سارا کھا لو ذرا سا بھی خیرات نہ کرو تو قربانی میں کچھ نقصان نہیں آتا۔ بس قربانی تو خون بہانے کا نام ہے اور یہ اس کا ظاہر ہے۔ اور ایک اس کی روح اور باطن ہے وہ مجاہدہ و نفس کشی ہے کیونکہ یہ شخص مال خرچ کر کے جانور کو خریدتا ہے اور نفس کو اپنی چیز کا ہلاک کرنا گراں ہے تو یہ اپنے نفس کے داعیہ کو دباتا ہے اور اس کے محبوب کو فنا کر کے اس پر زخم لگاتا ہے یہی مجاہدہ ہے اور اس درجہ کا نام اصطلاح میں فناء ہے اس کے آگے ایک اور درجہ ہے وہ یہ کہ قربانی سے مقصود رضائے حق ہے یہ شخص اپنے مال کو فنا کر کے رضائے حق کا طالب ہے ثواب کا قصد کرتا ہے اس کا نام اصطلاح میں بقاء ہے کیونکہ مال خرچ کرنے سے نفس میں جو اضمحلال ہوا اور زخم لگا تھا وہ حصول ثواب اور تصور رضائے حق سے مندمل ہو جاتا ہے۔ قربانی کرتے ہوئے جو قلب کو صدمہ اور کلفت ہوئی تھی وہ اب مبدل بعد راحت ہو جاتی ہے۔ پس یہ حالت اس حالت کے مقابلہ میں بقاء کے مشابہ ہے پس معلوم ہوا کہ قربانی کی روح فنا و بقاء ہے مگر یہ فنا و بقاء جو کہ باطن ہے اضحیہ کا یہ بھی دو قسم ہے ایک وہ جو مخصوص ہے۔ قربانی کے ساتھ دوسرا مطلق فناء و بقاء جو دوسرے مواد میں بھی متحقق اور ہر عمل میں مطلوب ہے میں نے اوپر اسی کو مجاہدہ کہا ہے اور جس مجاہدہ کا مجھ کو یہاں بیان کرنا مقصود ہے وہ قسم دوم ہے اس کی یعنی مطلق مجاہدہ جس کا تعلق ہر عمل سے عام ہے اور قربانی کے ساتھ اوروں سے زیادہ اس لئے قربانی کی مناسبت محرک ہوئی بیان مجاہدہ کی اب یہ سمجھئے کہ اس فنا و بقاء میں جس کی مختصر تعبیر مجاہدہ سے کی گئی ہے اصل مقصود و بقا ہے اور فنا اس کے لئے ذریعہ ہے اس بنا پر کہا جائے گا کہ باطن اضحیہ حیوٰۃ نفس ہے مگر حیوٰۃ سے وہ حیوٰۃ طیبہ مراد ہے جو فناء نفس کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یعنی بقاء جس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

حیوٰۃ طیّبہ سے مراد حیات ناسوتی نہیں

مَنْ عَمِلَ صَالِحًامِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ'' فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (جو شخص

نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو پس ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے)۔
وہ حیوٰۃ ناسوتی مراد نہیں جو فناء سے پہلے ہوتی ہے کیونکہ حیات ناسوتی ہر شخص کی طیبہ نہیں ہوتی بلکہ بعض کی حیات معیشت ضنک (یعنی تنگ زندگی) ہوتی ہے چنانچہ ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے گھر خیریت ہے تو وہ بہت خفا ہوا اور کہا تم مجھے کوستے ہو خیریت ہوگی تمہارے یہاں کہ نہ کچھ آگے کو نہ پیچھے کو ہمارے یہاں خیریت کیوں ہوتی کہ ماشاء اللہ بیٹوں، پوتوں، بہو بیٹیوں سے گھر بھرا ہوا ہے آج کسی کے سر میں درد ہے، کسی کے پیٹ میں درد ہے، کسی کو بخار آتا ہے، کسی کو دست آرہے ہیں، کسی کے چوٹ لگی گئی ہے تو ہمارے یہاں جب اتنا کنبہ ہے وہاں خیریت کیوں ہونے لگی خیریت تم جیسے کے یہاں جس کے اولاد نہ بنیاد سارے گھر میں اکیلے پڑے رہتے ہیں۔ واقعی دنیا داروں کو چین کہاں مگر وہ ان تعلقات میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ ان کا مذاق بھی بدل جاتا ہے وہ ان تعلقات کو جو حقیقت میں عذاب ہیں راحت سمجھتے ہیں اور راحت کو کلفت۔ چنانچہ اس شخص نے خیریت کے سوال کو کوسنا سمجھا اور صاف کہہ دیا کہ ہمارے یہاں اللہ نہ کرے جو خیریت ہو، خیریت تمہارے یہاں ہوگی۔ اہل دنیا قیود و علائق میں خود پھنستے جاتے ہیں جس کے ساتھ خدا نے کوئی بھی قید اور تعلق نہ لگایا ہو وہ خود اپنے سر ہزار جھگڑے باندھ لیتا ہے، وہی حال ہے ان کا غم نداری بز بخر (غم نہ رکھے تو بکری خرید) مگر اس وقت تو بوجہ مذاق بدل جانے کے ان کو ان تعلقات و قیود کی کلفت کا زیادہ احساس نہیں ہوتا گو حقیقت اب بھی معلوم ہے ایسا بے حس کوئی نہیں ہوسکتا جس کو کلفت ہونا بھی معلوم نہ ہو مگر چونکہ زیادت انہاک سے اب ان کی عادت ہوگئی ہے اس لئے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا (جیسے کسی شخص کے دو تین سال تک کھجلی رہے تو عادت کی وجہ سے اس کو کلفت کا احساس اتنا نہیں ہوتا جتنا ابتداء میں تھا اب اسے ہر وقت کھجلانے ہی میں مزا آتا ہے مگر حقیقت تو اسے بھی ضرور معلوم ہے ۱۲ جامع)۔

علائق دنیا کی عبرت انگیز مثال

مگر جب اہل دنیا مرنے لگتے ہیں اس وقت حقائق پوری طرح منکشف ہوتی ہیں اور ان کا عذاب ہونا معلوم ہوجاتا ہے اس وقت تو وہ ان تعلقات سے خوش نظر آتے ہیں اور آزاد لوگوں پر ہنستے ہیں مگر جب پردہ اٹھے گا اس وقت معلوم ہوگا کہ جن تعلقات سے ہم نے دل لگایا تھا وہ مار آستین تھے۔ بس وہی قصہ ہوگا کہ باکہ باختہ عشق در شب دیجور (کس کے ساتھ محبت میں مشغول ہوا اندھیری رات میں)

کوئی شخص اندھیری رات میں کسی عورت سے مشغول ہوا اس وقت تو وہ یہ سمجھ کر خوش ہوتا رہا کہ میں حسین پری پیکر کو بغل میں لئے ہوئے ہوں مگر جب صبح ہوئی اس وقت معلوم ہوا کہ ساری رات ایک بڑھیا چڑیل کے ساتھ مشغول رہا تھا اب اس کی حسرت قابل دید ہے کہ وہ اپنے اوپر ہزار نفرین کرتا ہے اور رات کے قصہ کو یاد کر کے اسے خود قے آتی ہے۔ خوب کہا ہے ۔

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَاانْکَشَفَ الْغُبَارُ   اَفَرَس تَحْتَ رِجْلِکَ اَمْ حِمَارُ

(غبار ہٹ جانے دو تم کو عنقریب پتہ چل جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر)

ایک شخص آندھی غبار میں گدھے پر سوار ہے اور کہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوں دوسرا شخص متنبہ کرتا ہے کہ کم بخت تو گھوڑے پر سوار نہیں بلکہ گدھے پر سوار ہے مگر وہ ایک نہیں سنتا اور ناصح کو بے وقوف بتلاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اچھا بھائی تو یہی سمجھتا رہ ابھی غبار کھلنے پر تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیری ران کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا۔

اسی طرح جو لوگ تعلقات دنیا میں پھنس کر خوش ہیں اور ان کو راحت سمجھتے ہیں ان سے عارفین یہی کہتے ہیں فَسَوْفَ تَرٰی اِذَاانْکَشَفَ الْغُبَارُ (غبار ہٹ جانے دو عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا) حق تعالیٰ اہل دنیا کے ان ہی تعلقات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔

عذابِ دنیا

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ

یعنی اے مخاطب تجھے ان منافقین کے اموال و اولاد (اولاد دنیوی ترقی وعروج ۱۲) اچھے نہ معلوم ہونے چاہئیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو عذاب دیں (اور ان کی جان کفر کی حالت میں نکل جائے) واقعی اہلِ دنیا کے لئے تو مال و اولاد عذاب ہی ہے کیونکہ ان کو ان چیزوں سے تعلق اس قدر ہوتا ہے کہ مارے فکر کے رات دن نیند نہیں آتی ہر وقت اسی توڑ جوڑ میں لگے رہتے ہیں کہ آج اتنے روپے ہیں کل کو اتنے ہو جائیں گے۔ فلاں پر اتنا قرض ہے اس کا اتنا سود آئے گا۔ رات کو سوتے ہیں تو روپیوں کے فکر سے بار بار آنکھ کھل جاتی ہے تو یہ خاک راحت ہے وبالِ جان ہے بعضوں کو اولاد سے ایسا ہی تعلق ہوتا ہے ان کے لئے کبھی زمین خریدتے ہیں کبھی باغ لگاتے ہیں کبھی جائیداد بڑھاتے ہیں جس میں سینکڑوں مقدمے کرنے پڑتے ہیں، وصول باقی کے لئے رات دن نالشیں ہوتی ہیں گرمی اور برسات میں مصیبت کے ساتھ سفر کرتے ہیں پھر ذرا کسی بچہ کا کان گرم ہو گیا تو بھاگے بھاگے پھرتے ہیں نہ کھانے کے نہ پینے کے نہ نماز کے نہ روزہ کے ہر وقت فکر میں گھلے

جاتے ہیں مسلمان کوتو خدا پر بھی نظر ہوتی ہے کافر تو ہر وقت بے چین رہتا ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ ہم اموال واولاد سے ان منافقین کو دنیا میں عذاب دینا چاہتے ہیں تو یہ کیا تھوڑا عذاب ہے اور یہ عذاب دنیا میں ہی ہوتا ہے آخرت کا عذاب الگ ہے پس اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّ بَهُمْ بِهَا (حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو عذاب دیں) میں دنیوی عذاب ہی مراد ہے آخرت کا عذاب مراد نہیں کیونکہ جس کا ذکر دوسرے جملہ میں ہے وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (اوران کی جان کفر ہی کی حالت میں نکل جائے) یعنی ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ لوگ ساری عمرانہی تعلقات میں گرفتار رہیں ان سے خلاصی نصیب نہ ہوحتیٰ کہ اس حالت میں ان کو موت آجائے اور کافر ہو کر مریں۔ تو کفر کی حالت میں مرنا یہ آخرت کا عذاب ہے اس لئے يُعَذِّبَهُمْ بِهَا (ان کے ذریعہ سے ان کو عذاب دیں) میں دنیوی عذاب مراد ہونا چاہیئے۔ ورنہ جملہ ثانیہ کو پہلے کی تاکید ماننا پڑے گا اور تاسیس تاکید سے اولیٰ ہے دوسرے اموال واولاد کا دنیا ہی میں وبال جان ہونا مشاہد ہے یہ بھی اس کو مقتضی ہے کہ اس عذاب کا بھی آیت میں ذکر ہو۔ تیسرے عذاب آخرت کا ذکر تو موت علی الکفر کے بعد ہونا مناسب ہے کیونکہ وہ موت کے بعد ہی ہوگا اور یہاں ذکر موت سے پہلے عذاب کا ذکر ہے تو ظاہر یہی ہے کہ اس سے دنیوی عذاب مراد ہے فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا (تم کو اچھے نہ معلوم ہوں ان کے اموال واولاد کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو دنیا میں عذاب دیں) آیت میں تو فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (دنیا کی زندگی میں) کی قید خود ہی مذکور ہے۔ میں نے خوامخواہ اتنی کوشش کی عذاب دنیوی کے مراد لینے میں یہاں تو تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اموال واولاد سے حیٰوۃ دنیا میں بھی ان کو عذاب دینا چاہتے ہیں مجھے فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کا لفظ یاد نہ رہا عجیب بات ہے حالانکہ بحمد اللہ میں حافظ بھی ہوں مگر خیر کچھ حرج نہیں اس تقریر سے یہ فائدہ ہوا کہ یہ مسئلہ نقلاً وعقلاً دونوں طرح ثابت ہو گیا اگر آیت میں فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (دنیا کی زندگی میں) کی قید نہ بھی ہوتی جب بھی دلائل سے یہاں عذاب دنیا کا مراد ہونا ثابت ہوتا تو اس جملہ کے بھول جانے میں بھی فائدہ ہی ہوا کہ حق تعالیٰ نے وہ دلائل قلب میں القاء فرمادیئے جن سے اس قید کی ضرورت وحکمت معلوم ہوگئی بہر حال نص سے ثابت ہو گیا کہ یہ تعلقات حقیقت میں عذاب ہیں گو فساد مذاق کی وجہ سے کسی کو اس کا احساس نہ ہو۔

اہلِ علائق دنیا کو مرتے وقت سخت تکلیف ہوتی ہے

علامہ غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اہل علائق کو مرتے وقت سخت تکلیف ہوتی ہے اور چونکہ مرنے

کے بعد بھی روح کو ان چیزوں سے تعلق رہتا ہے جن سے دنیا میں تعلق تھا بلکہ موت کے بعد بوجہ قوت ادراک کے یہ تعلق قوی ہو جاتا ہے تو مفارقت جسم کے بعد روح کو ان علائق کی مفارقت سے ایسی اذیت ہوتی ہے جیسے عذاب جہنم اس کا یہ مطلب نہیں کہ عذاب قبر اور عذاب جہنم کی حقیقت یہی اذیت روحانی ہے جیسا کہ فلاسفہ نے سمجھا ہے بلکہ علامہ غزالیؒ کا مطلب یہ ہے کہ عذاب قبر و عذاب جہنم کے علاوہ اہل علائق کو ان تعلقات کی مفارقت سے بھی سخت اذیت ہوتی ہے اور وہ اذیت عذاب جسمانی سے بدرجہا زائد ہے بلکہ اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ جس طرح نعیم جنت اعمال صالحہ وعلائق محمودہ کی صورت ہے اسی طرح عذاب قبر وعذاب جہنم اعمال سئیہ وعلائق مذمومہ کی صورت ہے لیکن اس سے عذاب جسمانی کی نفی لازم نہیں آتی اور جن لوگوں نے علامہ غزالیؒ کے کلام کا یہ مطلب سمجھا ہے وہ غلطی پر ہیں امام کا یہ مطلب ہرگز نہیں اور اہل اللہ چونکہ آزاد ہوتے ہیں اس لئے ان کی روح اس اذیت سے محفوظ ہے۔ اہل اللہ کو صرف ایک قید ہے یعنی فکر آخرت مگر یہ قید خود لذیذ ہے جس سے وہ خلاصی نہیں چاہتے وہ قید تو اس کا مصداق ہے ۔

اسیرش نخواہد رہائی زبند شکارش نجوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اس کا شکار کمند سے خلاصی نہیں چاہتا)۔

اور قدسی فرماتے ہیں ۔

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آب حیات ضاعف اللہ بہ کل زماں عطشی

(اور اس آب حیات سے میرا سیر ہونا مصلحت نہیں ہے اللہ تعالیٰ اسکی ہر زمانہ میں پیاس زیادہ کرے)۔

اور مولانا فرماتے ہیں ۔

گر و صد زنجیر آری بگسلم غیر زلفِ آں نگارِ مقبلم

(اگر محبوب کی زلف کی زنجیر کے سوا دو سو زنجیر بھی لاؤ تو میں ان کو توڑ ڈالوں گا)۔

اہل اللہ کو علائق دنیا میں انہماک نہیں ہوتا

اہل اللہ کو علائق دنیا میں انہماک نہیں ہوتا اور نہ ان کے قلب کو ان سے لگاؤ ہوتا ہے اگر ظاہر میں عارف علائق میں مشغول بھی ہو تو اس کا قلب ان سے فارغ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کا امتحان لینا چاہا، کیونکہ ان کے یہاں حشم وخدم اور ساز وسامان بہت کچھ تھا تو اس شخص نے خیال کیا کہ یہ تو بظاہر بہت ہی مشغول ہیں شاہی کارخانہ اور امیرانہ انتظام ہے دیکھو ان کا

باطن کیسا ہے تو اس نے ایک دن آ کر عرض کیا کہ حضرت میں حج کو جانا چاہتا ہوں اور دل چاہتا ہے کہ آپ کے ہمراہ چلوں، فرمایا بسم اللہ چلو اور یہ کہہ کر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اس شخص نے عرض کیا کہ حضرت آپ تو بہت ہی جلد تیار ہو گئے اس کارخانہ کا تو کچھ انتظام کر دیجئے۔ فرمایا یہ کارخانہ میرا تھوڑا ہی ہے حق تعالیٰ کا ہے وہ خود انتظام کر لیں گے میرے اوپر ان کا کام اٹکا ہوا نہیں ہے جب میں نہ ہوں گا وہ کسی دوسرے سے یہ کام لے لیں گے اب تو شاہ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں کہنے لگے کہ تھوڑا سا توقف فرمایئے میں ذرا گھر سے کمبل لے آؤں فرمایا بس اسی برتے پر امتحان لینے آئے تھے، میں نے تو اتنے بڑے کارخانہ پر بھی نظر نہ کی اور تم ایک کمبل سے بھی نظر قطع نہ کر سکے۔ تو بات یہ تھی کہ ان کے دل کو ایک کے سوا کسی سے تعلق نہ تھا اور اس ایک قید کے سوا ان کو کوئی قید نہ تھی اب لوگ اس قید سے تو آزادی چاہتے ہیں جو لذیذ ہے اور ان قیود کو خریدتے پھرتے ہیں جو مصیبت ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شدتِ نزع کا سبب

شاید یہاں کسی کو شبہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو جب دنیوی اسباب سے تعلق نہیں ہوتا تو چاہیئے ان سے مفارقت سہل ہو پھر ان کا نزع کیوں شدید ہوتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نزع میں بہت شدت ہوئی حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت نزع دیکھ کر میں کسی کی سہولت نزع دیکھ کر اس کی تمنا نہیں کرتی اسی طرح بعض اولیآ کو بھی نزع شدید ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے تو بات یہ ہے کہ شدید نزع کا سبب تو تعلقات ہی ہیں جس قدر روح کو ناسوت سے تعلق ہوگا۔ اسی قدر نزع میں شدت ہوگی۔ مگر تعلقات دو قسم پر ہیں ایک وہ جو مانع عن الآخرت ہیں جیسے جائیداد اور مال وغیرہ کی محبت ان سے جو شدت ہوتی ہے اس سے تکلیف سخت ہوتی ہے۔ دوسرے وہ تعلقات ہیں جو آخرت سے مانع نہیں ہیں بلکہ معین آخرت ہیں اور یہ وہی تعلقات ہیں جو اس کے مصداق میں داخل ہے ۔

اسیرش نہ خواہد خلاصی ز بند (اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا)

بعض اہل اللہ کی شدّتِ نزع کا موجب

اس کی تعین عنقریب آتی ہے ان سے بھی نزع میں شدت ہوتی ہے مگر اس سے روحانی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ شدت لذیذ ہوتی ہے کیونکہ اس کا منشا قید لذیذ ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اہل اللہ کو حقیقی تعلق تو بجز ذاتِ حق کے کسی سے نہیں ہوتا اور اس کا مقتضا سہولت نزع ہے مگر

بعض حضرات کوحق تعالیٰ کی طرف سے ارشادِ خلق وتربیت طالبین کی خدمت سپرد ہوتی ہے اور یہ بدون توجہ الی الخلق کے نہیں ہوسکتی اس لئے ان کوامرِ حق سے مخلوق کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے اور اصلاح وارشاد کے لئے ان سے ایک گونہ تعلق ہو جاتا ہے اور یہ تعلق چونکہ بامرِ حق ہے اس لئے آخرت سے مانع نہیں ہوتا بلکہ موجب اجر اور سبب ترقی ہے جس سے جس قدر اصلاح وارشاد کا فیض ہوگا اسی قدر اس کے درجات میں اضافہ ہوگا چونکہ یہ خدمت سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے سپرد کی گئی ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کومخلوق کے ساتھ یہ تعلق زیادہ ہوتا ہے اور انبیاء میں بھی ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد سب سے زیادہ یہ خدمت تھی کیونکہ قیامت تک آنے والی مخلوق کے لئے آپ ہی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں تو آپ کوسب سے زیادہ ارشاد اصلاح کی فکر واہتمام تھا اس لئے آپ کونزع میں شدت زیادہ ہوئی کیونکہ روح کوامت کے ساتھ تعلق تھا اور وصال کے وقت بھی آپ کوان کا اہتمام تھا مگر یہ تعلق لذیذ اور یہ فکر خوش گوار تھا۔ آپ کے لئے اس میں اجر اور ترقی درجات تھی اس لئے شدت نزع سے جسم کوتو تکلیف ہوئی مگر روح کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ انبیاءؑ کے بعد بعض اولیاء ایسے ہوتے ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد وتبلیغ ہوتی ہے ان کوبھی نزع میں بوجہ طالبین کی فکر کے شدت ہوتی ہے مگر ان کوانبیاء کے برابر شدت نہیں ہوتی کیونکہ ان کی ذمہ داری انبیاء کے برابر نہیں ہے اس لئے ان کومخلوق کے ساتھ اصلاح وارشاد کا تعلق بھی ان سے کم ہوتا ہے اور جن بعض اولیاء کے سپرد یہ خدمت نہیں ہوتی وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں ان کونہ کسی کی فکر ہے نہ کسی سے تعلق ہے ان کا نزع بہت سہل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ مرتے ہوئے بڑے شاداں وفرحاں ہوتے ہیں بعضے غزل پڑھتے ہوئے جاتے ہیں، بعضے ہنستے ہوئے جان دیتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم   راحت جاں طلبم وزپئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گرآید بسرایں غم روزے   تا درمیکدہ شاداں وغزل خواں بروم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحت جاں طلب کروں اور محبوب حقیقی کے پاس جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہوجائے تو خوش وخرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں)۔

ایک بزرگ مرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم   جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(اب وقت آ گیا ہے کہ میں عریاں ہوں جسم کو چھوڑ کر سراسر جان بن جاؤں)

ان کی یہ حالت دیکھ کر بعض لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان اولیاء سے افضل ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد ہے کیونکہ وہ موت کے وقت ان کے برابر بےفکر نہیں ہوتے ان کو اپنی ذمہ داری کی بھی فکر ہوتی ہے اپنے متعلقین کا بھی خیال ہوتا ہے اسی وجہ سے ان کو نزع میں شدت بھی واقع ہوتی ہے مگر یہ اعتقاد افضلیت صحیح نہیں بلکہ اکثر وہی اولیاء افضل ہوتے ہیں جو صاحب ارشاد ہیں کیونکہ ان کی حالت انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہے اور جو جتنا انبیاء کے مشابہ ہوگا وہ دوسروں سے افضل ہوگا لیکن تم کو اس تجویز کا حق نہیں ہے کہ اپنے لئے صاحب ارشاد ہونے کی تمنا کرو۔

ایاز کو باوجود تقرب خاص کے امورِ سلطنت میں اختیار نہ تھا

بس بادشاہ کو اختیار ہے کہ تمہارا امتحان لے کر جو عہدہ جس کو چاہے دیدے جس کو چاہے تحصیلدار بنادے، جس کو چاہے ڈپٹی کلکٹر بنادے اور اسے یہ بھی اختیار ہے کہ کسی کو کوئی عہدہ بھی نہ دے بلکہ اس کو اپنا مصاحب بنالے محمود غزنوی کو اختیار تھا کہ ایک کو حسن میمندی بنادے اور ایک کو ایاز بنائے۔ حسن میمندی کے سپرد قلمندان وزارت تھا سلطنت میں تصرف کرنے کا بڑا اختیار اسے دیا گیا تھا اور ایاز کو اختیار کچھ نہ تھا مگر تقرب اتنا تھا کہ حسن میمندی کو باوجود سب اختیارات کے وہ تقرب حاصل نہ تھا بعض دفعہ یہ نوبت آتی تھی کہ محمود سے بات کرنے کی ایاز کے سوا کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی اس وقت میمندی بھی ایاز کی خوشامد کرتا تھا کہ بادشاہ تک یہ بات پہنچا دو حالانکہ یہ وہ شخص ہے جسے سلطنت میں کوئی بھی عہدہ حاصل نہیں اور امور سلطنت میں ایک پیسہ کا تصرف بھی اس کے اختیار میں نہیں مگر تقرب کی یہ حالت ہے پس سالک کو اپنے لئے کسی تجویز کا حق نہیں خدا تعالیٰ کے سپرد کردو اپنے آپ کو وہ جو چاہیں کریں خواہ صاحب سلسلہ بنادیں یا درباری بنالیں۔

ہر کسے راہر کارے ساختند   میل اواندر دلش انداختند

(جس کسی شخص کو کسی کام کیلئے مقرر کرتے ہیں اسی کی طرف میلان اسکا اسکے دل میں ڈال دیتے ہیں)

سرکاری باغ میں جو درخت بھی ہے عمدہ ہی ہے۔ کوئی درخت آم کا ہے جس سے مخلوق کو نفع ہوتا ہے اور کوئی درخت گلاب کا ہے جس کے پھولوں کو خاص بادشاہ کی میز پر لا کر رکھا جاتا ہے کسی کو اس کے توڑنے کی اجازت نہیں پھر تم کون ہو جو آم ہی کا درخت بننا چاہو گلاب نہ بننا چاہو اسی باغ میں بلبل بھی ہے جس کا کام بجز نالہ وآہ زاری کے کچھ نہیں مگر سب کے سب اسی باغ کے رہنے والے ہیں ان میں کوئی ناقص نہیں سب کامل ہی ہیں گو حالات مختلف ہیں۔

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است بعند لیب چہ فرمودہ کہ نالان است
(پھول کے کان میں کیا کہہ دیا ہے کہ خنداں ہے بلبل سے کیا فرمادیا کہ گریہ وزاری میں ہے)
مولانا فرماتے ہیں۔

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست در بجہل آئیم ما زندان اوست
گر بخواب آئیم مستان ویئم در بہ بیداری بدستان ویئم

(اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ ان کا ایوان ہے کہ درجہ علم ان کے مصرف سے عطا ہوا۔ اور اگر جہل میں مبتلا ہیں تو یہ ان کا زندان ہے یعنی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے اگر سور ہیں تو ان ہی کے بیہوش کئے ہوئے ہیں اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو میں ہیں)۔

انبیاء علیہم السلام کے حالات وکیفیات میں تفاوت

ان کو اختیار ہے کہ جس حال میں چاہیں رکھیں، جب وہ اپنا بنالیں گے تو ہر حال میں تم ان ہی کے کہلاؤ گے اور جس کو وہ اپنا بنا لیتے ہیں وہ ناقص نہیں رہتا وہ کامل ہی ہوتا ہے۔ گو حالات اور مذاق میں تفاوت ہو چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے مذاق وحالات وکیفیات میں بھی باہم تفاوت ہے مگر ان میں کوئی ناقص نہیں سب کامل ہیں گو بعضے اکمل ہوں مگر بعض کی اکملیت کسی کے نقص کو مستلزم نہیں کامل سب ہیں۔ اور یہاں سے میں ایک بات پر تنبیہ کرنا چاہتا ہوں۔

کتاب سیرت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رائے

وہ یہ کہ آج کل ایک سیرت نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) شائع ہوئی ہے جس کو تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت مقبولیت حاصل ہے لوگ شوق سے اس کو خریدتے ہیں کیونکہ کاغذ چکنا اور لکھائی عمدہ ہے، ظاہری ٹیپ ٹاپ بہت ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا باطن بھی ایسا ہی ہوگا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کسی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت ہے۔ کیونکہ کمالات نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس میں بحث ہی نہیں۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مدبر بادشاہ کی سوانح عمری ہے زیادہ تر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر وانتظام ہی کا پہلو دکھلایا گیا ہے اور اگر کسی جگہ اتفاق سے آپ کے کمالات نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر بھی ہے تو غضب یہ کیا ہے کہ دوسرے انبیاء میں نقص نکالا گیا ہے۔ چنانچہ شروع ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات کے جامع تھے اور دیگر انبیاء علیہم السلام تمام

کمالات کے جامع نہ تھے کسی میں کوئی صفت تھی کوئی نہ تھی۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کے وقت دوسرے انبیاء کی تنقیص جائز نہیں

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی بابت دعویٰ کیا ہے کہ وہ رحم سے خالی تھے اور دلیل میں یہ واقعہ پیش کیا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کے لئے سخت بددعا کی تھی رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا (اے پروردگار زمین پر کفار میں سے کسی بسنے والے کو نہ چھوڑیئے سب کو تباہ کر دیجئے ۱۲ جامع) یہ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ نبی کو رحم سے خالی کہا جائے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ رہی دلیل تو اس کا جواب خود نص میں موجود ہے۔ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو برس تک اپنی قوم کو سمجھایا۔ غور کیجئے کہ سمجھانے کی بھی کوئی حد اتنی مدت تک ان کی اذیتوں پر صبر کرنا تھوڑی بات ہے ذرا کوئی کر کے تو دکھلائے نوسو برس تو کیا نو ہی برس میں حقیقت معلوم ہو جائے گی تو نوح علیہ السلام کا یہ تھوڑا رحم ہے کہ اتنی مدت تک قوم کی بدحالی اور ایذا رسانی پر صبر کرتے رہے اور بددعا نہ فرمائی۔ اس مدت کے بعد اگر وہ ازخود بھی بددعا فرماتے تو اس کو بے رحمی نہیں کہہ سکتے تھے چہ جائیکہ انہوں نے خود بددعا نہیں فرمائی بلکہ جب ان کو وحی سے معلوم ہو گیا کہ اب ان میں سے کوئی ایمان نہ لائے گا اور ان کی تقدیر میں کفر ہی پر خاتمہ لکھا ہے اس وقت دعا فرمائی بتلایئے جب ایک قوم کی اصلاح سے مایوسی ہو جائے تو اس وقت ان کا باقی رہنا بہتر ہے یا ہلاک ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوم کی بقا میں کچھ فائدہ نہیں بلکہ اندیشہ فساد ہے کہ یہ دوسروں کو بھی غارت کریں گے۔ اس وقت ان پر بددعا کرنا بے رحمی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے حق میں رحم ہے۔ چنانچہ نوح علیہ السلام نے اپنی بددعا میں اس بات کو ظاہر فرما دیا تھا اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (خداوندا اگر آپ ان کو زندہ چھوڑیں گے تو یہ آپ کے دوسرے بندوں کو بھی گمراہ کر دیں گے اور کافر فاجر کے سوا کسی کو نہ جنیں گے) اور یہ بات نوح علیہ السلام نے اپنے قیاس سے نہیں فرمائی بلکہ وحی سے ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اب ان میں یا ان کی اولاد میں کوئی بھی ایماندار نہ ہوگا وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (اور نوح کے پاس وحی بھیجی گئی کہ سوا ان کے جو ایمان لا چکے ہیں اور کوئی تمہاری قوم میں سے ایمان نہ لائے گا سو جو کچھ

یہ لوگ کر رہے ہیں غم نہ کرو)۔

حضرت نوح علیہ السلام کی بد دعا بے رحمی نہیں

تو بتلایئے اس حالت میں اگر نوح علیہ السلام ان کے لئے بد دعا نہ فرماتے تو اس کا انجام کیا ہوتا، ظاہر ہے کہ اس وقت تمام دنیا کافروں سے بھری ہوئی تھی مسلمان بہت ہی کم معدودے چند تھے اور کفار کے متعلق معلوم ہو چکا تھا نہ یہ خود ایمان لائیں گے نہ ان کی اولاد میں کوئی مومن ہوگا اور مسلمانوں کی اولاد کے متعلق یہ یقین نہ تھا کہ سب ایمان دار ہی ہوں گے بلکہ ان میں بھی ایمان دار اور کافر دونوں قسم کے لوگ ہونے والے تھے بلکہ مسلمانوں کی اولاد میں بھی غلبہ کفار ہی کو ہونے والا تھا۔ اب اگر اس زمانہ کے کافر غرق نہ کئے جاتے اور ان کی اولاد بھی اس وقت موجود ہوتی تو مسلمانوں کو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا۔

(احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جتنے لوگ موجود ہیں وہ نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹوں کی اولاد ہیں، جب تین آدمیوں کی اولاد میں کفار کا اس قدر غلبہ ہے جو مشاہدہ میں آرہا ہے تو دنیا بھر کے آدمیوں کی اولاد میں کفار کا کیا کچھ غلبہ نہ ہوتا، خصوصاً جب کہ ان کفار کی اولاد میں مسلمان کوئی نہ ہوتا سب کافر ہی ہوتے اس مقدمہ کے ملانے کے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نوح علیہ السلام نے مسلمانوں کے حال پر بہت ہی رحم فرمایا جو اپنے زمانہ کے کافروں پر بد دعا کی ورنہ آج کفار کا وہ غلبہ ہوتا کہ مسلمانوں کو حقیقت نظر آجاتی اور ان کو جینا محال ہو جاتا ۱۲)۔

غرض اس سیرت کے مصنف نے صرف ایک پہلو کو دیکھا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے واسطے ایسی سخت بد دعا کی جو بے رحمی معلوم ہوتی ہے مگر اس نے دوسرے پہلو کو نہ دیکھا کہ ان کی یہ بد دعا مسلمانوں کے حق میں خود جن میں یہ مصنف بھی داخل ہے سراسر رحم تھی ورنہ میاں کو آج دنیا میں رہنا اور کفار سے جان بچانا دوبھر ہو جاتا۔ یہ اعتراض تو نوح علیہ السلام پر تھا۔

حضرت عیسیٰ میں بدرجہ اتم انتظامی قابلیت اور تمدّن سیاست

اس کے بعد لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن وسیاست کا مادہ نہ تھا۔ نہ معلوم اس کے پاس کون سی وحی آگئی تھی (یا اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چہرہ دیکھ کر قیافہ سے پہچان لیا تھا کہ ان میں یہ مادہ ہے اور وہ مادہ نہیں ۱۲) کچھ نہیں اس اعتراض کا منشا صرف یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا اس سے ان حضرت نے یہ استنباط کر لیا کہ ان

میں یہ مادہ ہی نہ تھا۔ حالانکہ عدم ظہور شے ظہور عدم کو مستلزم نہیں بھلا اگر کسی شخص کو زندگی بھر روپیہ تقسیم کرنے کا موقعہ نہ ملے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں سخاوت کا مادہ نہیں ذرا اس کے ہاتھ میں روپیہ دے کر دیکھو اگر پھر بھی وہ سخاوت نہ کرے اس وقت تم کو اس بات کا حق ہے ورنہ دعوٰے بلا دلیل ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگر سلطنت کا موقعہ ہی نہ ملا تو اس سے ان کا تمدن وسیاست سے خالی ہونا کیسے لازم آ گیا اور تم نے کیونکر سمجھ لیا کہ ان میں انتظامی قابلیت نہیں یہ بات تو جب چل سکتی تھی کہ ان کو سلطنت کا موقعہ ملتا اور پھر انتظام نہ کر سکتے۔ پس اس شخص کا اعتراض تو لغو ہو گیا۔

اب میں ثابت کرتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن وسیاست اور انتظامی قابلیت بدرجہ کمال موجود ہے گو اس جوہر سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا اور اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَانَزَلَ فِیْکُمْ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ عَدْلًا مُقْسِطًا (او کما قال) (صحیح مسلم: ۱۵۵، فتح الباری ۶: ۴۹۱) تمہارا کیا حال ہوگا اس وقت جب کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام تمہارے اندر (آسمان سے) نازل ہو کر آئیں گے۔ عادل ومنصف ہو کر حکومت کریں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت سے مسرت ظاہر فرمائی ہے جب کہ عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں میں حکومت کریں گے اور آپ ان کے متعلق عدل واقساط کی خبر دے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ عدل وانصاف بدون قابلیت انتظام کے نہیں ہو سکتا، عدل وہی کر سکتا ہے جس میں سیاست کا مادہ بدرجہ کمال موجود ہو۔

نیز احادیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس وقت بہت امن وامان اور خیر وبرکت ہوگی جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہایت عمدگی اور خوبی کے ساتھ سلطنت کا انتظام کریں گے، اگر ان میں فی نفسہ یہ مادہ موجود نہیں تو اس وقت کیونکر سلطنت کا انتظام کرلیں گے۔ پس معلوم ہوا کہ اس شخص نے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جامعیت پر جو اعتراض کیا ہے وہ نہایت لغو ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب انبیاء میں اکمل ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ثابت کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ آپ کے بھائیوں میں نقص نکالا جائے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہو سکتے ہیں۔ یاد رکھو انبیاء علیہم السلام سب کامل ہیں ان میں ناقص کوئی نہیں یہ اور بات ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکمل ہیں

تفاضل بین الانبیاء (انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت دینے) سے اسی واسطے منع کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بھائیوں کی تنقیص گوارا نہیں۔

جملہ انبیاء علیہم السلام کاملِ ہیں

الغرض انبیاء علیہم السلام کے مذاق باہم مختلف ہیں مگر کامل سب ہیں اور ہر ایک کا مذاق خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔

تفاضل بَین الاولیاء کی ممانعت

اسی طرح صوفیہ نے تفاضل بین الاولیاء (اولیاء کرام کے درمیان فضیلت دینے) سے بھی منع کیا ہے کیونکہ اولیاء اللہ بھی سب مقبول اور جس کا جو مذاق ہے وہ خدا تعالیٰ کو پسند ہے، ان میں بھی باہم تفضیل کا کسی کو حق نہیں کمالات سے خالی کوئی ولی نہیں یہ اور بات ہے کہ کسی کمال سے حق تعالیٰ نے کام لے لیا اور کسی کمال کو مخفی رکھا اس سے کام نہیں لیا کسی کو صاحب ارشاد بنا دیا اس سے ہدایت خلق کا کام لیا کسی کو صاحب ارشاد نہیں بنایا اسے گم نام رکھا مگر قابلیت ارشاد سے وہ بھی خالی نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرات شیخین کے لئے تو سلطنت تجویز کرتے ہیں اور اپنی زندگی میں بعض لوگوں سے یہ فرماتے ہیں کہ اگر میں نہ ملوں تو اس معاملہ کو ابو بکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے پاس لانا وہ فیصلہ کر دیں گے (وغیرہ وغیرہ)۔

حضرت ابوذر غفاریؓ ہرگز ناقص نہ تھے

اور حضرت ابوذر غفاریؓ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یَااَبَاذَرِّ اِنِّیْ اُرِیْکَ ضَعِیْفًاوَاِنِّیْ اُحِبُّکَ وَاِنِّیْ اُحِبُّ لِنَفْسِکَ مَااُحِبُّ لِنَفْسِیْ لَاتَفِیْضِیْنَ بَیْنَ اِثْنَیْنِ وَلَا تَلِیْنَ مَالَ یَقِیْمِ (او کماقال) (صحیح مسلم، الامارۃ: ۱۷، سنن ابی داوٗد: ۲۸۶۸)

اے ابوذر میں تم کو کمزور دیکھتا ہوں اور تمہارے لئے اور تمہارے نفس کے لئے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے نفس کے لئے پسند کرتا ہوں نہ دو شخصوں کے درمیان فیصلہ کرنا نہ مال یتیم کا ولی بننا)۔

ان کو دو آدمیوں کے درمیان بھی فیصلہ کرنے سے منع فرماتے ہیں اور مال یتیم کی حفاظت سے روکتے ہیں اور حضرات شیخین کے تمام دنیا کے قضایا کا فیصلہ سپرد فرماتے ہیں تو کیا حضرت ابوذر ناقص تھے، کیا ان میں قوت فیصلہ نہ تھی یا وہ مال یتیم کی حفاظت نہ کر سکتے تھے۔ کوئی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا کیونکہ جس شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھوں سے دیکھ لیا ہو اور آپ کی صحبت میں رہا ہو وہ ناقص نہیں رہ سکتا خصوصاً جس شخص سے آپ کو محبت ہو وہ ناقص رہے ایسا نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی آپ حضرات شیخین

سے جو کام لیتے ہیں حضرت ابوذر سے وہ کام نہیں لیتے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صاف فرمادیا ہے اِنّي اُرِيْکَ ضَعِيْفًا کہ میں تم کو ضعیف پاتا ہوں اس لئے آپ نے ان کو قضا اور تولیت مال یتیم سے منع فرمایا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ میں نقص تھا اوران میں قضایا تولیت مال یتیم کا مادہ ہی نہ تھا۔ میں کہتا ہوں کہ ضعف سے نقص لازم نہیں آتا، دیکھو بچہ ضعیف تو ہوتا ہے کہ بالغ کے برابر اس کے اعضاء میں قوت نہیں ہوتی لیکن اگر وہ تام الاعضاء ہے تو اسے ناقص نہیں کہا جاسکتا۔ ناقص وہ ہے جس کے آنکھ نہ ہو یا ہاتھ کٹا ہوا یا پیر سے لنگڑا ہو۔ لیکن جو بچہ تندرست ہو اوراس کے سب اعضاء سالم ہوں اسے ناقص نہیں کہہ سکتے بلکہ اپنی ذات کے لحاظ سے وہ کامل ہی کہلائے گا۔ گو ضعیف ضرور ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ضعیف فرمانے سے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ناقص ہونا لازم نہیں آتا اگر وہ ناقص ہوتے تو آپ ان کو فقید (نایاب' بے نظیر) فرماتے (یعنی فقید القوی) یا فقیر فرماتے مگر آپ تو ضعیف فرمارہے ہیں پھراس سے یہ کہا معلوم ہوا کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں استعداد قضاء وقابلیت تولیت یتیم نہ تھی۔

حضرات صحابہؓ سب کامل تھے

دیکھئے محققین کا مذہب ہے کہ ایمان، زیادت ونقص کو قبول نہیں کرتا اور شدت وضعف کو قبول کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضعف کا مقابل شدت ہے نہ کہ زیادت نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ضعف اور نقص ایک نہیں بلکہ دونوں میں فرق ہے۔ پس حضرات صحابہ میں زائد وناقص کوئی نہیں بلکہ سب کامل ہیں اور جو کمالات حضرات شیخین میں تھے وہ ہر صحابیؓ کے اندر مجتمع تھے۔ البتہ شدید وضعیف کا فرق ضرور ہے۔ اگر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ میں ان امور کی قابلیت ہی نہ ہوتی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے منع فرمانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ حضرت ابوذرؓ نہ رسم پرست تھے نہ جاہل تھے۔ اگر ان میں ان کاموں کی قابلیت نہ ہوتی تو وہ خود ہی یہ کام نہ کرتے کیونکہ عدم قابلیت کے ساتھ کسی کام میں ہاتھ ڈالنا یا تو جہالت سے ہوتا ہے کہ اپنی نا قابلیت کی خبر ہی نہ ہو یا رسم پرستی سے ہوتا ہے کہ اپنی نا قابلیت کا علم ہے مگر انکار کرنے میں ہیٹی سمجھتا ہے۔ حضرت ابوذرؓ ان دونوں سے منزہ تھے۔ اگر کسی کام کی قابلیت ان میں نہ ہوتی تو وہ ہرگز اس کام کو ہاتھ نہ لگاتے۔ پس حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو منع کرنا اس کی دلیل ہے کہ ان میں قابلیت ضرور تھی مگر آپ نے اس قابلیت سے کام لینا نہیں چاہا بلکہ اِنّي اُرِيْکَ ضَعِيْفًا (میں تم کو ضعیف پاتا ہوں) فرما کر اس قوت کو ممنوع الاستعمال کر دیا اور ہمارا اعتقاد تو یہ ہے کہ اگر بالفرض حضرت ابوذرؓ میں قابلیت بھی نہ ہوتی اور

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے قضاء وتولیت کا کام لینا چاہتے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کے بعد ان میں معًا قابلیت پیدا ہو جاتی کیونکہ آپ کی شان یہ ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(اس کا کہنا خدا کا کہنا ہووے اگر چہ بندہ کی زبان سے نکلا ہو)۔

اور حق تعالیٰ کی شان یہ ہے۔

داد اورا قابلیت شرط نیست بلکہ شرط قابلیت داد اوست

(اس کے دین کے لئے قابلیت شرط نہیں ہے۔ بلکہ قابلیت کی شرط اس کی داد و دہش ہے)۔

مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ کام لینا چاہا ہی نہیں ۱۲۔

سالک کو شیخ کے سامنے مردہ بدست زندہ ہونا چاہیئے

اسی کو میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ سالکین کو اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرنا چاہیئے حق تعالیٰ جو چاہیں گے تمہارے لئے خود تجویز فرما دیں گے بعض سالکین اپنے لئے مشیخت تجویز کرتے ہیں اور ذکر و شغل سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی وقت شیخ و مقتدا بن کر مخلوق کی اصلاح کریں گے۔ یاد رکھو جس کے لئے ابھی تک شیخ نے مشیخت تجویز نہیں کی اس کے لئے اس کا خیال کرنا بھی گناہ ہے جیسا کہ حضرت ابوذرؓ کے لئے قضاء بین الاثنین اور تولیت مال یتیم گناہ تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے تجویز نہیں فرمایا تھا اس لئے سالک کو شیخ کے ہاتھ میں مردہ بدست زندہ ہونا چاہیئے اگر وہ مستحبات سے بھی منع کرے تو انقیاد و اطاعت ہی کرنا چاہیئے۔ بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں مشائخ پر کہ یہ مستحبات سے روکتے ہیں مگر وہ کریں تاویل حضرت ابوذر کے قصہ میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قضا و تولیت مال یتیم سے منع فرمایا حالانکہ قضاء فرض کفایہ ہے اور تولیت مال یتیم بھی جب کہ اس کا حق ادا کر سکتا ہو اور یقیناً حضرت ابوذرؓ اگر کسی یتیم کے مال کی حفاظت کرتے تو ایسی احتیاط سے کرتے جس کی حد نہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع فرما دیا پھر مشائخ پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے اگر وہ کسی کو روک دیں کہ تم اصلاح خلق اور نفع رسانی مخلوق کا وسوسہ نہ لاؤ۔

ترقی کا مدار اعمال ظاہرہ کی زیادتی پر نہیں

اور سنئے جنگ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو تو حکم دیا جہاد کا کہ صف بندی کر کے کفار کا مقابلہ کریں تلواریں چلائیں اور ایک جماعت کو حکم دیا کہ مورچہ پر خاموش بیٹھے

رہیں وہاں سے ہرگز نہ ہٹیں اور لڑائی میں شریک نہ ہوں ہاتھ تک نہ ہلائیں گویا ظاہر میں ان کو جہاد سے روک دیا مگر حقیقت میں ان کا یہی جہاد تھا۔ اس جماعت کے لئے میدان میں آ کر تلوار چلانا گناہ تھا چنانچہ جنگ احد میں جو فتح کے بعد شکست ہوئی حق تعالیٰ نے اس کا ایک سبب یہ بھی بتلایا ہے کہ اس مورچہ والی جماعت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کی اس لئے ہم نے فتح کے بعد تم کو شکست دے دی وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَآ اَرٰكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ (اور تم کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دلخواہ بات دکھا دی تھی)۔

ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہم جہاد میں شریک نہیں ہوئے ہمیں بھی کچھ کرنا چاہیئے اس لئے بعضے مورچہ سے ہٹ کر میدان میں آ گئے اور مال غنیمت پر قبضہ کرنے لگے مگر یہ ان کے لئے گناہ شمار ہوا گو دوسروں کے حق میں بڑا کام تھا مورچہ والوں کے لئے یہی جہاد تھا کہ حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں بٹھلا دیا تھا وہیں چپ چاپ بیٹھے رہتے وہ اس خاموشی ہی میں جہاد والوں کے برابر تھے یہاں سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ ترقی کا مدار اعمال ظاہرہ کی زیادتی پر نہیں بلکہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اعمال ظاہرہ کم کرتے ہیں مگر ان کی ترقی ہوتی جاتی ہے کیونکہ ان کے اعمال باطنہ زیادہ ہوتے ہیں جیسے یہ مورچہ والے بظاہر کچھ نہیں کر رہے تھے مگر ثواب میں جہاد کرنے والوں کے برابر تھے اسی طرح صوفیہ میں ایک جماعت قلندر کہلاتی ہے وہ ظاہر میں فرائض و واجبات کے سوا کچھ زیادہ کام نہیں کرتے مگر برابر ان کی ترقی ہوتی رہتی ہے کیونکہ اعمال باطنہ ان کے زیادہ ہوتے ہیں وہ ہر وقت تفکر اور تدبر میں رہتے ہیں قلب کو خدا تعالیٰ سے مشغول رکھتے ہیں اس لئے برابر ترقی میں رہتے ہیں اسی طرح بعض لوگ صاحب ارشاد نہیں ہوتے ان کا یہ مذاق ہوتا ہے۔

احمد تو عاشقی بہ مشیخت ترا چہ کار　　دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام محبوب کا دیوانہ ہو سلسلہ ہو یا نہ ہو)۔

ظاہر میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے فیض تو ہوا ہی نہیں یہ کیسے بزرگ ہیں مگر باطن میں وہ حق تعالیٰ کے ایسے مقرب ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ صاحب ارشاد بھی ایسے مقرب نہیں ہوتے۔

سالک کا مذاق عاشقانہ ہونا چاہیے

اس لئے سالک کا مذاق عاشقانہ ہونا چاہیئے اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرے کیسی مشیخت کیسا سلسلہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک مرید کسی شیخ کی خدمت میں برسوں ذکر و شغل کرتا رہا مگر نفع نہ ہوتا تھا راستہ کھلتا ہی نہ تھا، شیخ سے شکایت کرتا وہ ذکر و شغل میں کچھ ترمیم یا اضافہ

کر دیتے جب کسی طرح اس کو نفع نہ ہوا اور شیخ بھی تدبیر کرتے کرتے تھک گئے تو ایک دن انہوں نے مرید سے پوچھا کہ میاں یہ تو بتلاؤ ذکر و شغل سے تمہاری نیت کیا ہے کہنے لگا میری نیت یہ ہے کہ میں اپنی اصلاح کے بعد دوسروں کو نفع پہنچاؤں گا۔ شیخ نے فرمایا کہ یہی چور گھسا ہوا ہے جس نے سارے ذکر کو برباد کر رکھا ہے۔ اس خیال سے توبہ کر تو، تو شرک میں مبتلا ہے۔

اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی ۔۔۔ تا راہ بیں نباشی تو کے راہبر شوی

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق ۔۔۔ ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

(اے بے خبر کوشش کر کہ تو خبردار ہو جائے جب تک راستہ کا دیکھنے والا نہ ہوگا راہبر نہیں بن سکتا ادیب عشق کے سامنے حقائق کے مدرسہ میں اے لڑکے کوشش کر کہ کسی دن باپ یعنی شیخ بھی بن جائے گا)۔

سالکین کے لئے خیالِ مشیخت گناہ ہے

زمانہ پسری ہی میں باپ بننے لگے صاحب پہلے بیٹا تو بن لو بعد ہی میں باپ بننے کا خیال کرنا یہ کیا کہ بیٹا بننے سے پہلے ہی باپ بننے لگے اس لئے بار بار کہتا ہوں کہ سالکین کے لئے خیال مشیخت گناہ اور سدِّ راہ ہے تم ہرگز اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرو بس تفویض کر دو حضرت حق کے اور حضرت حق کے سپرد کرنا یہ ہے کہ ان کے نائبین کے ہاتھ میں اپنے کو سپرد کر دو کہ وہ جو تصرف تمہارے اندر کریں اس سے راضی رہو جو وہ تجویز کر دیں اس کے خلاف کا وسوسہ نہ لاؤ۔

آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رواست ۔۔۔ نائب ست و دست او دست خداست

گر خضر در بحر کشتی را شکست ۔۔۔ صد درستی در شکست خضر ہست

(جو جان دیتا ہے اگر وہ جان لے لے روا ہے خدا کا نائب ہے اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ اگر خضر علیہ السلام نے دریا میں کشتی کو توڑ ڈالا تھا مگر واقع میں خضر علیہ السلام کے دریا میں کشتی کو توڑ ڈالا تھا مگر واقع میں خضر علیہ السلام کے توڑنے میں سو درستی یعنی حفاظت تھی)۔

صبر کن در کار خضر اے بے نفاق ۔۔۔ تا نگوید خضر رو ہذا فراق

(خضر یعنی مرشد کامل کے افعال پر صبر و سکوت کر تا کہ خضر یوں نہ کہہ دیں کہ جاؤ ہماری تمہاری جدائی ہے)

اور فرماتے ہیں۔ چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو (جب پیر بنالو ہمہ تن تسلیم بن جاؤ) مطبع والوں نے اس کو پیرہن لکھ دیا ہے جس کا مطلب شاید کوئی یہ سمجھا ہو کہ جب شیخ سے

پیرہن (یعنی خرقہ خلافت) مل جائے اس وقت اس کی اطاعت کرو اس کے بغیر اطاعت نہ کرنا واہیات۔ یہ لفظ پیرہن نہیں بلکہ پیرا الگ لفظ ہے اور ہیں یعنی خبردار الگ لفظ ہے، فرماتے ہیں۔

چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو — ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو

ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ — شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

(جب مرشد کو پکڑ لیا تو اس کے سامنے رائے زنی مت کرو مثل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اور حضرت خضر علیہ السلام کی بات پر عمل کرو)

(جب تم پیر بنالو تو یاد رکھو کہ ہمہ تن تسلیم بن جاؤ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح زیر حکم خضر علیہ السلام چلنا)۔

تم کو کیا خبر کہ تم کو کیا عہدہ ملنے والا ہے بس تم اپنے کام میں لگو جو عہدہ دینا ہوگا وہ خود دے دیں گے (اور حق تعالیٰ کا دینا یہ ہے کہ وہ اپنے نائبین کے ہاتھ سے کوئی عہدہ دلوادیں گے خواہ مشیخت ہو یا گمنامی ۱۲) بعض اولیا ایسے بھی ہیں کہ صاحب ارشاد نہیں ہیں مگر ان کی حالت یہ ہوگی۔

لُمُتَحَابُّوْنَ فِی اللّٰهِ عَلٰی مَنَابِرَ مِنَ الْمِسْکِ یَوْمَ الْقِیَامَۃ یَغْبِطُهُمُ الْاَ نْبِیَاءُ والصِّدِّیْقُوْنَ (او کما قال) (مسند احمد ۵:۲۳۶، کنز العمال:۲۴۶۹۳)

حدیث میں ہے کہ متحابین فی اللہ قیامت کے دن منابر مسک پر بے فکر بیٹھے ہوں گے ان کی اس حالت پر انبیاء وصدیقین کو رشک آئے گا کہ یہ بڑے بے فکر ہیں علماء قشر تو تھک گئے اس کی تفسیر میں لگے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے مگر حقیقت تک نہ پہنچے وہ نہ بتلا سکے کہ یہ کون لوگ ہیں اسی لئے عارف شیرازی ایسے مدارس سے برأت ظاہر کرتے ہیں۔

از قال وقیل مدرسہ حالے دلم گرفت (مدرسہ کی قیل وقال سے کسی حال نے میرے دل پر اثر نہیں کیا)

خانقاہ اور مدرسہ دونوں کی ضرورت

حالے امالہ ہے حالا کا اور حالا مخفف ہے حالاً منصوب کا۔

از قال وقیل مدرسہ حالے دلم گرفت — یک چند نیز خدمت معشوق و مے کنم

(مدرسہ کی قیل وقال دل گرفتہ نہیں ہوا چند دن محبوب اور عشق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں)

قال وقیل مدرسہ سے دل گرفتہ ہونے کا سبب یہی ہے کہ وہاں حقائق کا انکشاف نہیں ہوتا بلکہ لفظوں ہی کے پھیر میں رہتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مدارس بے کار ہیں ہرگز نہیں ان کی بھی

ضرورت ہے اوران کے بعد خانقاہ میں آنے کی بھی ضرورت ہے۔ نہ تنہا مدرسہ کافی ہے نہ تنہا خانقاہ کافی ہے۔ مدرسہ بمنزلہ وضو کے ہے اور خانقاہ بمنزلہ نماز کے ہے تو جو صوفی مدرسہ میں نہ جائے وہ ایسا ہے جیسے کوئی نماز بلاوضو پڑھ جائے تو وہ صوفی نہ ہوگا بلکہ صافی ہوگا مگر وہ صوفی نہیں جس کے متعلق کہتے ہیں ۔

صوفی نشود صافی تادر نکشد جامے   بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(یعنی صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد ہوتی ہے)

بلکہ وہ صافی جس سے برتن اور پتیلیاں صاف کیا کرتے ہیں اور جو عالم مدرسہ سے فارغ ہو کر خانقاہ میں نہ جائے وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص وضو کر کے اسی پر قناعت کر لے اور نماز نہ پڑھے تو وہ اس کا مصداق ہے ۔

اَیُّھَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَۃِ   کُلُّ مَا حَصَلْتُمُوْہُ وَ سْوَسَہ

(مدرسہ والو! جو کچھ مدرسہ میں علم لفظی حاصل کیا وہ وسوسہ تھا)

حدیث میں متحابین فی اللہ سے مُراد

کیونکہ لفظی اور کتابی علم سے حقائق کا انکشاف نہیں ہوتا پس خانقاہ کے درس سے مشتق نہیں بلکہ دروس سے مشتق ہے بمعنی مٹنے کے تو وہ مٹانے کے قابل ہے۔ غرض علماء قشر تھک گئے اور ان کو پتہ نہ چلا کہ متحابین فی اللہ کا مصداق اس حدیث میں کون لوگ ہیں محققین عرفاء نے پتہ لگالیا یہ بڑے غماز ہیں انہوں نے کہا یہ وہ اولیاء ہیں جو صاحب ارشاد نہیں ان کے ذمہ کسی کی اصلاح وتربیت نہ تھی اس لئے قیامت میں یہ بےفکر ہوں گے اور انبیاء علیہم السلام اولیاء اصحاب ارشاد کو اپنے متعلقین کا فکر ہوگا تربیت وتبلیغ کے متعلق حساب کا اندیشہ ہوگا اس لئے وہ پریشانی میں ہوں گے اور ان لوگوں کی بےفکری پر غبطہ کریں گے کہ کاش آج ہم بھی ایسے ہی ہوتے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے افضل ہوں کیونکہ تحصیلدار کو وائسرائے کے سامنے جاتے ہوئے بڑا فکر ہوتا ہے جو ایک مزدور چپراسی کو کبھی نہیں ہوتا اور شاید کسی وقت اپنی ذمہ داری اور پریشانی کو دیکھ کر تحصیلدار یہ تمنا کرے کہ کاش میں چپراسی ہوتا تو کیا اس سے حقیقت میں چپراس گری افضل ہوگئی اس عہدہ سے ہرگز نہیں بلکہ ہر عاقل سمجھتا ہے کہ تحصیلداری کا عہدہ باوجود اس ذمہ داری کے چپراس گری سے بدرجہا افضل ہے کیونکہ یہ شخص سرکاری عہدہ دار ہے اور چپراسی کو سرکاری دربار سے وہ تعلق نہیں جو اس کو ہے۔

مشاہدہ جمالِ حق کی دو صورتیں

اور یہیں سے حقیقت منکشف ہوگئی اس حدیث کی اِنَّہُ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ وَ اِنِّیْ لَا

سْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (صحیح مسلم، الذکر:۴۱، سنن ابی داؤد:۱۵۱۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کبھی میرے دل پر بھی بادل چھا جاتا ہے اور میں اس کی وجہ سے دن میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں علماء قشر اس کی حقیقت نہ سمجھ سکے انہوں نے کہہ دیا کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے اور ہم نہیں جانتے کہ یہ غین کیا چیز ہے اور یہ طریقہ اسلم ہے کہ جس بات کی حقیقت معلوم نہ ہو اس سے سکوت کیا جائے مگر کسی کو معلوم ہو جائے تو اس کے بیان کرنے میں بھی مضائقہ نہیں چنانچہ بہت سی آیات متشابہات میں متاخرین نے مناسب توجیہات بیان کی ہیں جیسے يَدُاللّٰهِ وَوَجْهُهُ اللّٰهِ وَاَمْثَالُهَا (اللہ کا ہاتھ اللہ کا چہرا اور مثل ان کے) اسی طرح اگر کسی کی سمجھ میں غین کی حقیقت آجائے تو نصوص کے خلاف بھی نہ ہو اور شانِ نبوت کے بھی خلاف نہ ہو تو اس کا بیان کر دینا مذموم نہ ہوگا۔ محققین نے اس کا مطلب سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مشاہدہ جمال حق کی دو صورتیں ہیں ایک حضور بلا واسطہ (جو مقام فناء میں ہوا کرتا ہے ۱۲) دوسرے حضور بواسطہ (جو مقام بقا میں ہوتا ہے ۱۲) حضور بلا واسطہ تو یہ ہے کہ سوائے حضرت حق کے اور کسی چیز کی طرف اصلا التفات نہ ہو ہر دم خدا تعالیٰ کی طرف بدون کسی واسطہ کے متوجہ رہے (مقام فنا میں حضور غالب ہوتا ہے ۱۲) اور حضور بواسطہ یہ ہے کہ مخلوق کی طرف بھی توجہ والتفات ہو مگر مخلوق آئینہ بن جائے رویت جمال الٰہی کے لئے (مقام بقا میں یہی صورت حضور ہوتی ہے ۱۲) تو پہلی صورت کی نظیر یہ ہے کہ کوئی شخص محبوب کو بدون کسی حجاب کے دیکھتا رہے کہ اس کا چہرہ عاشق کے سامنے ہو اور دوسری صورت کی نظیر یہ ہے کہ محبوب عاشق سے کہہ دے کہ مجھ کو مت گھورو بلکہ سامنے جو آئینہ رکھا ہے اس میں سے میری صورت کو دیکھو اس وقت بھی عاشق کی توجہ محبوب ہی کی طرف ہے مگر رویت بواسطہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس دیدار میں اور پہلے دیدار میں فرق ضرور ہے جو بات بلا واسطہ دیکھنے میں ہے وہ آئینہ سے دیکھنے میں کہاں اسی طرح حضور بلا واسطہ (جو مقام فنا میں ہوتا ہے ۱۲) حضور بواسطہ سے (جو مقام بقا میں ہوتا ہے) اکمل واللہ ہے سالک کو اس میں زیادہ لذت آتی ہے کیونکہ اس میں غیر کی طرف اصلا التفات نہیں ہوتا اور حضور بواسطہ میں گو اس کی نظر بالذات حضرت حق ہی پر ہوتی ہے مگر فی الجملہ واسطہ پر بھی نظر ہوتی ہے اور عاشق پر اتنا واسطہ بھی گراں ہے۔

عشق کی شان

حضرات انبیاء علیہم السلام واہل ارشاد کی طبیعت تو یہی چاہتی ہے کہ ہر وقت حضور بلا واسطہ رہے خصوصاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تعلق محبت حق تعالیٰ سے ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ آپ ہر

وقت بلا واسطہ مشاہدہ جمال حق میں مشغول رہیں مگر آپ کو خدمت ارشاد میں رکھا گیا ہے مخلوق کو فیض پہنچانے کے لئے مامور کیا گیا ہے جس میں گونہ توجہ مخلوق پر بھی کرنا پڑتی ہے گویا توجہ الی الخلق توجہ الی الخالق سے آپ کے لئے مانع نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے اس کو اپنے جمال کا آئینہ بنا دیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور آپ کی تو بڑی شان ہے اہل اللہ کو جو آپ کے غلامانِ غلام ہیں یہ بات نصیب ہے کہ کوئی چیز ان کو محبوب سے مشغول نہیں کرتی یہ سب کچھ ہے مگر عشق کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کو بلا واسطہ دیکھا جائے بیچ میں آئینہ کا واسطہ بھی کیوں ہو عشق کی تو یہ شان ہے ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیثِ تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں)۔

اسی گرانی کو آپ غین سے تعبیر فرماتے ہیں کہ بعض دفعہ مخلوق کے واسطہ سے توجہ الی المحبوب کرنے میں میرے دل پر بادل سا چھا جاتا ہے کیونکہ ظاہر ہے۔ کہ بلا واسطہ مشاہدہ زیادہ لذیذ اور بے غبار ہوتا ہے گو قرب زیادہ اسی میں ہے کہ مخلوق کے واسطہ سے مشاہدہ کیا جائے کیونکہ اس میں محبوب کی اطاعت ہے عاشق کا دل گو یہ چاہتا ہے کہ محبوب کو بدون کسی واسطہ کے دیکھوں مگر جب محبوب کی مرضی یہ ہے کہ مجھ کو آئینہ میں سے دیکھو تو اس وقت اطاعت اسی میں ہے کہ آئینہ کی طرف منہ کر لیا جائے اور اس میں سے محبوب کی صورت دیکھی جائے گو آئینہ کی طرف منہ کرتے ہوئے عاشق کے دل پر نشتر لگتا ہے۔ مگر وہ یہ کہتا ہے ؎

میل من سوئے وصال و میل اوسوئے فراق ترک کام خود گرفتم تا بر آید کام دوست

(میرا میلان وصال کی طرف ہے اور اس (محبوب) کا میلان فراق کی طرف ہے میں نے اپنی مراد کو چھوڑ دیا تا کہ محبوب کی مراد پوری ہو جائے)۔

وصال سے مراد حضور بلا واسطہ ہے اور فراق سے حضور بواسطہ اور عاشق کی طبیعت فطری طور پر پہلی صورت کو چاہتی ہے مگر وہ رضائے محبوب کے لئے دوسری صورت کو اختیار کرتا ہے اسی لئے مقام فنا سے مقام بقاء کی طرف آنا سالک پر طبعاً گراں ہوتا ہے مگر امر الٰہی کی وجہ سے وہ اس کو خوشی سے قبول کرتا ہے۔ اس کی دوسری مثال اس سے واضح تر یہ ہے کہ ایک عاشق محبوب کے سامنے بیٹھا ہوا اس کے چہرہ کو دیکھ رہا ہو تھوڑی دیر کے بعد محبوب امر کرلے کہ ذرا بازار سے ہمارے واسطے آم لے آؤ تو بازار جانے میں گو فی الجملہ غیبت ہوگی مگر بتلایئے قرب زیادہ کس صورت میں

ہے آیا اطاعت وقرب اس میں ہے کہ فوراً اٹھ کر بازار چلا جائے اور آموں کی تلاش میں مارا مارا پھرے یا یہ کہ وہیں بیٹھا رہے اور محبوب سے کہے کہ حضور مجھے تو اپنا جمال دیکھنے دیجئے یہ کام کسی اور سے لے لیجئے۔ یقیناً ہر عاقل کہے گا کہ اس وقت اس کا بازار جانا ہی موجب قرب ہے۔ اگر یہ عاشق صادق ہے تو اس غیبت کو گوارا کرے گا۔ گو طبعاً اس پر گراں ہے اور یہ کہے گا۔

اُرِیْدُ وِ صَالَهٗ وَیُرِ یْدُ هَجْرِیْ　　فَاَ تْرُکُ مَا اُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ

(میں محبوب کے وصال کا خواہاں ہوں اور وہ ہجر کا خواہاں سو میں نے اپنی خواہش کو اس کی خواہش کی وجہ سے ترک کر دیا)۔

عاشق صادق فاسق نہیں ہوتا

اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ عاشق نہیں بلکہ عاشق ہے فاسق تو نہ کہنا چاہیئے اور کیونکہ عاشق صادق فاسق نہیں ہوا کرتا۔ اور جو فاسق ہوتے ہیں وہ عاشق نہیں بدمعاش ہیں عشق کے ساتھ کبھی بُرا خیال آ ہی نہیں سکتا ہیبت محبوب ان وساوس سے مانع ہو جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

عشق ہائے کزپئے رنگے بود　　عشق نبود عاقبت ننگے بود

(جو عشق رنگ وروپ کی وجہ سے ہوتا ہے وہ انجام کار عشق نہیں شرم ندامت ہوتی ہے)۔

جس عشق میں فسق کا خیال آئے وہ نفس کی شرارت ہے۔ بہرحال قرب زیادہ اس میں ہے کہ جب محبوب عاشق کو اپنے پاس سے اٹھا کر کسی کام میں لگا دے تو اس کام میں لگ جائے اگر وہ عاشق صادق ہے تو اس وقت بھی محبوب سے غافل نہ ہوگا بلکہ اس کام کو مرآۃ جمال بنا لے گا اور یقیناً اس وقت وہ محبوب کی نظر میں زیادہ مقرب ہے کیونکہ محض محبوب کی رضا کے لئے اس نے اس کام میں مشغولی اختیار کی ہے ورنہ اس کی طبیعت کا تقاضا تو کچھ اور ہی تھا یہی حالت ہوتی ہے حضرات انبیاء علیہم السلام کی ارشاد خلق میں کہ وہ اس خدمت میں حق تعالیٰ کی رضا کے لئے مشغول ہوتے ہیں جس میں مخلوق پر توجہ بھی کرنا پڑتی ہے۔ اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم غین فرماتے ہیں۔ چونکہ عارفین پر یہ حالات گزرتے ہیں اور وہ مقامات فناء وبقاء کا ذوق رکھتے ہیں اس لئے وہ اس غین کو سمجھ گئے علماء ظاہر اول تو اس کو سمجھتے نہیں اور جو کچھ سمجھتے بھی ہیں تو نہ معلوم کہاں کہاں پہنچتے ہیں (کوئی یہ کہتا ہے کہ انبیاء سے گناہ تو نہیں ہوتا مگر زلت کا صدور ہو سکتا ہے یہ غین اسی کا اثر تھا وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے مناسب نہیں کیونکہ آپ سے کسی زلت کا صدور عمداً نہیں ہوا بلکہ اگر ہوا بھی ہو تو خطاء اجتہادی سے ہوا جس سے قلب پر غین طاری نہ ہونا چاہیئے کیونکہ خطاء اجتہادی سے قرب

میں کمی نہیں ہوتی بلکہ ترقی ہی ہوتی ہے بلکہ اس کی حقیقت وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ یہ غین وہ گرانی ہے جو توجہ الی الخلق سے آپ کے قلب پر ہوتی تھی اس پر شاید یہ سوال ہو کہ پھر اس سے استغفار کرنے کی کیا ضرورت تھی یہ تو کوئی گناہ کی بات نہیں جواب یہ ہے کہ وہ جو غیبت واقع ہوگئی تھی اس کا تدارک اس حضور بلا واسطہ سے فرماتے تھے اور ہر چند کہ یہ تدارک ہر ذکر سے ہوسکتا تھا مگر وہ غیبت چونکہ صورۃً بعُد تھا۔ اس لئے استغفار سے اس کا تدارک مناسب تھا۔

(اور ایک جواب یہ ہے کہ ہر چند یہ گرانی طبعی ہے جس میں عاشق کا دل مجبور ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو سید العاشقین ہیں اس طبعی گرانی سے بھی استغفار کرتے تھے۔ اور آپ چاہتے تھے کہ جب مجھ کو توجہ الی الخلق کا امر ہے تو اب مجھ کو حضور بلا واسطہ کی طرف میلان اور اس حضور بواسطہ سے گرانی کیوں ہو اس لئے آپ استغفار کرتے تھے اور حق تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتے تھے ۱۲ جامع)۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنے لئے مشیخت وغیرہ کچھ تجویز نہ کرو بعض دفعہ حق تعالیٰ کسی کو صاحب ارشاد نہیں بناتے اور اپنا مقرب بنا لیتے ہیں اور اصل مقصود قرب حق ہی ہے جو صاحب ارشاد ہونے پر موقوف نہیں سو تم اپنے لئے اس کو کیوں تجویز کرتے ہو بس خدا کے سپرد کرو۔

قربانی میں فنا و بقا کا زیادہ ظہور ہے

نیز میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو تعلقات شرعاً مطلوب نہیں ہیں وہ عذاب ہیں ایسے تعلقات کے ساتھ حیات طیبہ حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ وہ تو معیشۃ ضنک (روزی تنگ) ہے ان تعلقات کو قطع کرنا چاہیئے اور ان کا قطع کرنا مجاہدہ ہے جو کہ فنا کہلاتا ہے اس کے بعد رضائے حق نصیب ہوتی ہے وہ بقا ہے اور یہی حقیقت ہے قربانی کی اور ہر چند کہ یہ فنا و بقاء ہر عمل میں ظاہر ہوتا ہے مگر قربانی میں اس کا ظہور زیادہ ہے اس لئے قربانی سے مجاہدہ کا تعلق ظاہر ہوگیا اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مجاہدہ مقصود بالبیان جو باطن اضحیہ ہے تو یہ وہ باطن نہیں جو ظاہر کے ساتھ متقید ہو بلکہ یہ وہ باطن ہے جو ظاہر کے لئے لازم کیونکہ اس مطلق مجاہدہ کا حصول قربانی ہی پر موقوف نہیں بلکہ سب اعمال میں اس کا حصول ہوتا ہے البتہ یہ مجاہدہ لازم اضحیہ ضرور ہے کیونکہ اس عمل پر مجاہدہ کا ترتب ظاہر ہے باقی جو مجاہدہ کہ مخصوص بالاضحیہ ہے اور وہ بھی ایک قسم ہے باطن اضحیہ کی جو کہ بدون اضحیہ کے متحقق نہیں ہو سکتی وہ اس وقت مقصود بالبیان نہیں۔

شانِ نزول آیت متلوہ

اب میں اس قصہ کو بیان کرتا ہوں جس کا ذکر ان جگہ اس آیات میں کیا گیا ہے۔ پھر اس کی

تطبیق مضمون مجاہدہ پر بیان کروں گا۔ قصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مالدار شخص تھا اس کے وارثوں نے طمع مال میں اس کو قتل کر دیا تھا کہ جلدی سے اس کے مال پر قبضہ ہو جائے قتل کر کے پھر خود ہی خون کے مدعی ہو گئے جب قاتل خود مدعی ہو تو قاتل کا پتہ کون دے۔ اس لئے سب کی رائے ہوئی کہ اس قصہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے جایا جائے وہ وحی وغیرہ سے قاتل کا پتہ بتلا دیں گے۔ چنانچہ سب لوگ آپ کے پاس آئے آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا تو وہاں سے ایک جانور ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً (جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم کو ایک بیل ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں) بقرہ سے خاص گائے مراد نہیں اور نہ اس میں تاء تانیث کے لئے ہے بلکہ تاء وحدت کے لئے ہے اور بقرہ گائے بیل دونوں کو عام ہے اور بظاہر اس جگہ بیل ہی مراد ہے کیونکہ آگے اس کی صفت میں یہ بات مذکور ہے لَا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ کہ وہ کام کاج میں پامال نہ ہو زمین کو جوتتا اور کھیتی کو پانی نہ دیتا ہو اور یہ شان بیل کی ہوتی ہے۔ گائے سے ہل نہیں چلاتے نہ اس سے کھیتی کو پانی دیتے ہیں ہاں اس زمانہ میں اگر گائے سے بھی یہ کام لیا جاتا ہو تو خیر۔ ممکن ہے اس وقت گائیں مضبوط ہوتی ہوں جو بیل کا کام دیتی ہوں جیسے بعض لوگ عورتوں سے چور مروایا کرتے ہیں بعض عورتیں اللہ کی بندیاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ مردوں کی طرح چور کو مار لیتی ہیں۔ اور جس طرح بعض عورتیں بہادر ہوتی ہیں ایسے ہی بعض مرد عورت ہوتے ہیں۔

سورۃ البقرہ میں بقرہ سے مراد

لکھنو کے ایک شاہزادے بیٹھے ہوئے تھے چھت سے سانپ گرا تو آپ فرماتے ہیں ارے کوئی مردوا ہے کسی سے کہا اور حضور آپ بھی تو ماشاءاللہ مرد ہیں تو بولے واللہ خوب یاد دلایا۔ لاٹھی لانا، پھر نہ معلوم وہ سانپ ان سے مرا بھی یا نہیں مگر آپ ایسے مرد تھے کہ دوسرے کے یاد دلانے سے اپنا مرد ہونا معلوم ہوا۔

غرض ایک جانور کے ذبح کا حکم ہوا جو گائے تھی یا بیل تھا اب میں اس کی تذکیر و تانیث کی کہاں تک رعایت کروں، جیسے ایک بنئے نے رعایت کی تھی، ایک ہجڑے نے بنئے کی دکان پر سے مُرمُرے اٹھا کر کھانا شروع کئے تو اب وہ اس سے کہتا ہے میرے تمام مُرمُرے کھا گیا کھا گئی میاں کے ایسی دھول ماروں گا کہ بی بی کی پگڑی وہاں جا کر گرے گی۔ ظالم نے اپنے کلام میں ہجڑے

کے دونوں صفات کی رعائت کی مرد ہونے کی بھی عورت ہونے کی بھی کبھی اس کو میاں کہا کبھی بی بی تو میں کہاں تک اس کی رعایت کروں کہ کبھی مذکر کا صیغہ استعمال کروں کبھی مؤنث کا بس میں تو سیدھا بقرہ کہوں گا مگر اس سے عربی کا بقرہ مراد ہوگا اردو کا نہیں۔ شاید آپ کہیں کہ اردو کا بقرہ کیسا تو سنئے۔

ایک بیرسٹر صاحب نے میرٹھ کے ایک مقدمہ میں جو قربانی گاؤ کی متعلق تھا۔ ہندوؤں کی طرف سے دعوے کیا گیا تھا کہ حضور مسلمانوں کے مذہب میں تو بکرے ہی کی قربانی ہے، گائے کی قربانی ہے ہی نہیں۔ گائے تو محض ہندوؤں کے جلانے کو ذبح کرتے ہیں اور دلیل یہ بیان کی کہ دیکھ لیجئے جس عید میں قربانی ہوتی ہے اس کا نام ہی بقرعید ہے یعنی بکرے کی عید۔ اس احمق نے یہ سمجھا کہ بقر بکرے کی عربی ہے کاف کو قاف بنا کر بقر کر لیا (یا اردو والوں نے قاف کو کاف بنا کر بکرا بنا لیا ۱۲)۔

مسلمانوں کے وکیل نے کہا حضور بس اسی پر فیصلہ ہے عربی لغت منگوا کر دیکھ لیا جائے کہ بقر کے معنے گائے کے ہیں یا بکرے کے۔ ایسے عقلاء کی وجہ سے میں نے کہا تھا کہ بقرہ عربی کا مراد ہوگا اردو کا نہیں۔

تو جب بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے آ کر قصہ عرض کیا انہوں نے جناب باری سے دعا کی وہاں سے حکم ہوا کہ ایک بقرہ ذبح کرو اور یہ نہیں بتلایا کہ بقرہ ذبح کرنے سے کیا ہوگا قاتل کا پتہ اس سے کیونکر معلوم ہوگا کیونکہ آقا کو کچھ ضرورت نہیں ہے پوری بات بیان کرنے کی اور اپنے احکام کی علت وحکمت اور غایت بتلانے کی مگر غلام کا ادب یہ ہے کہ چوں وچرا نہ کرے جو حکم ہو فوراً بجا لائے اور جتنی بات کہی جائے اس کی جلدی تعمیل کر دے چاہے اس کا فائدہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر بنی اسرائیل نے ایسا نہ کیا وہ چون وچرا میں پڑ گئے حکم کے سنتے ہی نبی پر اعتراض کر دیا۔ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کیا آپ ہم سے مسخرہ پن کرتے ہیں۔

حکیم کے احکام حکم سے خالی نہیں

منشا بنی اسرائیل کی اس غلطی کا یہ ہوا کہ وہ تو قاتل کو دریافت کرنے آئے تھے اور یہاں حکم ہوا ذبح بقرہ کا تو وہ سوچنے لگے کہ سوال وجواب میں جوڑ کیا ہوا ہمیں قاتل کا پتہ پوچھنا تھا اس کا جواب یہ تھا کہ نام بتلا دیتے فلاں ہے یا فلاں یہ بے جوڑ حکم کیسا کہ بقرہ ذبح کرو، یہ تو وہی ہوا ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ مگر انہوں نے اپنے اور خداوند تعالیٰ کے تعلق پر نظر نہ کی وہ تو غلام تھے ان کو جوڑ بے جوڑ سے کیا لینا تھا جو حکم ہوا تھا فوراً تعمیل کر دیتے۔ دیکھئے اگر آپ اپنے نوکر کو حکم دیں کہ حکیم صاحب سے فلاں مرض کے لئے نسخہ لکھوا لاؤ اور وہ نسخہ لکھوا کر لائے جس میں شربت بنفشہ اور

شیرۂ بادام لکھا ہوا تھا نسخہ کو دیکھ کر نوکر سے کہے کہ بازار سے ایک آنہ کے کوئلے لے آؤ وہ نوکر سوچنے لگے کہ نسخہ میں تو کوئلہ کہیں نہ لکھا تھا یہ نسخہ کو کیا سمجھ گئے مگر وہ خاموش ہو کر چلا گیا اور کوئلے لے آیا پھر آقا نے کہا انگیٹھی اور دیگچی لاؤ اس پر اسے اور حیرت ہوئی کہ نسخہ میں ان چیزوں کا ذکر نہ تھا مگر اس نے حکم کی تعمیل کی اس کے بعد آقا نے بنفشہ پانی میں ڈال کر انگیٹھی پر رکھا اور کوئلے دھکا کر اسے جوش دیا پھر چھان کر شکر میں قوام کیا پھر ٹھنڈا کر کے بوتل میں بھرا تو اب نوکر کی آنکھیں کھلیں اور وہ سمجھا کہ نسخہ میں جو شربت لکھا تھا اسی کے تیار کرنے کے لئے یہ سب سامان کیا گیا تھا۔ اس نوکر نے شربت تو دیکھا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ اس طرح تیار ہوتا ہے وہ سمجھتا تھا کہ بس شہد کی طرح یہ بھی بنا بنایا آتا ہوگا اس لئے اس کو کوئلوں اور دیگچی کے منگانے سے حیرت ہوئی مگر اخیر میں یہ بات دیکھ کر اپنی خاموشی پر شکر کرتا ہوگا کہ اچھا ہوا میں نے آقا سے کاوش نہ کی ورنہ اس وقت مجھے بہت شرمندہ ہونا پڑتا۔ اسی طرح بنی اسرائیل کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ حق تعالیٰ حکیم ہے ان کے احکام میں کچھ حکمت ہوگی۔ ہم نہ سمجھیں تو کیا ہے مگر انہوں نے اپنی عقل سے چون و چرا کو دخل دیا یہ خلاف ادب ہے خوب سمجھ لو اول تو انہوں نے ذبح بقرہ کے حکم کو معاذ اللہ اس پر محمول کیا کہ موسیٰ علیہ السلام ہم سے دل لگی کرتے ہیں، یہ نبی کا ادب تھا، بھلا نبی ان سے مسخرہ پن کیوں کرنے لگے تھے اور اگر مزاح کرتے بھی تو اس کے لئے وقت موقعہ ہوتا ہے یہ کیا موقعہ تھا مزاح کا کہ لوگ تو ایک مقدمہ فیصل کرانے آئیں اور نبی ان سے دل لگی کریں۔ پھر دل لگی بھی اس عنوان سے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً (اللہ تعالیٰ تم کو ایک بیل ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں) خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک حکم کو منسوب کر کے اگر یہ بھی دل لگی ہوسکتی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ معاذ اللہ موسیٰ علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کی طرف یہ حکم غلط منسوب کر دیا تھا استغفر اللہ۔ بھلا اس عنوان سے کچھ بھی مزاح کا احتمال ہوسکتا ہے ہرگز نہیں مگر بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو بے دھڑک کہہ دیا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (کیا آپ ہم سے مسخرہ پن کرتے ہیں) موسیٰ علیہ السلام نے لرز کر ڈر کر فرمایا اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ (نعوذ باللہ جو میں جہالت والوں کا سا کام کروں) بتلا دیا کہ احکام الٰہیہ بیان کرتے ہوئے دل لگی کرنا جہالت ہے اور نبی جہالت سے معصوم ہے پھر تمہارا اپنے پیغمبر کو ایسی بات کہنا گنوار پن کی دلیل ہے۔ اب ان کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ حکم خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے چاہیئے تھا کہ اب دیر نہ کرتے فوراً تعمیل کر دیتے مگر چونکہ ان کو یہ خلجان ہو رہا تھا کہ ذبح بقرہ کو قاتل کے پتہ سے کیا جوڑ ہے۔ اس لئے مختلف حالات میں پڑ کر متردد ہو گئے اور سوچنے لگے کہ شاید کوئی

خاص بقرہ ہوگا جس کو اس کام میں دخل ہوگا اس لئے سوال کیا قَالُوْا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ کہنے لگے اے موسیٰ علیہ السلام اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ صاف صاف ہم کو بتلا دیں وہ بقرہ کیا چیز ہے یعنی کیسی ہے۔

قرآن کو ہمیشہ مذاق عربیت پر سمجھنے کی ضرورت

مَا هِیَ سے اصطلاح معقول پر سوال مراد نہیں جو سوال حقیقت کے لئے موضوع ہے کیونکہ حقیقت تو ان کو معلوم ہو چکی تھی کہ بقرہ ہے بلکہ مَاهِیَ سے سوال صفات مراد ہے ای ما صفاتها (اس کی صفات کیا ہیں) اور محاورات میں مَاهِیَ سے سوال صفات بھی ہوتا ہے یہاں محاورات ہی کے موافق استعمال ہے لوگ غضب کرتے ہیں کہ قرآن مجید کو اصطلاحات فنون حاصل کرنے کے بعد پڑھتے ہیں۔ پھر ان اصطلاحات کو قرآن مجید میں جاری کرتے ہیں جس سے اشکال پڑتا ہے اور خوامخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ بھلا قرآن کریم کو اصطلاحاتِ فنون کا اتباع کس دلیل سے لازم ہے۔ قرآن کو ہمیشہ مذاق عربیت اور محاورات پر سمجھنا چاہیئے اصلاحات علوم پر منطبق نہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ سب اصطلاحات نزول قرآن کے بعد مدون ہوئی ہیں باقی اس کا انکار نہیں کیا جاتا کہ مَاهِیَ محاورات میں بھی کبھی سوال حقیقت کے لئے آتا ہے مگر اس ہی میں منحصر نہیں۔

سوال کیفیات وصفات کے لئے بھی بہت مستعمل ہے (اور ممکن ہے کہ اس کو سوال عن الماہیۃ پر محمول کر کے کہا جائے کہ ان لوگوں نے صفات کا سوال مَاهِیَ سے اس لئے کیا ہو کہ اس عجیب بقرہ کے صفات کا مجہول ہونا گویا ان کے ذہن میں خود ذات کا مجہول ہونا تھا وہ یہ سمجھے کہ جس بقرہ کے ذبح کا ہم کو حکم ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے گائے بیلوں کے ساتھ صرف نام میں شرکت رکھتا ہے اور خواص و کیفیات میں شاید ان سب سے ممتاز ہوگا ۱۲ جامع)۔

وہاں سے جواب ملا قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِكَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ (آپ نے یہ فرمایا کہ وہ فرماتے ہیں۔ وہ ایسا بیل ہو نہ بالکل بوڑھا نہ بچہ ہو پٹھا ہو دو عمروں کے درمیان سو اب کر ڈالو جو تم کو حکم ملا ہے)۔

بے ادبی کی سزا

اب ادھر سے بھی تشدد شروع ہوا۔ کیونکہ غلام کا آقا کے حکم میں چون و چرا اور توقف کرنا

خلاف ادب ہے جس کی سزا ان کو دی گئی کہ اچھا جب تم ہمارے حکم کو بے جوڑ سمجھتے ہو (کہ اس کو ہمارے سوال سے کچھ ربط نہیں) اور اس لئے بقرہ کے بارہ میں متعجب و متردد ہو کہ شاید کوئی خاص بقرہ ہوگا تو ہم بھی ایسی قیود کا اضافہ کرتے ہیں جن سے تم کو حقیقت نظر آ جائے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہم کسی نوکر سے کہیں کہ بازار سے پانی پینے کا کٹورا خرید لاؤ۔ اس کو چاہیئے کہ اس بات کے سنتے ہی حکم کی تعمیل کرے۔ مگر نہیں اب وہ پوچھتا ہے حضور! کتنا بڑا لاؤں، یہ سوال محض لغو ہے کیونکہ پانی پینے کا کٹورا سب جانتے ہیں کتنا بڑا ہوا کرتا ہے۔ مگر اس کی اس کاوش پر کہا جاتا ہے کہ اتنا بڑا ہو جس میں پورا آدھ سیر پانی آتا ہو نہ اس سے زیادہ ہو نہ کم اگر کچھ بھی کم و بیش ہوا تو واپس کر دیں گے۔ لیجئے اب اس کے لئے دن بھر کا دھندا ہو گیا کہ پھرے ٹکریں مارتا ہوا سارے بازار میں۔ اگر وہ سنتے ہی حکم کی تعمیل کر دیتا تو یہ مصیبت نہ اٹھانی پڑتی اسی طرح بنی اسرائیل نے چون وچرا کر کے خود اپنے سر مصیبت دھری ورنہ کوئی سی گائے بیل بھی ذبح کر دیتے تو کافی ہو جاتا۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔ لَوْ ذَبَحُوا اَیَّ بَقَرَةٍ اَجْزَاتْھُمْ وَلٰکِنْ شَدَّدُوْا فَشَدَّدَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ (اگر وہ کوئی سا بیل بھی ذبح کر ڈالتے تو ان کو کافی ہوتا لیکن انہوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے ان پر سختی ڈال دی) اب ان کے سوال پر یہ قید بڑھائی گئی کہ وہ بقرہ نہ تو عمر رسیدہ ہو نہ بچہ ہو بلکہ درمیانی عمر کا ہو یہ قید بھی کچھ زیادہ سخت نہ تھی کیونکہ اس شان کے بیل گائے بھی بہت دستیاب ہو سکتے ہیں اور خیر خواہی اور شفقت کے طور پر یہ بھی کہہ دیا گیا فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ کہ جو کچھ تم کو حکم دیا گیا ہے اس کو کر ڈالو۔ اس میں زیادہ کاوش نہ کرو مگر وہ کب ماننے والے تھے ان کو اس صفت سے اور تردد پیدا ہو گیا کہ یہ تو کوئی خاص صفت نہ ہوئی ایسی گائے بیل تو بہت موجود ہیں اس لئے دوبارہ پھر سوال کیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُھَا یعنی ہم کو یہ بھی بتلا دیا جائے کہ اس کا رنگ کیسا ہے وہاں سے رنگ بھی متعین کر دیا گیا۔ قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُھَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ کہ وہ بقرہ زرد رنگ کا ہو جس کی زردی خوب گہری ہو جو اپنے رنگ سے دیکھنے والوں کو خوش کر دے ان کو اس سے بھی تسلی نہ ہوئی کیونکہ اس رنگ کی بھی بہت سی گائے بیل تھیں اور وہ لوگ تعیین جزئی کے طالب تھے کہ بس ایسا پتہ نشان بتلا دیا جائے جس میں غیر کا احتمال ہی نہ رہے (مثلاً یہ کہہ دیا جائے کہ وہ گائے یا بیل جو فلاں جنگل میں فلاں کھیت میں ایسے ایسے درخت کے پاس چر رہا ہے یا وہ بیل جو فلاں شخص کے پاس ہے وغیرہ وغیرہ) اور حق تعالیٰ کی طرف سے

جتنی صفات بتلائی گئیں وہ سب صفات کلیہ تھیں اور قاعدہ ہے کہ صفات کلیہ چاہے کتنی ہی ہوں ان سے تعیین نہیں ہوتی احتمال شرکت باقی رہتا ہے جیسے ایک وہمی کا قصہ ہے کہ وہ نماز میں جب کسی امام کی اقتدا کرتا تو پہلے یہ کہتا کہ اقتداء کرتا ہوں میں اس امام کی جو میرے آگے ہے اس سے بھی تسلی نہ ہوتی تو پھر کہتا کہ جس کا لباس ایسا ہے جس کا یہ نام ہے پھر وہم ہوتا کہ شاید میں نے پہچاننے میں غلطی کی ہو اور اس کا یہ نام ہو تو پھر اس کی کمر میں انگلی چبھو کر کہتا کہ پیچھے اس امام کے۔ تو یہ شخص اس حقیقت کو سمجھا کہ صفات کلیہ سے تعیین نہیں ہوتی تعیین اشارۂ جزئیہ سے ہوتی ہے وہ بھی اس طرح کہ اس پر ہاتھ رکھ دیا جائے۔

اسی طرح بنی اسرائیل کو بھی ان صفات سے تسلی نہ ہوئی تو سہ بارہ پھر سوال کیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّآ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ (کہنے لگے ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں ہم کو اس بیل میں اشتباہ ہے اور ہم ان شاء اللہ ضرور ٹھیک سمجھ جائیں گے)۔

یعنی ایک مرتبہ اور بتلا دیا جائے کہ وہ بقرہ کیسی ہے ان صفات سے تو تعیین نہیں ہوئی بلکہ اس شان کے بہت افراد ہیں جن میں ہم کو تشابہ والتباس ہو رہا ہے ہم متردد ہیں کہ کون سا بقرہ ذبح کریں ایک دفعہ اور وضاحت کر دی جائے ان شاء اللہ ہم راہ پا جائیں گے یعنی سمجھ جائیں گے۔ اس مرتبہ یہ خیر ہوئی کہ ان کے منہ سے ان شاء اللہ نکل گیا۔

اِن شاء اللہ کی برکت

حدیث میں آتا ہے وَلَوْلَمْ يَسْتَثْنُوْا لَمَا بُيِّنَ لَهُمْ اٰخِرَ الْاَبَدِ (او کما قال) یعنی بنی اسرائیل اگر استثناء نہ کرتے (یعنی ان شاء اللہ نہ کہتے) تو قیامت تک ان کو پتہ نہ دیا جاتا مگر ان شاء اللہ کی برکت سے یہ سلسلہ سوالات وجوابات کا جلدی ہی ختم ہو گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا قَالَ إِنَّهٗ يَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ (موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نہ وہ ہل چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جاتی ہے نہ اس سے زراعت کی آب پاشی کی جائے سالم ہو اس میں کوئی داغ نہ ہو کہنے لگے اب آپ نے پوری بات فرمائی اور اس کو ذبح کیا اور کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے

تھے) کہ وہ ایسا بقرہ ہے جو کام کاج میں استعمال نہیں کیا گیا نہ زمین کو جوتتا ہے نہ کھیت کو پانی دیتا ہے (اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بقرہ سے بیل مراد ہے) تندرست بدن کا ہے جس پر کوئی داغ اور دھبہ ذرا نہیں مطلب یہ کہ جو جانور کھیتی وغیرہ کے کام میں مشغول ہوتا ہے اس کے بدن پر جوار کھنے کا نشان یا مار پیٹ کا نشان ہو جاتا ہے وہ ایسا نہ ہو۔ اب سمجھے کہنے لگے بس اب لائے تم ٹھیک بات۔ یہاں اشکال ہوتا ہے کہ اخیر میں بھی تو کچھ زیادہ تعیین نہیں ہوئی کیونکہ اس میں بھی تو صفات کلیہ ہی ہیں جزئیات نہیں اور تعیین جزئیات سے ہوتی ہے نہ کلیات سے اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر میں استثناء کی برکت سے ان کے لئے بیان ہو گیا تھا (جس سے متبادر یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ وضاحت ہو گئی تھی ۱۲)۔

بعض افعال کی تاثیر

حالانکہ بظاہر اب بھی پہلے سے کچھ زیادہ وضاحت نہیں ہوئی جو صفات اخیر میں مذکور ہوئی ہیں اس شان کے بیل بھی بہت ہوتے ہیں تو بات یہ ہے کہ گو تعیین جزئی اب بھی نہیں ہوئی مگر ان کی تسلی اس طرح ہو گئی کہ ان کے ذہن سے ان شاء اللہ کی برکت سے وہ مقدمات واہیہ نکل گئے اور وہ سمجھ گئے کہ تعیین جزئی ہم کو نہ بتلائی جائے گی اس لئے کاوش فضول ہے یہ کیا تھوڑی برکت ہے ان شاء اللہ کی کہ ان کی فہم درست ہو گئی۔ غرضیکہ اس کے بعد جانور کی تلاش ہوئی اور اس قدر گراں قیمت میں ان صفات کا جانور ملا کہ بقرہ کی کھال میں سونا بھر کر دینا پڑا مگر اس گرانی سے بنی اسرائیل گھبرائے نہیں خرید کر ذبح ہی کر دیا حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ کہ انہوں نے اس کو ذبح کر دیا اور وہ کرنے والے تھے نہیں۔ یہاں سے ان شاء اللہ کی برکت معلوم ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض افعال کی تاثیر ایسی ہوتی ہے جو ظاہر ہو کر رہتی ہے گو محل زیادہ قابل نہ ہو (یعنی فاعل ان افعال کا چاہے کیسا ہی ہو پورا قابل یا کم قابل مگر فعل کا اثر ضرور ظاہر ہو کر رہتا ہے) اور راز اس میں یہ ہے کہ بعض افعال مؤثر بالخاصہ ہوتے ہیں جیسے بعض ادویہ مؤثر بالخاصہ ہوتی ہیں کہ خصوصیت مزاج ان کے اثر کو نہیں روک سکتی تو جب بنی اسرائیل کے ان شاء اللہ کا یہ اثر ہوا کہ ان کی فہم اس کی برکت سے درست ہو گئی حالانکہ وہ کچھ زیادہ مؤدب بھی نہ تھے ان کا ادب تو اسی سے ظاہر ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ خطاب کیا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (کیا آپ ہم سے مسخرہ پن کرتے ہیں) پھر حکم الٰہی میں چون و چرا کی اور سب سے بڑی ادب کی بات تو

وہ تھی جوانہوں نے اخیر میں کہی یعنی اَلْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ کہ اب لائے ٹھیک بات گویا اس سے پہلے جو کچھ کہا تھا وہ ٹھیک نہ تھا اور یہ جملہ اس وقت کہا جب ان شاء اللہ کی برکت سے راہ پر آ گئے تھے فہم درست ہوگئی تھی تو جن کا سمجھ آ جانے کے بعد یہ ادب ہے ان کا مؤدب ہونا ظاہر ہے مگر پھر بھی ان شاء اللہ نے اپنا اثر کیا گو قائل زیادہ قابل نہ تھے بلکہ نا قابل تھے (اور لیجئے حدیث میں آتا ہے کہ یاجوج وماجوج سد سکندری کو روزانہ چاٹ چاٹ کر ورق کر دیتے ہیں اور شام کے وقت یہ کہہ کر چل دیتے ہیں کہ بس کل کو آ کر توڑ دیں گے، رات کو دیوار پھر ویسی ہو جاتی ہے جیسی تھی۔ تو پھر آ کر چاٹتے ہیں روزانہ ان کا یہی شغل ہے یہاں تک کہ اخیر میں ایک دن ان کے منہ سے یہ نکلے گا کہ انشاء اللہ کل کو آ کر توڑ ڈالیں گے۔ ان شاء اللہ کی برکت سے اس رات دیوار اپنی اصلی حالت پر عود نہ کرے گی ویسی ہی ورق جیسی رہے گی جیسے وہ چھوڑ کر جائیں گے اور اگلے دن آ کر توڑ ڈالیں گے۱۲) پس اندازہ کر لیجئے کہ اگر کوئی مخلص باادب ان شاء اللہ کہے گا تو کیا اثر ہوگا۔

شریعت کے بعض احکام کی خاصیت

اور یہاں سے میں ایک اور مضمون پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جس طرح انشاء اللہ میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے کام آسان ہو جاتا ہے گو قائل کیسا ہی ہو (کافر ہی کیوں نہ ہو۱۲) اسی طرح شریعت کے بعض احکام میں یہ خاصیت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے ترقی حاصل ہوتی ہے گو فاعل کیسا ہی ہو۔ آج کل ترقی کی پکار بہت ہے ہر شخص ترقی کا طالب ہے اور دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر بھر آتا ہے اور ان کے لیڈر بار بار اس میں غور کرتے ہیں کہ دوسری قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے مگر اب تک حقیقت تک کوئی نہیں پہنچا کسی نے کہا کہ یہ لوگ سود لیتے ہیں اس وجہ سے ترقی ہو رہی ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اگر اس میں یہ خاصیت ہوتی تو چاہیئے کہ جو مسلمان سود لیتے ہیں ان کو بھی ترقی ہوتی حالانکہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں وہ بھی کچھ ترقی یافتہ نہیں ہیں بعضے کہتے ہیں کہ شریعت میں چوں کہ تجارت کی بعض صورتوں کو ناجائز قرار دیا ہے اس لئے مسلمان ترقی نہیں کر سکتے مگر یہ بھی غلط ہے کیونکہ معاملات میں حدود شرعیہ کے پابند کتنے تاجر ہیں ذرا مجھے تو بتلاؤ ان شاء اللہ دو چار کے سوا کوئی نہ ملے گا پھر ان مسلمان تاجروں کو ترقی کیوں نہیں ہوتی یہ کون سے ناجائز معاملات کو چھوڑ دیتے ہیں غرض سب کی مشق اسلام پر ہے کہ مذہب ہی ترقی سے مانع ہے چنانچہ بعض کی زبان پر تو یہ لفظ صاف صاف آ گیا اور بعض نے مذہب کو تو کچھ نہیں کہا لیکن مولویوں پر

نزلہ اتارا کہ یہ علماء ترقی سے مانع ہیں مگر یہ بھی غلط ہے، واللہ ہم تو سب سے زیادہ تمہاری ترقی کے طالب ہیں اور وہ طریقہ تم کو تعلیم کرتے ہیں جس پر چلنے کے واسطے ترقی لازم ہے۔

علماء ترقی سے مانع نہیں

ایک بار میں نے ایک ایسے جلسہ جس میں جنٹلمین بکثرت شریک تھے یہی مضمون بیان کیا تھا میں نے کہا کہ لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں۔ آج میں اس الزام کو دفع کرنا چاہتا ہوں اور اس وقت میں ترقی کی ضرورت ہی پر بیان کروں گا۔ اس پر جنٹلمین چونکے کہ یہ ملا آدمی اور ترقی کا بیان؟ میں نے کہا کہ آپ تو ترقی کو صرف عقلی ضروری ہی کہتے ہیں اور میں اسے شرعی فرض کہتا ہوں اس پر اور بھی حیرت ہوئی میں نے کہا حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ یعنی ہر قوم کے لئے ایک جہت قبلہ مقرر ہے جس کی طرف وہ منہ کرتی ہے پس ایک دوسرے پر سبقت کرو اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہم کو استباق کا حکم دیا ہے جس کے معنے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کے ہیں اور یہی حاصل ہے ترقی کا تو ترقی کی ضرورت قرآن سے ثابت ہے بلکہ اِسْتَبِقُوْا (ایک دوسرے پر سبقت کرو) صیغہ امر ہے جس کا مقتضیٰ وجوب ہے تو یوں کہنا چاہیئے کہ قرآن میں ترقی کو واجب وفرض کیا گیا ہے تو اب جو لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں وہ ان پر کتنا بڑا افترا کرتے ہیں بھلا جس چیز کا قرآن میں امر ہے علماء کی مجال ہے کہ اس سے منع کرسکیں پس ترقی کا ضروری ہونا تو متفق علیہ ہے البتہ اس کے طریقہ میں اختلاف ہے۔

جنٹلمین کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کہیں اس طرح ترقی کرو اور علماء کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کہے اس طرح ترقی کرو۔ سو قرآن مجید میں فَاسْتَبِقُوْا کے ساتھ الْخَيْرَاتِ کی بھی قید ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ نیک کاموں میں ترقی کرو۔ اب اس اختلاف کا فیصلہ بہت جلد ہوسکتا ہے آپ یہ ثابت کردیں کہ جس ترقی کے آپ خواہاں ہیں وہ ترقی فی الخیر ہے یا ترقی فی الشر اگر ترقی فی الخیر ہے تو میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ علماء آپ کو اس ترقی سے منع نہ کریں گے اور اگر ترقی فی الشر ہے تو اس کا مطلوب نہ ہونا بلکہ مذموم ہونا تمام عقلاء کے نزدیک مسلم ہے ورنہ پھر ایک ڈاکو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ مجھے ڈاکہ سے کیوں منع کیا جاتا ہے میں تو ترقی کا طالب ہوں بتلایئے آپ اسے کیا جواب دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تیری یہ ترقی ترقی محمود نہیں بلکہ ترقی مذموم ہے جو کہ بُرے طریقہ سے حاصل کی جاتی ہے۔

صرف ترقی محمود مطلوب ہے

معلوم ہوا کہ ترقی مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ وہی مطلوب ہے جو محمود ہو مذموم نہ ہو پس اب یا تو آپ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ طالب ہیں وہ محمود ہے مذموم نہیں جس کی تعلیم آپ دے رہے ہیں۔ اس تقریر سے بہت جلد سمجھ گئے اور اقرار کر لیا کہ واقعی علماء کو ترقی سے اختلاف نہیں بلکہ اس کے طرق تحصیل سے اختلاف ہے کیونکہ ان طرق نے خلاف شرع ہونے کی وجہ سے اس ترقی کو ترقی فی الشر کا مصداق بنا دیا ہے۔ غرض دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور وہ ان کی ہر حالت کو ترقی میں دخیل سمجھ کر اختیار کرتے جاتے ہیں۔ کبھی ان کی صورت وضع کو اختیار کرتے ہیں کہ شاید اس کو ترقی میں دخل ہو. کبھی عورتوں کے پردہ کو اٹھانا چاہتے ہیں کہ یہی ترقی سے مانع ہے اگر عورتیں آزاد ہوں گئیں تو علوم وصنعت وحرفت سیکھ کر خود بھی ترقی کریں گی اور اولاد کو بھی ترقی یافتہ اٹھائیں گی۔

بے پردگی کو ترقی میں کچھ دخل نہیں

ایک صاحب نے میرے سامنے یہی دلیل بیان کی تھی میں نے کہا کہ مسلمانوں میں صرف شرفاء کی عورتیں پردہ نشین ہیں جن کی تعداد ہندوستان میں بہت کم ہے زیادہ تعداد چھوٹی قوموں کی ہے اور ان میں پردہ کا ہمیشہ سے رواج نہیں ہے اگر بے پردگی کو ترقی میں کچھ دخل ہے تو ان قوموں نے کیوں نہ ترقی کر لی، بس اس کا جواب کچھ نہ تھا وہ میرے منہ کو تکنے لگے یہاں تک مذاق بگڑا ہے کہ بعض لوگ تشبیہات غلط بولنے کو ترقی میں دخیل سمجھتے ہیں۔

محاورات اردو کا قصداً غلط استعمال ترقی کا سبب نہیں

ہم نے کانپور کے سٹشن پر ایک خانساماں کو سنا کہ وہ ایک شخص سے کہتا ہے "ہم یہ سننا نہیں مانگتا" میں نے کہا جا کمبخت تجھے اردو غلط بولنے پر کس مصیبت نے مجبور کیا بھلا انگریز تو اس لئے غلط بولتے ہیں کہ ان کو زبان نہیں آتی تجھے کس مصیبت نے گھیرا بس کچھ نہیں صاحب بہادر بننے کا شوق ہے اردو غلط بولنے کو بھی صاحب بہادری میں دخیل سمجھتے ہیں صاحب بہادر بننے پر مجھے ایک اور حکایت یاد آئی۔ مظفر نگر اور میرٹھ کے ضلع میں کچھ چمار عیسائی ہو گئے ہیں۔

عیسائی بننے کے بعد انہیں صاحب بہادر بننے کا شوق ہوا بلکہ یوں کہئے کہ یہی شوق ان کو عیسائیت کی طرف داعی ہوا اب ان کی حالت یہ ہے کہ شام کو پھٹے پرانے بوٹ سوٹ (جو انگریزوں

کے یہاں سے اتارن کے طور پر مل جاتا ہوگا) پہن کر نکلتے ہیں اور سڑک پر ٹہلتے ہیں اور کھانا اس طرح کھاتے ہیں کہ گھڑوں کو اوندھا کر کے ان پر بیٹھ گئے گویا کرسی ہے اور گھڑے کو اوندھا کر کے اس پر بجھڑے کی روٹی کے ٹکڑے رکھ لئے یہ میز ہے اور ببول کے کانٹوں سے وہ ٹکڑے اٹھا اٹھا کر کھاتے ہیں کیا دماغ سڑے ہیں۔ انہی چماروں میں سے ایک شخص برسات کے دنوں میں کہیں جا رہا تھا راستہ میں بارش آئی تو قریب ہی نہر کا ڈاک بنگلہ تھا جہاں ظہور علی نام ایک چوکیدار رہا کرتا تھا اس وقت وہ اپنی کوٹھڑی کے کواڑ بند کر کے سو رہا تھا تو یہ چمار صاحب چوکی پر پہنچے اور ظہور علی کو پکارنا شروع کیا، اے جہور لی، اے جہور لی کواڑ کھول صاحب کھڈے بھجیں (کھڑے بھیگیں) وہ غریب یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی انگریز دورہ میں ہوگا وہ بھیگ رہا ہوگا بارش سے پناہ لینے یہاں آ گیا فوراً گھبرا کر اٹھا اور جلدی سے کیواڑ کھولے دیکھا تو وہاں چمار کے سوا کوئی نہیں پوچھا ابے وہ صاحب کہاں۔ تو کہتا کیا ہے اور ہم ہیں نہیں۔ ظہور علی نے کہا آئیں تجھے صاحب بناؤں اور جوتہ نکال پانچ چھ لگائے تو اس چمار نالائق کا ایسا دماغ سڑا کہ اپنے منہ سے اپنے آپ کو صاحب کہتا تھا۔

اسی طرح اس خانساماں کا دماغ خراب ہوا تھا کہ سیدھی صحیح اردو چھوڑ کر کہتا تھا "ہم یہ بات سننا نہیں مانگتا" افسوس انگریز تو کوشش کرتے ہیں صحیح اردو بولنے کی اور وہ محض مجبوری کی وجہ سے غلط بولتے ہیں اور ہندوستانی ان کی دیکھا دیکھی صحیح اردو کو چھوڑ کر غلط بولنا اختیار کرتے ہیں بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ تمہارے اوپر کیا خدا کی مار پڑی۔ انگریزوں کی کوشش کا تو یہ حال ہے کہ ایک انگریز نے اردو بڑی کوشش سے سیکھی تھی اور اس کو اپنی اردو دانی کا دعویٰ تھا گو اس کا یہ دعوے صحیح نہ تھا کیونکہ غیر اہل زبان بھی دوسری زبان میں اہل زبان کے برابر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اسی انگریز کا واقعہ ہے کہ ایک دن وہ صبح کو اٹھا تو طبیعت خراب تھی کسی ملاقاتی نے پوچھا حضور کا مزاج کیسا ہے۔ کہنے لگا ہماری طبیعت خراب ہے آج رات سے ہم کو لید نہیں ہوئی یہ اردو دانی تھی کہ انسان کے پاخانہ کو بھی لید کہتا تھا۔ واقعی چاہے کیسے ہی کوشش کی جائے دوسری زبان صحیح طور پر کم آتی ہے۔

زباں دان اہل زبان کی برابری نہیں کرسکتا

ایک ایرانی ہندوستان میں آیا تھا اور اردو صاف بولنے لگا تھا اسے بھی اپنی اردو دانی کا دعویٰ تھا، لوگوں نے کہا ہم آپ کے سامنے قصداً آسان آسان باتیں کرتے ہیں جن کو آپ جلدی سمجھ لیتے ہیں اگر ہم اردو کے محاورات آپ کے سامنے بولیں تب معلوم ہو کہ آپ کتنے اردو داں ہیں اس نے کہا واہ ہم سب سمجھ جائیں گے، لوگوں نے کہا اچھا بتلایئے اس جملہ کے کیا معنی ہیں، چھبیلی رنگیلی، رسیلی تو آپ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ "کشش گر بہ رنگین رسن گرفت" چھبیلی کو چھ

بلی بنایا اور رسیلی کو رسی لی یعنی چھ رنگین بلیوں نے رسی لی۔ کیا بگاڑا ہے مضمون کو۔

حکایت زباں داں فارسی شاعر

اسی طرح ایک ہندی ایران رہ کر آیا تھا۔ ہندوستان آ کر اس نے فارسی دانی کا دعویٰ کیا۔ ایک ایرانی نے سنا اس کو جوش آیا کہ ہندی کو فارسی دانی کا دعوی یہ نہیں ہوسکتا وہ اس کا امتحان لینے آیا اور اس سے کہا کہ اپنا کوئی شعر سناؤ۔ اس نے فی البدیہہ ایک شعر تصنیف کیا جو ظاہر میں بہت ہی عمدہ شعر تھا۔

سیہ چوری بدست آں نگارے نازنین دیدم بشاخِ صندلیں پیچیدہ مارے آتشیں دیدم

(میں نے اس حسین نازنین کے آنکھوں میں سیاہ چوڑیاں دیکھیں جو ایسے معلوم ہوتا ہے گویا صندل کی شاخ پر گہرا سیاہ سانپ پیچ لگا کر لیٹا ہوا ہے)

مگر ایرانی نے سنتے ہی کہا تف تف یہ نازنین دیدم اور آتشیں دیدم کیسا سیدھا یوں کیوں نہیں کہتے۔

سیہ چوری بدست آں نگارے بشاخِ صندلیں پیچیدہ مارے

(اس حسینہ کے ہاتھ میں سیاہ چوڑیاں گویا صندلی شاخ پر پیچیدہ سانپ)

واقعی زباں داں کی اصلاح کے بعد اب معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شعر نہایت بھدّا تھا جس میں فضول الفاظ بھرے ہوئے تھے اور یہ ذوق زبان داں ہی کو حاصل ہوتا ہے جو دوسروں کو نہیں ہوسکتا وہ ہندوستانی باوجود ایران میں اتنے دن رہنے کے اس ذوق کو حاصل نہ کر سکا۔ غرض دوسری زبان پوری طرح نہیں آسکتی چاہے کتنی ہی کوشش کی جائے زبان داں کے برابر نہیں ہوسکتا۔ خاص کر اردو زبان تو دوسروں کو آتی ہی نہیں۔ اسی لئے ہندیوں کو قرآن ایسا نہیں آتا جیسا عرب کو، جیسا اردو عرب کو ایسی نہیں آتی جیسی ہندی کو۔

حکایت مولانا رحمت اللہ صاحب ؒ کیرانوی

ایک بار مکہ مکرمہ میں اہل عرب نے مولانا رحمت اللہ صاحب مہاجر کے سامنے ہندیوں پر اعتراض کیا کہ یہ لوگ قرآن بہت غلط پڑھتے ہیں مولانا نے جواب دیا کہ ہندی قرآن اتنا غلط نہیں پڑھتے جتنا آپ اردو غلط بولتے ہیں۔ (مطلب یہ تھا کہ اہل عرب کا قرآن صحیح پڑھنا کمال نہیں کیونکہ وہ اہل زبان ہیں اور ہندی قرآن غلط پڑھنے میں معذور ہیں کیونکہ وہ غیر اہل زبان ہیں اور غیر اہل زبان کو دوسری زبان پوری طرح نہیں آسکتی، چنانچہ اہل عرب کو اردو صحیح نہیں آتی وہ اتنی غلط اردو بولتے ہیں کہ ہندی قرآن مجید اتنا غلط نہیں پڑھتے ۱۲)۔

اس پر اہل عرب نے کہا کہ نہیں ہم اردو اتنی غلط نہیں بولتے ۔ مولانا نے کہا اچھا کہیے ٹٹو، ٹھٹھا۔ تو وہ کہتے ہیں تتو، تتا۔ مولانا ہنسنے لگے کو یہ اردو ہوئی نہ معلوم آپ کیا بول رہے ہیں ۔ بس ہندی قرآن مجید کو ایسا غلط نہیں پڑھتے ۔ خیر یہ تو مولانا نے اس وقت جواب دے دیا لیکن مولانا میں حمیت قومی بہت تھی۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ ہندیوں پر سے غلطی قرآن کا الزام رفع ہو جائے۔

قاری عبداللہ صاحبؒ عرب میں بینظیر قاری

چنانچہ اسی لئے انہوں نے مدرسہ صولتیہ قائم کیا اور واقعی مولانا اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اس مدرسہ میں بڑے بڑے کامل اساتذہ رہے ہیں۔ انہوں نے اول اپنے مدرسہ میں مصر کے ایک قاری کو جن کا نام ابراہیم سعد تھا مدرس رکھا جو اس فن میں بڑے کامل اور ماہر تھے۔ قاری عبداللہ صاحب نے انہیں سے قرأت سیکھی تھی پھر وہ مدرسہ سے علیٰحدہ ہو گئے اور قاری عبداللہ صاحب ان کے قائم مقام ہوئے یہ ایسے کامل ہوئے کہ ایک دفعہ کسی نے ابراہیم سعد کے سامنے قاری عبداللہ صاحب کی تعریف کی کہ ہندیوں میں تو قاری عبداللہ صاحب بینظیر ہیں، تو ابراہیم سعد نے فرمایا بلکہ عرب میں بینظیر ہیں۔ قاری عبداللہ صاحب کے کمال کے لئے اتنے بڑے ماہر فن کی یہ شہادت بہت بڑی شہادت ہے۔ اور واقعی قاری صاحب قرآن مجید بینظیر پڑھتے تھے۔

مسلمانوں میں جوش ہے ہوش نہیں

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ آج کل لوگ اردو غلط بولنے کو بھی ترقی میں دخیل سمجھتے ہیں حالانکہ غیر قوموں کی جو باتیں ترقی میں دخیل ہیں وہ دوسری ہیں وہ ان کی خاص صفات ہیں جو انہوں نے آپ ہی کے گھر سے لی ہیں مثلاً منتظم ہونا مستقل مزاج ہونا۔ پابند وقت ہونا۔ متحمل ہونا۔ انجام کو سوچ کر کام کرنا صرف جوش سے کام نہ کرنا ہوش سے کام لینا آپس میں اتحاد و اتفاق کرنا۔ ایک دوسرے کے راز کو چھپانا اور یہ سب باتیں وہ ہیں جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے اور ان احکام میں یہ خاصیت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے ترقی ہوتی ہے، خواہ کوئی اختیار کرے اب مسلمانوں نے تو ان احکام پر عمل کرنا چھوڑ دیا نہ ان میں اتحاد نہ ان میں اتفاق ہے نہ راز داری کا مادہ ہے نہ انتظام ہے نہ وقت کی پابندی ہے نہ انجام بینی ہے جو کام کرتے ہیں جوش سے کرتے ہیں ہوش سے نہیں کرتے اس لئے ان کو تنزل ہے اور غیر قوموں نے ان کے گھر سے چرا کر ان باتوں پر عمل کرنا شروع کر دیا تو ان احکام کی خاصیت ظاہر ہوئی کہ ان کو ترقی ہونے لگی۔

اسلاف کی شان

پھر یہ سرقہ ناقص ہے کیونکہ چور کو گھر کے اندر کی سب چیزیں معلوم نہیں ہوا کرتیں اس کو وہی چیزیں ہاتھ لگتی ہیں جو ظاہر ہوں (یا تالے کنجی میں ہوں) دبے ہوئے خزانے کی اطلاع اسے نہیں ہوا کرتی اس لئے وہ پارس کی پتھری جو آپ کے گھر میں تھی اس کی انہیں خبر نہیں ہوئی یا خبر ہوئی مگر انہوں نے بیکار سمجھ کر اس کو چھوڑ دیا کیونکہ پارس کی پتھری دیکھنے میں تو پتھری ہی ہوتی ہے اس کی خاصیت جسے معلوم ہو وہی اس کی قدر جان سکتا ہے۔ ناواقف کے نزدیک تو کانچ کا ٹکڑا اور بلور کا پتھر برابر ہے وہ پارس کی پتھری آپ کے گھر میں کیا ہے۔ ایمان و توحید و اعتقاد رسالت نماز روزہ وغیرہ افسوس آپ کو اپنے گھر کی قدر نہیں اگر آپ میں وہ صفات ہوتیں جو دوسری قوموں نے آپ سے لے لی ہیں تو پارس کی پتھری کے ساتھ مل کر آپ کو وہ ترقی ہوتی جو غیر قوموں کو خواب میں بھی کبھی نہ آئی ہوگی آپ کو وہ عروج حاصل ہوتا جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا کہ کوئی ان کے ساتھ آنکھ نہ ملا سکتا تھا مگر آج کل مسلمانوں کو اس ارشادِ الٰہی پر نظر نہیں۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرما دے گا۔ جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے ان کو ان کے لئے قوت دے گا اور ان کے اس خوف کے بعد اس کو مبدل بامن کر دے گا بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں)۔

اعمال کی بے قدری کا سبب

اور یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ان کاموں کو بھی ترقی میں کچھ دخل ہے؟ حالانکہ اس آیت میں ایمان و عمل صالح پر صاف صاف وعدہ ہے استخلاف (زمین میں خلافت) فی الارض اور تمکین کا مگر مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ نماز روزہ اور ایمان میں بھی کچھ قوت ہے اور اس سے بھی ترقی ہوتی ہے۔ افسوس جس خزانہ کو چور نے ناواقف ہو کر یا بیکار سمجھ کر چھوڑا تھا اس کی قیمت و قوت سے خود گھر والے بھی آج ناواقف ہیں یا بعض کے اعتبار سے یوں کہئے کہ بیکار ہی سمجھتے ہیں مگر

ایسوں کو تو مسلمان بھی نہ کہنا چاہیئے یہ کاہے کے مسلمان جو نماز روزہ کو بیکار سمجھیں مگر ایسے تو دو چار ہی نکلیں گے زیادہ وہی ہیں جو اپنے خزانہ کی قیمت سے ناواقف اور اس کی طاقت سے بے خبر ہیں۔ اسی لئے ان اعمال کی بے قدری کرتے ہیں۔کوئی مسلمانوں کی حالت کا تتبع (معلوم کرنا) کرے تو ان میں ہزاروں ایسے نکلیں گے جن کو کلمہ بھی نہیں آتا اور لاکھوں ایسے ملیں گے جو نماز کو جانتے بھی نہیں کہ کس چیز کا نام ہے اور بہت سے وہ ملیں گے جو کبھی سال میں ایک دو دفعہ پڑھ لیتے ہیں کبھی جی چاہا جمعہ کو بھی مسجد میں آجاتے ہیں اور جس تھوڑے سے اللہ کے بندے پانچوں وقت کی نماز کے پابند ہیں ان میں بھی قاعدہ کے ساتھ صحیح طور پر ادا کرنے والے بہت کم ہیں کسی کا رکوع غلط ہے، کسی کا سجدہ، کسی کا قومہ مفقود ہے، کسی کا جلسہ ایک گڑبڑ کر رکھی ہے تو اب آخر یہ کیا ہے بیقدری ہے یا نہیں اور بخدا یہ بیقدری اسی واسطے ہے کہ نماز کو صرف ثواب کا کام سمجھ رکھا ہے اس کے دنیوی منافع کی ان کو خبر نہیں بلکہ بعض جاہل تو نماز روزہ کو دنیوی ترقی سے مانع سمجھتے ہیں اور اگر ان کو حقیقت معلوم ہو جاتی کہ ان اعمال کو ترقی اور تمکن فی الارض میں بھی دخل ہے تو پھر دیکھئے آپ کہ مسلمان کس شوق سے ان اعمال کو بجالاتے گو اس نیت سے عمل کرنا اچھا نہیں خلوص کے خلاف ہے طاعات سے ثمرات دنیا کا قصد نہ ہونا چاہیئے وہ تو تابع ہیں خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں الغرض ترقی کے اسباب تو آپ کے گھر میں موجود ہیں اور آپ ہی کے گھر سے دوسروں نے چرائے ہیں۔ اور آپ کی یہ حالت ہے کہ دوسروں سے لیتے اور در بدر گدائی کرتے پھرتے ہیں پس وہ حال ہے۔

یک سبد پر ناں ترا بر فرق سر   تو ہمی جوئی لب نان در بدر
تا بزانوئے میان قعر آب   وز عطش وز جوع کشتی خراب

یعنی روٹیوں کا ٹوکرا تو سر پر رکھا ہوا ہے اور در بدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں دریا کے اندر کھڑے ہوئے ہیں اور پیاس کے مارے برا حال ہے۔

استیذان کا حکم

اب دیکھئے اسلام میں ایک تعلیم یہ ہے کہ جو شخص خاص مجلس میں عام نہ ہو تو اس کے پاس بدون اجازت کے نہ جاؤ اور اس میں زنانہ مکان ہی کی تخصیص نہیں بلکہ مردانہ مکان میں بھی اگر کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا ہو اس کے پاس بھی بدون اجازت کے نہ جانا چاہیئے اور زنانہ مکان میں

جس طرح دوسروں کو استیذ ان (اجازت لینا) کا حکم ہے خود گھر والے کو بھی حکم ہے کہ اپنے گھر میں بدون اطلاع کے نہ جائے ممکن ہے کوئی پردہ دار عورت آئی ہوئی ہو اگر تم بلا اطلاع چلے جاؤ گے اس کا سامنا ہو جائے گا یا ممکن ہے تمہاری ماں بہن ہی کسی وجہ سے ننگی بیٹھی ہو اپنے گھر میں دس دفعہ عورتوں کو ایسا اتفاق پیش آتا ہے اس لئے مردوں کو حکم ہے کہ اپنے گھر میں بھی بدون اطلاع کے نہ جائیں پھر اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ جب تم کسی کے پاس جانا چاہو اور وہ اجازت نہ دے بلکہ یہ کہہ دے کہ میں اس وقت نہیں مل سکتا پھر کسی وقت ملوں گا تو اس بات کا بُرا نہ مانو بلکہ لوٹ آؤ فَاِنْ قِیْلَ لَکُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْکٰی لَکُمْ (پس اگر تم سے کہا جائے لوٹ جاؤ تو تم لوٹ آؤ یہ برتاؤ تمہارے دلوں کو زیادہ صاف رکھنے والا ہے)۔

استیذان میں حکمت

اور اس میں حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ برتاؤ تمہارے دلوں کو زیادہ صاف رکھنے والا ہے کیونکہ ایسے وقت میں شرما شرمائے اگر کسی نے بلا بھی لیا تو انشراح وانبساط کے ساتھ وہ تم سے نہ ملے گا اس لئے کہ دل تو ملنے کو چاہتا ہی نہ تھا تو یقیناً اس کے قلب پر تمہاری ملاقات سے گرانی ہوگی پھر ممکن ہے کہ اس گرانی کا احساس تم کو بھی ہو جائے تو اس سے تم کو بھی دل دل میں شکایت ہوگی کہ یہ کیسا روکھا آدمی ہے کیسا بد خلق ہے جس پر میرا آنا اتنا گراں ہوا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ جب کوئی یہ کہہ دے کہ اس وقت میں نہیں مل سکتا فوراً لوٹ آؤ۔ اب اس مسئلہ میں ہم لوگ کتنی کوتاہی کرتے ہیں استیذان کا سبق ہم لوگوں نے بالکل ہی بھلا دیا۔ مگر دوسری قومیں اس پر عامل ہیں کوئی شخص کسی کے کمرہ میں بدون اجازت کے نہیں جا سکتا سو دیکھ لیجئے جو قومیں اس پر عمل کر رہی ہیں ان میں باہم کیسا اتفاق ہے آگے یہ ان کے تکلفات ہیں کہ استیذان کے لئے اپنے پتہ کا کارڈ بھیجتے ہیں۔ ہم کو ان تکلفات کی ضرورت نہیں بس زبانی اجازت لینا کافی ہے مگر ہماری تو یہ حالت ہے کہ چاہے کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا ہو چاہے کوئی سو ہی رہا ہو مگر ان کا سلام ومصافحہ قضا نہ ہو۔

سونے والوں کی رعایت کا حکم

ایک دفعہ سیوہارہ میں مجھے خود یہ واقعہ پیش آیا کہ شب کے سفر سے مجھے تکان زیادہ محسوس ہوا تو جاتے ہی ایک کمرہ میں لیٹ گیا اور سونے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک صاحب تشریف

لائے اور بڑے زور سے آ کر پوچھا کہ فلاں شخص (میرا نام لے کر) کہاں ہے، لوگوں نے کہا ذرا آہستہ بولو وہ سو رہا ہے کہنے لگے واہ مجھے ان سے ابھی ملنا ہے لوگوں نے بہت منع کیا مگر وہ کب باز آنے والے تھے۔ سیدھے وہیں پہنچے جہاں میں لیٹا تھا اور آ کر بڑے زور سے سلام کیا میں جاگ رہا تھا مگر میں نے قصداً آنکھ نہ کھولی کیونکہ اس وقت یہی مصلحت تھی جب اس نے دیکھا کہ سلام سے بھی یہ نہیں جاگا تو میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اور پیشانی پر گھس کر چل دیئے لوگوں نے برا بھلا کہا کہ یہ کون سا وقت تھا سلام اور مصافحہ کا۔ تو آپ فرماتے ہیں واہ جی ہم حج کو جارہے ہیں پھر نہ معلوم کب ملنا ہوتا۔ بس ان کو تو حج ہوا چاہے دوسرے کا کچھ ہی حال ہو جائے۔ حالانکہ شریعت میں سونے والے کی اس قدر رعایت ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے، حضرت مقداد راوی ہیں کہ ایک بار یہ چند شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مہمان تھے۔ آپ جب رات کو ذرا دیر سے گھر میں تشریف لاتے اور یہ مہمان لیٹے ہوتے تو آپ بہت آہستہ آہستہ تشریف لاتے اور ایسی آواز سے سلام فرماتے کہ جاگنے والا تو سن لے اور سونے والے کی نیند خراب نہ ہو۔ حالانکہ یہ وہ ذات ہے کہ اگر آپ قتل بھی کر دیتے تو صحابہ کرام کو انکار نہ ہوتا۔ بلکہ آپ کے ہاتھ سے خوشی خوشی جان دینا ان کے نزدیک فخر تھا مگر پھر بھی آپ صحابہ کی نیند کی اتنی رعایت فرماتے تھے۔ مگر یہاں یہ حالت ہے کہ ہر وقت مصافحہ ہے چاہے کسی کو تکلیف ہوتی ہو۔

دیوبند کے جلسہ میں بڑا اژدھام تھا ایک بار میں نماز پڑھانے کے لئے مصلے پر پہنچ چکا تھا تو ایک صاحب تیسری صف سے نکلے اور مصلے پر سے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور مصافحہ کر کے چھوڑ دیا کہ اب جاؤ، بھلا یہ بھی کوئی آدمیت تھی اس بھلے مانس کو مصافحہ کا یہی وقت ملا تھا۔ غرض دوسرے کی راحت و تکلیف کا ذرا خیال نہیں۔ اب اگر کوئی انتظام کرنے لگے تو اسے قانون باز، قانون ساز کہتے ہیں۔

اسلام سے زیادہ کسی میں انتظام نہیں

چنانچہ میرے یہاں اس قسم کی باتوں پر روک ٹوک اور انتظام بہت ہے جس پر عنایت فرماؤں نے مجھے بہت کچھ خطاب دے رکھے ہیں۔ ایک صاحب نے میرے منہ پر کہا کہ ہم کو یہ طریقہ پسند نہیں، انگریزوں کا سا قانون ہر بات میں انتظام ہر بات میں انتظام۔ افسوس گویا اسلام میں انتظام ہی نہیں بس اسلام تو ان کے نزدیک بے انتظامی کا نام ہے حالانکہ اسلام سے زیادہ انتظام کسی نے بھی نہیں کیا، ہر کام کا وقت مقرر ہے۔ نماز کا بھی روزہ کا بھی حج کا بھی اور اتنا بڑا انتظام ہے کہ ذرا ایک تاریخ سے حج مؤخر ہو جائے تو پھر سال بھر سے ورے نہیں ہو سکتا تو کیا اس کو

بھی انگریزی قانون کہو گے عیادت اور بیمار پرسی کے لئے یہ قانون ہے اِذَاعَادَاَحَدُکُمُ الْمَرِیْضَ فَلْیَخْفِفِ الْجُلُوْسَ حدیث شریف میں ہے کہ جب بیمار کی عیادت کیا کرو تو اس کے پاس تھوڑی دیر بیٹھا کرو کیونکہ بیمار کو زیادہ ہجوم سے تکلیف ہوتی ہے حضرات فقہاء نے اس حکم کی حقیقت کو سمجھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس چیز سے مریض کو توحش ہو وہ کام نہ کرو جس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ مثلاً کسی کو بدھ کے دن عیادت کرنے سے اعتقاد شر کا ہو تو اس دن عیادت نہ کرو بلکہ دوسرے دن عیادت کر کے اس عقیدہ کی اصلاح کر دو کوئی زاہد خشک ہوتا تو یوں کہتا کہ نہیں کہ ایسے شخص کی عیادت بدھ ہی کے دن کرنا چاہیئے تا کہ اس عقیدہ باطلہ کی مخالفت ہو۔ تو اے صاحب پھر وہ عیادت ہی کیا ہوئی مناظرہ ہو گیا۔

عیادت سے مقصود تو مریض کی دلجوئی ہے آپ کی اس مخالفت سے یہ مقصود کہاں حاصل ہوا بلکہ اس کو تو آپ کی صورت دیکھ کر دونی وحشت ہوگی کہ یہ کمبخت بدھ کے دن کہاں آمرا دیکھئے اس کا کیا منحوس اثر ہوتا ہے تو وہ اس سے گھبرائے گا جیسے ایک بہرا آدمی کسی کی عیادت کو گیا تھا بیمار کو اس کی صورت دیکھتے ہی خفقان شروع ہو گیا کہ یہ کمبخت کہاں آمرا اپنی سب کہے گا میری ایک نہ سنے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا وہ اپنے جی میں مضمون پکا کر لایا تھا کہ میں پوچھوں گا کہ مزاج کیسا ہے وہ کہے گا اچھا ہوں میں کہوں گا الحمد للہ پھر پوچھوں گا علاج کس کا ہے کسی حکیم کا نام لے گا، میں کہوں گا ان کے قدم بہت مبارک ہیں ماشاء اللہ دست شفا رکھتے ہیں ان کا علاج کبھی نہ چھوڑنا۔ پھر کہوں گا نسخہ کیا استعمال میں ہے وہ کچھ بتلائے گا میں کہوں گا انگبین ہے خدا رگ رگ میں پیوست کرے مگر وہاں سارا مضمون برعکس ہوا مریض تو اس کی صورت دیکھ کر ہی پریشان ہو گیا تھا۔ اب جوان سے پوچھا کہ مزاج کیسا ہے بیمار نے کہا مر رہا ہوں آپ نے کہا الحمد للہ پھر پوچھا علاج کس کا ہے اس نے کہا ملک الموت کا۔ آپ کہتے ہیں خدا ان کے قدم مبارک کرے۔ ماشاء اللہ دستِ شفا رکھتے ہیں ان کا علاج کبھی نہ چھوڑنا پھر کہا نسخہ کیا پی رہے ہو بیمار نے کہا زہر پی رہا ہوں آپ کہتے ہیں انگبین ہے خدا رگ رگ میں پیوستہ کرے بھلا اس شخص کی عیادت سے کیا نفع ہوا شرعاً ایسے لوگوں کو عیادت نہ کرنا چاہیئے بس اگر بہت ہی شوق ہو تو دوسروں کے ساتھ ملے جلے چلے جائیں تا کہ عیادت نہ کرنے کا الزام بھی رفع ہو جائے اور بیمار سے بات چیت بھی نہ کرنا پڑے خواہ مخواہ اس کا دماغ پریشان کرنے سے کیا نفع۔

تعلیماتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دقیق امور کی رعایت

اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ فقہا حکماء امت ہیں شریعت کو ان حضرات نے سمجھا ہے بات

چیت کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام فرمایا ہے **لَایَتَنَاجیٰ اِثْنَانِ دُوْنَ الثَّالِثِ حَتّٰی یَأْتِیَ رَابِعٌ** (او کما قال) (المعجم الکبری للطبرانی ۱۲: ۲۷۷ مسند الحمیدی: ۱۰۹) یعنی جہاں تین آدمی بیٹھے ہوں وہاں دو شخص آہستہ آہستہ باتیں نہ کریں اس سے تیسرے کی دل شکنی ہوگی کہ مجھ کو غیر سمجھا یہاں تک کہ چوتھا آجائے تو اب دو شخص باتیں کر سکتے ہیں کیونکہ تیسرے کو باتوں کا شوق ہوگا تو وہ چوتھے سے کرنے لگے گا پھر اس کو وہ بدگمانی نہ ہوگی احتمال ہوگا کہ شاید اس چوتھے سے اخفا مقصود ہو اور اس چوتھے کو اس تیسرے پر یہی احتمال ہوگا۔ سبحان اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی ذرا ذرا سی باتوں کی رعایت فرمائی ہے اور یہ معجزہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ باوجود اتنے مشاغل کثیرہ کے پھر بھی آپ نے معاشرت کے دقیق سے دقیق امور (باریک کاموں) کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا کہ بدون نبوت کے ایسا ہوسکتا ہے ہرگز نہیں اسی جامعیت تعلیم کو دیکھ کر تو کفار کہا کرتے تھے حضرات صحابہ کرام سے کہ تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تم کو ہر بات سکھلائی حتیٰ کہ ہگنا موتنا بھی سکھلا دیا۔ کفار نے تو یہ بات طعن سے کہی تھی مگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ ہاں بیشک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سکھلایا ہے کہ بول و براز کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت نہ کریں اور داہنے ہاتھ سے اپنے عضو کو نہ چھوئیں اور تین ڈھیلوں سے کم استنجا کے واسطے نہ لے جائیں اور ہڈی اور کوئلہ سے استنجا نہ کریں یہ تعلیم سن کر کفار کی آنکھیں کھل گئیں کہ واقعی بول و براز کے یہ آداب تو بدون تعلیم کے معلوم ہو ہی نہیں سکتے۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے انتظام کا کہ پیشاب و پاخانہ کے لئے بھی آداب مقرر ہیں۔ پاکی اور صفائی کا یہ قانون ہے کہ آپ فرماتے ہیں **اِذَا سْتَیْقَظَ اَحَدُ کُمْ مِنْ مَنَامِہٖ فَلَا یَغْمِسُ یَدَہٗ فِیْ اِنَاءِ ہٖ فَاِنَّہٗ لَایَدْرِیْ اَیْنَ بَاتَتْ یَدُہٗ** (سنن النسائی ۱: ۹۹) جب کوئی سوکر اٹھے تو برتن میں ہاتھ نہ ڈالے کیا خبر ہاتھ کہاں کہاں پہنچا ہوگا بھلا یہ انتظام ہی نہیں اور کیا ہے۔ نیز ارشاد ہے **نَظِّفُوْا اَفْنِیَتَکُمْ وَلَا تَشَبَّھُوْا بِالْیَھُوْدِ** (سنن الترمذی: ۲۷۹۹، کشف الخفاء ۱: ۳۴۲) اپنے گھر کے سامنے کا میدان صاف رکھا کرو یہود کی طرح نہ بنو وہ صفائی کا اہتمام نہیں کرتے۔ سبحان اللہ جب فنا دار کی صفائی کا اتنا اہتمام ہے تو خود گھر کی صفائی کا اہتمام کیا کچھ ہوگا۔ اور جب گھر کا اتنا اہتمام ہے تو لباس کی صفائی کا کیا کچھ اہتمام نہ ہوگا پھر بدن اور روح کی نظافت کا امر تو کیسا کچھ ہوگا۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ (چمن سے میری بہار کو قیاس کرو) اسی سے عاقل سمجھ سکتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہر کی نظافت کا اتنا خیال ہے تو نظافت باطن کا تو کس درجہ اہتمام ہوگا مگر آج کل مسلمان اپنے گھر کے اس سبق کو ایسا بھولے ہیں کہ کوئی اس زمانہ

میں نظافت مکان ونظافت لباس وبدن کا اہتمام کرنے لگے تو اس کو عیسائی اور انگریز کہنے لگیں۔

نظافت اور بات کرنے میں دقیق رعایتیں

چنانچہ مدارس میں ایک انگریز اسلام لایا ایک روز وہ جامع مسجد میں گیا تو حوض کی نالی میں اس قدر رنیٹ جما ہوا تھا جسے دیکھ کر گھن آتی تھی۔ اس سے نہ رہا گیا اس نے ایک دولوٹے پانی سے سب دھودیا اور لوگوں سے کہا کہ صاحبو! ذرا نالی میں سے کبھی کبھی رنیٹ تو صاف کردیا کرو، دیکھو کیسا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ تو لوگ کیا کہتے ہیں معلوم ہوتا ہے تجھ میں ابھی عیسائیت کا اثر باقی ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ بھلا یہ بھی کوئی حرکت ہے کہ نظافت اسلامی کو کوئی دوسری قوم اختیار کرلے تو وہ اسلام سے نکل جائے اور انگریزوں کا کام ہو جائے۔ میں کہاں تک گناؤں شریعت کے انتظام کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک انتظام فرمایا ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں لَاتَقُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ خَبِيْثَتْ نَفْسِيْ وَلِيَقُوْلَنَّ قَلَسَتْ نَفْسِيْ (او کما قال) (صحیح للبخاری ۸: ۵۱، مشکوۃ المصابیح: ۴۷۶۵) یعنی اگر جی متلائے تو خبث نفسی (میرا نفس خبیث ہے) نہ کہو کیونکہ مسلمان کا نفس خبیث نہیں ہوا کرتا بلکہ یوں کہو کہ میرا جی مالش کرتا ہے متلاتا ہے، سبحان اللہ آپ نے تو ہم کو بات کرنے کے بھی طریقے بتلائے ہیں۔ افسوس آج اگر کوئی اس انتظام پر عمل کرنے لگے تو اس کو الزام دیا جاتا ہے کہ اس کے یہاں تو انگریزوں کا سارا انتظام ہے۔ ارے ہم انگریزوں کے متبع (پیروی کرنیوالے) ہیں یا ان امور میں وہ خود ہمارے متبع ہیں مجھے تو کبھی ان کی معاشرت دیکھنے کا آج تک موقعہ ہی نہیں ملا جو کچھ میں انتظام کرتا ہوں وہ اپنے گھر کی تعلیم کو دیکھ کر خود تجویز کرتا ہوں اور چونکہ وہ انتظامات سب کی راحت کے ہوتے ہیں دوسری قوموں نے بھی ہماری کتابوں سے ان کو لے لیا اس لئے بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ جو انتظام میں نے کیا ہے، دوسری قوموں نے بھی اختیار کر رکھا ہے تو اب اگر دوسری قومیں ہمارے افعال کو لینے لگیں تو کیا ہم اپنے گھر کو چھوڑ دیں یا اسے گرادیں اگر یہی عقل ہے تو ایسی عقل آپ کو ہی مبارک ہو اور یہ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جتنے قواعد میں نے اپنے یہاں مقرر کئے ہیں گو وہ میں نے اپنی ہی راحت کے لئے مقرر کئے ہیں میں کسی پر کیوں احسان رکھوں اس لئے میں یہ دعوٰی نہیں کرتا کہ یہ قواعد دوسروں کی راحت کے واسطے مقرر کئے ہیں گو بعض احباب کا اعتقاد ہے کہ اس میں ان کی بھی مصالح کی رعایت ہے۔

بہرحال جو کچھ بھی ہو مگر وہ سب قرآن واحادیث سے بلاتکلف او بدون تاویل کے ثابت ہیں اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ آداب المعاشرت کا دیباچہ دیکھ لے اس میں ان انتظامات کے کلیات کو

قرآن واحادیث سے ثابت کر دیا گیا ہے۔ اور جزئیات کا کلیات میں داخل کر لینا اہل علم کو کچھ مشکل نہیں اور اگر کسی کو اس میں خفا رہے تو میں اس کے بیان کے لئے حاضر ہوں۔

دوسری قوموں کی ترقی کا راز

تو صاحب دوسری قوموں کی ترقی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے آپ کے گھر سے یہ چند باتیں چرالی ہیں۔ انتظام، پابندی وقت، راز داری، اتحاد واتفاق وغیرہ وغیرہ اور ان اعمال کی خاصیت ہے کہ جو ان کو اختیار کرتا ہے اسے ترقی ہو جاتی ہے۔ اس لئے دوسری قوموں کو ترقی ہو رہی ہے اور آپ نے ان اعمال کو ترک کر دیا ہے اس لئے آپ تنزل میں ہیں۔ پھر دوسری قوموں نے جو ان اعمال کو اختیار کیا ہے وہ اختیار ناقص ہے۔ اگر اختیار کامل ہوتا تو وہ نتیجہ ہوتا جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　صاف گر باشد ندانم چوں کند

ایک خاک آمیز گھونٹ نے تو نچا دیا ہے اگر خالص جام پیتے تو نہ معلوم کہاں پہنچتے یہ مضمون اس پر چلا تھا کہ بنی اسرائیل حالانکہ کچھ زیادہ مئودب نہ تھے مگر بایں ہمہ ان کے ان شاء اللہ کہنے کی برکت ظاہر ہوئی اس پر میں نے کہا تھا کہ بعض اعمال میں ایک خاصیت ہوتی ہے جس کا ظہور ہر محل میں ہوتا ہے گو محل کم قابل ہی کیوں نہ ہو اسی پر یہ مضمون متفرع کیا تھا کہ بعض اعمال شرعیہ کو ترقی میں دخل ہے جو انہیں اختیار کرتا ہے اس کو ترقی حاصل ہو جاتی ہے گو کافر ہی اختیار کرے اب میں پھر اصل مضمون کی طرف غور کرتا ہوں کہ اس کے بعد حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

احکام خداوندی میں حجتیں نکالنا بڑا جرم ہے

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۚ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ اور جب تم نے ایک جان کا خون کر دیا پھر اس کو ایک دوسرے پر ڈالنے لگے اور حق تعالیٰ کو اس بات کا ظاہر کرنا تھا جسے ہم چھپا رہے تھے یہ اس قصہ کی ابتداء ہے جس کو ترتیب میں مئوخر کیا گیا ہے۔ مفسرین نے اس تقدیم وتاخیر میں بہت سے نکات لکھے ہیں ان سب میں سہل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس مقام پر دور سے بنی اسرائیل کی بے عنوانیوں کا ذکر چلا آ رہا ہے اور یہاں بھی اس کا بتلانا مقصود ہے اور اس قصہ میں بنی اسرائیل سے دو بے عنوانیاں ہوئی تھیں ایک قتل کر کے اخفا واردات (واردات کو چھپانا) کرنا دوسرے احکام خداوندی میں خواہ مخواہ کی حجتیں نکالنا۔ پہلی بے عنوانی ابتداء قصہ

میں ہوئی اور دوسری اس کے بعد۔ اگر قصہ کو ترتیب وار بیان کیا جاتا تو ناظرین پہلے جزو کو مقصود سمجھتے اور دوسرے جزو کو تتمیم قصہ پر محمول کرتے اور ترتیب بدلنے سے صاف معلوم ہو گیا کہ دونوں ہی جزو مقصود ہیں اور ہر جزو سے ایک مستقل بے عنوانی پر تنبیہ کرنا منظور ہے (دوسرے احکام خداوندی میں حجتیں نکالنا اخفاء واردات سے بڑھ کر جرم ہے اس لئے اس کو پہلے بیان کیا گیا تا کہ ناظرین کو تنبیہ ہو جائے تا کہ خدا کے نزدیک قتل وغیرہ کی نسبت احکام میں حجتیں نکالنا زیادہ شدید ہے جس کو عام لوگ معمولی بات سمجھتے ہیں ۱۲ جامع) اس کے بعد فرماتے ہیں۔

امتثال امر پر رحمتِ خداوندی

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (پس ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو اس طرح حق تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو)۔

پھر ہم نے کہا کہ اس مقتول پر بیل کے کسی عضو کو لگا دو اس سے وہ زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلا دے گا اس وقت گر کی بات بتلا دی کہ بیل کے ذبح کرنے کا حکم اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کے کسی عضو کے مَس کرنے سے مقتول زندہ ہو جائے گا پہلے یہ بات نہیں بتلائی کیونکہ بنی اسرائیل کی اطاعت کا امتحان مقصود تھا، جس میں وہ ناکام ثابت ہوئے مگر جب حجتیں نکالنے کے بعد انہوں نے بقرہ کو ذبح کر دیا اس وقت امتثال امر (حکم ماننا) پر یہ رحمت فرمائی کہ اس حکم کی حکمت بتلائی گئی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس نے زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلا دیا اور پھر مر گیا یہاں یہ شبہ نہ ہو کہ مقتول کے قول پر فیصلہ کیونکر ہوا کیونکہ مقتول بھی فی الجملہ مدعی ہوتا ہے اور مدعی کا قول محتاج بینہ یا اقرار مدعیٰ علیہ کا ہے خود حجت نہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہاں مقتول کا قول فی نفسہ حجت نہ تھا بلکہ حجت وحی تھی جس سے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ مقتول زندہ ہو کر جو کچھ کہے گا وہ صحیح ہوگا۔

علمِ اعتبار کی حقیقت

یہ تو قصہ تھا اب میں اس کو منطبق کرنا چاہتا ہوں مقصود پر یعنی مضمون مجاہدہ پر قربانی سے تو مناسبت اس قصہ کے جزو اول ہی کو تھی اس کا بیان تو بوجہ مناسبت زمانہ کے ضروری تھا ہی مگر چونکہ مجھے مجاہدہ سے بھی اس مضمون کی مناسبت بیان کرنا ہے اس لئے میں نے جزو اخیر کو بھی تلاوتِ کیا

مجاہدہ کے مقصود سے اس کو مناسبت ہے اب یہ سمجھو کہ اس وقت میں جو کچھ بیان کروں گا وہ علم اعتبار ہوگا جو کہ تفسیر آیات نہیں ہے اور جن لوگوں نے اس کو تفسیر سمجھا ہے وہی صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں مگر صوفیہ کی مراد علم اعتبار سے یہ نہیں ہے کہ نصوص کو ظاہر سے محرف کریں بلکہ ظاہر کو ظاہر پر رکھ کر پھر بطور قیاس کے امثال قرآنی کو وہ اپنے مقصود پر جاری کرتے ہیں اور یہ بھی ایک قسم کا قیاس ہے جس کی نصوص سے اجازت ہے جیسے فقہی قیاس کی اجازت ہے چنانچہ حق تعالیٰ سورۂ حشر میں قصۂ بنی نضیر کے بیان کے بعد فرماتے ہیں فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ (اے بصیرت والو عبرت حاصل کرو اس واقعہ سے) تو اب اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنے کا مطلب کیا ہے، یہی تو مطلب ہے کہ تم اپنے حال کو ان کے حال پر موازنہ کر کے دیکھو اگر تمہارے اندر ان جیسے اعمال وخصائل ہوں گے تو سمجھ لو کہ یہی معاملہ تمہارے ساتھ بھی ہوگا۔ اسی طرح عاد وثمود وغیرہ کے قصے بیان فرما کر ارشاد فرمایا ہے لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (البتہ ان کے قصوں میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے) اب بتلایا جائے کہ ان کے قصے میں عبرت کیا ہے یہی تو ہے کہ ان کے اعمال میں غور کر کے اپنے کو ان سے بچانے یہی صوفیہ نے کیا ہے کہ قصصِ قرآنیہ کو وہ اپنے نفس پر جاری کرتے ہیں وہ ان قصوں کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتے (بلکہ ہر چیز کی نظیر اپنے اندر قائم کر کے مشبہ بہ کے احکام کو مشبہ بہ پر جاری کرتے ہیں ۱۲)۔

مثلاً قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ فرعون کے ساتھ جابجا مذکور ہوا ہے اس کی تفسیر صوفیہ کے نزدیک بھی وہی ہے جو کتب تفاسیر میں مذکور ہے موسیٰ علیہ السلام سے وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں جو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور فرعون سے مراد خاص وہی شخص ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ تھا لیکن صوفیہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ تفسیر آیات کے بعد اس قصہ کو اپنے نفس پر جاری کرتے ہیں کہ ہمارے اندر بھی ایک چیز موسیٰ علیہ السلام کے مشابہ ہے یعنی روح یا عقل اور ایک چیز فرعون کے مشابہ ہے یعنی نفس اور جس طرح فرعون کا غلبہ موسیٰ علیہ السلام پر باعث فساد تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا غالب ہونا فرعون پر موجب صلاح ہے اس کے بعد وہ عام قصے کو روح ونفس کے معاملات پر منطبق کرتے چلے جاتے ہیں اب وہ کہتے ہیں کہ اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (فرعون کی طرف جاؤ اس نے سرکشی کی ہے) کے معنی علم اعتبار کے طور پر یہ ہیں اِذْهَبْ اَيُّهَا الرُّوْحُ اِلَى النَّفْسِ اِنَّهٗ طَغٰی (اے روح نفس کی طرف جا اس نے سرکشی کی ہے) تو بتلایئے اس میں شرعاً کیا خرابی ہے اس کی حقیقت قیاس فقہی کے قریب ہے۔

قیاس اور تشبیہ

اتنا فرق ہے کہ قیاس کا نتیجہ بواسطہ قیاس مدلول نص ہے اور اعتبار کا نتیجہ مدلول نص نہیں بلکہ مدلول نص کے مشابہ ہے اور اسی فرق کا یہ اثر ہے کہ حکم قیاسی میں تو اگر مستقل نص نہ ہو تب بھی مقیس علیہ سے مقیس میں حکم کو متعدی کر سکتے ہیں اور حکم اعتباری میں اگر مستقل نص نہ ہو تو مشبہ بہ سے مشبہ میں حکم کو متعدی نہیں کر سکتے جیسے حدیث شریف میں ہے۔ لَاتَدْ خُلُ الْمَلٰئِکَۃُ بَیْتًا فِیْہِ کَلْبٌ' (اس گھر میں فرشتہ نہیں آتا جس میں کتا ہو) اور اس سے بطور اعتبار یہ کہا گیا ہے کہ لَاتَدْ خُلُ الْاَنْوَارُ الْاِلٰھِیَّۃِ قَلْبًا فِیْہِ صِفَاتٌ' سَبْعَیَۃٌ' (نہیں ہوتے داخل انوارِ الٰہی اس دل میں جس میں بہائمی صفات ہوں) تو اگر یہ حکم کسی مستقل دلیل سے ثابت نہ ہو تو محض اس نص سے حکم کا تعدیہ نہیں کر سکتے اس لئے بجائے قیاس کے اگر اس کا نام تشبیہ رکھا جائے تو مناسب ہے تاکہ خلط نہ ہو۔

بعض فقہاء کا تسامح

اور یہاں سے تسامح ظاہر ہو گیا ہو گا ان فقہاء کا جنہوں نے اقل مدت حیض کے تین دن ہونے پر اقل مدت سفر سے استدلال کیا ہے کہ دونوں حالت عارضی ہیں اور کل مدت طہر پندرہ دن ہونے پر اقل مدت اقامت سے استدلال کیا ہے کہ دونوں حالت اصلی ہیں۔ سو تشبیہ کو قیاس کہہ دیا ورنہ یقینی بات ہے کہ اگر مقیس میں مستقل دلیل نہ ہو تو ہرگز اس مقیس علیہ حکم مذکور کو متعدی نہیں کر سکتے البتہ اس تشبیہ سے ایک گونہ تائید تقریب ضرور ہو گئی۔

علم اعتبار کا سلف سے ثبوت

شاید تم یہ کہو کہ دلائل سے تو علم اعتبار کا صحیح ہونا اور خلاف شرع نہ ہونا معلوم ہو گیا لیکن یہ بتلاؤ کہ اس کا ثبوت کہیں سلف سے بھی اس قسم کی نظائر منقول ہیں۔ چنانچہ رزین نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے جس کو تیسیر الوصول میں نقل کی ہے کہ انہوں نے ایک آیت میں اسی طرح کا مطلب بیان فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا یَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْھِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُھُمْ وَکَثِیْرٌ مِّنْھُمْ فٰسِقُوْنَ (کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ جائیں جن کو ان کے قبل کتاب ملی

تھی پھران پر ایک زمانہ گزر گیا پھران کے دل سخت ہو گئے اور بہت سے آدمی ان میں کے کافر ہیں)۔
اس میں تو خشوع کا امر ہے اور قساوت قلب سے بچنے کی تاکید اس کے بعد فرماتے ہیں۔
اِعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ (جان لو کہ حق تعالیٰ زمین کو بعد اس کے مردہ ہونے کے زندہ کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو)۔

قَالَ اِبْنِ عَبَّاس لِیَنَ الْقُلُوْبُ بَعْدَ قَسْوَتِھَا فَیَجْعَلَھَا مُخْبِتَةً مُنِیْبَةً یُحْیِ الْقُلُوْبَ الْمَیْتَةَ بِالْعِلْمِ وَالْحِکْمَةِ وَالَّافَقَدْ عَلِمَ اِحْیَاءُ الْاَرْضِ بِالْمَطَرِ مُشَاھِدَةً وَمَقْصُوْدَةً اِنَّ ھٰذَا مِثْلُ ضَرَبَہِ اللّٰہُ لِعِبَادِہٖ وَیُرِیْدُ اَنَّ قُلُوْبَکُمْ کَالْاَرْضِ فَلَا تَیْئَسُوْا مِنْ قَسَاوَتِھَا فَاِنَّھَا یُحْیِیْ بِالْاَعْمَالِ کَالْاَرْضِ تُحْیِی بِالْغَیْثِ (حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نرم کر دیا دل کو بعد ان کی قساوت کے کہ ان کو مردہ کر دیا تھا زندہ کر دیا مردہ دلوں کو علم و حکمت سے ورنہ جان لیا تھا زمین کے زندہ ہونے کو بارش سے مشاہدہ سے اور یہ مثال ہے کہ بیان کیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اور مراد یہ ہے کہ ان کے دل مثل زمین کے ہیں پس ان کی قساوت سے ناامید مت ہو زندہ کر دیں گے ان کو اعمال سے مثل زمین کے کہ اس کو بارش سے زندہ کرتے ہیں)۔
یعنی مقصود عبداللہ بن عباسؓ کا یہ ہے کہ اِعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا الخ (جان لو کہ حق تعالیٰ زمین کو بعد مردہ ہونے کے زندہ کر دیتے ہیں) میں حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے ایک مثال بیان فرمائی ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح زمین خشک ہو جانے کے بعد بارش سے زندہ ہو جاتی ہے اسی طرح قلوب بھی قساوت کے بعد اعمال صالحہ سے زندہ ہو جاتے ہیں پس اگر کسی کے قلب میں معاصی گزشتہ سے قساوت پیدا ہو گئی ہو تو وہ اصلاح سے مایوس نہ ہو کیونکہ زمین کی نظیر تمہارے لئے ہم نے بیان کر دی ہے اس پر اپنے قلوب کو بھی قیاس کر لو۔
تو اب دیکھ لو کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت میں ارض سے قلب مراد لیا اور موت سے قساوت یہی علم اعتبار ہے ورنہ لغۃً ارض کے معنی قلب اور موت کے معنے قساوت کے کہیں نہیں ہیں مگر انہوں نے آیت کو تشبیہ پر محمول کر کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں۔ اسی طرح صوفیہ بطور تشبیہ کے کہہ دیتے ہیں کہ موسیٰ سے مراد روح اور فرعون سے مراد نفس ہے۔ وعلیٰ ھذا جب علم اعتبار کی نظیر سلف سے بھی منقول ہے اور قواعد شرع کے بھی وہ خلاف نہیں تو اب کوئی مضائقہ نہیں ہے اگر وہ علم اعتبار کے طور پر اس قصہ کو مضمون مجاہدہ پر منطبق کر کے بیان کروں۔ الغرض اس جگہ یہ ارشاد

ہے کہ بنی اسرائیل کو ذبح بقرہ کا امر ہوا تھا۔

نفس کشی کا امر

اور اہل لطائف علم اعتبار کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ گویا نفس کشی کا امر ہوا تھا۔ گویا بقرہ سے نفس کو تشبیہ دی گئی ہے اور یہ تشبیہ بہت مناسب ہے کیونکہ گائے بیل بھی بہت حریص ہوتے ہیں کھانے پینے کے اور نفس بھی بہت حریص ہوتا ہے اس لئے نفس کو بقرہ کہنا تو مناسب ہے لیکن آج کل نفس کو کتا کہا جاتا ہے۔ چنانچہ شعراء کے کلام میں سگِ نفس بکثرت مستعمل ہے مگر یہ واہیات ہے۔ اسی طرح بعض لوگ نفس کو کافر کہتے ہیں یہ اس سے بھی واہیات ہے۔ ہمارا نفس تو الحمد للہ نہ کتا ہے نہ کافر ہے۔ ہاں بقرہ تو ہوگا۔ نہ معلوم لوگ نفس کو کیا سمجھتے ہیں لغت میں تو نفس حقیقت شے کو کہتے ہیں۔ پس نفس زید حقیقت زید ہوئی تو حقیقت میں نفس ہمارا ہی نام ہے ہم سے الگ کوئی چیز تھوڑا ہی ہے تو اپنے کو کتا یا کافر کہنا کیا زیبا ہے اور اگر نفس کوئی مستقل چیز بھی ہو تب بھی اول تو وہ ہمیشہ شریر نہیں ہوتا کہ اس کو کتے سے تشبیہ دی جائے۔

نفس کے تین اقسام

بلکہ کبھی مطمئنہ ہوتا ہے کبھی لوامہ بھی ہوتا ہے کبھی امارہ ہوتا ہے، چنانچہ نصوص میں یہ تینوں صفات مذکور ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِىۡ‌ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوۡۤءِ (اور میں اپنے نفس کو بری نہیں بتلاتا نفس تو بری ہی بات بتلاتا ہے)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے لَاۤ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۙ‏ وَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ (میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے)۔

اور تیسری جگہ ارشاد ہے يٰۤاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ۖ ارۡجِعِىۡۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً (اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح کہ تو اس سے خوش ہو اور وہ تجھ سے خوش ہو)۔

پھر اگر شریر بھی ہو تب بھی مسلمان تو ہے تو مسلمان کو کافر کہنا یا کتے سے تشبیہ دینا کیا مناسب ہے ہاں بقرہ کے ساتھ تشبیہ دینے کا مضائقہ نہیں غرض جس طرح بقرہ کے ذبح کا امر ہوا تھا اسی طرح نفس کو بھی مجاہدہ سے ذبح کرنا چاہیئے بدون مجاہدہ کے کامیابی نہیں ہوتی۔ بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے بس ویسے ہی کامیاب ہو جائیں۔

عارفین کی تقلید

چنانچہ مشائخ سے کہتے ہیں کہ اپنے سینہ میں سے کچھ دے دو میں نے اس کے متعلق ایک وعظ میں یہ جواب دیا ہے کہ سینہ میں کیا رکھا ہے بجز بلغم کے مطلب یہ کہ جو بدون مجاہدہ کے تم کو دیا جا سکے وہ تو یہی ہے اور جس چیز کے تم طالب ہو وہ سینہ سے بدون مجاہدہ کے نہیں مل سکتی میرے اس مضمون پر ایک صاحب نے بہت خفا ہو کر مجھے خط میں لکھا کہ تم نے طریق کی بہت بے ادبی کی حالانکہ سینہ ہی میں تو سب کچھ ہے صوفیہ تصریحاً فرماتے ہیں کہ نسبت مع اللہ کی دولت درویشوں کے سینہ سے حاصل کرنی چاہیئے ۔ چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی مالا بدمنہ میں لکھتے ہیں ۔

از سینہ درویشاں باید جست (درویشوں کے سینہ سے ڈھونڈنا چاہیئے)

اور تم کہتے ہو کہ سینہ میں کیا رکھا ہے بجز بلغم کے ۔ سو میرے پاس اس بات کا جواب تھا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ جو چیز سینہ سے بدون مجاہدہ طالب کے دی جا سکتی ہے وہ تو بلغم کے سوا کچھ نہیں اور جس چیز کو قاضی ثناء اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ درویشوں کے سینہ سے حاصل کرنی چاہیئے میں اس کی نفی نہیں کرتا لیکن وہ مجاہدہ سے ملتی ہے بدون مجاہدہ کے نہیں مل سکتی مگر میں نے کچھ جواب نہیں دیا کیونکہ مجھے اس کے خط سے اندازہ ہو گیا تھا کہ مخاطب بھدّی طبیعت کا ہے یہ خطاب کے قابل نہیں اس لئے میں نے حضرت حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد پر عمل کیا وہ فرماتے ہیں ۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگزار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے اسرار و مستی کی باتیں مت بیان کرو، اس کو رنج و خود پرستی میں مرنے دو)۔

اور گو جواب نہ دینے سے انہوں نے مجھ کو عاجز و لاجواب سمجھا ہو گا مگر میں نے اس کی پروانہ کی میں نے عارفین کی تقلید کی ان کا مذاق یہ ہے کہ وہ صرف طالب کو جواب دیا کرتے ہیں مدعی کو جواب نہیں دیتے چاہے وہ ان پر کتنا ہی اعتراض کرے اور ان کو جاہل ہی سمجھے بلکہ اگر کوئی ان سے یہ کہے کہ تم کو کچھ نہیں آتا تم کچھ نہیں جانتے تو وہ خوش ہو کر کہتے ہیں کہ ہاں بھائی تم سچ کہتے ہو مجھے کچھ نہیں آتا تم سب لوگوں سے کہہ دو کہ یہ جاہل ہے اسے کچھ نہیں آتا میں تمہارا ممنون ہوں گا یہ عارف ہی کر سکتا ہے ۔ علماء قشر ایسا نہیں کر سکتے ان کو تو اگر کوئی کہہ دے کہ تم کچھ نہیں جانتے تو فوراً غصہ آ جائے اور اثبات کے درپے ہو جائیں مناظرہ پر آمادہ ہو جائیں کہ آؤ بحث کر لو ابھی معلوم ہو جائے گا کون جانتا ہے کون نہیں جانتا مگر عارف سے یہ نہیں ہو سکتا اس کو تو اس سے خوشی ہوتی ہے کہ کوئی اس کو جاہل ہی سمجھتا رہے کیونکہ اچھا ہوا ایک معتقد کم ہوا پیچھا چھوٹا بلکہ وہ تو بعض دفعہ قصداً

ایسی حرکت کرتا ہے جس سے معتقدین کم ہوں اور اس کا راز یہ ہے کہ وہ کیمیا گر ہے اور قاعدہ ہے کہ کیمیا گر یہ نہیں چاہا کرتا کہ لوگوں کو اس کا کیمیا گر ہونا معلوم ہو اور جو کوئی یہ کہہ دے کہ تجھے کیمیا گری کچھ بھی نہیں آتی اس سے وہ خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں بھائی واقعی مجھے کیمیا نہیں آتی تم سب سے یہی کہہ دو کہ مجھے پریشان نہ کریں۔

ساری اصلاح کسی ایک شخص پر موقوف نہیں

اہل قشر کہتے ہیں کہ قصداً ایسی حرکت نہ کرنا چاہیئے جس سے معتقد کم ہوں کیونکہ اس سے فیض اصلاح بند ہوتا ہے ہائے وہ اسی چکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح معتقد کم نہ ہوں اور دل میں یہ تاویل کرلی ہے کہ ہمارا مقصود نفع خلق ہے میاں بس جانے دو۔ ساری اصلاح آپ ہی پر تو موقوف ہے بس لوگ آپ کے معتقد نہ ہوں گے تو ان کو کہیں سے فیض ہی نہ ملے گا۔ خدا کے سینکڑوں بندے صاحب ارشاد موجود ہیں تم نے فیض کو اپنے ہی اوپر کیوں منحصر سمجھ لیا ہے یاد رکھو تمہارے معتقد کم ہونے سے فیض بند نہیں ہوسکتا اس لئے عارف ان تاویلوں پر کبھی توجہ نہیں کرتا بلکہ اس کو تو لوگوں کی بے اعتقادی سے خوشی ہوتی ہے اسے اپنے صاحب فیض ہونے کا وسوسہ بھی نہیں آتا۔ عارفین کا اصلی مذاق تو یہی ہے باقی جب ان کے گلے ہی مڑھ دیا جائے کسی خدمت کو تو اس وقت وہ مجبور ہو کر اسے انجام دیتے ہیں مگر اس حالت میں بھی وہ ہر وقت اس کے لئے آمادہ ہوتے ہیں کہ ان کا دنیا میں ایک بھی معتقد نہ رہے اسی لئے کسی کی بے اعتقادی سے ان کو رنج نہیں ہوتا نہ کسی کے جاہل کہنے سے غصہ آتا ہے۔

عارفین پر فنا کا غلبہ ہوتا ہے

ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحبؒ سے ایک شخص نے کہا کہ حضرت اپنے فلاں مرید کو سمجھا دیجئے کہ وہ بے جا حرکتیں نہ کیا کرے ورنہ لوگ آپ سے بھی بداعتقاد ہو جائیں گے حضرت نے فرمایا کہ میاں تمہارا جی چاہتا ہو بداعتقاد ہونے کو تو تم ہو جاؤ دوسروں پر بات کیوں رکھتے ہو، پھر فرمایا کہ تم نے تو اپنے نزدیک یہ بڑی دھمکی دی کہ لوگ بدگمان ہو جائیں گے اور اگر کسی کو یہی مطلوب ہو کہ سب بداعتقاد ہو جائیں تو؟ پھر فرمایا کہ واللہ مجھے تو تمہارے اعتقاد ہی نے پریشان کر رکھا ہے بخدا میں چاہتا ہوں کہ سارا عالم مجھے زندیق ملحد سمجھ کر چھوڑ دے اور میں اکیلا کسی پہاڑ میں بیٹھا ہوا اپنے محبوب میں مشغول ہوں اور یہ حال ہو۔

ولآ رامے کہ داری دل درو بند　　　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس محبوب سے دل باندھ لیا ہے تو پھر تمام جہاں سے آنکھ بند کرلو)۔

اور اس کا راز یہ ہے کہ ان حضرات پر فناء کا غلبہ ہوتا ہے پھر جو اپنے کو فنا کر چکا وہ معتقدوں کی فوج جمع کرنا کیونکر چاہے گا اس کو تو واقعی مخلوق کے اعتقاد سے پریشانی ہوگی ان کا تو یہ حال ہوتا ہے ۔

تو درو گم شود صال ابن ست و بس　　　　گم شدن گم کن کمال این ست و بس

(تم محبوب میں فنا ہو جاؤ بس یہی وصال ہے اور اس فنا ہونے کو بھی بھول جاؤ بس یہی کمال ہے)۔

تو درو گم شو یہ تو فنا ہے اور گم شدن گم کن یہ فناء الفنا ہے کہ ایسا فنا ہو کہ اپنی فنا کی بھی خبر نہ ہو اور یہ مبالغہ شاعری نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے لوگ اس کو شاعری مبالغہ سمجھے ہوں گے مگر میرے پاس ایک نظیر موجود ہے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ فناء کے لئے فناء الفنا لازم ہے وہ فنا ہی نہیں ہے جس میں اپنے فانی ہونے کی بھی خبر ہو دیکھئے نائم وہ ہے جس کو اپنی نوم کی بھی خبر نہ ہو اگر نائم کو اپنی نوم کی خبر ہو اور وہ اتنی بات جانتا ہو کہ میں سو رہا ہوں تو وہ نائم نہیں ہے بیدار ہے نیند تو اسی کا کام ہے کہ سونے والے کو یہ بھی خبر نہ ہو کہ میں سو رہا ہوں اسی طرح فنا وہی ہے جس میں اپنی فنا کی بھی خبر نہ ہو اور جو شخص اپنے کو فانی سمجھتا ہے وہ فانی نہیں ہے بیدار ہے بلکہ مدعی ہے تو جس پر یہ حال غالب ہو فنا الفنا کا وہ بھلا معتقدین کی زیادتی سے کیا خوش ہو سکتا ہے وہ تو اس سے ہی خوش ہوگا کہ کوئی بھی اس کو نہ پہچانے۔

حکایت حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ

مولانا محمد قاسم صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر چار حرفوں کی تہمت نہ لگی ہوتی تو میں ایسا اپنے کو غائب کرتا کہ کوئی یہ بھی نہ جانتا کہ میں دنیا میں پیدا بھی ہوا ہوں۔ مگر اس غائب نہ کر سکنے پر بھی آپ کی یہ حالت تھی کہ ایسی وضع سے رہتے تھے کہ دیکھ کر کوئی نہ پہچانتا تھا کہ یہ کوئی عالم ہیں۔ بس ایک لنگی گاڑھے کی کندھے پر ڈالے ہوئے رہا کرتے تھے۔ غدر میں مولانا کے پیچھے پولیس پھرتی تھی مگر کسی نے بھی آپ کو نہ پہچانا ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ مولانا مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے پولیس آئی اور خود مولانا ہی سے پوچھا کہ تم کو معلوم ہے کہ مولوی محمد قاسم صاحب کہاں ہیں تو آپ ذرا سا اپنی جگہ سے کھسک کر فرماتے ہیں کہ ابھی تو یہاں تھے، پولیس چلی گئی۔ سفر میں جب کبھی جاتے تو ساتھیوں کو نام بتلانے کی ممانعت تھی کہ میرا نام کسی سے ظاہر نہ کرنا اور اگر کوئی آپ سے دریافت کرتا کہ آپ کا نام کیا ہے تو فرماتے میرا نام خورشید حسن ہے یہ مولانا کا شاید کسی تصرف

سے تاریخی نام تھا۔ مگر اسے کوئی جانتا بھی نہ تھا، مشہور نام محمد قاسم تھا وہ نہیں بتلایا کرتے تھے اگر کوئی وطن کا نام پوچھتا تو فرماتے الہٰ آباد۔ ایک بار کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کا وطن تو نانوتہ ہے الہٰ آباد کیسے ہوگیا۔ فرمایا نانوتہ بھی تو خدا ہی نے آباد کیا ہے۔ بتلا دیا کہ معنی لغوی کے اعتبار سے وہ بھی الہٰ آباد ہے۔ سبحان اللہ کیسا اخفا حال تھا مگر باوجود اس انخفآ کے چھپے تھوڑا ہی رہتے تھے آخر عشاق نے پہچان ہی لیا طالبوں نے تاڑ ہی لیا پھر ایسے مشہور ہوئے کہ دنیا میں نام روشن ہے، بھلا آفتاب کہیں چھپ سکتا ہے۔ جب شاہجہانپور میں مباحثہ ہوا ہے مسلمانوں کا اور آریوں اور عیسائیوں کا تو مسلمانوں نے مولانا کو بھی بلایا تھا، مولانا تشریف لے گئے مگر وقت سے کچھ ہی پہلے پہنچے تھے اس لئے آپ سیدھے میدان مناظرہ میں تشریف لے گئے، صورت سے کسی نے بھی نہ پہچانا کہ یہ کوئی عالم ہیں۔ ایک نیلی لنگی موٹی سی سر پر ڈال رکھی تھی اس شان سے آپ پہنچے۔ لوگ سمجھے کہ کوئی معمولی آدمی ہیں مگر آپ کا سادہ حسن تکلف والوں کے حسن سے بڑھا ہوا تھا، بڑے بڑے جبے عمامے والے مولوی آپ کے حسن خداداد کے سامنے گرد تھے کیونکہ ؎

حُسْنُ الْحَضَارَةِ مَجْلُوبٌ بِتَطْرِيَةٍ وَفِي الْبَدَاوَةِ حُسْنٌ غَيْرُ مَجْلُوبِ

(شہریوں کا حسن بناوٹی ہوتا ہے اور دیہاتیوں کا حسن خداداد ہے)۔

اور آپ کی یہ شان تھی ؎

دل فریبان بناتی ہمہ زیور بستند دلبر ماست کہ باحسن خداداد آمد

(دل فریبان بناتی زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں حسن خداداد ہے)۔

حسن خداداد کے ہوتے ہوئے کیا ضرورت تھی عمامہ کی اور کیا ضرورت ہے، جبہّ کی ؎

حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را

غرض جب آپ تقریر کے لئے اٹھے ہیں اور تقریر فرمائی ہے تو تمام جلسہ محو حیرت تھا اس وقت مسلمانوں کے جان میں جان آئی اور مولانا کے تشریف نہ لانے کے خیال سے جو رنج ہو رہا تھا مبدل بخوشی ہوگیا۔ آپ کی تقریر میں ایسی خداداد شوکت تھی۔ کہ اسی زمانہ میں ایک ہندو نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ کہ شاہجہاں پور کے مناظرہ میں ایک نیلی لنگی والا چھوٹے قد کا مولوی سب سے جیت گیا۔ حالانکہ اس ہندو نے شاید مولانا کی تقریر کا ایک لفظ بھی نہ سمجھا ہوگا مگر اتنی بات وہ بھی سمجھ گیا کہ یہ سب سے جیت گئے کیونکہ علوم وحقائق میں ایک نور اور ایک شوکت ہوتی ہے جو

باطل میں کبھی نہیں ہو سکتی۔ حقائق کو سن کر ہر شخص کو اس کا غلبہ نظر آ جاتا ہے گو وہ سمجھا بھی نہ ہو۔

اصلی کمالات عمامہ اور جبہّ پر موقوف نہیں

صاحبو! یہ ہیں اصلی کمالات اور اس کا نام ہے علم عمامہ اور جبہّ پہننے سے تھوڑا ہی عالم ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ بھاگلپور میں علماء کا اجتماع ہوا تھا، مولوی انور شاہ صاحب بھی تشریف لے گئے تھے۔ جلسہ میں پہلے بڑے بڑے عمامے اور جبے والے مولوی موجود تھے مگر ایک ہندو نے مولوی انور شاہ صاحب کو دیکھ کر کہا کہ یہ شخص اس مجمع میں سب سے بڑا عالم معلوم ہوتا ہے، حالانکہ وہ نہ جبہ پہنے ہوئے تھے نہ عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ معمولی لباس میں تھے گویا اپنی طرف سے تو انہوں نے اپنے کو چھپانا چاہا تھا مگر علم وعمل کا نور کہاں چھپتا ہے وہ تو چہرہ سے عیاں ہوتا ہے (ان کے اثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں میں نمایاں ہیں) سچ ہے۔

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی   نیک بیں باشی اگر اہل ولی

(ولی میں نور حق ظاہر ہوتا ہے اگر تو اہل دل ہے تو نیک بین ہو)۔

اور اردو میں کسی نے ترجمہ کیا ہے۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور   کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

(جو شخص انکساری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کرتے ہیں)۔

مٹانے والوں کی شہرت ہو ہی جاتی ہے۔

متواضعین کی شہرت ہو ہی جاتی ہے

حدیث میں وعدہ ہے مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ (کنز العمال:۵۷۳۰، مشکوٰۃ المصابیح:۵۱۱۹) (جو شخص انکساری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کرتے ہیں)۔

اور جو شخص اپنے کو بڑھانا چاہتا ہے حق تعالیٰ اس کو گرا دیتے ہیں اسی حدیث سے لازم آتا ہے کہ مَنْ تَرَفَّعَ وَضَعَهُ اللّٰهُ (جو شخص اپنے کو بڑھاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پست کر دیتے ہیں) پس اگر کسی کو شہرت ہی مطلوب ہو تو اس کی بھی یہی صورت ہے کہ فنا اختیار کرے اور طلب شہرت کو دل سے نکال دے۔

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو   کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا

یعنی دیکھو عنقا نے اپنے آپ کو غائب کر دیا تو اس کا کیسا نام ہوا اسی طرح تم فنا اختیار کرو تو حق تعالیٰ تم کو رفعت وشہرت عطا کریں گے طلب شہرت سے شہرت حاصل نہیں ہو سکتی (یہاں پہنچ کر حضرت مولانا نے کاتب وعظ سے دریافت فرمایا کہ یہ مضمون کس بات پر چلا تھا۔ احقر نے عرض کیا

کہ حضرت حاجی صاحب کی حکایت بیان ہو رہی تھی کہ آپ سے کسی نے عرض کیا کہ اپنے فلاں مرید کو سمجھا دیجئے ورنہ لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے الخ) فرمایا اس سے پہلے کیا بیان ہو رہا تھا، میں نے عرض کیا اس سے پہلے یہ مضمون تھا کہ نفس کو بقرہ سے تشبیہ دی گئی ہے تو جس طرح اس کے ذبح کا امر ہوا تھا اس کو بھی مجاہدہ سے ذبح کرنا چاہیئے۔ فرمایا اس مضمون کے بعد اور حاجی صاحب کی حکایت سے پہلے درمیان میں کیا مضمون تھا وہ مضمون اس وقت نوٹ ہونے سے رہ گیا تھا۔ ختم وعظ پر یاد آیا تو نوٹ کیا گیا اس موقعہ پر میں نہ بتلا سکا چونکہ سلسلہ کا ربط اسی سے تھا اس لئے دیر تک حضرت سوچتے رہے کئی منٹ تک سوچنے کے بعد بھی جب یاد نہ آیا تو فرمایا کہ خیر یاد نہیں آتا تو نہ سہی اور ربط فوت ہو جائے تو کچھ حرج بھی نہیں کیا محبوب کی زلف ہمیشہ مسلسل ہی ہوا کرتی ہے کبھی زلف پریشان بھی تو ہوتی ہے اور کیا موتی سب منظوم ہی ہوتے ہیں درمنثور بھی تو ہوتے ہیں کما قال شاعر۔

قبادا کردہ دکاکل پریشاں کردہ می آید　　　　بہ بیں ایں بے سروساماں چہ ساماں کردہ می آید۔

(قبا کھولے ہوئے کاکل بکھرے ہوئے آتا ہے دیکھو اس بے سروسامانی میں کس سروسامان کیساتھ آتا ہے)

اس کے بعد حضرت نے تقریر شروع فرمائی جو عنقریب آتی ہے جس کا ربط احقر بیان کر دینا چاہتا ہے یہ مضمون اس پر شروع ہوا تھا کہ جو چیز بزرگوں کے سینہ سے طلب کی جاتی ہے وہ بدون مجاہدہ کے حاصل نہیں ہوتی بدون مجاہدہ کے جو چیز سینہ سے حاصل ہو سکتی ہے وہ تو بلغم کے سوا کچھ نہیں، اس پر فرمایا تھا کہ میں نے ایک وعظ میں یہی بات لکھ دی ہے کہ سینہ میں بلغم کے سوا کچھ نہیں اس پر فرمایا تھا کہ میں نے ایک وعظ میں یہی بات لکھ دی ہے کہ سینہ میں بلغم کے سوا کیا رکھا ہے، اس کو دیکھ کر ایک صاحب مجھ پر بہت خفا ہوئے اور انہوں نے مجھے خط لکھا کہ تم نے طریق کی بہت بے ادبی کی۔ سینہ ہی سے تو سب کچھ ملتا ہے۔ پھر فرمایا کہ میں گو اس شخص کو جواب دے سکتا تھا مگر میں نے جواب نہیں دیا اور حضرت حافظ کے ارشاد پر عمل کیا۔

با　مدعی　مگوئید　الخ

گو جواب نہ دینے سے وہ مجھے عاجز والا جواب سمجھا ہوگا مگر میں نے اس کی پروانہ کی۔ اس پر عارفین کے مذاق کا ذکر چلا تھا کہ وہ مدعی کو جواب نہیں دیا کرتے اور اگر کوئی ان کو جاہل سمجھے تو اس سے خوش ہوتے ہیں کہ اچھا ہوا ایک معتقد کم ہوا اور یہ سارا بیان اس پر چلا تھا کہ اس آیت میں ذبح بقرہ کا امر ہوا ہے جس سے اہل لطائف نے نفس مراد لیا ہے کہ اس کو مجاہدہ سے ذبح کرنا چاہیئے۔ کیوں کہ بدون مجاہدہ کے کامیابی نہیں ہوتی۔ بعض لوگ بدون مجاہدہ کے کامیاب ہونا چاہتے ہیں

اور مشائخ سے کہتے ہیں کہ اپنے سینہ سے کچھ دیدو یہ ان کی غلطی ہے ۱۲ جامع۔

ذبح نفس سے مراد مجاہدہ ہے

بہر حال آیت میں بقرہ سے نفس کو تشبیہہ دی گئی ہے جس طرح بقرہ کے ذبح کا حکم ہے نفس کے ذبح کا بھی حکم ہے مگر بقرہ کا ذبح چُھری سے ہوتا ہے اور نفس کا ذبح مجاہدہ سے ہوتا ہے۔ کوئی صاحب ذبح نفس کے ظاہری معنی نہ سمجھ جائے کہ بس لگے خود کشی کرنے بلکہ ذبح نفس کے معنی مجاہد کے ہیں جس کی حقیقت عنقریب ظاہر ہو جائے گی۔ اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام کے سنن میں سے ہے گائے کا ذبح کرنا اور بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو گائے کے گوشت سے رغبت بھی تھی چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں وارد ہے وَجَاءَ بِعِجْلٍ کہ وہ اپنے مہمانوں کے سامنے بچھڑے کا گوشت بُھنا ہوا لائے۔ اور ظاہر ہے کہ مہمان کے لئے وہی چیز لاتے ہیں جو اپنی مرغوب ہوتی ہے۔ اب آج کل لوگ کہتے ہیں کہ گائے کا گوشت سودا پیدا کرتا ہے، ہاں صاحب اب پیدا کرنے لگا ہوگا (یعنی جب سے کہ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد و اتفاق کا خیال پیدا ہوا ۱۲ جامع)۔

پہلے تو کبھی اس نے سودا نہ پیدا کیا یعنی اس ضرر کا کبھی ذکر نہ کیا گیا۔ پھر میں کہتا ہوں کہ وہ کون سی چیز ہے جو سودا صفرا پیدا نہیں کرتی۔ انسان میں صفرا، بلغم، سودا اور خون کے سوا اور ہے کیا اور ہر خوردنی چیز ان میں سے کسی نہ کسی کو ضرور مضر ہوتی ہے، کوئی دوا یا غذا ایسی نہیں جو بہمہ وجوہ نافع ہو اور کسی خلط انسانی کو مضر نہ ہو۔ کتب طب اٹھا کر دیکھو ہر چیز میں کچھ نہ کچھ نقصان ضرور ہے۔ دودھ کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ ذرا طب کی کتابوں میں دیکھو کہ اس کے نقصانات کس درجہ لکھے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ گائے کے گوشت کے قریب ہی قریب مضر نکلے گا تو یہ سب بہانے ہیں جو آج کل تراشے گئے ہیں پہلے ان کا کوئی نام بھی نہ لیتا تھا۔

غرض ابرہیم علیہ السلام کے قصہ میں قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیا سابقین علیہم السلام گائے کا گوشت کھایا کرتے تھے۔ بس ہمارے واسطے ذبح بقرہ کے لئے یہ دلیل کافی ہے پہلے زمانہ میں سواری کا زیادہ کام اونٹ سے لیا جاتا تھا بیلوں سے سواری کا کام نہ لیا جاتا تھا بس یہ تو کھیتی کے کام آتا تھا یا کھانے کے کام میں آتا تھا اور واقعی سواری کے لئے اونٹ ہی موزوں ہے کیونکہ وہ بڑا قانع جانور

ہے، تھوڑی سی غذا اس کے لئے کافی ہے اور ایک دن پانی پی کر کئی دن تک پانی سے صبر کر سکتا ہے۔ پھر اس کی غذا بھی کچھ گراں نہیں، درختوں کے پتوں پر اکتفا کر لیتا ہے اور بیل تو ہاؤ ہپ ہے اس کے لئے تو چارہ کا گٹھڑ ہونا چاہیئے پھر دانہ الگ چاہیئے اس لئے سواری میں اس سے اونٹ کی برابر راحت نہیں مل سکتی علاوہ اس کے اونٹ میں بیل سے قوت بھی زیادہ ہے۔ جتنا بوجھ وہ لے جاسکتا ہے بیل نہیں لے جاسکتا اس لئے پہلے زمانہ میں بیل سے سواری کا کام نہ لیتے تھے بس یہ تو کھانے ہی کے کام میں آتا تھا یا کھیتی میں چلتا تھا اور تماشا ہے کہ جیسے عرب کے اندر قناعت کا مادہ بہت زیادہ ہے تو وہاں کے جانوروں میں بھی یہ صفت موجود ہے۔ چنانچہ اونٹ کو زمین عرب سے خصوصیت ہے تو اس میں سب جانوروں سے زیادہ قناعت ہے اور ہندوستان کے لوگوں میں حرص کا مادہ زیادہ ہے تو یہاں جانوروں میں بھی اسی صفت کا غلبہ ہے چنانچہ بیل اور گائے کو زمین ہندوستان سے خصوصیت ہے تو دیکھ لیجئے اس میں کتنی حرص ہے کہ ہر وقت اس کا منہ ہی چلتا رہتا ہے جیسے خود ہم ہیں۔

شتر کینہ کا محاورہ

سر سید نے غضب کیا ہے کہ عرب کی مذمت لکھتے ہوئے آپ کہتے ہیں کہ اس قوم میں کینہ بہت ہے حتی کہ وہاں کے جانوروں میں بھی اس صفت کا غلبہ ہے چنانچہ شتر کینہ مشہور ہے مولوی محمد علی صاحب نے سر سید کی تفسیر کے رد میں ایک کتاب البرہان بہت ہی عمدہ لکھی ہے، بڑی قابلیت سے جواب دیا ہے انہوں نے اس اعتراض کا بھی بڑا عمدہ جواب دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ اول تو جانوروں کے اخلاق سے انسانوں کے اخلاق پر استدلال کرنا یہ عجیب طریقہ استدلال ہے پھر ہم سید صاحب سے پوچھتے ہیں کہ شتر کینہ جو مشہور ہے یہ عرب کا محاورہ ہے یا فارس کا ظاہر ہے کہ یہ عرب کا محاورہ نہیں فارس کا ہے تو اس سے بہت سے بہت یہ لازم آیا کہ فارس کے اونٹوں میں کینہ ہوتا ہوگا عرب کے اونٹوں میں اس صفت کا ہونا کیسے لازم آیا۔

اونٹ کی صفاتِ حمیدہ

اگر مان لیا جائے کہ عرب کے اونٹوں میں بھی یہ صفت ہے تو آپ نے اس کے ایک عیب کو تو دیکھ لیا اس کی دوسری خوبیوں کو بھی تو بیان کیا ہوتا۔

عیب مے جملہ بگفتی سبزش نیز بگو (شراب کے تمام عیب تو تم نے بیان کر دیئے اس کے ہنر بھی بیان کرو)

اونٹ میں اگر ایک عیب کینہ کا ہے تو ہزار باتیں مدح کی ہیں اس میں تحمل و جفاکشی بہت ہے، قناعت کا مادہ بہت ہے عرب کے اونٹ مطیع ومنقاد (فرمانبردار) بہت ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ جہاں کسی نے اونٹ پر سوار ہونے کے لئے اس کی گردن کو جھکایا وہ فوراً گردن کو زمین پر رکھ دیتا ہے پھر سوار کے پاؤں رکھنے کے بعد آہستہ آہستہ اس کو اس طرح اٹھاتا ہے کہ سوار نہایت سہولت سے پشت پر پہنچ جاتا ہے۔ لوگ کثرت سے اسی طرح چڑھتے اترتے ہیں۔ اونٹ کی لمبی گردن سیڑھی کا کام دیتی ہے۔ تو اگر اس کے ایک عیب سے عرب کے ایک عیب پر استدلال کیا گیا ہے تو اس کی ان خوبیوں سے بھی تو اہل عرب کی خوبیوں پر استدلال کیا ہوتا۔ پھر عرب میں جہاں اونٹ ہیں وہاں گھوڑے بھی تو ہیں جن کی اصالت (اصیل اور شریف ہوں) ونجابت وشرافت ضرب المثل ہے کہ وہاں کے گھوڑے مالک کے ساتھ ایسے وفادار ہوتے ہیں جس کو سب جانتے ہیں (لڑائی میں جہاں عربی گھوڑا دیکھتا ہے کہ میرا مالک زخمی ہو کر گرا چاہتا ہے تو وہ وقت دشمن پر حملہ کر کے اور مالک کے پاس سے لوگوں کو ہٹا کر میدان سے اس کو لے بھاگتا ہے ۱۲)۔

زمانہ جاہلیت میں اہلِ عرب کے کمالات

اگر یہی طریقہ استدلال ہے تو گھوڑوں کی ان صفاتِ حمیدہ سے بھی تو اہل عرب کے کمالات پر استدلال کرنا چاہیئے تھا۔ مگر کچھ نہیں آج کل لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کرلیا ہے کہ اہل عرب کی جہالت ووحشت کو بہت ہی غلط اور بدنما بھدّے عنوان سے بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال ثابت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے جاہلوں کی اصلاح کی ایسے وحشیوں کو متمدن بنایا ان لوگوں کی نیت تو اچھی ہے مگر عنوان نہایت بُرا ہے۔ اول تو بات اتنی کہنا چاہتے جتنی اصلیت ہو اہل عرب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جہالت ووحشت ضرور تھی مگر نہ اتنی جتنی یہ لوگ بیان کرتے ہیں پھر جتنی جہالت تھی اس کے ساتھ ان کے کمالات وصفات حمیدہ کو بھی تو بیان کرنا چاہیئے جو ان میں خود زمانہ جہالت میں تھیں۔ اہل عرب میں ہمیشہ سے شجاعت کا جو ہر موجود تھا۔ زبان کے بڑے پکے تھے۔ جھوٹ بولنا جانتے ہی نہ تھے وفا عہد ان کی ضرب المثل ہے خیانت سے بہت ہی نفرت کرتے تھے مہمان نواز اور سخی نمبر اول کے تھے اور ایک بات تو ان میں ایسی تھی جو دنیا کی کسی قوم میں بھی نہ تھی وہ یہ کہ جب وہ دشمنوں کے ساتھ اپنے مقابلہ اور لڑائی کا

ذکر کرتے ہیں تو دشمن کی شجاعت و بہادری کا دل کھول کر تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ ایسے بہادر، ایسے کریم، ایسے دلیر تھے حتیٰ کہ کبھی میں اپنا پسپا ہونا بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ غرض دشمنوں کی تعریف کرنا یہ اہل عرب کی خاص صفت ہے اس پہلو کو بھی کرنا چاہیئے تا کہ ناظرین و سامعین کو اہل عرب سے نفرت نہ ہو ان کی نظروں میں یہ قوم ذلیل نہ ہو مسلمان کا دل اس بات کو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل وحقیر کرے اور اس طرح ان کا ذکر کرے جس سے قلوب میں ان سے نفرت پیدا ہو جیسا سرسید نے کیا ہے اس لئے مولانا محمد علی صاحب کو غصہ آیا اور اس کا خوب جواب دیا۔ خدا تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

جوانی میں مجاہدہ نفس کی زیادہ فضیلت ہے

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ نفس کو بقرہ کے ساتھ تشبیہ دینا بہت ہی مناسب ہے اس کے بعد ارشاد ہے۔ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَـرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ بقرہ (جس کے ذبح کا حکم ہوا ہے) نہ تو بالکل بوڑھا ف ہو نہ بہت بچہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو دونوں عمروں کے اوسط میں، لغت میں فارض کے معنی منقطع العمر ہیں یعنی جس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ قطع کر لیا ہو فرض کے معنی قطع ہیں۔ تو فارض کے معنی بہت بوڑھے کے ہوئے اور بکر کہتے ہیں اس نر یا مادہ کو جو دوسرے سے جفت نہ ہوا ہو اور جانور عادۃً جوانی سے پہلے ہی بکر رہتا ہے جوان ہونے کے بعد بکر نہیں رہتا پس بکر کے معنی یہاں بچہ کے ہیں جو ابھی تک جوان نہ ہوا ہو مطلب یہ ہوا کہ وہ بقرہ نہ بچہ ہو نہ بوڑھا ہو بلکہ ان دونوں عمروں کے درمیان ہو جس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ جوان ہو کیونکہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان جوانی ہی کا درجہ ہے۔ اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ علم اعتبار کے طور پر بقرہ سے نفس کو تشبیہ دی جاتی ہے تو اس صفت کو بھی نفس پر جاری کرنا چاہیئے جس سے اشارۃً یہ ثابت ہوا کہ جوانی میں مجاہدہ نفس کی زیادہ فضیلت ہے کیونکہ اس وقت غلبۂ قوت نفس کے سبب مجاہدہ شاق ہوتا ہے وَلَاَجْرُ بِحَسْبِ الْمُشَقَّةِ (یعنی ثواب اعمال کا مشقت کے موافق ہے) جس عمل میں زیادہ مشقت ہو وہ اس سے افضل ہے جس میں مشقت کم ہو۔ نیز قوت بدن کے سبب عمل بھی زیادہ ہے اور ظاہر ہے کہ کثرت عملی موجب ہوگا کثرت ثواب کا اور اس سے لازم یہ آتا ہے کہ بچپن اور بڑھاپے میں مجاہدہ کرنا جوانی کے مجاہدہ کے برابر نہ ہو مگر یہاں ایک سوال و جواب ضروری ہے وہ یہ کہ جوانی کے مجاہدہ میں دو درجے ہیں ایک یہ کہ جوانی

میں مجاہدہ کرتے ہوئے کام زیادہ کیا یا مقاومت نفس میں مشقت زیادہ برداشت کرنا پڑی اور اتنا کام اور اتنی مشقت بچپن اور بڑھاپے میں نہ کرنا پڑی اس صورت میں تو جوانی کے مجاہدہ کا بچپن کے اور بڑھاپے کے مجاہدہ سے افضل ہونا ظاہر ہے کیونکہ اس وقت عمل اکثر واشد ہوا تو قرب واجر بھی زیادہ ہوگا۔ اور ایک درجہ یہ ہے کہ جوانی میں بحالتِ مجاہدہ عمل زیادہ نہیں کیا مشقت زیادہ ہوئی بلکہ اتفاق سے کسی محل میں عمل ومشقت اتنی ہی کرنا پڑی جتنی بچپن یا بڑھاپے کے مجاہدہ میں ہوتی تو کیا اس صورت میں بھی جوانی کا مجاہدہ بچپن اور بڑھاپے کے مجاہدہ سے افضل ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں جوانی اور بڑھاپے کا مجاہدہ برابر ہو کیونکہ مجاہدہ شباب کی فضیلت بوجہ شدت وکثرت عمل کے تھی اور وہ اس صورت میں مفقود ہے۔

مگر یہ اس نفس سے مدلول بالا بالاعتبار کے خلاف ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ جوانی کا مجاہدہ مطلقاً افضل ہے خواہ اس میں مشقت وعمل زمانہ شیخوخت وصبا کے برابر ہو یا زیادہ ہو اور اس مدلول اعتباری کی تائید بعض احادیث کے اطلاق سے بھی ہوتی ہے جو عنقریب آتی ہے **وشابنشاء فی عبادة الله** (اور جوان جس نے شروع کی جوانی اپنے پروگرام کی عبادت میں) اگرچہ اس میں بھی احتمال معلل بالمشقۃ ہونے کا ہوسکتا ہے لیکن اطلاق لفظ پر اور بعض عبادات کے خالی عن المشقۃ ہونے پر نظر کرنے سے اس مدلول اعتباری کی تائید کو راجح کہا جاسکتا ہے اور اس صورت میں اس پر ایک سخت اشکال ہوگا وہ یہ کہ اس صورت میں صرف شباب کی وجہ سے بدون زیادت عمل کے قرب واجر کا زیادہ ہونا لازم آتا ہے اور شباب امر غیر اختیاری ہے تو لازم آیا کہ ایک امر غیر اختیاری کی وجہ سے اجر وقرب زیادہ ہوگیا۔

قرب امور ماموربہ میں امور اختیار کو دخل نہیں

حالانکہ صوفیہ کا قول ہے کہ قرب میں امور غیر اختیاریہ کو دخل نہیں یہ اشکال اس کی ایک نظیر میں کہ وہاں یہ حکم یقینی ہے مجھے برسوں رہا اور وہ نظیر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اولیاء سے مطلقاً افضل ہیں خواہ انبیاء کے اعمال اولیاء سے زیادہ ہوں یا برابر ہوں یا کم ہوں تو یقیناً وجہ افضلیت محض نبوت ہے اور ظاہر ہے کہ نبوت امر غیر اختیاری ہے یہاں بھی وہی اشکال ہے کہ امر غیر اختیاری کو زیادہ قرب میں دخل ہوا حالانکہ صوفیہ کی تصریح ہے کہ امور غیر اختیاری کو قرب میں دخل نہیں یہ اشکال کئی سال تک حل نہ ہوا اور نہ میں نے کسی سے پوچھا چاہے کوئی اس کو میرا تکبر ہی سمجھے مگر میں نے کسی کی طرف اس لئے رجوع نہیں کیا کہ مجھے حل کی امید نہ تھی اور وجہ امید نہ ہونے کی یہ تھی کہ لوگ آج

کل علوم تصوف کو فضول سمجھتے ہیں گو اعمال واشغال کا اہتمام تو کسی قدر ہے مگر علوم سے بہت ہی بے التفاتی ہے جس درجہ میں دیگر فنون کو حاصل کرنے اور پڑھتے پڑھاتے ہیں اس طرح اس کی طرف توجہ نہیں ہے اس لئے اشکالات تصوف کی وقعت اوران کے حل کی طرف التفات بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتا اس لئے میں نے کسی سے رجوع نہ کیا ہاں حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا رہا چنانچہ بحمد للہ کئی سال کے بعد یہ اشکال رفع ہوا۔ حل اس کا یہ ہوا کہ قول اکابر میں ایک ذرا سی قید محذوف ہے وہ جو یہ فرماتے ہیں کہ قرب میں امور غیر اختیاریہ کو دخل نہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ قرب مامور بہ میں ان امور کو دخل نہیں پس ان کے کلام میں مامور بہ کی قید گو مذکور نہیں مگر مراد ہے۔

قرب کی دو قسمیں

تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرب کی دو قسمیں ہیں ایک قرب مامور بہ جس کی تفصیل کا انسان مکلّف ہے اس میں تو صرف امور اختیاریہ ہی کو دخل ہے غیر اختیاری امور کو کچھ دخل نہیں ورنہ مامور بہ کا غیر اختیاری شے پر موقوف ہونا لازم آئے گا۔ اور یہ نص کے خلاف ہے **يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** (اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) دوسرے قرب موہوب جس کی تحصیل کا بندہ کو مکلّف نہیں کیا گیا بلکہ وہ وہب حق سے حاصل ہوتا ہے اور امور غیر اختیاری ہے و غیر اختیاری میں کسی غیر اختیاری کا دخیل ہونا مستبعد نہیں پس اب اشکال جا تا رہا کیونکہ نبوت سے جو قرب ہوتا ہے وہ قرب غیر مامور یعنی وہبی ہے تو اس میں نبوت کو دخل ہوسکتا ہے جو کہ امر غیر اختیاری ہے۔ اسی طرح جوانی کا مجاہدہ بچپن اور بڑھاپے کے مجاہدہ سے مطلقاً افضل ہونے میں بھی کچھ اشکال نہیں بلکہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ گو جوانی کے مجاہدہ میں مشقت وعمل زیادہ بھی نہ ہو جب بھی وہ زمانہ صبا وکھولت (لڑکپن و بڑھاپا) کے مجاہدہ سے افضل ہے جیسا کہ اس مقام پر اعتبار نص کا بھی مقتضا ہے دوسرے ایک حدیث سے بھی جس میں چند شخصوں کے لئے قیامت میں ظل عرش کی بشارت وارد ہے یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ اس کا ایک جملہ یہ ہے۔ **وَشَابٌ نَشَاءَ فِيْ عِبَادَةِ رَبِّهٖ** (اور جوان جو شروع جوانی سے اپنے پروردگار کی عبادت میں ہے) اس کے اطلاق سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود شاب ہی کو فضیلت میں دخل ضرور ہے مگر یہ فضیلت موہوب اور غیر مامور بہ ہے مامور بہ اور مکتسب نہیں اس میں صرف اعمال اختیاریہ کو دخل ہوتا ہے۔

قرب ماموربہ کا مدار اعمال اختیاریہ پر ہے

الحمدللہ حق تعالیٰ نے یہ علم عظیم عطا فرمایا جس سے بہت اشکالات حل ہوگئے اور علوم کا باب مفتوح ہوگیا۔ اب میں یہ بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ مجھے اس علم عظیم کی تفصیل بیان کرنے سے اس وقت مقصود کیا ہے تو سمجھئے کہ میرا مقصود یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے جوانی میں مجاہدہ نہ کیا ہو اور اب بڑھاپے میں مجاہدہ شروع کرنا چاہے تو وہ عبادت شباب کی فضیلت سن کر مایوس نہ ہو کر مجھے اب مجاہدہ سے ثواب ہی کیا ملے گا۔ شباب تو رہا ہی نہیں بلکہ اس کو جان لینا چاہیئے کہ قرب ماموربہ اس کو بھی مجاہدہ سے حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ اس کا مدار اعمال اختیاریہ پر ہے جن میں بوڑھا جوان برابر ہیں باقی جس قرب میں شباب کو دخل ہے یعنی قرب غیر ماموربہ سو اس کی تمنا بھی بوڑھے کو نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ تو اس کے حق میں وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (مت تمنا کرو اس چیز کی جس سے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) میں داخل ہے جس میں فضائل غیر اختیاریہ کی تمنا سے منع کیا گیا ہے۔ الغرض یہ بات واضح ہوگئی کہ قرب ماموربہ ہر شخص کو مجاہدہ سے حاصل ہوسکتا ہے اور مطلوب یہی ہے اور اس کی طلب و تمنا بھی جائز ہے پس بوڑھے کو بھی مجاہدہ کے ثمرات مکتسبہ سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔

ہر شخص کی قوّت کے ضعف کے مطابق مجاہدہ

رہا یہ کہ بڑھاپے میں خود مجاہدہ کی ہی ہمت اور طاقت کہاں رہتی ہے جس سے اکتساب قرب کیا جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ بوڑھے سے اس درجہ کا مجاہدہ مطلوب نہیں ہے جس درجہ کا جوان سے مطلوب ہے جوان کو جو نفع مجاہدہ شدیدہ سے ہوسکتا ہے بوڑھے کو وہی نفع مجاہدہ غیر شدیدہ سے ہوسکتا ہے کیونکہ اس کے لئے وہ ہی شدیدہ ہے۔ غرض ہر شخص کے لئے مجاہدہ کا ایک ہی طریقہ نہیں ہے بلکہ محقق ہر شخص کے مناسب مجاہدہ تجویز کیا کرتا ہے یہ کام عطائیوں کا ہے وہ سب کو ایک ہی لکڑی ہانکتے ہیں کہ جو آتا ہے اس کو ایک ہی وظیفہ بتلاتے ہیں کہ چوبیس ہزار یا بارہ ہزار دفعہ اسم ذات پڑھا کرو بوڑھا ہو یا جوان سب سے چکی ہی پسواتے ہیں۔ عارف شیرازیؒ ایسے ہی لوگوں کی شکایت فرماتے ہیں ۔

خستگا نراچہ طلب باشد و قوت نبود　　　　گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

(کمزوروں کو جب طلب ہو اور قوت نہ ہو اگر تم ان پر زیادتی کرو تو یہ مروت کی شرط

کے خلاف ہے)۔

بیدادیہی ہے کہ تم نے ایک کمزور کو وہ کام بتلادیا جو قوی کے مناسب تھا مولانا فرماتے ہیں ۔

چار پار قدر طاقت بار نہ　　　　برضیعفان قدر ہمت کار نہ
طفل را گرنان وہی برجائے شیر　　　　طفل سکین را ازان نان مردہ گیر

(چار پاوؤں پر ان کی طاقت کے موافق بوجھ رکھو، کمزوروں کو ان کی ہمت موافق کا دو۔ بچہ کو اگر روٹی دودھ کے بدلے دو تو بچہ کو مردہ سمجھ لو)۔

بچہ کو اگر دودھ کی جگہ روٹی دینے لگو تو ظاہر ہے چند روز میں سدّہ کی تکلیف سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ محقق ایسا کبھی نہیں کرتا وہ ہر شخص کی دماغی اور جسمانی قوت کا لحاظ کر کے مجاہدہ تجویز کرتا ہے نیز فراغت وعدم فراغت کی رعایت کرتا ہے وہ شخص قوی تندرست ہیں مگر ان میں ایک فارغ ہے دوسرا اہل وعیال وغیرہ میں مشغول ہے وہ ان دونوں کے لئے بھی یکساں دستورالعمل تجویز نہ کرے گا۔

سیدالطائفہ حضرت حاجی صاحب ایک شیخ کامل

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ واقعی اس طریق کے مجدد وحکیم تھے۔ حضرت کے یہاں ہر شخص کے لئے جدا تعلیم تھی۔ کسی کو صرف تلاوت قرآن کی تعلیم فرماتے تھے کسی کو محض کثرت نوافل، کسی کو ذکر اللہ پھر اس میں بھی کسی کو ذکر خفی کسی کو ذکر جہر کسی کو چوبیس ہزار دفعہ کسی کو بارہ ہزار کسی کو دو تین ہزار حتی کہ حضرت نے بعض لوگوں کو صرف یہ بتلایا کہ بعد ہر نماز کے تین دفعہ لاالٰہ الا اللہ کہہ لیا کرو اور بعضوں کو یہ بتلایا کہ خانقاہ والوں کی خدمت کیا کرو جیسے پانی بھرنا، ان کے لئے گوشت روٹی لا دینا ان کی جوتیاں سیدھی کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اور بحمد للہ جس کو جو بتلادیا وہ اسی سے کامیاب ہو گیا تو یہ حضرات ہیں حکیم نہ وہ کہ محض گل بنفشہ یاد کرے اور ہر ایک کو وہی پلایا کرے جیسے ایک حکیم کے لڑکے کا قصہ ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ ایک مریض کے دیکھنے کو گیا۔ کہ حکیم نے نبض دیکھ کر کہا شاید آپ نے نارنگی کھائی ہے۔ مریض نے اقرار کیا کہ واقعی نارنگی کھائی تھی لڑکے نے باپ سے پوچھا تھا کہ نبض سے یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے کہا نبض سے تو صرف برودت کا غلبہ معلوم ہوا تھا پھر وہاں اتفاق سے نارنگی کے چھلکے پڑے تھے اس سے میں سمجھا کہ نارنگی کا استعمال کیا ہے بس اب بیوقوف لڑکے کے یہ نسخہ ہاتھ آ گیا کہ جس مریض کے پاس جو چیز پڑی ہوئی نظر آئی کرے وہ وہی کھایا کرتا ہے چنانچہ باپ کے انتقال کے بعد جب ان کا دور دورہ ہوا تو یہ کسی

مریض کو دیکھنے گئے آپ نے نبض دیکھی پھر اس قاعدہ کے موافق چار پائی کے نیچے نظر دوڑائی تو وہاں نمدہ پڑا ہوا دیکھا تو آپ مریض سے کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے آپ نے نمدہ کھایا ہے لوگ ہنسنے لگے مریض نے کہا نمدہ بھی کوئی کھایا کرتا ہے۔ تو آپ کہتے نبض سے تو یہی معلوم ہوتا ہے اس نے نوکروں سے کہا نکالو اس بیوقوف کو اس کی دم میں نمدہ۔ تو ایسے ہی جو شیخ عطائی ہوتا ہے وہ دو چار اشغال یاد کر کے سب کو وہی بتلاتا ہے یہ نہیں دیکھتا کہ یہ تعلیم اس شخص کے مناسب ہے یا نہیں شیوخ کو محقق ہونا چاہیئے کہ جیسی استعداد وقوت ہو ویسی تجویز ہو۔ پس بوڑھوں اور کمزوروں کو مجاہدہ سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ ان سے چکی نہ پسوائی جائے گی۔ بلکہ ان کی طاقت وہمت کے موافق کام بتلایا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ کسی محقق کے پاس پہنچ جائیں پھر جو کچھ وہ تم کو بتلائے اس میں اپنی تجویز کو دخل نہ دو اپنی طرف سے کچھ کچھ تجویزیں کر کے اس کے سامنے پیش کرو کہ حضرت میں یہ بھی کر لیا کروں حضرت میں وہ بھی کر لیا کروں۔ بلکہ سب کام اسی پر چھوڑ دو وہ تمہاری مصلحت کو تم سے زیادہ جانتا ہے ؎

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید　　　که سالک بے خبر نبود زراہ رسم منزلہا

(امر مباح جو طریقت کے خلاف مرنے سے منکر معلوم ہوتا ہوا گر مرشد بتلا دے تو اس پر عمل کرے اس کو حقیر نہ سمجھے کیونکہ شیخ کو اس کے نشیب وفراز کا زیادہ تجربہ ہے)۔

پھر انشاء اللہ تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے مگر ایک شرط اور ہے وہ یہ کہ جو کچھ تم کو بتلا دے اس پر عمل کر کے اپنے حالات وکیفیات سے اسے اطلاع بھی دیتے رہو محض ان کے کشف کے بھروسہ پر نہ رہو کیونکہ اول تو شیخ کا صاحب کشف ہونا لازم نہیں اور ہو بھی تو کشف کے لئے دوام لازم نہیں کہ ہر وقت ہوا کرے اور ہر وقت بھی شیخ تمہاری طلب کا بھی تو منتظر ہے۔ دیکھو حق تعالیٰ کو تو سب کا حال معلوم ہے۔ وہاں تو کسی کے بتلانے کی کچھ ضرورت نہیں مگر طلب کے بغیر وہ بھی کچھ نہیں دیتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اَنُلْزِمُکُمُوْھَا وَاَنْتُمْ لَھَا کَارِھُوْنَ (کیا ہم اپنی نعمت کو تم پر چپکا دیں حالانکہ تم اس سے کراہت کر رہے ہو تو بدون طلب کے حق تعالیٰ کے یہاں سے بھی نہیں ملتا وہاں بھی اظہار طلب کی ضرورت ہے حالانکہ وہاں شان یہ ہے ؎

چہ حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن　　　کہ حال خستہ دلا نرا تو خوب میدانی

(تیرے سامنے دل کا حال بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے اس لئے خستہ دلوں کا حال تو خوب جانتا ہے)۔

نفس اور بقرہ کی صفات میں مشابہت

واقعی حق تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے کسی کے اظہار کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی اظہار کا امر اس لئے ہے تا کہ تمہارا عجز ظاہر ہو تم ناک رگڑو گریہ وزاری کرو ان کو یہ ادا پسند ہے اس لئے دعا وغیرہ کی ضرورت ہے پھر مشائخ سے بدوں اظہار طلب کے تم کیونکر فیض لینا چاہتے ہو وہ تو انسان ہیں، محتاج بھی ہیں مستغنی نہیں ہیں ان کو اگر تمہارے اظہار طلب کا انتظار ہو تو کیا تعجب ہے اس کے بعد بقرہ کی ایک صفت یہاں پر یہ مذکور ہے قَالَ اِنَّهُ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۔ یعنی ارشاد ہے کہ وہ بقرہ زرد رنگ کی ہو (کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو) اس صفت کو بھی نفس سے مناسبت ہے کیونکہ صوفیہ کو لطیفہ نفس کا رنگ بھی زرد ہی مکشوف ہوا ہے اور اس کو لطیفہ میں نے اصطلاح کے اعتبار سے کہہ دیا اور وہ اصطلاح بھی تغلیب پر مبنی ہے ورنہ وہ تو کثیفہ ہے۔ البتہ مجاہدہ سے مطمئن ہونے کے بعد ایک معنی لطیفہ ہی بن جاتا ہے۔ ایک صفت بقرہ کی یہ ہے۔ لَا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا کہ وہ بقرہ کام کاج میں مستعمل نہ ہو نہ زمین کو جوتتا ہو نہ کھیت کو پانی دیتا ہے (اس میں داغ دھبہ نہ ہو) اس میں اشارہ ہے نفس کے فراغ کی طرف یعنی مجاہدہ سے پہلے نفس کو تمام افکار و تعلقات سے فارغ کر کے یکسو ہو کر مجاہدہ کرنا چاہیئے کہ اسی حالت میں مجاہدہ کا اثر پورا ظاہر ہوتا ہے کچھ دنوں کے لئے سارے کاروبار کسی کے سپرد کر کے عزلت گزیں ہو کر مجاہدہ کرو پھر دیکھو کہ کتنی جلدی اثر ہوتا ہے (گو مجاہدہ بحالت شغل بھی اپنا اثر دکھاتا ہے مگر تجربہ ہے کہ حالتِ فراغ میں جیسا اثر کامل ہوتا ہے ویسا بحالتِ شغل نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانہ میں نسبتیں قوی ہوتی تھیں اور حالت بھی عالی طاری ہوتے تھے کیونکہ پہلے زمانہ میں طالبین فراغ کیساتھ مشغول مجاہدہ ہوتے تھے اور مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيْهَا (صحیح وسالم ہو اس میں داغ دھبہ نہ ہو) میں اس طرف اشارہ ہے کہ نفس مجاہدہ سے پہلے تمام معاصی سے پاک صاف ہو جائے یعنی معاصی سابقہ سے توبہ صادق کر کے مجاہدہ کرے اگر کسی بندہ کے حقوق ذمہ ہوں ان کو ادا کر دے یا معاف کرالے اور خدا کا حق جیسے نماز روزہ قضا ہو گیا ہو تو اس سے توبہ کر کے ان کی قضا شروع کر دے اس طرح توبہ کرنے سے نفس گناہوں سے بالکل پاک ہو جائے گا کیونکہ التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ (سنن ابن ماجۃ: ۴۲۵۰، مشکوٰۃ المصابیح ۲۳۶۳) (پس وہ اسی کا مصداق ہوگا مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيْهَا ۱۲ جامع (صحیح سالم ہے اس میں معاصی بھی نہیں) یہ تو بیان تھا صفات مذکورہ کی مناسبت کا مجاہدہ کے مضمون سے اور

قربانی کے مضمون سے ان کو یہ مناسبت ہے کہ قربانی میں ایسا جانور ذبح کرنا چاہیئے جس کا ذبح کرنا نفس پر گراں ہو یعنی قیمتی جانور ہو تندرست موٹا تازہ خوبصورت ہو جس کو ذبح کر کے کچھ جی بھی تو دکھے، ایسا نہ ہو جس کو ذبح کر کے دل یوں کہے کہ اچھا ہوا پاپ کٹا۔ بعض لوگ واقعی ایسا جانور ذبح کرتے ہیں جو مارنے سے پہلے ہی مرا ہوا ہوتا ہے (تو اس کا ذبح کرنا اس کا مصداق ہے)۔

(جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو اگر مارا تو کیا مارا ۱۲ جامع)

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ایسی اونٹنی کی قربانی کی تھی جس کی قیمت تین سو دینار تھی اگر ایسا بھی نہ ہو تو کم از کم آنکھ ناک کا تو درست ہو دیکھنے میں برا تو نہ معلوم ہو۔

مجاہدہ کی حقیقت

اب میں مجاہدہ کی حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں تو سنئے مجاہدہ کہتے ہیں نفس کی مخالفت کرنے کو یعنی اس کے اقتضاء کو روکنا مثلاً باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے تو مجاہدہ یہ ہے کہ خاموش رہو کسی وقت خاموشی کو جی چاہتا ہے اس وقت مجاہدہ یہ ہے کہ باتیں کرو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ نفس کے ہر تقاضے کی مخالفت کیا کرو یہاں تک کسی وقت کھانے پینے کو جی چاہے تو بھوکے پیاسے مرنے لگو نہیں بلکہ اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ اقتضاءات نفس کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو یقیناً مذموم ہیں یعنی خلاف شرع ہیں ان کی مخالفت تو ضروری ہے اور بعض وہ ہیں جو یقیناً محمود ہیں جیسے فرض نماز، روزہ اور بقدر ضرورت کھانا پینا، کپڑا پہننا ان کی مخالفت ضروری کیا ہوتی بلکہ موافقت ضروری ہے اور بعض وہ ہیں جو نہ یقیناً مذموم ہیں نہ یقیناً محمود ہیں بلکہ دونوں کو محتمل ہیں جیسے مباحات بلکہ بعض دفعہ بعضے مستحبات بھی ان میں شیخ محقق سے رجوع کیا جائے اگر وہ کہہ دے کہ تقاضا محمود ہے تب تو مخالفت کی ضرورت نہیں اور اگر وہ کہے کہ یہ تقاضا مذموم ہے تو اس کی مخالفت کی جائے شاید یہاں کسی ذہین کو شبہ ہو کہ تم نے مستحبات کو بھی غیر مذموم محمود کی فہرست میں شمار کر دیا حالانکہ جو چیز شرعاً مستحب ہے وہ تو یقیناً محمود ہے اس میں مذموم ہونے کا احتمال کیوں ہو سکتا ہے سو خوب سمجھ لو کہ مستحبات گو فی نفسہ محمود ہی ہیں مگر جب نفس کسی مستحب کا تقاضا کرے اس وقت وہ کسی عارض کے سبب مذموم ہو سکتا ہے کیونکہ نفس تو امارہ بالسوء ہے یہ تو ہمیشہ برائی کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔

نفس کی چال

جب نفس میں کسی مستحب کا تقاضا ہوگا تو اندیشہ ہے کہ اس میں نفس کی کوئی چال ہے اس

چال پر نظر کر کے وہ تقاضائے مستحب مذموم ہوسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ بعض تقاضے ظاہر ہیں محمود ہوتے ہیں۔ مگر دوسرے پہلو پر نظر کر کے مذموم ہو جاتے ہیں جیسے ایک شخص حج نفل کا قصد کرے اور وہ نماز میں سست ہو تو شیخ اس کو حج سے منع کرے گا اور یوں کہے گا۔

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید　　معشوق دریں جاست بیائید بیائید

(اے لوگو حج کو کہاں جاتے ہو محبوب یہاں ہے ادھر آؤ)۔

کیونکہ اس شخص کے نفس میں تقاضائے حج پیدا ہونا یہ نفس کی چال ہے وہ چاہتا ہے کہ میں کئی حج کر کے لوگوں کی نظروں میں معزز ہو جاؤں گا یا سیر و سیاحت میں جی بہلاؤں گا اس لئے شیخ اس کو حج سے منع کرتا ہے کہ تمہارے لئے میرے ہی پاس رہنا مفید ہے حج مفید نہیں کیونکہ تمہاری نیت خالص نہیں پھر نماز میں سُست ہو ایک نفل کے لئے نہ معلوم کتنے فرض برباد کرو گے لوگ مشائخ کے ایسے احکام سن کر اعتراض کرتے ہیں کہ حج سے روک دیا میں کہتا ہوں غلط ہے وہ حج سے نہیں روکتے بلکہ معاصی سے روکتے ہیں اس شخص کے حق میں فقیہ کے فتوے سے حج ناجائز ہے صوفی بھی فقیہ ہوتا ہے۔

فقیہ کون ہے؟

فقہ صرف ہدایہ اور کنز کا نام نہیں تصوف بھی فقہ میں داخل ہے امام صاحبؒ سمجھے اس فقیہ کو وہ فرماتے ہیں الفِقْهُ مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَالَهَا وَعَلَيْهَا (نفس کا ان چیزوں کا پہچاننا جو اس کے لئے نافع اور ضرر رساں ہے فقہ کہلاتا ہے) تو فقہ اصل میں معرفت نفس للنافع والضار کا نام ہے اور یہ تعریف فقہ کی صوفیہ پر سب سے زیادہ صادق آتی ہے، بشرطیکہ صوفی جاہل نہ ہو کیونکہ یہ حضرات نفس کے مصالح و مضار کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ پس حیرت ہے کہ ایک کتابی فقیہ کسی مستحب کو ناجائز کہہ دے وہ تو ناجائز ہو جائے اور ایک عارف فقیہ ناجائز کہے تو ناجائز نہ ہو، دیکھئے فقہا صاف لکھتے ہیں کہ اگر کسی وقت مستحب ترک فرض کی طرف مفضی ہو جائے تو اس وقت مستحب ممنوع ہو جاتا ہے (چنانچہ مولود فاتحہ میں مفاسد ہی کی وجہ سے بعض مستحبات کو ممنوع قرار دیا گیا ہے ۱۲) پھر اسی قاعدہ سے صوفی اگر مستحب سے روک دے تو اس پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے۔ صاحب یہ نفس بڑا ہوشیار ہے اس کے تقاضے بڑے باریک ہوتے ہیں جن میں یہ سمجھنا کہ کون سا تقاضا محمود ہے اور کون سا مذموم ہے بڑے محقق کا کام ہے بعض دفعہ ظاہر میں تقاضا بہت اچھا ہوتا ہے مگر جب حقیقت منکشف ہوتا ہے اس وقت نفس کا کید ظاہر ہوتا ہے۔

نفس کے باریک کید

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ ایک مقام پر مشغول ریاضت تھے کہ دفعتہً قلب میں جہاد کا تقاضا ہوا کہ فلاں مقام پر مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوکر کفار کے ساتھ جہاد کرو وہ بڑے پریشان ہوئے کہ یہ نفس امارہ بالسوٗ ہے اس لئے یہ امر بالمعروف کیسا۔ چونکہ طالب صادق تھے اس لئے کھٹک گئے مگر حقیقت منکشف نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے حق تعالیٰ سے دعا کی مجھے اس تقاضے کی حقیقت سے مطلع کیا جائے کہ یہ محمود ہے یا مذموم آخر مکشوف ہوا کہ تمہارا نفس نجات عاجلہ چاہتا ہے وہ روز کے مجاہدات سے گھبرا کر چاہتا ہے کہ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ ایک دفعہ گردن کٹ جائے تو رات دن کے رگیدنے سے بچ جاؤں۔ بس یہ معلوم کرتے ہی جہاد کے ارادے سے رک گئے۔ اور نفس سے کہا کہ جس جہاد میں اس وقت مشغول ہوں وہ تو فرض عین ہے اور جس جہاد کا تو طالب ہے وہ فرض کفایہ ہے میرے بہت سے مسلمان بھائی اس کو انجام دے رہے ہیں میں تو تجھ سے اسی طرح چکی پسواتا رہوں گا۔

تو دیکھئے کہ ظاہر میں تقاضا کیسا محمود تھا مگر اس میں نفس کی چال تھی وہ فرض عین سے ہٹا کر فرض کفایہ میں مشغول کرنا چاہتا تھا۔ کیا پوچھتے ہو اس نفس کی چالوں کو یہ بڑا شریر ہے۔ لوگ شیطان پر لعنت کرتے ہیں اور اس کو الزام دیتے ہیں مگر شیطان سے زیادہ خود انسان کا نفس اس کو تباہ کرتا ہے (اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ ۱۲ جامع) (تمہارے دشمنوں میں سب سے بڑا دشمن تمہارا نفس ہے جو تمہارے دونوں پہلو میں ہے)۔

شیطان کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ ہم جیسوں کو بہکانے آئے وہ تو خاص خاص لوگوں کو بہکاتا ہے جن کا نفس درست ہو گیا ہے اور ہم جیسوں کا تو نفس ہی بہکانے کے لئے کافی ہے اس کو بعض دفعہ وہ بات سوجھتی ہے کہ شیطان کو بھی نہیں سوجھتی۔ دیکھئے فرعون نے اپنے کو خدا کہا اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمارا رب اعلیٰ ہوں) کا دعویٰ کیا یہ ہمت شیطان کی بھی نہ تھی۔

انسان کا نفس شرارت میں شیطان سے بڑا ہے

چنانچہ بر سیر میں لکھا ہے کہ شیطان نے فرعون سے کہا تھا کہ جو بات تو نے انسان ہوکر کہی ہے میں شیطان ہوکر بھی نہ کہہ سکا تیری ہمت مجھ سے بھی بڑھی ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ فرعون ہماری ہی

برادری کا تھا یعنی انسان تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا نفس شرارت میں شیطان سے بھی بڑا ہوا ہے فرعون کے لئے اِنَّہٗ طَغٰی (کہ وہ سرکشی میں بڑھ گیا ہے) اسے پڑھنے کے لئے فرمایا ہے اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا، ہمارے یہاں ایک شخص پڑھتا ہے اور ہمارے گھر کا کاروبار بھی کرتا ہے میں نے اس سے پوچھا کہ تمہاری ذات کیا ہے اس نے کہا تگہ میں نے کہ فرعون کے بارے میں آیا ہے اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی (فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکشی میں بڑھ گیا ہے) کہیں تگا اس طغٰی کا مہند تو نہیں۔ خیر یہ تو ہنسی کی بات تھی مگر اس سے قرآن کی تحریف کا شبہ نہ ہو کیونکہ میرا مطلب یہ نہ تھا کہ قرآن میں لفظ طغی تگہ کی عربی ہے بلکہ میرا مطلب یہ تھا کہ اردو والوں نے کہیں طغیٰ کو بگاڑ کر تگا تو نہیں کر دیا۔ بہرحال ہمارا نفس بھی کچھ شیطان سے کم نہیں ہے ہمارے بہکانے کو تو یہی بہت ہے۔ دوسرے اگر شیطان ہمیں بہکاتا بھی ہے تو اس کا اس سے زیادہ کچھ زور نہیں چلتا کہ وہ وسوسہ اور خطرہ دل میں ڈال دیتا ہے۔ پھر اس پر عمل کرنا یہ ہمارے نفس کا فعل ہے شیطان ہم سے عمل نہیں کرا سکتا۔ چنانچہ جب قیامت میں جب دوزخ والے اس کو ملامت کریں گے کہ کم بخت تو نے ہم سب کو تباہ کیا تو وہ یہی کہہ کر صاف الگ ہو جائے گا۔

وَقَالَ الشَّیْطَانُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰہَ وَعَدَکُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّکُمْ فَاَخْلَفْتُکُمْ وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُکُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَکُمْ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِکُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّ اِنِّیْ کَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ (یعنی جب فیصلہ ہو چکے گا اور جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں پہنچ جائیں گے۔ اور وہ سب شیطان کو بُرا بھلا کہیں گے) تو شیطان (ان سے) کہے گا کہ مجھے ملامت کیوں کرتے ہو تم سے حق تعالیٰ نے تو سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی ایک وعدہ کیا تھا جو غلط وعدہ تھا (پھر تم نے خدا کے وعدہ کو چھوڑ کر میرے وعدہ کو کیوں مانا) اور (میں نے تم پر کچھ زبردستی تو کی نہ تھی) تمہارے اوپر میرا قابو ہی کچھ نہ تھا سوائے اس کے کہ میں نے تم کو (ایک بات کی طرف) بلایا اور تم نے میری دعوت کو قبول کر لیا۔ تو اب مجھے ملامت نہ کرو اپنے نفسوں ہی کو ملامت کرو اب نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو۔

شیطان کو ملامت کرنا فضول ہے

حقیقت میں شیطان کا کام سوا اس کے کچھ نہیں کہ وہ ایک بات دل میں ڈال دیتا ہے اب اس پر

عمل کرنا یہ خود ہمارا کام ہے شیطان ہم سے زبردستی عمل نہیں کرا سکتا پھر اس کو ملامت کرنا فضول ہے کیونکہ وہ تو کھلا ہوا دشمن ہے وہ اگر ہمیں بُرا مشورہ دے تو کچھ بعید نہیں مگر اس سے بڑھ کر ہمارا دشمن یہ نفس ہے جو بظاہر ہم سے ملا ہوا ہے اور باطن میں شیطان سے ملا ہوا ہے کہ جو شیطان کہتا ہے۔ یہ کم بخت نفس اس کو خفیہ خفیہ ہمارے سامنے آراستہ ومزین کرکے پیش کردیتا ہے جس سے ہم مبتلائے معاصی ہوجاتے ہیں مثل مشہور کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھا۔ ئے۔ وہی حال اس نفس کا ہے کہ یہ ہم سے مل کر ہم کو تباہ کرتا ہے باقی شیطان تو صرف شیرہ لگاتا ہے آگے سب کچھ ہم خود کرتے ہیں۔ شیرہ لگانے کا قصہ یہ ہے کہ کسی نے شیطان سے کہا تھا کہ کم بخت تو نے مخلوق کو تباہ کردیا کہ ان سے کیسے کیسے مفاسد کا ارتکاب کراتا ہے اس نے جواب دیا کہ بالکل غلط میں تو ذرا سا اشارہ کرتا ہوں آگے ساری خرابیاں تم اپنے ہاتھوں سے کرتے ہو آئیں تم کو اپنا کام دکھلاؤں یہ کہ کروہ ایک حلوائی کی دوکان پر لے گیا اور جا کر ذرا سا شیرہ دیوار کو لگا دیا اور شیرہ لگا کر خود الگ ہوگیا اور ملامت گر سے کہا کہ میرا کام تو بس اتنا تھا اب آگے تم اپنی برادری کے کرتوت ملاحظہ کرو۔ شیرہ کے اوپر مکھیاں آئیں، مکھیوں کے اوپر چھپکلی دوڑی چھپکلی کے اوپر ایک بلی جھپٹی راستہ میں ایک سوار جارہا تھا اس کا کتا بلی کو دیکھ کر حملہ آور ہوا کتے نے جو بلی کو مارا تو حلوائی نے غصہ میں کتے کے لاٹھی ماری جس سے وہ مرگیا سوار نے جو اپنے کتے کو مرا ہوا دیکھا اس نے تلوار نکال کر حلوائی کا صفایا کردیا۔ حلوائی کے قتل پر بازار والوں نے سوار کو مار ڈالا وہ فوج کا افسر تھا فوج کو اطلاع پہنچی کہ ہمارا افسر مارا گیا اس نے سارے شہر کا محاصرہ کرلیا اور قتل عام شروع ہوگیا۔ شیطان نے کہا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ میں نے کیا کیا تھا اور آپ کی برادری کے بھائیوں نے کہاں سے کہاں نوبت پہنچا دی اس لئے میں نے کہا تھا کہ نفس کے اقتضاءات بڑے باریک ہوتے ہیں یہ کم بخت مستحبات اور مباحات میں بھی ہم کو دھوکہ دیتا ہے اس کے اقتضاءات محمودہ بھی قابل اطمینان نہیں۔

تقاضائے نفس کی تین اقسام

الغرض نفس کے تقاضے تین قسم پر ہیں ایک محمودہ ان کی مخالفت کسی حال میں بھی ضروری کیا جائز بھی نہیں بشرطیکہ شیخ محقق کہہ دے کہ تقاضا محمود ہے۔ دوسرے تقاضائے مذموم اس کے ترک کی ضرورت ہے تیسرے وہ جو ظاہر میں نہ مذموم ہیں نہ محمود ہیں یعنی مباحات بشرطیکہ ان میں انہماک نہ ہو۔ ورنہ پھر وہ بھی مذموم ہیں ان میں اکثر تو نفس کی مخالفت چاہیئے گا ہے گا ہے موافقت کا مضائقہ نہیں پس خلاصہ مجاہدہ کا یہ ہوا کہ مباحات میں نفس کی مخالفت کی جائے اور محرمات میں اس کی مخالفت اس طرح کہ ترک کیا جائے اور مجاہدہ کا یہ درجہ تو سب کے نزدیک واجب ہے اس

طرح کہ ان کی تقلیل اور اس کی ضرورت ہر مسلمان کے نزدیک مسلم ہے بلکہ اصل حالت کے اعتبار سے تو اس کو مجاہدہ میں داخل کرنا بھی ٹھیک نہیں بھلا زہر سے بچنا بھی کچھ مجاہدہ ہے مجاہدہ تو اسے کہتے ہیں جس میں نفس پر مشقت وگرانی ہو اور ظاہر ہے کہ اصل مشقت فطرت میں انہی کاموں کے ترک میں ہوتی ہے جن کی فی الجملہ اجازت ہے اور جن کا حرام ہونا معلوم ہے ان کے ترک میں مجاہدہ ہی کیا ہوتا مگر چونکہ قریب قریب ہر شخص محرمات میں بھی مبتلا ہے اس لئے ترک محرمات بھی مجاہدہ ہوگا۔ ورنہ اصل فطرت کے اعتبار سے تو اصل مجاہدہ یہی ہے کہ مباحات میں بھی نفس کی مخالفت کی جائے کہیں انہماک میں کہیں نفس فعل میں بھی کیونکہ بعض موقع میں جب نفس کی مباحات سے روکا جائے گا اس وقت وہ محرمات سے بچ سکے گا کیونکہ مباحات کی سرحد محرمات سے ملی ہوئی ہے اور قاعدہ ہے کہ جس جنگل میں شیر رہتا ہو اس سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کی سرحد کے بھی پاس نہ جاؤ اگر کوئی شخص اس جنگل کی حدود میں رہ کر شیر سے بچنا چاہے یہ اس کی حماقت ہے ممکن ہے کبھی غلطی سے حد کے اندر داخل ہو جائے اور شیر کا سامنا ہو جائے۔

مباحات کے انہماک سے بچنے کی ضرورت

اس لئے سالکین کو مباحات میں انہماک سے بہت ہی احتراز چاہیئے اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ بیوی بچوں کو چھوڑنا اور گھر کو تالا لگانا یہ مجاہدہ نہیں ہے۔ کیونکہ بیوی بچوں کی خبر گیری شرعاً فرض ہے اور مجاہدہ ترک فرائض کا نام نہیں بلکہ ترک محرمات اور کہیں ترک مباحات کا نام ہے اگر کسی شخص کو بیوی سے محبت ہو جائے تو اس کے ازالہ کا حکم نہ کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ محبت خلاف شرع نہیں بلکہ شرعاً مطلوب ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی) مجاہدہ کی حقیقت تو معلوم ہو گئی اب یہ بھی سمجھ لیجئے کہ مجاہدہ کا اثر کیا ہوگا کیونکہ اس میں بھی بہت لوگ غلطی کرتے ہیں بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مجاہدہ سے نفس کے رذائل اور تقاضائے معصیت بالکل زائل ہو جاتے ہیں سو خوب سمجھ لو یہ خیال غلط ہے مجاہدہ کا یہ اثر نہیں ہے بلکہ مجاہدہ کا اثر یہ ہے کہ اس سے تقاضائے معصیت مضمحل اور کمزور ہو جاتا ہے۔

مجاہدہ سے تقاضائے نفس کا زوال مقصود نہیں

بعض لوگ مجاہدہ کر کے جب تقاضائے معصیت پھر اپنے اندر موجود پاتے ہیں تو مایوس

ہو جاتے ہیں کہ ہماری ساری محنت بیکار گئی ان لوگوں کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ مجاہدہ بیکار نہیں گیا کیونکہ مجاہدہ سے زوال تقاضا مطلوب نہیں اگر تقاضا بالکل زائل ہو جائے تو پھر گناہوں سے بچنے میں ثواب ہی کیا ہوگا۔ ثواب تو اسی بات کا ہے کہ نفس میں تقاضائے معصیت موجود ہے اور تم اس سے بچتے ہو۔ دیکھو عنین (نامرد) اگر زنا نہ کرے تو اس کا کیا کمال ہے اندھا اگر نظر بد سے بچا رہے تو کون سی خوبی ہے۔ کمال تو یہی ہے کہ تم سوانکھے، وادر مرد ہو پھر بھی نگاہ بد سے اور زنا سے بچتے ہو مولانا فرماتے ہیں۔

شہوت دنیا مثال گلخن است   کہ از و حمام تقویٰ روشن است

(دنیا کی شہوت مثل انگیٹھی کے ہے کہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے)۔

خوب مثال دی کہ شہوت کی ایسی مثال ہے جیسے ایندھن جس سے حمام روشن ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح تقاضائے معصیت بیکار چیز نہیں بلکہ یہ حمام تقویٰ کے لئے ایندھن ہے اگر یہ ایندھن نہ ہو تو حمام تقویٰ سرد پڑ جائے تقویٰ کی رونق اور گرم بازاری اسی تقاضائے معصیت سے ہے بشرطیکہ اس کو جلاتا پھونکتا رہے دل میں جمع کر کے نہ بیٹھے کیونکہ ایندھن سے جلانے کا کام لوگے جبھی روٹی پکے گی ورنہ بھوکے مرو گے اس پر شاید کوئی صاحب یہ کہیں کہ جب ثواب اسی تقاضائے کی وجہ سے ملتا ہے تو پھر مجاہدہ کی اور اس تقاضے کو مضمحل (کمزور) کرنے کی کیا ضرورت ہے اچھا ہے اسے قوی رہنے دو زیادہ ثواب ہوگا۔

مجاہدہ کی ضرورت

اس کا جواب یہ ہے کہ مجاہدہ کی اس لئے ضرورت ہے تا کہ مقاومت (اور مقابلہ) سہل ہو جائے (تنور میں اتنا ہی ایندھن ہونا چاہیئے جس سے تنو پھٹ نہ جائے اگر زیادہ ایندھن ہوا تو کسی وقت تنور کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا جس سے پاس والے بھی جل بھن جائیں گے۔ انجن کے لئے آگ کی ضرورت مسلم ہے مگر اسی قدر جس سے بیلر پھٹ نہ جائے ۱۲ جامع) اگر تقاضائے معصیت کو مضمحل نہ کیا گیا تو کسی وقت گناہ میں مبتلا کر کے تم کو تباہ کر دے گا اور اس وقت اس کا مقابلہ دشوار ہو جائے گا۔ ان کے نیچے گھوڑا شائستہ ہی رہنا چاہیئے ورنہ کسی وقت ضرور ٹپک دے گا۔ گو شائستہ گھوڑا کبھی شوخی کیا کرتا ہے مگر اس کی مقاومت سہل ہوتی ہے پس سالکین کو مجاہدہ کر کے بے فکر نہ ہونا چاہیئے بلکہ تھوڑا بہت مجاہدہ پھر بھی باقی رہے گا۔ بلکہ عارفین نے لکھا ہے کہ مجاہدہ ابتدائی کے بعد جو مجاہدہ شروع ہوتا ہے اس کی زیادہ ضرورت ہے (ایسا کہ پہلے تفصیل مذکور ہو چکا ہے) رہا یہ کہ جب مجاہدہ کے بعد بھی مجاہدہ کی ضرورت ہے تو پھر صاحب مجاہدہ و غیر صاحب مجاہدہ میں کیا فرق ہوا

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں میں وہی فرق ہے جوان دوسواروں میں ہے جن میں سے ایک کی ران کے نیچے شائستہ گھوڑا ہے اور ایک کے نیچے غیر شائستہ گھوڑا ہے۔ گو ہوشیار رہنے کی ضرورت تو اس کو بھی ہے جس کے نیچے شائستہ گھوڑا ہے کیونکہ شائستہ بھی بعض دفعہ شوخی کر جاتا ہے مگر اس کو اتنا خطرہ نہیں ہوتا جتنا اس سوار کو ہوگا جس کے نیچے غیر شائستہ گھوڑا ہے کہ اس کو ہر وقت اپنی جان کا خطرہ ہے شائستہ گھوڑا اگر شوخی کرتا ہے تو ایک ایڑ سے سیدھا ہو جاتا ہے اور غیر شائستہ شوخی کرتا ہے تو سوار کے باپ سے بھی نہیں سنبھلتا تو یہ کیا تھوڑا فرق ہے اور سنو! دو شخص ڈاکوؤں کے جنگل میں جا رہے ہیں جن میں سے ایک تو بنوٹ جانتا ہے اور دوسرا بنوٹ نہیں جانتا تو کیا دونوں برابر ہیں ہرگز نہیں بنوٹ جاننے والا بے خوف ہو کر جائے گا کیونکہ اس کے پاس دشمن سے بچنے کی ترکیب موجود ہے اور جو بنوٹ سے ناواقف ہے وہ جان کو ہتھیلی پر رکھ کر جائے گا یہی حال ہے صاحب مجاہدہ اور غیر صاحب مجاہدہ کا مگر یہ مثال یہاں چسپاں نہیں کیونکہ یہاں بے خطر اور بے فکر ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

صاحبِ مجاہدہ بھی بے فکر نہیں ہوسکتا

صاحب مجاہدہ بھی بے خطر اور بے فکر نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی باگ ایسی ذات کے قبضہ میں ہے جو نہایت بے پروائی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہیں۔ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْهِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا اِذًا لَّاَذَقْنٰکَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا ایک واقعہ کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا (اور معصوم نہ کیا ہوتا) تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے اور اگر ایسا ہوتے تو ہم آپ کو حالت حیات میں اور بعد موت کے دوہرا عذاب چکھاتے (کیونکہ مقربان را بیش بود حیرانی۔ مقربوں کو بہت حیرانی ہوتی ہے)۔

پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار بھی نہ پاتے۔ اللہ اللہ کیا شوکت ہے اور کیسی سطوت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی صاف صاف خطاب ہے اسی سے تو معلوم ہوتا کہ قرآن خدا کا کلام ہے جو کسی سے بھی نہیں دبتے اور دوسرے مقام پر حضور ہی کو خطاب ہے۔ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ بِهٖ عَلَیْنَا وَکِیْلًا اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّکَ اِنَّ فَضْلَهٗ کَانَ عَلَیْکَ کَبِیْرًا اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر وحی بھیجی ہے سب سلب کر لیں پھر اس کے لئے آپ کو ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی بھی نہ ملے (یہ) آپ کے رب ہی کی رحمت ہے (جو ایسا نہیں کیا)

بیشک آپ پراس کا بڑا فضل ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلب وحی سے ڈرایا جاتا ہے تو پھر تو اور کون ہے جو سلب رحمت سے بے خطر ہونا چاہتا ہے اللہ اللہ نہ معلوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر اس آیت کے نزول کے وقت کیا حالت گزری ہوگی اِلَّا رَحْمَةً مِنْ رَبِّکَ (آپ کے رب کی ہی رحمت ہے) فرما کر سنبھال لیا ورنہ دل پھٹ جاتا (اس وقت مولانا پر ہیبت وجلال کا خاص غلبہ تھا چہرہ سے خوف ٹپک رہا تھا ۱۲ جامع)۔

تسلیم ورضا کی ضرورت

ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب پر اس شان کا استغنا وجلال کا انکشاف ہوا تو مولانا کی یہ حالت تھی کہ بار بار بیقرار ہوکر یہ شعر پڑھتے تھے ۔

غیر تسلیم و رضا کو چارۂ در کفِ شیر نرخو نخوارہ

(سوائے تسلیم ورضا کے کچھ علاج نہیں شیر خونخوار کے قبضہ میں ہے)۔

کتنی دیر تک ان پر یہ حالت رہی پس سالک بے خطر کبھی نہیں ہوسکتا تسلیم ورضا کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ اس سے عنایت حق متوجہ ہوجاتی ہے اور اسی سے کام چلتا ہے مولانا فرماتے ہیں ۔

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیج بے عنایات خدا ہیچیم ہیچ !

(یعنی گو ہم نے بہت سی پند ونصیحت کی ہے لیکن کسی کام کے پختہ ارادہ کرنے میں جب تک حق تعالیٰ کی عنایت نہ ہو ہم محض ہیچ ہیں)۔

اور میں بھی اپنے اس بیان کے متعلق یہی کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ تعلیم کیا ہے بدون عنایت حق کے یہ کچھ بھی نہیں ۔

ایں ہیچ گفتیم ولیک اندر بسیج بے عنایات خدا ہیچیم ہیچ

(یہ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے بدون عنایت حق تعالیٰ کے محض ہیچ ہے)۔

بے عنایات حق و خاصاں حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(حق تعالیٰ اور خاصان خدا کی عنایات کے بغیر اگر تو فرضاً فرشتہ بھی ہو تو تیرا نامہ اعمال سیاہ ہے)۔

عنایاتِ خداوندی کی علامت

اس شعر میں خاصانِ حق کا لفظ بڑھا کر تسلی کردی کیونکہ عنایات حق کا علم دشوار ہے تو مولونا عنایات خدا کی علامت بیان فرماتے ہیں کہ خاصان حق کی عنایت حاصل کرو جس پر خاصان خدا

کی عنایت ہو سمجھ لو کہ اس پر حق تعالیٰ کی عنایت ہے۔

کامیابی کا آسان طریقہ

پس کامیابی کا طریقہ یہ ہے کہ نفس کی مخالفت کرو یہ تو اصل ہے اور خاصان حق سے متعلق پیدا کرو یہ اس کا متمم ہے اور یہاں سے ان لوگوں کے لئے بھی راستہ معلوم ہو گیا جو طالب ہیں مگر کسی شیخ کے پاس نہیں پہنچ سکتے تو یہ لوگ نفس کی مخالفت شروع کر دیں جو کہ اصل طریق ہے انشاء اللہ تعالیٰ حاصل ہو جائیں گے کیونکہ مجاہدہ کی یہی حقیقت ہے اور مجاہدہ پر وصول کا وعدہ ہے پس یہ لوگ بھی مایوس نہ ہوں البتہ اتنا کام اور کریں کہ اوقات فرصت میں بزرگوں کے حالات وملفوظات کا مطالعہ کر لیا کریں انشاء اللہ اس سے وہی نفع ہو گا جو صحبت شیخ سے ہوتا ہے مگر جو لوگ شیخ کے پاس پہنچ سکتے ہیں وہ یہ ترکیب سن کر خوش نہ ہوں کہ بس ہم بھی ایسا ہی کر کے واصل ہو جائیں گے کیونکہ اول تو وہ شخص معذور ہے اس کی منجانب اللہ بلاواسطہ اعانت ہو گی اور تم معذور نہیں ہو تمہارے ساتھ اعانت خداوندی بلاواسطہ متعلق نہ ہو گی۔ دوسرے اس کو سخت سخت مشکلات قدم قدم پر پیش آئیں گی ان کو یہ سہولت کہاں نصیب جو تم کو نصیب ہے کہ جہاں گاڑی اٹکی فوراً شیخ سے رجوع کر لیا۔ جہاں نفس کے کسی تقاضے کے متعلق شبہ ہوا کہ یہ محمود ہے یا مذموم فوراً شیخ سے دریافت کر لیا اس سہولت کی قدر تم کو کیا معلوم ہو اس کے دل سے پوچھو جس کو شیخ محقق میسر نہیں ہوا وہ کس مصیبت سے راستہ طے کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر پھر بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں وہ مجاہدہ تو شروع کریں انشاء اللہ اعانت الٰہی ان کا ساتھ دے گی عنایت خداوندی متوجہ ہو گی جس سے کام بن جائے گا۔ پس اب میں ختم کرتا ہوں بحمد للہ مجاہدہ کے متعلق کافی بیان ہو گیا اور ضرورت کے موافق قربانی کی حقیقت بھی بیان ہو چکی۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم وعمل مستقیم عنایت فرمائے۔ (آمین)

(وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمّد وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ اجمعین والحمد للہ الذی بنعمتہ وعزتہ وجلالہ تتم الصالحات) ممبر سے اترتے ہوئے فرمایا کہ اس وعظ کا نام العبرة بذبح البقرة رکھ دیا جائے ۱۲ جامع۔

اطاعة الاحکام

مع

فضلِ دارِ حدیث خیر الانام

یعنی

تعمیر دار الحدیث کی اعانت کی ترغیب سے متعلق یہ وعظ
مدرسہ عربیہ دیوبند میں ۱۹؍ ربیع الثانی کو بیان فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارِكۡ وَسَلِّمۡ (دَائِمًا اَبَدًا كَمَا يُحِبُّ وَيَرۡضٰى ۱۲) اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ. بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ.

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ‌ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ؕ ذٰ لِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا (النساء:۵۹)

(اے ایمان والو تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اولی الامر ہیں ان کا بھی پھر اگر کسی امر میں باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالہ کر دیا کرو۔ اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو یہ امور سب سے بہتر ہیں اور ان اکا انجام خوشتہ ہے)

میں پہلے اپنی موجودہ حالت عرض کرلوں اس کے بعد بیان کروں گا وہ یہ ہے کہ مجھے کل کے بیان سے تکان ہو گیا ہے عادت دو دن متصل بیان کرنے کی نہیں دماغ پر بہت اثر ہے اور شب کو نیند بھی نہیں آئی۔ اس لئے زیادہ بیان نہ ہو سکے گا۔

متلو آیت کا مقصود اصلی

میں نے جو آیت تلاوت کی ہے اس سے مقصود دو امر ہیں۔ ایک مقصود اصلی ہے اور ایک مقصود کا طریق ہے مقصود اصلی کو تفصیل سے بیان کرنا منظور ہے اگرچہ فی نفسہ اس میں بسبب تکان کے بسط نہ ہو لیکن بہ نسبت طریق کے مبسوط ہوگا۔ اس کے بعد طریق کو مختصراً عرض کروں گا اور وہ بھی اس طور سے کہ وہ اس کے تابع ہوگا۔ مقصود اصلی تو صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ ایمان والوں کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کی۔ اور جناب رسول مقبول صلی اللہ

علیہ وسلم کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو میں اس وقت صرف اوّل کے دو جملوں پر اکتفا کرتا ہوں یعنی ہم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم فرمایا ہے۔

خواہشاتِ نفسانی کا اتباع

اب ہم کو غور کرنا چاہیئے کہ ہم اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں یا نہیں سو ہم جو اپنی حالت میں غور کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ اپنی ہوائے نفسانی کا زیادہ اتباع کرتے ہیں ہر شخص اپنی رائے کو پسند کرتا ہے حدیث شریف میں آیا ہے حتّٰی اِذَارَ اَیْتَ شُحًّا مُطَاعًا وَھَوًی متبعا!! واعجاب کل ذِی رأی بِرَ ایہٖ فعلیک بخاصّہ نفْسِکَ (المعجم الکبیر للطبرانی ۷:۶۳، المغنی عن حمل الاسفار ۲:۳۰۴) (خواہش نفسانی کا اتباع کیا جاتا اور ہر شخص اپنی رائے کو پسند کرتا ہے تو ایسے وقت اپنے نفس کی فکر کرو اور عوام کے حال سے تعرض چھوڑ و) یعنی جب تم یہ دیکھو کہ مرض غالب ہے یہاں سے ذاکر شاغل لوگوں کے کام کی ایک عجیب بات سمجھ میں آئی اگرچہ اس کو بیان کرنا مقصود میں ظاہراً مخل (خرابی ڈالنا) ہوتا ہے لیکن چونکہ یہ بھی اطاعت کا مکمل و متمم (پورا کرنیوالا) ہے اس لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ غیر ذاکر کو تو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم میں کیا مرض ہے اس لئے ان کو یہی حکم کیا جائے کہ تقویٰ طہارت میں مبالغہ کرو لیکن بعض وہ حضرات ہیں کہ انہوں نے پہلے سے یہ کام مجاہدہ کا شروع کر رکھا ہے اور کسی وجہ سے ان کو تسہیل کی ضرورت ہے میرا خطاب اُن کو ہی ہے وہ یہ ہے کہ بعض مرتبہ ان صاحبوں کو ایسی مصیبت پیش آتی ہے کہ کمر توڑ ڈالتی ہے اور ہمت پست ہو جاتی ہے۔

تین حالتیں

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حالتیں تین ہیں اور یہ حالتیں کچھ ذکر شغل کے ساتھ ہر کام میں مخصوص نہیں یہی تین حالتیں ہیں لیکن چونکہ مقصود بیان کرنا ذاکر کی حالت کا ہے اس لئے اس کا خصوصیت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے ایک ابتدائی حالت اور ایک توسط کی اور ایک انتہائی جس کو تمکین کہا جاتا ہے۔ ان احوال کے احکام کو سمجھنا بڑے اکابر کا کام ہے اور حقیقت میں عقلاء یہ لوگ ہیں حکماء کی جو تحقیقات ہیں سب اٹکل پچو کے تیر ہیں۔ طبیعات الٰہیات کے اکثر مسائل غلط عقول عشرہ کے دلائل سب واہی قدیم سائنس کے بہت دعاوی آج تک غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا موجودا سائنس کا بھی ایک بڑا حصہ ایسا ہی ہے پس حکماء کے کمال کی تو یہ حالت ہے۔

حقیقی کمال فقہائے امت کا ہے

حقیقی کمال فقہائے امت کا ہے خواہ وہ فقہ احکام ظاہرہ ہو یا فقہ احکام باطنہ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حکمائے طبیعین تو اجسام کے محققین ہیں جن کے خواص مشاہدہ سے تجربہ سے معلوم کر لینا چنداں عجیب نہیں اور باوجود اس کے پھر بھی اس میں ٹھوکریں کھائی ہیں اور الٰہیات کے متعلق ان کی تحقیقات بالکل ہی بادر مُشت (مٹھی میں ہوا) ہے کہ قابل اعتداد (گنتی کے قابل) ہی نہیں اور فقہاً اور عرفاء امت نے معانی کو سمجھا ہے اور اس میں فرق بیان کئے ہیں بس بڑا کمال ان حضرات کا ہے اس لئے تفقہ و تصوف دونوں بہت خطرناک رہیں ہیں دونوں میں عقل کامل کی ضرورت ہے اور خصوص تصوف بغیر عقل کامل کے ایک قدم بھی اس راہ میں نہیں رکھ سکتا جو اس راہ میں مجتہد اور عاقل کامل نہ ہو اس سے بیعت کرنا جائز نہیں تصوف اور طب دونوں اس بات میں کہ معالج میں قوتِ اجتہادیہ ہونا چاہیئے ہم رنگ ہیں۔ طب کو اوّل سمجھ لو۔ طبیب وہی شخص ہو سکتا ہے جو مجتہد ہو نرا مقلد نہ ہو اس میں کتر بیونت (کانٹ چھانٹ) کر سکے گا گو کلیاتِ فن کا مقلد ہوتا کہ اجتہاد سے مریض کی حالت کو دیکھ کر بتلا سکے کہ اس کو فلاں مرض ہے اس لئے کہ کتب طب میں تو کلیات لکھے ہیں یہ تو نہیں لکھا ہے کہ زید کو فلاں مرض ہے یہ تو اپنے اجتہاد اور عقل سے ہی سمجھے گا کہ یہ کون سی قرابادین میں لکھا ہے کہ زید کو صفروی بخار ہے۔ یہ البتہ ملے گا کہ ایک قسم بخار کی صفروی بخار بھی ہے۔ اور اس کا علاج یہ ہے اس لئے اس میں بخار کے فوٹو تو ہیں نہیں اسی طرح تصوف ہے کہ کتب فن میں حالات تو لکھے ہیں لیکن یہ نہیں لکھا کہ زید پر یہ حالت ہے یہ تو عقل کامل اور نور فراست سے دریافت ہوگا۔

دقائق کا سمجھنا بڑے لوگوں کا کام ہے

غرض ان دقائق کا سمجھنا بڑے لوگوں کا کام ہے منجملہ ان دقائق کے ایک یہ ہے کہ جب ذاکر ابتداء میں ذکر کرتا ہے تو یہ حکم كُلُّ جَدِيْدٍ لَذِيْذٌ (ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے) اس پر لذت غالب ہوتی ہے اور احوالِ و مواجید (وجد کی جمع) کا اس پر غلبہ ہوتا ہے۔ اس لئے اخلاق رذیلہ معدوم نظر آتے ہیں۔ حالانکہ وہ معدوم نہیں ہوتے لیکن چونکہ نفس دوسری طرف مشغول ہے اس لئے ان کے تقضیات کا ظہور نہیں ہوتا اور جب وہ جدت نہ رہی تو لذت و حالات بھی نہ رہیں گے بلکہ ایک کیفیت راسخہ (دیرپا) معتدلہ غیر غالبہ و غیر مغلوبہ پیدا ہوگئی کہ وہ ہی حالت پائیدار اور قائم و معتبر ہے جیسے درخت کو اوّل چھوٹا پھول آتا ہے وہ گر جاتا ہے اُس کے بعد سچا پھول آتا ہے وہ مثمر

ہوتا ہے پس جب وہ حالات نہ رہے تو ان اخلاق رذیلہ کو جن کو یہ معدوم یا کالمعدوم سمجھے ہوئے تھا ظہور ہوا۔ یہ سالک ان کو یہ سمجھتا ہے کہ اخلاق رذیلہ پیدا ہوئے اور انہوں نے عود کیا ہے حالانکہ دوبارہ پیدا نہیں ہوئے بلکہ ان کا ظہور ہوا ہے اب یہ مقام بہت خطرناک ہے اس لئے کہ اس حالت میں یہ ناامید ہوتا ہے اور تنگ ہوتا ہے اور برسون کے مجاہدہ ریاضت کو بیکار سمجھتا ہے اس وقت شیخ کامل کی سخت ضرورت ہے سو شیخ کامل اگر رہبر مل گیا تو وہ کہتا ہے ؎

چونکہ قبض آید تو دردے بسط بیں　　　تازہ باش وچیں میفکن برجبیں

(یعنی جب تم کو قبض کی حالت پیش آئے اس میں حالت بسط کا ملاحظہ کرو خوش وخرم ہو پیشانی پر جھری بت ڈالو)

اور کہتا ہے ؎

کوئی نومیدی مرد کامید ہاست　　　سوئی تاریکی مرد خورشید ہاست

(ناامیدی کی راہ مت چلو اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت سی امیدیں ہیں اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں کاملین پیدا کرتے رہتے ہیں ظلمت یعنی جھوٹے پیروں کی طرف مت جاؤ خورشید یعنی منور باطن لوگ بھی موجود ہیں)

حضرت گنج مرادآبادیؒ کا ایک لطیفہ

اس وقت مجھ کو ایک عجیب لطیفہ یاد آیا۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ حضرت ذکر میں پہلا سا مزہ نہیں آتا فرمایا کہ میاں پرانی جورواماں ہو جاتی ہے یعنی مزہ تو نئی شئے میں ہوتا ہے اور پرانی شئے میں مزہ اور حالِ شوق نہیں ہوتا البتہ اس سے اُنس بڑھ جاتا ہے۔

اخلاق کے دو مرتبے

اصل بات یہ ہے کہ اخلاق کے اندر دو مرتبے ہیں ایک نفس اخلاق دوسرے عمل مقتضی الاخلاق یہ بات جو میں کہتا ہوں بڑے کام کی ہے جو مصیبت میں پھنسا ہوگا اس کو اس کی قدر ہوگی اور ان شاء اللہ نجات ہو جائے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ خود وجود اخلاق رذیلہ مذموم نہیں ہے، ہاں عمل مقتضی الاخلاق الرذیلہ مذموم ومنہی عنہ ہے مثلاً وجود غصہ کا مذموم نہیں لیکن اس کے بے محل صرف کرنا ناجائز ہے۔ مجاہدے سے پہلے بے موقع غصہ چلاتا تھا اب موقع پر چلاتا ہے نہ یہ کہ بے موقع کبھی آتا ہی نہیں اور دلیل اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَھَا (یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) تو اخلاق رذیلہ کے ازالہ پر اس کو قدرت نہیں ہاں اُن کو بے محل صرف نہ کرنے پر قدرت ہے اس لئے صرف اسی

کی تکلیف دی گئی ہے جب یہ بات ہے تو ان اخلاق رذیلہ کے ابھرنے اور ان سے متاثر ہو جانے سے غمگین اور ناامید ہونا محض بے وجہ ہے مثلاً کسی کو نصیحت کی گئی اور اس کے نفس پر طبعاً گراں ہوئی۔ چہرہ پر تغیر آ گیا۔ مگر نصیحت کی مخالفت نہیں کی تو کچھ مضائقہ نہیں اور کچھ مواخذہ نہیں ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ تعالیٰ فرماتے ہیں یعنی جب وہ غصہ کو ضبط کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اچھے لوگوں کو بھی غصہ آتا ہے مگر ان میں اور دوسروں میں فرق یہ ہے کہ اور لوگ ضبط کے موقع پر بھی ضبط نہیں کرتے اور یہ حضرات ضبط کرتے ہیں بلکہ اسے ترجیح اس حالت کو معلوم ہوتی ہے کہ غصہ رہے ورنہ ضبط اور صبر کی فضیلت کیسے حاصل ہوگی۔

اخلاق ذمیمہ کا صرف امالہ مطلوب ہے

اسی واسطے حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اخلاق ذمیمہ کا رہنا ضروری ہے اور شیخ کامل کا کام ان کا ازالہ نہیں بلکہ اس کا کام ان کا امالہ ہے یعنی ان کا معرف بدل دینا مثلاً بخل ہے پہلے حقوق واجبہ میں بخل تھا اب منہیات و محرمات میں اس کو صرف کرنے لگا اور واجبات میں اگر اس کا تقاضا بھی ہوتا ہے تو اس کا استعمال نہیں کرتا تو اگر یہ صفت ہی نہ رہے تو محرمات میں امساک مال کس قوت سے کرلے اسی طرح غصہ رہنا چاہیئے کیونکہ اگر غصہ نہ ہو تو مخالف کی مدافعت ضرور یہ کیسے کر سکتا ہے۔ مشہور ہے کہ ایک سانپ کسی بزرگ کا مرید ہو گیا تھا ان بزرگ نے اس سے عہد لیا کہ کسی کو ستانا مت اس نے عہد کرلیا چند روز بعد پیر کا اُدھر گذر ہوا دیکھا کہ وہ پڑا ہوا ہے پوچھا کیا حال ہے کہا حضرت یہ بیعت کی برکت ہے میں عہد کرلیا تھا جس کی خبر جانوروں کو ہو گئی اس لئے جانور بہت ستاتے ہیں ان بزرگ نے کہا کہ بندہ خدا میں نے تو کاٹنے سے منع کیا تھا۔ پھنکارنے سے تو منع نہ کیا تھا۔ پھنکارنے کی اجازت ہے پس انسان کے اندر کچھ حرکت ضرور ہونا چاہیئے۔

شریعت کا مقصود

شریعت کا مقصود یہ نہیں ہے کہ آدمی جماد محض ہو جائے بلکہ مطلب یہ کہ قویٰ کو ان کے مصارف شرعیہ میں صرف کرے۔ دیکھو شہوت بہت ذلیل شئے ہے لیکن حدیث شریف میں آیا ہے کہ اپنی بی بی سے اگر مشغول ہو تو ثواب ہے۔ اب وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ (وہ غصہ کو ضبط کرنے والے ہیں) کے معنی خوب سمجھ میں آ گئے ہوں گے اگر وجود غضب مذموم ہوتا تو الفَاقِدِيْنَ الْغَيْظَ

(وہ غصہ کو مفقود کرنے والے ہیں) فرماتے پس اے جماعت سالکین اگر تم نے ریاضت ومجادہ کیا اور تم سمجھ گئے تھے کہ اب اصلاح ہوگئی پھر اتفاق سے کسی عورت یا مرد پر نظر پڑ گئی اور نفس کے اندر میلان اس کی طرف پایا گیا مگر قصداً اس پر نظر نہیں کی تو اس وقت دو حالتیں ہیں اگر وہ شخص عارف ہے تو اس کو اس کا کچھ غم نہ ہوگا کہ میلان کیوں ہوا بلکہ وہ اس پر شکر کرے گا کہ معصیت کا صدور تو نہیں ہوا یعنی قصداً نہیں دیکھا اور اپنے کام میں مشغول رہے گا اس لئے کہ نظر فجاءۃ گناہ تو ہے نہیں اور اگر عارف نہیں ابھی سیر وسلوک میں مشغول ہے تو اس وقت اس کو دو غم ہوں گے ایک تو اس میلان سے تشویش خاطر ہونے کے سبب اس کو حالت سابقہ جمعیت میں فرق پائے گا۔ ایک غم تو اس کا ہوگا اور دوسرا غم یہ ہوگا کہ سمجھے گا کہ میرا دو برس کا مجاہدہ بے کار گیا پھر کبھی اس سے بڑھ کر ایک آفت ہوگی کہ شیطان یہ وسوسہ ڈال دے گا کہ یہ سب بے کار ہے سب چھوڑ دے حالانکہ اس تشویش کا ہونا کوئی بری حالت نہیں بلکہ اس کو ناگوار سمجھنا اور اس سے جی گھبرانا اور اچھی حالت ہے۔

شیطان اضلال میں کامل ہے

لیکن شیطان بڑا ہوشیار رہے میں نے بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ جیسے انبیاء طرق ہدایت سمجھنے میں کامل العقل ہوتے ہیں اسی طرح شیطان اضلال میں کامل ہے جب شیطان نے دیکھا کہ اس سے براہ راست تو گناہ کرا نہیں سکتا پس وہ ایسے ایسے وسوسہ ڈالتا ہے اور اس کے ذہن میں جما دیتا ہے کہ مجاہدہ ریاضت بیکار ہے حتیٰ کہ وہ سب چھوڑ بیٹھتا ہے۔ میں نے خود یہ واقعات دیکھے ہیں اس لئے طالب کو چاہیئے کہ اس کی پروانہ کرے حافظ شیرازیؒ اسی مضمون کو فرماتے ہیں ؎

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش   بر جفائے خارِ ہجراں صبر بلبل بایدش

(یعنی باغباں کی اگر یہ خواہش ہے کہ چندے صحبتِ گل میں رہے تو اس کو لازم ہے کہ خار ہجراں کی جفا پر بلبل کی طرح صبر کرے اس سے صحبت گل حاصل ہو جائے گی)

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی مناں   مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

(اے دل! جب محبوب کی بند زلف میں گرفتار ہوگیا ہے تو پریشانی سے آہ ونالہ مت کر اس لئے کہ مرغ زیرک جب دام میں پھنس جائے تو اس کو تحمل کرنا چاہیئے شاید کہ اللہ تعالیٰ اس کو نجات دیں آہ ونالہ سے سوائے پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا)

اسی واسطے اس حدیث مذکور میں بھی شحاً کو مطاعاً سے اور ہویٰ کو متبعاً کے ساتھ مقید کیا پس وجود شح اور

ہوا مذموم نہیں اس کا اتباع اور اطاعت اور ان کے مقتضیٰ پر عمل کرنا مذموم ہے۔ سبحان اللہ شحا مطاعاً سے کیسا مسئلہ حل ہوا لوگ کہتے ہیں کہ حدیث میں تصوف نہیں ہے میں کہتا ہوں جس میں تصوف نہیں ایسی کوئی حدیث ہی نہیں دیکھئے مطاعاً اور متبعا کا لفظ کتنے بڑے مسئلے کو حل کر رہا ہے غرض حالت ہم لوگوں کی یہ ہے کہ بجائے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شح اور ہوا کا اتباع کر رہے ہیں اور دنیا کو ترجیح دے رہے ہیں۔

دینی امور میں اپنی رائے دینا بڑا مرض ہے

ہر شخص اپنی رائے کو پسند کرتا ہے اور بڑا سخت مرض یہ ہے کہ دنیا کے امور میں تو اپنی رائے لگاتے ہی ہیں دین کے اندر بھی کہتے ہیں کہ ہماری رائے یہ ہے مجھے بڑا تعجب ہوتا ہے کہ انگریزی پارلیمنٹ میں کسی کو ممبر بننے کی ہوس نہیں ہوتی اور خدائی پارلیمنٹ کے ممبر بننے کو ہر شخص تیار ہے استغفر اللہ یہ دین کی قدر ہے اس وقت کی وہ حالت ہے کہ دین زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے ۔

اے گراں جاں خوار دیدستی مرا　　زاں کہ بس ارزان خریدستی مرا

(اے کاہل تو نے مجھ کو بے قدر سمجھ رکھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں تجھ کو مفت مل گیا ہوں)

وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ (عظمت اللہ تعالیٰ کی کرنی چاہیئے ویسی عظمت انہوں نے نہیں کی) چنانچہ اس کی عظمت ہی کا اثر ہے کہ آج کل مسلمانوں کا عام طریقہ ہو گیا ہے کہ ہر شئے کی علت پوچھتے ہیں اور جب جواب نہیں ملتا ہے تو خود اخباروں رسالوں میں مضامین لکھنے شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی روزے کی فلاسفی لکھ رہا ہے کوئی نماز کی فلاسفی بیان کر رہا ہے خدا جانے یہ فلاسفی کیا لفظ ہے ان سے کوئی پوچھے کہ تم کو معمولی باتوں کی تو خبر ہی نہیں تم کیا جانو فلاسفی۔ تم تو فلس جانتے ہو تم کیا جانو محقق کیسا ہوتا ہے آج کل محقق حقہ سے مشتق ہیں یعنی حقہ نوش۔ غرض ہر شخص ہر حکم کی علت سمجھنا چاہتا ہے سو میں اس کا راز بتلا رہا ہوں کہ یہ کمی عظمت کا اثر ہے۔

کسی حکم کی علت دریافت کرنے کا سبب

کیونکہ تجربے اور غور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس حکم و تجویز کی عظمت قلب میں نہیں ہوتی اس کی علت اور لم دریافت کی جاتی ہے اور جس کی عظمت دل میں ہوتی ہے اس کی علت دریافت کرنے کا خطرہ بھی نہیں گذرتا چنانچہ حکام مجازی کے احکام کی کوئی شخص علت نہیں دریافت کرتا اور اگر کوئی کرتا بھی ہے تو جواب یہ ملتا ہے کہ بھائی سرکاری حکم ہے ضابطہ ہے۔ افسوس ہے کہ اگر مولوی یہ کہہ دیں کہ یہ خدائی ضابطہ ہے تو اس پر قناعت نہیں ہوتی بلکہ اس کی علت دریافت کی جاتی ہے

ایسے کج فہموں کو وہی علت بتلانا مناسب ہے جو مولانا مولوی محمد یعقوبؒ نے بتلائی تھی کسی نے حضرت سے سوال کیا کہ حیض کے زمانہ کی نمازیں قضا نہیں کی جاتیں اور روزے قضا کئے جاتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے آپ نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تم اس کو نہ مانو تو اتنے جوتے لگیں کہ بال نہ رہے پس علماء کو یہی چاہیئے کہ ایسے جاہلوں کو منہ نہ لگائیں۔

علماء کو احکام کی حکمتیں نہ بتلانا لازم ہے

اس باب میں حضرات علماء پر بھی تھوڑا الزام ہے کہ جو بات کوئی پوچھتا ہے اس کا جواب دینا شروع کر دیتے ہیں خواہ سائل کو اس کا منصب ہو یا نہ ہو نفس حکم تو بتلانا ضروری ہے باقی اس کی علت ہرگز نہ بتائیں۔ ہاں اگر کوئی فہیم استفادۃً سوال کرے اس کو جواب دیا جائے گا اور اس کو بتلا کر جی بھی خوش ہوگا اس لئے کہ سامع کی مثال بچۂ شیر خوار کیسی ہے جس وقت وہ دودھ پستان میں سے کھینچتا ہے اللہ تعالیٰ اور پیدا کر دیتے ہیں ایسے ہی سامعین کی رغبت اور طلب کا حال ہے اگر سامعین خوش فہم اور طالب ہوں تو اسرار و حکم بیان کرنے کو خود بیان کرنے والے کا جی چاہتا ہے اور آپ کو جو علماً وجہ نہیں بتلاتے اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ جانتے نہیں جانتے سب کچھ ہیں لیکن

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ۔ ورنہ در مجلس رنداں خبری نیست کہ نیست

(یعنی کوئی ضروری بات ایسی نہیں ہے جو علماً کو معلوم نہ ہو لیکن اس کو کھلم کھلا ظاہر کرنا مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں)

وعظ و نصیحت کے بعد بے فکر ہونے کی ضرورت

غرض اعجاب (دنیادار رے دہندگان کار) ذی رائے برایہ کی اب کثرت ہوگئی ہے کہ دن میں بھی لگاتے ہیں جس کا ابھی ذکر ہوا ایسے ہی وقت کے لئے فرماتے ہیں لعلیک بخاصة لفسکُ ودع امر العوام یعنی ایسے وقت اپنے نفس کی فکر کرو اور عوام کے حال سے تعرض چھوڑ و اگر کوئی کہے کہ پھر تم کیوں بیان کر رہے ہو اس کے جواب دو ہیں ایک تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وعظ و پند سے منع نہیں فرمایا اس کی تو اجازت ہے صرف اس کا غیر نافع ہونا فرمایا ہے مطلب یہ ہے کہ اپنا کام کرو اور عوام کی فکر میں نہ پڑو اور منجملہ اپنے کام کے وعظ و نصیحت بھی ہے تو حاصل یہ ہوا کہ تم اپنا کام کر کے بے فکر ہو جاؤ۔ اس دھن میں نہ رہو کہ کسی نے عمل کیا یا نہیں، اور کچھ حالات درست ہوئے یا نہیں اور دوسرا جواب لطیف ہے وہ یہ کہ اس وقت جس قدر مجمع ہے چونکہ اپنے لوگوں کا مجمع ہے اس لئے ہم آپ

صاحبوں کو اجنبی نہیں سمجھتے بلکہ یہ نَفُسَک ہی میں داخل ہیں اور جن کے چھوڑنے کا حکم ہے وہ ہیں جو دین سے بیگانہ ہیں اور راہ حق سے تجاوز و معاند ان کے بارے میں دَعْ پر عمل ہے دفیہ قلیل ۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی　　یگذارتا بمیرد در رنج خود پرستی

(یعنی ظاہر پرستوں کے سامنے عشق و مستی کے اسرار مت بیان کرو بلکہ ان کو رنج خود پرستی میں مرنے دو)

یہ سب تو تعریفات ہیں اصل مقصود یہ ہے کہ ہماری حالت یہ ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں اَطِیْعُوا اللہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو) اور ہم زبان حال سے کہہ رہے ہیں نَحْنُ فَطِیع الشح واطویٰ (ہم نفس پرستی کی اطاعت کرتے ہیں) پس اپنی حالت کو سنبھالو اور جلدی خبر لو یہ بیان مقصود اصلی کا تھا۔

اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق دو چیزوں سے مرکب ہے

اب میں اسکا طریق بتاتا ہوں جاننا چاہیئے کہ اس مقصود یعنی اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تحصیل کا طریق دو چیزوں سے مرکب ہے علم سے اور عمل سے اور علم سے مراد علم دین ہے اور عمل کی تحصیل کے لئے ایک اور شئے کی بھی ضرورت ہوگی وہ کیا ہے ہمت اور ہمت بڑھانے کا طریق جو تجربے سے نافع ہے موت کو یاد کرنا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی بات ہے لیکن ہے بڑے کام کی بات مگر لوگوں کی حالت یہ ہے کہ موت کے نام سے گھبراتے ہیں اس لئے یاد نہیں کرتے اور بعضے خود اصلاح ہی سے گھبراتے ہیں کہ اس سے حظوظ نفس فوت ہوتے ہیں اس لئے موت یاد نہیں کرتے کہ کہیں اس سے اصلاح نہ ہو جائے۔ صاحبو! گھبراؤ یا ڈرو موت بھی ضرور آئے گی اور اصلاح بھی واجب ہو چکی ہے خواہ موت کو یاد کرو یا نہ کرو اس کی یاد سے یہ واجب آسان ہو جانا۔ اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آ گئی ایک ڈوم نے سنا تھا کہ چاند دیکھ کر روزہ فرض ہو جاتا ہے اس نے کہا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں گے جو روزہ فرض ہو جس روز چاند رات ہوئی گھر میں چھپ کر بیٹھ گیا کھانا پینا بول براز سب گھر ہی میں کرتا۔ کئی روز بعد بیوی نے ملامت کی کہ کم بخت کیا آفت و نحوست ہے کہ گھر میں موتنے ہگنے بھی لگا ہے یا باہر نکل ڈرتے ڈرتے آنکھیں بند کر کے منہ کو ہاتھ اور کپڑے سے ڈھانپ کر باہر گیا کہ کبھی چاند کہیں نظر نہ پڑ جائے اور جنگل میں جا کر رفع حاجت کی اور طہارت کے لئے ایک تالاب پر آیا اور ڈرتے ڈرتے نیچی نگاہ کر کے آنکھیں کھولیں تو پانی میں چاند کا عکس نظر آیا آپ فرماتے ہیں

''بڑ جا آنکھوں مانند کردے روجہ بھرج'' (یعنی آنکھوں میں گھس جا اور روزہ فرض کر دے) تو صاحبو! جیسے یہ ڈوم حماقت میں مبتلا تھا کہ روزے کی فرضیت سے ڈرتا تھا حالانکہ روزہ اس پر فرض ہو چکا تھا ایسے بعض حضرات جو اصلاح کے نام سے ڈرتے ہیں اور اس لئے موت کو یاد نہیں کرتے حالانکہ اصلاح بھی فرض ہو چکی اور اس کے لئے موت کی یاد بھی ضرور ہو چکی کہ یہ اس کا اچھا علاج ہے۔

موت کو یاد کرنے کا طریق

صاحبو! یہ علاج میں نے اپنی طرف سے نہیں تراشا خود حدیث شریف میں ہے اَکْثِرُوْا ذکرھا ذم اللّذات الموت (سنن الترمذی ۲۳۰۷، سنن النسائی ۴:۴) یعنی لذات کے مٹا دینے والی شئے یعنی موت کو بہت یاد کیا کرو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تسبیح لے کر بیٹھ گئے اور موت موت کہہ لیا مطلب یہ ہے کہ پندرہ بیس منٹ اپنے اوقات میں سے نکال کر خلوت میں بیٹھ جاؤ اور یہ سوچو مجھ کو ایک دن اس دنیا سے سفر کرنا ہے اول بیمار ہوں گا اس کے بعد مروں گا۔ پھر لوگ قبر میں دفن کر دیں گے وہاں دو فرشتے سوال کے لئے آئیں گے اے نفس ان کے جواب کے لئے تیار رہ اور وہ بدکار کے پاس ڈراؤنی شکل سے آئیں گے اور نیک کے پاس اچھی شکل سے پھر قبر یا تو دوزخ کا ایک گڑھا یا بہشت کا باغ ہوگا کہ اس میں جنت کی ہوائیں آئیں گی اور اسی طرح جو جو واقعات دخول جنت و جہنم تک احادیث میں آئے ہیں ان کو اسی تفصیل سے سوچے اسی طرح روزانہ یاد کر لیا کرے۔ دیکھئے تو سہی ایک مدت کے بعد اس کا کیا ثمرہ ہوتا ہے کہ دل دنیا سے ہٹ جائے گا اور آخرت کی طرف رغبت ہوگی۔ اور نیک کاموں کی ہمت بڑھے گی۔ پھر ہمت سے عمل آسان ہوگا اور اس سے طریق کا ایک جزو حاصل ہو جائے گا اب دوسرے جزو کو لیجئے یعنی علم دین سے ہماری مراد مقدار اور وہ طرز خاص نہیں جیسا کہ بعض لوگ الزام دیتے ہیں کہ مولوی تو یوں چاہتے ہیں کہ سب مولوی ہو جائیں۔ تو یہ محض افترا ہے بلکہ ہم تو اس کے عکس کو چاہتے ہیں یعنی یہ چاہتے ہیں کہ سب نہ بنیں بلکہ اگر سب بنیں بھی تو ہم ہرگز نہ بننے دیں اس لئے کہ علم دین بشکل مولویت و مقتدائیت ہر شخص کے مناسب نہیں صرف اس شخص کو لائق ہے جس میں حب دنیا نہ ہو اور دین کی محبت ہو ورنہ الٹا مضر ہے۔

بد گہر را علم و فن آموختن   دادن تیغ است دست راہزن

(نا اہل کو علم و فن سکھانا ایسا ہے جیسا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا)

ہر مسلمان کو علم دین کا ماہر بننا لازم نہیں

ہم نے تجربہ کیا ہے کہ جن لوگوں کی طبائع میں فساد ہے اور انہوں نے علم پڑھ لیا ہے ان سے دین کو بجائے نفع کے ضرر ہوا ہے اس لئے ہم سب کو رائے نہیں دیتے کہ سب کے سب مولوی بنیں۔ دیکھو

قوانین گورنمنٹ سے پورا ماہر ہونا ہر شخص کو ضروری نہیں جو لوگ پارلیمنٹ کے ممبر ہیں ان کو تو قانون از بر ہونا چاہیئے اسی طرح جو وکیل و بیرسٹر ہیں ان کو بھی ضروری ہے باقی ہر شخص کے لئے خواہ شہری ہو یا قصبائی ہو یا گاؤں میں رہتا ہو۔ یہ احاطہ ضروری نہیں صرف روزمرہ کی ضروریات کثیر الوقوع کا علم ضروری ہے مثلاً بادشاہ کا بادشاہ ہونا حاکم ضلع کے حکم کو ماننا بغاوت نہ کرنا اور جن جرائم سے بغاوت کا الزام آتا ہو ان سے واقف ہونا وغیرہ اسی طرح یہاں یہ سمجھو کہ ہر شخص کو یہ ضروری نہیں کہ علم دین کا پورا ماہر ہو ہاں یہ ضروری ہے کہ جو کچھ وہ کرے وہ حد قانون میں ہو کوئی بات خلاف ضابطہ نہ ہو پس اس کو اتنا علم کافی ہے کہ جس سے علم ہو جائے کہ فلاں فلاں امور مجھ پر واجب ہیں اور فلاں فلاں سے بچنا ضروری ہے۔

ضرورت کا علم حاصل کرنے کا طریق

تو اتنے علم کے لئے عربی پڑھنا ضروری نہیں بلکہ اس کا سہل طریق یہ ہے کہ جو لوگ حرف شناس ہیں وہ تو اردو کے رسائل خرید کر ان کو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لیں اور خود اپنے مطالعہ پر اعتماد نہ کریں جس طرح قانون کی کتابیں ہیں۔ باوجود اس کے کہ اردو میں ہیں لیکن ان کو ہم وکیلوں کی طرح نہیں سمجھ سکتے ہیں اور جو اَن پڑھ ہیں ان کو پڑھے ہوئے لوگ سنا دیا کریں سو اس طریق سے قوم کے سب احاد عالم ہو سکتے ہیں۔ پس علم دین جو کہ دوسرا جزو مقصود کے طریق کا ہے اس کے حاصل کرنے کا یہ طریقہ ہوا۔

اطاعت کی دو قسمیں

اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمانبرداری کا حکم فرمایا ہے وہ کون سی قسم کی فرمانبرداری ہے اطاعت کی دو قسمیں ہیں ایک تو ضابطہ کی اور ایک دل سے اور خوشی سے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلوب دوسری نوع ہے اس لئے کہ اطیعوا کا ماخذ طلوع ہے اور طوع کے معنی رغبت ہے تو مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت رغبت اور خوشدلی سے کرو یعنی ہر امر دین کے اندر رغبت اور خوشدلی ہو کسل اور کراہیت نہ ہو۔

اطاعت کا سہل طریق اہل اللہ کی صحبت ہے

اس لئے مختصراً اس کا طریقہ بھی جو کہ بہت سہل ہے عرض کئے دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اہل محبت کے پاس جا کر بیٹھا کریں۔ میں آپ کو یہ نہیں کہتا کہ تم تہجد پڑھو نفلیں پڑھو ذکر شغل کرو بلکہ صرف بہ نیت استفادہ ایک وقت مقرر کر کے التزام سے اہل اللہ کی خدمت میں جا بیٹھا کرو ان شاء اللہ سب کام اس سے بن جائیں گے۔

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
(تھوڑی دیر تمہارا اولیاء اللہ کے پاس بیٹھ جانا سو سالہ طاعت بے ریا سے بہتر ہے)
صحبت صالح ترا صالح کند صحبت طالح ترا طالح کند
(نیک آدمی کی صحبت تم کو نیک کر دے گی اسی طرح طالح یعنی بد بخت کی صحبت تم کو بد بخت بنا دے گی)

سچے بزرگوں کی علامات

لیکن جو جھوٹے پیر ہیں ان سے بہت بچنا چاہیئے اس میں بھی بہت دھوکا ہو جاتا ہے سچے بزرگوں کی صحبت اختیار کرنا چاہیئے اس لئے سچے لوگوں کی علامت بتاتا ہوں کہ سچے وہ ہیں کہ جن کے پاس بیٹھنے سے اللہ تعالیٰ یاد آئیں اور دنیا سے نفرت ہو اور ان کے مجمع کے لوگ زیادہ صلحا ہوں۔ امراء اور دنیا داروں کا زیادہ ہجوم نہ ہو۔ ہمارے حضرت قبلہ حاجی صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ جس درویش کو دیکھو کہ اس کے پاس دنیا دار امراء بہت آتے ہیں سمجھو کہ یہ درویش نہیں بلکہ دنیا دار ہے اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ الجنس یمیل الی الجنس (ہر جنس کا میلان اپنی جنس کی طرف ہوتا ہے) افسوس بعض اہل سلسلہ فخر کرتے ہیں کہ ہمارے سلسلہ میں بڑے بڑے امراء اور نواب ہیں ہم اس پر فخر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں امراء نہیں غرباء صلحا کا مجمع ہے پس اے صلحا اگر آپ لوگ اپنے اندر میلان الی الفساق (فاسق لوگوں کی طرف میلان) پائیں تو اپنی خیر منائیں غرض ان علامات سے جلیس صالح ڈھونڈ کر اس کی صحبت اختیار کرو۔

کفار و فساق کی صحبت سے بچنے کی تاکید

اور اخیر درجہ ایک بات کہتا ہوں کہ اگر جلیس صالح میسر نہ ہو اور اہل اللہ کی صحبت ہاتھ نہ آئے تو خدا کے واسطے بُری صحبت اور ناجنس یعنی کفار و فساق کی صحبت تو چھوڑ دو۔

تا توانی دور سواز یارِ بد یارِ بد بَدتر بُود از مارِ بد
(جب تک تم سے ہو سکے یار بد سے علیحدہ رہو اس لئے کہ یار بد بُرے سانپ سے بھی بدتر ہے یعنی یار بد کی صحبت سانپ کے کاٹنے سے بھی زیادہ ضرر رساں ہے)
مار بد تنہا ہمیں بر جاں زند یار بد برجان و بر ایماں زند
(سانپ تو صرف جان ہی پر حملہ کرتا ہے اور یارِ بد جان اور ایمان دونوں پر حملہ کرتا ہے یعنی سانپ کے کاٹنے سے تو جان ہی جاتی ہے اور یارِ بد کی صحبت سے جان اور ایمان جاتے ہیں)

تو ایسی حالت میں بس تنہا رہا کرو۔ تنہا آدمی زیادہ گناہ نہیں کر سکتا زیادہ جرائم کا تعلق مجمع سے ہے یہ تو مختصر سا بیان تھا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (خوشی سے اللہ کا کہنا مانو اور خوشی سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا مانو)۔

اب اس آیت کے اسلوب سے ایک اور امر ضروری مستنبط ہوتا ہے اس کو بھی اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں تین ذاتوں کی اطاعت کا حکم فرمایا ہے اپنی ذات پاک کا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور (جو لوگ تم میں سے جو اولی الامر ہیں) کا اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تو مکرر اطیعوا لائے اور اولی الامر کے لئے تکرار اطیعوا کا نہیں کیا سو اس کی وجہ یہ تو ہے نہیں کہ حق تعالیٰ کی اطاعت علیحدہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت جدا بلکہ اس اسلوب میں ایک فائدہ کی طرف اشارہ لطیف یہ ہے کہ ہر چند کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت عین اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے لیکن بعض خصوصیات کے اعتبار سے من وجہ استقلال ظاہری کا حکم رکھتی ہے۔

حدیث شریف بھی حجت مستقلہ ہے

پس اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جیسے قرآن مجید حجت مستقلہ ہے اسی طرح حدیث شریف بھی حجت مستقلہ (دائمی حجت) ہے اور میں قرآن مجید کے ساتھ حدیث شریف کی برابری کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں۔ لیکن اس اعتبار سے دونوں برابر ہیں کہ جیسے قرآن مجید کے احکام ماننا ضروری ہے اسی طرح احادیث سے جو احکام ثابت ہیں ان پر بھی ایمان وایقان واجب ہے کسی کو کہنا جائز نہیں کہ جو مسئلہ قرآن شریف میں نہیں ہے میں اس کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جو قرآن شریف میں نہیں احادیث سے ہی ثابت ہوتے ہیں۔

سب مسائل کو قرآن سے ثابت کرنا حماقت ہے

یہاں سے جملہ معترضہ (روک ٹوک کرنیوالا) کے طور پر ایک بات یاد آئی کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمام علوم حتی کہ طبعیات سائنس وغیرہ سب قرآن شریف میں ہیں چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹروں نے تحقیق کر لیا ہے کہ مادۂ منویہ میں کیڑے ہوتے ہیں، سو قرآن مجید میں بھی یہ مسئلہ مذکور ہے اس لئے کہ فرمایا ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (اللہ تعالیٰ نے انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا) اور علق کے معنے جونک کے ہیں حالانکہ یہاں علق کے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ خون بستہ کے ہیں وہ زبردستی اس تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بتاتے ہیں۔ ایک اور سائنس داں کہتے تھے کہ جیسے حیوانات میں نر و مادہ ہیں اسی

طرح نباتات میں بھی ہیں اور قرآن شریف میں اس کا بھی ذکر خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا ہے (تمام اصناف کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا) اس عقلمند نے ازواج کا ترجمہ میاں بیوی سے کیا حالانکہ ازواج کے یہاں یہ معنی نہیں ہیں بلکہ بمعنی اصناف ہے۔ صاحبو! یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا ہے سخت مُضر ہے۔

دوستی بے کرد چوں دشمنی ست (بیوقوف کی دوستی بھی دشمنی کی طرح ہے)

اس میں بڑی دشمنی ہے اسلام کے ساتھ اس لئے کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سائنس کے مسائل منقح (جھوٹ سے پاک صاف کیا ہوا) نہیں ہوئے اور اس کو اہل سائنس بھی مانتے ہیں کہ ہم کو اب تک اس دریا کا ایک قطرہ بھی حاصل نہیں ہوا۔ پس جبکہ مسائل منقح نہیں ہوئے تو اگر آج آپ نے کسی جدید تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بنایا مثلاً یہی کہ تخم درخت میں نر و مادہ ہوتے ہیں اور سو برس بعد یہ تحقیق غلط ثابت ہوگئی اور دوسری تحقیق نئی ہوئی تو اس میں تکذیب کلامِ الٰہی کی بھی لازم آئے گی بس یہ لوگ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ (یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں) کے مصداق بن رہے ہیں۔ غرض یہ کوشش کرنا کہ سب چیز قرآن شریف سے ثابت ہو سخت حماقت ہے۔

قرآن شریف کا کمال

بلکہ قرآن شریف کا کمال یہ ہے کہ جس فن کی وہ کتاب ہے وہ فن اس میں ہو اور دیگر خرافات سے خالی ہو۔ قرآن شریف ایک طبّ روحانی ہے اور اس فن میں وہ یکتا ہے اور موٹی بات ہے کہ جب مسائل دینیہ فرعیہ بھی سب کے سب قرآن میں نہیں ہیں تو فنون و تجربے کے مسائل تو اس میں کل کیسے ہوں گے غرض بہت سے احکام احادیث سے بھی ثابت ہوئے ہیں اور بعض مسائل وہ ہیں جو اجماع و قیاس ملحق کتاب و سنت کے ساتھ ہیں اس لئے کہ اجماع دو طور سے ہوتا ہے ایک تو یہ کہ کسی مسئلہ کے متعلق خبر واحد تھی پھر اس مسئلہ پر اجماع ہو گیا اور دوسرے یہ ہے کہ وہ مسئلہ قیاس سے ثابت تھا اور اس پر اجماع ہوا پہلی صورت میں تو اجماع کا ملحق بالسنۃ ہونا ظاہر ہے اور دوسری صورت میں یہ الحاق اس لئے ہے کہ قیاس وہی حجت ہے مُسْتَبِطُمی الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ (قرآن و حدیث سے مستنبط ہے) ہو تو اگر وہ مسئلہ جس پر اجماع ہوا ہے قیاس مستنبط من الکتاب سے ثابت ہے تو یہ اجماع ملحق با کتاب ہے اور اگر قیاس مستنبط من السنۃ سے ثبوت ہوا تو ملحق بالسنۃ ہے اور اسی تقریر سے قیاس کا الحاق بھی کتاب و سنت سے معلوم ہو گیا اس لئے کہ اس میں قید استنباط من الکتاب والسنۃ کی موجود ہے اور اسی وجہ سے قیاس کو علماء نے مظہر (واضح کرنیوالا) کہا ہے مثبت مانا مثبت اصل میں

کتاب وسنت ہی ہے پس ثابت ہو گیا کہ حدیث شریف من وجہ استقلال ہے بہ خلاف اجماع و قیاس کے کہ وہ محض تابع وملحق ہیں صرف کتاب وسنت کی حجیت میں صرف ہمارے اعتبار سے اس قدر فرق ہے کہ قرآن شریف چونکہ تواتر سے ثابت ہے اس لئے وہ قطعی ہے اور احادیث میں بھی جو متواتر ہیں ان کا بھی یہی حکم ہے۔ البتہ بعض جو خبر واحد ہیں وہ قطعی نہیں مگر ماننا ان کا بھی واجب و ضروری ہے باقی جن حضرات نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے ان کے حق میں یہ بھی فرق نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمایا ہوا بھی مثل قرآن ہی کے حجتِ قطعیہ ہے۔

حضرات محدثین کی شان

بہرحال نفس حجیت میں سب احادیث مشترک ہیں پس بڑی حسرت ہے ان لوگوں پر جو احادیث کو حجت نہیں مانتے وہ بڑے نور سے محروم ہیں۔ اس کا عجیب نور ہے حتی کہ اس میں اور عامہ بشر کے کلام میں کھلا فرق ہے عام کلام کے سامنے تو احادیث مثل کلام اللہ کے معلوم ہوتی ہیں ہاں کلام اللہ کے مقابلے میں جب رکھ کر دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی بندے کا کلام ہے حضرات محدثین کی شان یہ تھی کہ وہ اکثر اپنی فراست سے حدیث موضوع کو سن کر پہچان لیتے تھے کہ یہ موضوع ہے، پھر تحقیق سے موضوع ہونا اس کا ثابت ہوتا تھا ایک بزرگ تھے عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جو ان پڑھ تھے وہ بتلا دیتے تھے کہ یہ حدیث ہے یا کلام اللہ ہے ان سے پوچھا گیا انہوں نے فرمایا کہ الفاظ کے ساتھ جو نور ظاہر ہوتا ہے اگر وہ نور قدیم ہوتا ہے تو جان لیتا ہوں کہ کلام اللہ تعالیٰ ہے اور اگر وہ حادث ہوتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ حدیث شریف ہے۔ اور اگر نور نہیں ہوتا تو پہچان لیتا ہوں کہ کسی امتی کا کلام ہے۔

حدیث پڑھانے کی برکت

ہمارے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ میں نے جب سے حدیث شریف پڑھانا شروع کیا ہے تو مجھ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بالکل متحد ہوں۔ یہ حدیث شریف کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مرتبہ میسر فرمایا یہ غلبۂ اتحاد ہے۔ یہی غلبہ تو شجرۂ طور پر ہو گیا تھا جو مظہر ہو گیا اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ کا اس تقریر سے آپ کو رفعت وعظمت حدیث کی معلوم ہو گئی ہوگی۔

دارالحدیث گویا بیت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے

اب میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ حدیث شریف کی تدریس کے لئے ایک مقدس مکان

بنانے کی یہاں تجویز ہے جس کا نام دارالحدیث ہوگا اور حدیث کی فضیلت معلوم کرنے کے بعد دارالحدیث کی مکانیت خود واضح ہوگئی گویا کہ بیت الرسول ہے جیسے مسجد نمونہ ہے کعبہ کا۔ اسی طرح دارالحدیث نمونہ ہے مرقد مبارک کا کہ وہاں جسد مبارک ہے اور یہاں کلام مبارک اور ماشا اللہ تعالیٰ مدرسے میں دونوں جمع ہورہے ہیں سامنے آپ کے مسجد ہے وہاں سے طلبہ فارغ ہوکر اس دارالحدیث میں آیا کریں گے اور یہاں سے پڑھ کر وہاں مسجد میں جایا کریں گے تو گویا کبھی بیت اللہ سے بیت الرسول میں اور کبھی بیت الرسول سے بیت اللہ میں گویا۔ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہر وقت صادق آیا کرے گا۔

خوشا سعادت آں بندۂ کہ کرد نزول　　گہے بہ بیتِ خداؤ گہے بہ بیتِ رسول

(بڑی خوش نصیبی ہے اس بندہ کی جس نے کبھی بیت اللہ کی زیارت کی اور کبھی بیت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی)

دارالحدیث کے لئے چندہ

اس لئے آپ حضرات اس میں حصہ لینے کو غنیمت سمجھئے کہ اس میں روح مبارک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش ہوگی۔ تخمینہ اس کا ۵۰ ہزار روپیہ ہے میرے خیال میں اس کی ترکیب یہ ہے کہ ایک ہزار آدمی پچاس پچاس روپیہ دے دیں گویا پچاس پچاس روپے کا ایک ایک حصہ بنالیا جائے چنانچہ ایک حصہ ان میں سے لیتا ہوں (جامع) اور حضرات سے بھی امید ہے کہ اسی طور سے حصے لیں گے اس کے بعد چاروں طرف سے صدائیں اٹھیں اور بہت حصے اسی وقت لوگوں نے لے لئے اور بہت سا نقد روپیہ بھی لوگوں نے دیا۔ فَجَزَاکم اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَآءِ. (اللہ تعالیٰ انہیں بہترین جزا عطاء فرمائیں)

دعاء وخاتمہ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

(اے پروردگار ہم سے یہ خدمت قبول فرما۔

بے شک تو سننے والا (اور) جاننے والا ہے)

الظلم

یہ وعظ

جلال آباد میں ۲۰ رمحرم ۱۳۳۲ھ کو اڑھائی گھنٹہ
بیٹھ کر بیان فرمایا۔
مولانا محمد عبداللہ صاحبؒ نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ (دَائِمًا اَبَدًا كَمَا يُحِبُّ وَيَرْضٰى ۱۲) اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (الشوریٰ:۴۲،۴۳)

ترجمہ: الزام صرف ان لوگو پر ہے جولوگون پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق دنیا میں سرکشی اور تکبر کرتے ہیں ایسوں کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے اور جو شخص صبر کرے اور معاف کردے یہ البتہ بڑے ہمت کے کاموں میں ہے۔

ربطِ جلی اور ربطِ خفی

یہ دو آیتیں ہیں جو ماقبل کے مضمون سے مرتبط ہیں اور یوں تو قرآن مجید کی سب آیتیں باہم مرتبط ہیں فرق اتنا ہے کہ بعض جگہ وجہ ربط جلی ہے اور بعض مقام پر خفی۔ یہ دونوں ماقبل کے ساتھ ظاہر الارتباط ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ مضمون اوپر کی آیت فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ.

(سو جو کچھ تم کو دیا گیا ہے وہ محض (چندروزہ) دنیوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے اور (اجر وثواب آخرت میں) جو اللہ کے یہاں وہ (بدرجہا) اس سے بہتر اور زیادہ پائیدار ہے وہ اُن لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لے آئے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں) شروع ہوا اور آخر تک یہی مضمون چلا گیا ہے۔

دلائل توحید کا مقتضاء

حاصل اس مقام کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں سے پہلے دلائل توحید بیان فرمائے ہیں

کہ جس کا اقتضا حق تعالیٰ شانہ کو ذات اور تمام صفات کمال میں یکتا و واحد اعتقاد کرنا ہے اور ذات باصفت میں شریک نہ ٹھہرانا ہے۔ اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ غیر حق نظر سے مرتفع ہو جائے جس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کی خست اور لاشے محض ہونا۔ اور آخرت کا باقی ہونا پیش نظر ہو جاوے اور دنیا کا مہروب عنہ اور آخرت کا مطلوب ہونا ثابت ہو جائے پس اس تقریر سے **فما اوتیتم الخ** بفا تفریع کا ماقبل پر متفرع ہونا بھی ظاہر ہو گیا۔

صرف تمنا سے آخرت نہیں ملتی

اب آئندہ چل کر آخرت کے طلب کا طریقہ ارشاد فرماتے ہیں اس لئے کہ نری تمنا سے تو آخرت ملتی نہیں جیسا کہ آج کل لوگوں کا خیال ہے اور ان کا طرز عمل اس خیال کو بتا رہا ہے کیونکہ دیکھا جاتا ہے کہ دنیا باوجود اس کے کہ آخرت کے مقابلہ میں لاشے محض ہے اس کو تو عمل وسعی کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں اور آخرت کو جو کہ مسلمان کا اصلی مقصود اور اعلیٰ مطالب وقصاری آرزوؤں کا ہے اس کا عمل کے ساتھ تعلق نہیں جانتے بلکہ یہ ہوس پکائے بیٹھے ہیں کہ محض تمنا سے اس تک دسترس ہو جائے گی۔ کلّا صاحبو! مجھ کو حیرت ہے کہ دنیوی مقاصد میں آپ کیوں محض درخواست اور تمنا پر اکتفا نہیں فرماتے یاد رکھو کسی شئے کے محض چاہنے سے وہ شئے نہیں ملا کرتی۔ مثلاً تحصیلداری جو ایک ادنیٰ عہدہ ہے اسی کو لے لیجئے جب تک پاس نہ حاصل کیا جائے اور جو اس کے شرائط ہیں وہ جمع نہ کئے جاویں نری درخواست سے نہیں مل سکتی تمام شرائط کے اجتماع و موانع کے ارتفاع کے ساتھ درخواست دینے پر اگر مل جاتی ہے تو بسا غنیمت سمجھتے ہو ہاں کوئی شخص مستثنیٰ ہو یا حاکم غایت عنایت سے اس کو شرائط سے مستثنیٰ کر دے وہ دوسری بات ہے اور اگر دونوں باتیں نہیں۔ نہ تو پاس حاصل کیا اور نہ یہ مستثنیٰ ہیں تو مل چکی تحصیلداری، اسی طرح آخرت کو سمجھئے کہ اس کے حاصل ہونے کی بھی شرائط ہیں۔ تو یا تو ان کو پورا کر لیجئے یا کوئی پروانہ سرکاری حاصل کر لیجئے کہ آپ مستثنیٰ ہیں۔ جب تک وحی نازل ہوتی تھی اس وقت تک تو شاید ممکن بھی تھا کہ آپ مستثنیٰ ہو جاتے۔ گو واجب تو یہ تھا کہ باوجود استثنا کے بھی سعی و خدمت میں کوتاہی نہ کرتے چنانچہ جن کو بلا درخواست مستثنیٰ کیا بھی گیا تھا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جن کی شان میں نازل ہوا تھا لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (تا کہ بخش دے اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ اگلے پچھلے) اور دوسرے درجہ میں حضور کے صحابہ جن کے لئے دنیا ہی میں جنتی ہونے کی خبر آئی تھی۔ وہ ہی سب سے زیادہ سعی اور سب سے بڑھ کر خائف تھے اور تو عشا کی نماز ہی پڑھ کر سو رہتے تھے اور

آپ تمام تمام رات کھڑے ہو کر گذار دیتے تھے حتی کہ قدم مبارک ورم کر گئے تھے یہاں تک کہ جناب باری تعالیٰ نے خود ممانعت فرمائی کہ اتنی مشقت نہ اٹھایئے چنانچہ ارشاد ہوا۔ یعنی ہم نے طٰهٰ ۞ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ تکلیف میں پڑ جائیں۔ گویا یہ ایک درجہ میں ممانعت ہے۔

احسان کا تقاضا

کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کو کیا ضرورت ہے کہ آپ اتنی مشقت گوارا فرماتے ہیں آپ کے لئے تو لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ الخ نازل ہوا ہے۔ فرمایا **افلا اکون عبدًا الشکورًا** یعنی کیا میں بندہ شکر گذار نہ ہوں۔ یعنی میں اس نعمت کا کیا شکر ادا نہ کروں۔ واقعہ احسان ماننے کا یہی مقتضیٰ ہے کہ احسان سے آدمی اور زیادہ پگھلے اور دبے۔ یہ ہماری طبیعتیں دنی (کمینہ پن اور نالائق) اور خسیس ہیں کہ جتنا احسان ہمارے ساتھ کیا جاتا ہے ہماری غفلت اور ناشکری اور بڑھتی ہے ورنہ شرافت کا مقتضیٰ تو یہی ہے کہ جس قدر احسان زیادہ ہو محسن کی اطاعت میں اور زیادہ سرگرمی ہو غرض باوجود اس استثنا (علاوہ) کے اور قسم قسم کی تسلیوں کے حضور کی حالت یہ تھی کہ فرماتے ہیں **اَنَا اعلمکم باللّٰہ واخشاکم** یعنی میں تم سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں اسی طرح اور انبیاء کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے خوف سے لرزتے تھے اور کانپتے تھے حالانکہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں یہاں بھی محفوظ ہیں اور وہاں بھی مامون ہیں مگر اس پر بھی اس درجہ خائف تھے کہ حضور ارشاد فرماتے ہیں **انی اریٰ ما لاترون والّذی نفسی بیدہ لوتعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیراً اولخرجتم الیٰ الصعدات تجارون الی اللّٰہ وما تلذ ذتم بالنساء علی الفرش اوکماقال۔** (سنن الترمذی: ۲۳۱۲، سنن ابن ماجۃ: ۴۱۹۰) یعنی میں وہ شے دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ واللہ اگر تم ان چیزوں کو جان جاؤ تو بہت کم ہنسو اور اکثر رو ؤ اور روتے چلاتے جنگلوں میں چڑھ جاؤ۔ اور بیبیوں سے کبھی لذت نہ حاصل کرو یہ حضور ہی کی قوت تحمل تھی کہ حق تعالیٰ کے جلال کا مشاہدہ فرماتے تھے اور پھر از جارفتہ نہ ہوتے تھے۔ اور یہ حضور ہی کا قلب مبارک تھا جو باروحی کا متحمل ہوتا تھا ورنہ ارشاد ہے لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ یعنی اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو آپ اس کو دہل جانے والا اور پھٹنے والا دیکھتے اللہ کے خوف سے اور باوجود اس خوف الٰہی کے آپ کے تحمل و خوش اخلاقی کو دیکھئے کہ سب سے ہنستے بولتے تھے مگر پھر بھی اتنا اثر

خوف کا تھا کہ کبھی آپ کی ہنسی تبسم سے نہیں بڑھتی تھی چنانچہ وارد ہے و کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کثیرا لتبسم ومار أی ضاحکاً مستجمعًا (اتحاف السادۃ ۷:۴۹۹) (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نے کبھی کھل کھلا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا) قطہ اور خوف کا یہ اثر تھا کہ کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم متواصل الاحزان دائم الفکرۃ. (اتحاف السادۃ ۷:۱۵۸) ہر وقت آپ کو غم و فکر رہتا تھا گویا خوش اخلاقی اور دلجوئی سے آپ ہنستے تھے مگر قہقہہ آپ کا کسی نے نہیں سنا دیکھو جس کو کوئی غم اور فکر ہوتا ہے ہنسی کی بات پر اس کو ہنسی آتی ہے مگر وہ ہنسی بہت دبی ہوتی ہے کوئی چیز تو آخر روکنے والی تھی کہ عمر بھر آپ کی آواز ہنسی کی نہیں سنی گئی اور کوئی وقت آپ کا غم سے خالی نہیں ہوا اور یہی وجہ ہے کہ بیبیاں آپ کی زیادہ نہ تھیں جیسا آپ نے غم کی خاصیت فرمائی ہے۔ ماتلذذتم بالنساء علی الفوش.

حضور علیہ والصلوٰۃ والسلام کی قوتِ جسمانی

اگر کوئی کہے کہ نو بیبیاں تو تھیں اس سے زیادہ اور کیا ہوں گی۔ بات یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے اس کے بعد یہ سمجھئے کہ حضور کو اللہ تعالیٰ نے تمام صفات بشریت علی وجہ الکمال عطا فرمائی تھیں چنانچہ قوتِ جسمانیہ حضور میں اس درجہ تھی کہ رکانہ ایک پہلوان تھے اور ان میں ایک ہزار مردوں کے مقابلہ کی قوت مشہور تھی انہوں نے آپ سے یہ شرط کی کی اگر آپ مجھ کو پچھاڑ دیں تو میں آپ پر ایمان لے آؤں کوئی پوچھے نبوت کے لئے پہلوانی بھی لازم ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمالیا۔ چنانچہ حضور نے اس کو اٹھا کر پھینک دیا اس نے کہا اس مرتبہ تو ایسا ہو گیا دوبارہ گرا دیجئے تو جانوں۔ آپ نے پھر پھینک دیا۔ وہ ایمان لے آیا۔

حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ

اور لیجئے حضرت عمرؓ بڑے بہادر اور بہت قوی دلیر تھے اور دعا فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ اسلام کو عمر بن ہشام یعنی ابوجہل یا عمرؓ بن الخطاب سے قوت دے یعنی ان میں سے ایک کو مسلمان کر دے اللہ تعالیٰ نے حضور کی دعا قبول فرمائی اور سامان اس کا یہ ہوا کہ ایک بار عمرؓ زرہ تلوار باندھ کر چلے بعض غرباء اسلام نے پوچھا کہ کہاں جاتے ہو کہا محمد کو قتل کرنے کے لئے جاتا ہوں۔ وہ سن کر سہم گئے کہ یہ عمر ہے خدا جانے کیا کر کے رہیں گے اور آپ ؐ کے یہاں پہرہ نہیں۔ چوکی نہیں۔ اللہ اکبر ہمارے بزرگوں پر کیسی کیسی مصیبتیں آئی ہیں لیکن ہر حال میں ثابت قدم رہے۔ ایک ہم ہیں

کہ ذرا سی بات میں پیچھے ہٹ جاتے ہیں چنانچہ انہوں نے سن کر کہا کہ میاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیچھے قتل کیجیو پہلے اپنی بہن اور بہنوئی کی تو خبر لو وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ سن کر جھلا گئے اور اسی وقت بہن کے یہاں پہنچے وہ دروازہ بند کئے ہوئے قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ کنڈی بند تھی۔ انہوں نے کہا دروازہ کھولو۔ بہن بہنوئی دونوں سہم گئے اور قرآن شریف کو چھپا کر دروازہ کھول دیا۔ پوچھا تم کیا پڑھتے تھے انہوں نے نہ بتلایا۔ انہوں نے بہن کو مار کر لہولہان کر دیا اور کہا کہ بتلاؤ۔ بہن نے کہا خواہ مارو خواہ چھوڑ دو۔ ہم تو قرآن پڑھتے تھے انہوں نے کہا مجھ کو دکھلاؤ۔ بہن نے کہا تم ناپاک ہو۔ غسل کرو تو تم کو دیں چنانچہ ان کو غسل کرایا پھر ان کو قرآن دیا۔ یہ آیتیں نظر پڑیں طٰه مَا اَنْزَلْنَا الخ دیکھ کر حیران رہ گئے اور دل پر ایک چوٹ لگی اور کہا کہ مجھ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلو چنانچہ وہ ان کو آپ کی خدمت میں لائے آپ مع اپنے اصحاب کے دروازہ بند کئے بیٹھے تھے جب عمرؓ آئے تو بعض صحابہ ڈرے اور دروازہ کھولنے کی جرأت نہ ہوئی حضور نے فرمایا کھول دو۔ وہ آئے آپ نے ان کو بغل میں اس زور سے دبایا کہ بیتاب ہو گئے اور یہ اس لئے کیا تاکہ ان کو اپنی قوت پر گھمنڈ نہ رہے کہ میں بڑا زور آور ہوں۔ اگر ایمان نہ لاتا تو غالب آسکتا۔ غرض وہ مسلمان ہو گئے ان دونوں قصوں سے حضور ﷺ کی قوت جسمی کا بھی کمال معلوم ہوا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ رجولیت

اسی طرح قوت رجولیت کی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت زیادہ تھی چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ آپ کے اندر سو مردوں کی قوت تھی اور یہ معلوم ہے کہ ایک مرد کو چار بیبیاں تک رکھنے کی اجازت ہے پس جب آپ میں سو مردوں کی قوت تھی۔ اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ آپ چار سو بیبیاں رکھتے آپ نے چار سو میں سے نو پر اکتفا فرمایا کہاں چار سو کہاں نو یہ کمی نہیں تو اور کیا ہے اس لئے میں نے کہا ہے کہ آپ نے بہت کم بیبیاں رکھیں سو اس کا سبب بھی وہی فکر اور غم تھا آپ کو ایسے افکار لگے ہوئے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے آپ کا قلب مبارک حظوظ کے لئے کیسے خالی ہو سکتا تھا۔ پس یہ حال تو تھا ان کا جن کو مستثنیٰ کیا گیا تھا اور ہم تو مستثنیٰ بھی نہیں پھر کیسے بے فکر ہو گئے اسی طرح بعض حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ ان کو دنیا ہی میں بشارت جنتی ہونے کی دی گئی تھی چنانچہ ان میں سے دس تو ایسے تھے کہ ان کو ایک مجلس میں خوشخبری دی گئی تھی مگر وہ سب سے ہی زیادہ خائف اور سب سے ہی زیادہ کام کرنے والے تھے ہمارے

لئے تو اگر کوئی حدیث ضعیف بھی آجاتی تو حلال وحرام کی تمیز نہ رہتی ۔ اور ان کی حالت یہ تھی کہ ان کو اس خبر نے مطمئن نہیں بنایا ہر وقت فکر اور غم ہی میں رہتے تھے ۔

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی عجیب شان

چنانچہ ایک حضرت صدیق اکبرؓ کو دیکھا گیا کہ خلوت میں بیٹھے ہوئے زبان کھینچ رہے ہیں اور فرما رہے ہیں هذه اوردتنی الموارد کہ اس نے مجھ کو ہلاکتوں میں ڈالا ہے جس طرف چاہتی ہے نکل جاتی ہے کسی کی شکایت کردی کسی کو برا کہہ دیا کسی کی غیبت کرلی ۔ بات یہ ہے کہ جیسا جس کا مقام ہوتا ہے اس کو اسی قدر حیرانی ہے حضرت عمرؓ کی حالت سنئے کہ ایک صحابی ہیں حضرت حذیفہؓ جو صاحبِ سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب سے ملقب ہیں ان کا مذاق اس قسم کا تھا کہ خاص خاص حالات مستقبلہ اور فتن کے متعلق حضور سے سوالات کیا کرتے تھے چنانچہ وہ فرماتے کان الناس یسئلون عن الخیر واسئلہ عن الشر یعنی لوگ تو خیر کی باتیں پوچھا کرتے تھے اور میں شر کے متعلق سوال کیا کرتا تھا تاکہ میں اس سے بچا رہوں ۔ جیسے کسی کا مقولہ ہے عرفت الشرّ لا للشر لکن لتوقیه ومن لا یعرف الشر من الخیر یقع فیه. کہ جو شخص شر کو خیر سے نہ پہچانے وہ اس میں واقع ہو جائے گا ۔ چنانچہ حضورؐ نے ان کو اہل شر کے نام تک بھی بتلا دیئے تھے کہ فلاں فلاں لوگ بظاہر مسلمان ہیں اور عند اللہ کافر ہیں ۔ چنانچہ جس کے جنازہ پر حضرت حذیفہؓ تشریف نہ لے جاتے تھے تو جو لوگ سمجھدار تھے اور اس بھید سے واقف تھے وہ بھی اس جنازہ کی نماز میں شریک نہ ہوتے تھے ۔ حضرت حذیفہؓ تو بوجہ علم کے نہ پڑھتے تھے اور لوگ ان کو چونکہ معتبر سمجھتے تھے اس لئے نہ پڑھتے تھے ۔ ایک روز حضرت حذیفہؓ کو حضرت عمرؓ بلایا اور خلوت میں لے جا کے پوچھا کہ سچ بتانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین میں میرا نام تو نہیں بتلایا ۔ اللہ اکبر اس کو سن کر آپ لوگوں کو تعجب ہوگا کہ باوجود دنیا میں خوشخبری سن لینے کے پھر حضرت عمرؓ کو اس کا خیال کیونکر ہوا ۔ بات یہ ہے ؎ عشق است و ہزار بدگمانی

آپ کو تعجب اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا قلب خالی ہے ۔ ان کو جناب باری تعالیٰ سے محبت و عشق تھا اور محبت و عشق کا خاصہ ہے کہ بہت دور دور کے وسوسے آیا کرتے ہیں ۔ ایسا نہ ہو کہ فلاں بات سے میرا محبوب مجھ سے خفا ہو ۔ یا فلاں بات اس کو ناپسند ہو اس لئے حضرت پوچھتے تھے کہ منافقین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام تو نہیں لیا ۔ جب حضرت حذیفہؓ نے قسم کھا کر فرمایا کہ واللہ آپ کا نام نہیں لیا اس وقت تسلی ہوئی ۔

ہماری غفلت کی انتہا

صاحبو! ایک طرف ان حالات کو لیجئے اور ایک طرف اپنی غفلت اور اپنی بداعمالی کو اس کے بعد دیکھئے کہ آیا ہمارے لئے کیا اس غفلت کی کوئی گنجائش ہے کہ ہمارے لئے کوئی استثنا (علیحدہ حکم) ہوا ہو۔ ہرگز ہرگز نہیں، شاید کوئی صاحب اپنی خوابوں پر ناز کئے ہوئے بیٹھے ہوں تو یاد رکھو کہ قرآن مجید کے مقابلہ میں خواب کوئی چیز نہیں۔ پس نصوص کے عام ہوتے ہوئے خواب سے استثناء کیسے ہو جائے گا۔ آج کل لوگ خواب کو بڑی شئے سمجھتے ہیں خاص کر ذاکر شاغل لوگ۔ صاحبو! ہم کیا اور ہمارا خواب کیا۔ رات دن اکل وشرب اور اس کے دھندوں میں لگے رہتے ہیں۔ وہ ہی خیالات دماغ میں جمع ہو کر شب کو دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ہمارے خواب کی حقیقت ہے اور جو واقع میں خواب ہیں وہ مبشرات سے بڑھ کر نہیں حجت ان کو بھی نہیں کہا جا سکتا۔ میرے پاس تو اگر کوئی خواب لکھتا ہے یا مجھ سے کہتا ہے تو میں اُس کے جواب میں یہ شعر لکھ دیتا ہوں ؎

نہ شب نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم   چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(نہ میں رات ہوں نہ رات کی پرستش کرنے والا ہوں کہ خواب کی باتیں کہتا رہوں چونکہ میں آفتاب کا غلام ہوں)

اور لکھ دیتا ہوں کہ بیداری کا حال بیان کرو تو لطف آئے۔ اپنا کوئی مرض بیان کرو تا کہ اس کا علاج کیا جائے اور خواب میں کیا رکھا ہے خواب تو اگر کوئی یہ بھی دیکھ لے کہ میں جنت میں ہوں تو اس سے ذرہ برابر قرب نہیں بڑھتا اور اگر یہ دیکھے کہ سور کھا رہا ہوں تو ذرا برابر بعد نہیں ہوتا خواب فی نفسہ مؤثر نہیں ہے۔ ہاں قرب و بُعد پر بعض خواب مرتب ہو سکتا ہے یعنی اگر اچھا خواب دیکھو تو بعض احوال میں علامت ہے کہ اعمالِ قرب سے تم سے کوئی عمل ہوا ہے اور اگر بُرا خواب دیکھو تو اسی طرح علامت ہے کہ کوئی بُرا عمل ہوا ہے۔ غرض خواب علامت سے بڑھ کر نہیں ہے جیسے لال جھنڈی ریل کے کھڑے ہونے کے واسطے اور سبز جھنڈی چلنے کے لئے علت نہیں ہے علامت ہے۔ علت تو ڈرائیور کا کھڑا کرنا اور چلانا ہے پس سبز جھنڈی سے صرف استدلال کیا جا سکتا ہے کہ اب چلے گی اسی طرح سرخ جھنڈی سے استدلال اس کے ٹھہرنے پر۔ اسی طرح اصل میں قرب و بعد کا مدار عمل ہے۔ سو اعمال اپنے دیکھنا چاہئیں کہ کیسے ہیں اور اعمال کی فکر کرنا چاہیئے اب جو اصلی مدار تھا اس کو تو چھوڑ دیا اور خوابوں کے پیچھے پڑ گئے۔ بعضے عمل کو ضروری سمجھتے ہیں مگر ان کی بڑی معراج آخرت کے لئے عمل اور

سعی کی یہ ہوتی ہے کہ تھوڑی دیر بیٹھ کر رو لئے۔ صاحبو! رونے سے کیا ہوتا ہے، تدبیر بھی تو کیجئے ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال　　صد سال می تواں بہ تمنا گریستن!

(عرفی اگر رونے سے وصال محبوب میسر آجائے تو سو برس تک اس کی تمنا میں رو سکتا ہوں)۔

صرف تمنا سے کچھ حاصل نہیں ہوتا

البتہ رونے سے یہ امید ہوتی ہے کہ اب یہ شخص تدبیر کرے گا۔ اور اگر ہزار رونا ہی ہو اور تدبیر کچھ نہ کرے تو کوئی فائدہ نہیں اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کسی شخص کا بیٹا بیمار ہو گیا۔ اور وہ اس کے معالجہ سے غافل تھا علاج کی طرف توجہ نہ کرتا تھا ایک روز وہ ہائے ہائے کرنے لگا اور رونے لگا۔ عقلا دیکھ کر توقع کریں گے کہ یہ اس کا علاج کرے گا۔ کوئی عاقل اس کے رونے سے یا مریض کے رونے سے یہ نہیں سمجھ سکتا کہ رونے سے یہ اچھا ہو جائے گا البتہ قصد علاج و تدبیر پر استدلال کریں گے اور اگر رو دھو کر چپ ہو کر بیٹھ گیا اور معالجہ نہ کیا تو اس رونے سے وہ تندرست نہ ہوگا آجکل لوگوں نے سن لیا کہ رونا بڑی چیز ہے پس تھوڑی دیر بیٹھ کر سسک لئے اور سمجھ گئے کہ اب ہم جنت کے مستحق ہو گئے یا در کھو نری تمنا اور رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوتا تمنا کے باب میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں ؎

لو کان هذا لعلم یدرک باطنی　　ما کان یبقی فی البریة جاهل

(یعنی علم و معرفت صرف تمنا اور خیال سے حاصل ہو جایا کرتے تو دنیا میں اس سے کوئی بھی محروم نہ رہتا)

اگر کوئی شخص تمنا کرے کہ میں تحصیلدار ہو جاؤں اور اس تمنا میں رات دن رویا کرے اور تدبیر کچھ نہ کرے تو وہ تحصیلدار نہ ہوگا۔ یا کوئی کھیت کی ڈول پر بیٹھ کر تمنا کرے کہ کیا اچھا ہو کہ میرے کھیت میں گیہوں جم جائیں۔ عاقل اسے سن کر یہی دریافت کرے گا کہ میاں تم جو تمنا کرتے ہو تو کیا تم نے زمین میں ہل پھیرا تھا وہ کہتا ہے کہ نہیں بیج ڈالا تھا کہا نہیں۔ عاقل کہے گا کہ بیوقوف ہوا ہے بغیر بوئے جوتے ہل پھیرے گیہوں کیسے جم جائیں گے اسی طرح آخرت بھی اعمال اور سعی کے ساتھ وابستہ ہے جب تک ان کو بجا نہ لاؤ گے وہ کیسے حاصل ہوگی مجھے سخت حیرت ہوتی ہے کہ بڑے بڑے عقلاء اس قاعدہ کو آخرت میں آ کر کیوں بھول گئے کچھ نہیں یہ سب سستی ہے اور غفلت اور نفس کے حیلہ ہیں۔ صاحبو! باتیں بنانے اور تمنائیں کرنے اور رونے پیٹنے سے کچھ نہیں ہوتا کام کرو ؎

کار کن کار بگزار از گفتار　　اندریں راہ کار باید کار

(عمل کرو، دعویٰ ترک کرو، اس طریق میں عمل اور کام ہی کی ضرورت ہے)

حصولِ آخرت کی تدابیر

الحاصل جیسے دنیا اعمال کے ساتھ وابستہ ہے اسی طرح آخرت کے حاصل کرنے کے بھی تدبیریں ہیں چونکہ حق تعالیٰ نے آیت فَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنْ شَیْءٍ الخ میں آخرت کی مطلوبیت کو ذکر فرمایا تھا اس لئے اب آگے ان اعمال کا ذکر فرماتے ہیں کہ جن پر آخرت کا مدار ہے چنانچہ ارشاد ہے:

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝

یعنی خبر بھی ہے آخرت کس کو ملتی ہے آخرت ان لوگوں کو ملتی ہے جو ایمان لائے اور اپنے رب کے اوپر بھروسہ کرتے ہیں اور فلاں فلاں اعمال صالحہ کرتے ہیں اور اخیر میں مظلومیت کی حالت میں معاف کرنے کی فضیلت اور ساتھ ہی بدلہ لینے کی اجازت بھی فرمائی اور یہ بھی فرما دیا کہ جو مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لے اس پر کوئی الزام نہیں ان سب آیتوں کے بعد یہ آیت ہے جو میں نے شروع وعظ میں تلاوت کی تھی اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ ۔ یعنی مواخذہ والزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ناحق ظلم کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

ظلم مانع آخرت ہے

اسی آیت کا مضمون مجھ کو بیان کرنا مقصود ہے لیکن ارتباط اور مقام کی حقیقت بیان کرنے کے لئے اوپر کی آیتوں کے متعلق بھی کچھ بیان کر دیا۔ حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان آیتوں میں ان اعمال کی فہرست بتائی ہے جن سے آخرت حاصل ہوتی ہے منجملہ ان کے اس آیت میں ارشاد ہے کہ ظلم کرنا مانع طریق ہے یہ ہے حاصل اجمالی اس آیت کا۔

وعظ ایک مطب ہے

اب یہ سمجھئے کہ میں نے اس وقت آیت کو کیوں اختیار کیا بات یہ ہے کہ میری عادت ہے کہ جس مضمون کی زیادہ ضرورت دیکھتا ہوں وہی اختیار کرتا ہوں خواہ اس مضمون میں لوگوں کو مزہ آوے

یا نہ آوے۔ آجکل لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وعظ سے رنگین اور چٹ پٹے مضامین کو مقصود سمجھتے ہیں اور ایسے ہی واعظوں کے وعظ کو بہت پسند کرتے ہیں جو ایسے مضامین بہت بیان کرتے ہوں کہ اچھا ہے تھوڑی دیر کے لئے بزم رنگین رہے گی، یاد رکھو ہر شے کا ایک موضوع (یعنی غرض ومقصود) ہوتا ہے مثلاً کپڑے کا مقصود دفع حر و برد ہے زینت ایک زائد شے ہے اگر حاصل ہو تو سبحان اللہ ورنہ مقصود یہ نہیں۔ اور اگر یہ مقصود حاصل نہ ہو نری زینت ہی ہو تو ایسے کپڑے سے کوئی نفع نہیں۔ جیسے آجکل سردی کا موسم ہے کوئی شخص ایک کرتہ زیب تن کئے ہوئے ہاتھ میں پنکھا جھلتے ہوئے باہر نکلے تو عقلاء اس کو خبطی کہیں گے آجکل بہت لوگ اس خبط میں بھی مبتلا ہیں فیشن پر مرتے ہیں۔

ایک عاشق فیشن ریل میں سوار تھے سردی کا موسم تھا آپ گبرون کا کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے اور سردی میں اکڑ رہے تھے مگر رضائی ساتھ لے کر نہیں چلے اس لئے کہ رضائی کا رکھنا فیشن کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ خیر ایک مصیبت تو تھی ہی وہی دوسری بلا اور اپنے اوپر لی۔ وہ یہ کہ ایک اسٹیشن پر گاڑی تھمی۔ ایک انگریز نے اتر کر برف پیا۔ آپ بھی چونکہ پورے نقال اور انگریزوں کے پورے مقلد تھے آپ نے بھی برف پی۔ برف کا پینا تھا اکڑ گئے۔ بھلے مانس نے یہ نہ سمجھا کہ انگریز تو سرد ملکوں کے رہنے والے ہیں ان کے مزاج میں حرارت ہوتی ہے ان کو تو مضر نہیں ہے مجھ پر کیا مصیبت سوار ہوئی جو اس سردی میں برف پیوں۔ غرض فیشن نے عقل پر ایسا پردہ ڈالا ہے کہ جو منفعت کی چیزیں ہیں ان کو بھی چھڑا دیا۔ چنانچہ رضائی لانا تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس سے بہت ہی راحت ملتی ہے۔ عارف نظامی فرماتے ہیں ؎

میفکن گول گرچہ عار آیدت　　　که ہنگام سرما بکار آیدت

(رضائی کو مت پھینک گر چہ تجھے شرم آتی ہو کیونکہ سردی کے وقت تیرے کام آسکتی ہے)

پس یاد رکھو کہ وعظ کا موضوع لہ علاج ہے امراض کا اگر مزہ دار مضمون بھی کوئی آجاوے تو اس کی زینت ہے ورنہ مقصود ہر طرح قابل تحصیل ہے جب موضوع لہٗ یہ ٹھہرا تو وعظ کہنے والے اور سننے والوں کو اس کی رعایت ضروری ہے۔

مکرِ شیطان سے بچنے کا نسخہ

بعض مرتبہ واعظین کو شیطان بہکاتا ہے کہ دوسروں کے عیوب میں کیسے بیان کروں جبکہ خود میرے اندر یہ عیوب موجود ہیں۔ اسی واسطے بعض لوگ وعظ چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ یہ شیطان بڑا ہوشیار

ہے دنیاداروں کوان کے خیالات کے رنگ میں بہکاتا ہے اور دینداروں کو دینداری کے رنگ میں دھوکہ دیتا ہے مثلاً ایک عالم ہے کہ وہ پڑھاتا ہے وعظ کہتا ہے اس کو کہتا ہے میاں پڑھنے پڑھانے اور وعظ میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز تو قلب کی اصلاح ہے غرض اس سے درس و تدریس چھڑا کرنہ ادھر کا رکھتا ہے نہ اُدھر کا۔ اس کے مکروں سے بچنے کا طریقہ اگر ہے تو بس یہ ہے کہ اپنے کو شیخ کامل کے ہاتھ میں دیدے جس طرح وہ کہے اس پر عمل کرے ۔

صبر کن در کار خضر اے بے نفاق　　تانگوید خضر رو ہذا فراق

(تو صبر کر اور کسی رہنما کے کام میں خلل مت ڈال تاکہ ایسا موقع نہ آئے کہ خضر کہہ دیں کہ جاؤ میری جدائی ہے)۔

چنانچہ میں نے بعض علماء کو اس بلا میں مبتلا دیکھا ہے کہ انہوں نے وعظ اور امر بالمعروف اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ ہمارے اندر جب خود یہ عیوب ہیں تو ہم دوسروں کو کس منہ سے منع کریں اس کے دو جواب ہیں ایک حاکمانہ اور دوسرا حکیمانہ۔ حاکمانہ جواب تو یہ ہے کہ تمہاری مصلحت کوئی چیز نہیں حاکم حقیقی کا جب حکم ہے تو اس کے سامنے اپنی مصلحت پر خاک ڈال دو ۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(اگر سلطان دین مجھ سے طمع چاہتا ہے تو پھر اس کے بعد قناعت کے سر پر خاک ڈالنے کے لئے تیار ہوں)۔

شارع کا جب تم کو یہی حکم ہے تو تم کو اس میں چون و چرا نہ چاہیئے ۔

ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است　　(جو عیب سلطان کو پسند ہو وہ ہنر ہے)

وعظ کہنے کے چند آداب

حکیمانہ جواب یہ ہے کہ تم دوسروں کو اصلاح کی نیت سے وعظ نہ کہو کہ اس میں یہ امر مذکور مانع ہے، تمہارے اندر جو عیوب ہیں ان کی اصلاح کی نیت سے کہو کہ ان کی اصلاح کا طریقہ بھی یہی ہے اس لئے کہ جب تم اوروں کو کہو گے تو نفس شرمائے گا اور حیا آئے گی کہ میں اوروں کو کہتا ہوں مجھ کو بھی تو چاہیئے کہ ان عیوب کو چھوڑ دوں پس وعظ اپنی اصلاح کے واسطے کہے یہ حکیمانہ اور اصول تصوف پر جواب ہے ورنہ سیدھی بات یہ ہے کہ ہم کو حکم ہے کہ ہر حال میں امر بالمعروف کریں بہرحال وعظ کہنے والے اور سننے والے اس کی رعایت ضرور رکھیں کہ وعظ کو ایک مطب سمجھیں اور اپنے مرض کا علاج اس

کا مقصود جانیں بعض مرتبہ لوگوں کا خوف باعث ہوتا ہے امراض نہ بیان کرنے کا کہ اگر ہم لوگوں کے عیوب بیان کریں گے تو لوگ ہمارے درپے ہو جائیں گے اور ہماری عافیت تنگ کر دیں گے اس وجہ سے اس قسم کی بات نہیں کہتے۔ صاحبو! بیان کرنے کا طرز ہے۔ ایک طرز تو طعن اور تحقیر اور خشونت کو لئے ہوئے ہے وہ تو واقعی دل خراش ہے اور اس کا اثر بیشک یہی ہے کہ لوگ درپے ایذا ہو جاتے ہیں۔ اور ایک طرز شفقت اور خیر خواہی اور اخلاص کا ہے اس سے کوئی برا نہیں مانتا۔

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا اندازِ وعظ گوئی

مولانا اسمعیل شہیدؒ بہت صاف گو تھے جو بات کہیں منکر دیکھتے تھے نہایت صاف فرماتے تھے اس زمانہ میں لکھنو میں شاہی تھی گو وہ سپاہی تھی بادشاہ مولانا کے وعظ کا مشتاق ہوا اور اپنے مصاحب سے کہ وہ مولانا کا میزبان تھا کہا کہ ہم ان کا وعظ سننا چاہتے ہیں ان کو لاؤ۔ وہ بیچارے ڈرے کہ مولانا ہیں صاف گو اور یہ ہے حاکم خدا جانے کیا کرے گا۔ اس خیال سے ٹال دیا۔ چند روز کے بعد بادشاہ کو پھر خیال ہوا اور تقاضا کیا۔ آج جب اس شخص نے کوئی مفر نہ دیکھا مولانا سے بادل نخواستہ عرض کیا کہ حضرت بادشاہ آپ کے وعظ کے بہت مشتاق ہے مگر دیکھئے خدا کے واسطے رفض کے متعلق کچھ بیان نہ فرماویں مولانا نے فرمایا کہ تم لوگ باؤلے ہو۔ میں کوئی بچہ ہوں جو مجھ کو سمجھاتے ہو غرض تشریف لائے اور اعوذ بسم اللہ پڑھ کر بیان فرمایا کہ صاحبو! قبل اس کے کہ میں کچھ بیان کروں یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علماء کی مثال اطبا کی سی ہے تو طبیب جو مرض دیکھتا ہے اس کا علاج کرتا ہے اور جو مرض نہ ہو اس کا علاج کرے گا تو وہ احمق ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب کو تو مرض ہے رفض کا اور فلاں صاحب کہتے ہیں کہ رفض کا بیان مت کرنا اب میں ان کا کہنا کیسے مانوں۔ یہ تو خیانت ہے۔

اس کے بعد جو تشیع کے متعلق بیان کرنا شروع کیا ہے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اور اب نواب صاحب پر اور سب پر بھی اس قدر اثر ہوا کہ مولانا کے ہاتھ تک چومے اور نہایت عزت و احترام سے رخصت کیا پس آفت ہمیشہ جب آتی ہے جب نفس کی کوئی غرض درمیان میں آجاوے ورنہ کسی کو ناگوار نہیں ہوتی اور یوں کسی کی طبیعت ہی خبیث ہو وہ الگ بات ہے تو ایسے وقت میں وعظ معاف بھی ہے بہر حال وعظ علاج ہے امراض کا۔

حضرت حکیم الامتؒ کا انداز وعظ گوئی

اب امراض ہیں ہمارے اندر بہت سے کسی وقت کوئی مرض یاد آجاتا ہے کسی وقت کوئی یاد

آ جاتا ہے۔ بعض مرتبہ کوئی یاد نہیں آتا۔ اور فکر ہوتی ہے کہ کیا بیان کیا جاوے اس لئے طبیعت جویاں رہتی ہے ایسے مضمون کی جو انفع (زیادہ نفع پہنچانے والا) ہو اور جو عام ہو حتی کہ منبر پر بیٹھنے تک ذہن میں نہیں آتا کہ کیا مضمون اختیار کیا جاوے۔ مگر دفعتہً (اچانک) کوئی مضمون قلب میں واقع ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ حاضرین میں سے کسی شخص کی صورت دیکھ کر مضمون سمجھ میں آ گیا جیسے مریض کی صورت دیکھ کر طبیب کو قانون شیخ کا پورا ایک باب یاد آ جاوے۔ ہم لوگوں کی بھی یہی کیفیت ہے کہ ہماری صورتیں دیکھ کر امراض سمجھ میں آتے ہیں۔ چنانچہ جو مضمون آج سمجھ میں آیا ہے وہ بھی اسی نوع کا ہے اور واللہ میری عادت کسی کو چھیڑنے کی نہیں ہے خاص کر اپنے اہل وطن کے ساتھ جو کچھ عرض کرتا ہوں خیر خواہانہ عرض کرتا ہوں اور اپنے آپ کو بھی اس میں شریک کرتا ہوں اور حتی الامکان ایسا ہی مرض بیان کرتا ہوں کہ کم و بیش اس میں سب مبتلا ہوں حتی کہ میں بھی۔ میں چنانچہ آج جس مرض کا بیان کرتا ہوں وہ بھی ایسا ہی ہے۔ او وہ مرض ظلم ہے کہ اس میں مرد عورت۔ بچے۔ بوڑھے امیر غریب۔ حاکم رعایا سب ہی کم و بیش مبتلا ہیں۔ شاید لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ ظلم میں تو بڑے ہی لوگ مبتلا ہیں اور چھوٹے بے چارے تو خود ہی دبے ہوئے ہیں وہ کیا کسی پر ظلم کریں گے تو جواب یہ ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں۔ مبتلا سب ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ غربا کے پاس اس کا اس قدر سامان نہیں جتنا امراء کے پاس ہے۔ اس اعتبار سے غربا کی حالت بہ نسبت امراء کے اچھی ہے۔ ضلع کانپور میں ایک مقام ہے بارہ اکبر وہاں ایک غریب جولاہہ تھا وہ ایک روز اپنی مسکنت کی حالت میں بیٹھا تھا۔ ایک رئیس خاں صاحب کا گزر ہوا۔ تحقیراً پوچھا میاں جی کیا کر رہے ہو۔ وہ جولاہا بھی تھا استاد بولا خانصاحب اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں خانصاحب نے کہا کہ تجھ پر اللہ تعالیٰ کی کون سی نعمت ہے جس کا شکر ادا کر رہا ہے کہا اس کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو خانصاحب نہیں بنایا ورنہ میں بھی مخلوق پر ظلم کرتا۔ خانصاحب لاجواب ہو گئے اس نے بالکل سچی بات کہی۔ ؎

ندارى بحمد اللہ آں دسترس (تجھے اللہ تعالیٰ کے کرم سے وہاں تک دسترس نہیں)

غرض ایسے سامان کا نہ ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اس لئے کہ جس قدر سامان والے ظلم کریں گے اس قدر یہ نہ کرے گا۔ سو یہ فرق تو ضرور ہے لیکن ظلم میں سب مبتلا ہیں۔ ہاں امراء زیادہ کرتے ہیں اور غرباء کم اس لئے غریب ہونا بھی اچھا ہی ہے۔

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرزِ زندگی

یہ تو اس تقدیر پر ہے جب کہ غریب اور امیر کی تعریف ہمارے عرف کے اعتبار سے لی

جائے اور اگر صحابہؓ کی اصطلاح لی جائے تو اس زمانہ میں کوئی بھی غریب نہیں۔ کسی شخص نے ایک صحابی سے اپنے فقر و فاقہ و غربت کی شکایت کی۔ انہوں نے پوچھا کہ تمہارے رہنے کے لئے گھر بھی ہے اور بیوی بھی ہے۔ عرض کیا کہ گھر بھی ہے اور بیوی بھی ہے فرمایا کہ تم غریب کہاں ہوئے تم تو امیر ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ ایک غلام بھی ہے۔ فرمایا کہ پھر تو تم بادشاہ ہو۔ ان ارشادات کے سننے کے بعد وہاں یہ نہیں تھا جیسے ہم لوگوں کی حالت ہے کہ حدیث قرآن سب کچھ پڑھتے سنتے ہیں اثر کچھ نہیں۔ چنانچہ یہ سب سن لیا مگر پھر بھی سمجھ رہے ہیں اپنے کو غریب ہی۔ وہاں تو یہ حالت تھی کہ جو کچھ سن لیا نقش کالحجر (پختہ یقین ہونا) ہو گیا جس بات کی نسبت ارشاد فرمایا کیا مجال ہے کہ اس کے خلاف ہو چنانچہ انہوں نے امیری کی یہ ماہیت سن لی تو بس پتھر کی لکیر ہوگئی۔ تمام اجزاء شریعت کے ساتھ ان کی یہی حالت تھی کہ ایک ایک جزو حاضر اور نقد وقت تھا ان حضرات کی دولت تو بس حضورؐ کے ارشادات تھے اسی کو وہ امیری اور غنا سمجھتے تھے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہرقل کو جواب

چنانچہ جب ہرقل کے پاس ایک سیاسی امر کے متعلق صحابہ تشریف لے گئے ہیں تو اس نے یہ بات پوچھی کہ آپ لوگ اوّل اہل فارس پر کیوں نہ گئے، ہمارا نمبر تو پیچھے تھا۔ کیونکہ ہم تو دونوں اہل کتاب ہیں جو کام ضروری ہے اول وہ کرنا چاہیئے۔ سو اس سوال کے وقت اگر ہم میں سے کوئی عاقل ہوتا تو حیران رہ جاتا۔ اور سوچنا پڑتا کہ کیا جواب دیا جائے مگر وہاں تو محرک عمل کا قرآن مجید ہی تھا اس وقت بے تکلف آیت پڑھی يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ قَٰتِلُواْ ٱلَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ ٱلۡكُفَّارِ یعنی اے ایمان والو ان کفار سے قتال کرو جو تمہارے نزدیک ہیں، وہ سن کر چپ رہ گیا پس یہی مذاق ہم کو بھی پختہ کرنا چاہیئے۔

امیری کی ماہیت

کہ روایت مذکورہ سے امیری کی ماہیت سن کر اپنے کو امیر ہی سمجھنا چاہیئے اور لیجئے دوسری حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں من اصبح معافی فی جسدہ یامنافی سربہ و عندہ قوت یومہ فکانما حیزت لہ الدنیا بحذا فیرہ۔ (مجمع الزوائد ۱۰:۲۸۹، حلیۃ الاولیاء ۵:۲۴۹) یعنی جو شخص صبح کو اٹھے اس حالت میں کہ جسم میں اس کے عافیت ہو اور نفس میں اس کے اور گھر میں امن سے ہو۔ اور ایک دن کا اس کے پاس کھانے کو ہو پس گویا دنیا بتمامہ اس کے لئے جمع کر دی گئی ہے۔ اور یہ بات عقلی طور پر بھی سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اگر کسی کے پاس بہت بھی ہو تو کام تو

اس کے اتنا ہی آئے گا جس قدر وہ کھائے گا اتنا ہی وہ کھائے گا۔ اور اتنا ہی غریب بلکہ غریب زیادہ کھاتے ہیں۔ پس زیادہ ہونے کا کیا فائدہ ہوا۔ رہی حرص تو وہ کسی طرح بھی پوری نہیں ہوتی ؎

کوزۂ چشم حریصاں پُر نشد　　تا صدف قانع نشد پُر در نشد

(لالچیوں کی آنکھ کا کوزہ اس وقت تک نہیں بھرتا جب تک کہ سیپ کے اندر موتی نہ پڑے گا)

صراحی میں پانی اتنا ہی آتا ہے جس قدر اس میں وسعت ہے۔ امیر غریب سے کچھ زیادہ نہیں کھاتے جس کے پاس ایک ہزار من غلہ ہے وہ بھی اتنا ہی کھائے گا اور جس کے پاس ایک من ہے وہ بھی اتنا ہی۔ پھر اس کو اس پر کیا ترجیح ہے، بات تو یہی ہے لیکن ہم لوگوں کی ہمت ضعیف ہے یہ خیال ہوتا ہے کہ ہائے خدا جانے کل ملے گا یا نہیں۔ حضرت مولانا رفیع الدین علیہ الرحمۃ بچپن میں دہلی گئے تھے جو کچھ سرمایہ پاس تھا ختم ہوگیا۔ فرماتے تھے کہ فکر ہوئی پھر سوچا کہ اے نفس اب تک خدا تعالیٰ نے بلا استحقاق دیا تو کیا اب نہ دے گا۔ غرض حدیث شریف کا مضمون عقلی بھی ہے۔ مولانا گویا اسی کا ترجمہ فرماتے ہیں ؎

چوں ترا نانے و خرقانی بود　　ہر بن موئے تو سلطانی بود

(جب تک تیرے پاس کھانے کی اشیاء ہیں اس وقت تک تیرا بال بال بادشاہ ہے)

یعنی اگر تیرے پاس ایک روٹی کھانے اور ایک کپڑا پہننے کو ہو تو تیرا بال بال بادشاہ ہے۔

اہل اللہ بادشاہوں سے بڑھ کر ہیں

بلکہ اگر اللہ والا ہو تو بادشاہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ ایک قانونی لطیفہ اس کے بادشاہ سے بڑھ کر ہونے کے متعلق یاد آیا وہ یہ کہ اگر کسی امیر کو بادشاہ کہو تو قانوناً ناجائز ہے اور اگر فقیر کو شاہ صاحب کہو تو جائز ہے۔ گویا گورنمنٹ بھی اس کے بادشاہ ہونے کو تسلیم کرتی ہے۔ حقیقت میں بادشاہ وہی ہے جس کے پاس سوائے خدا کے کچھ نہ ہو۔ اور جو ایسا ہو گا سب کچھ اسی کا ہے۔

ہارون رشید کی ایک ذہین باندی کی حکایت

ہارون رشید کے ہاں کوئی جشن تھا بس مختلف قسم کی چیزیں رکھ کر ہارون رشید نے حاضرین سے کہا کہ جو شخص جس شئے پر ہاتھ رکھ دے وہ شئے اسی کو دی جائے گی سب نے اپنی اپنی مرغوب شئے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک لونڈی مورچھل لئے ہوئے خلیفہ کے پیچھے کھڑی تھی اس نے بادشاہ کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا۔ بادشاہ نے غضب ناک ہو کر کہا کہ یہ کیا حرکت ہے اس لونڈی نے عرض کیا کہ حضور نے فرمایا کہ

جو جس شئے پر ہاتھ رکھ دے وہ شئے اُسی کی ہے۔کوئی استثناء حضور نے نہیں فرمایا تھا پس میں نے حضور ہی کو پسند کیا ہے اس لئے کہ جب حضور میرے ہو گئے یہ سب چیزیں میری ہو گئیں۔خلیفہ کو اس کی ذہانت سے تعجب ہوا اور اس کو اپنی خواص میں داخل کر دیا۔صاحبو! ہم تو عقل میں اس لونڈی کے برابر بھی نہ نکلے۔ہماری سمجھ تو اس سے بھی کم نکلی۔اور اگر اس کو سمجھا بھی تو کن لوگوں نے جن کو آپ نکما اور بیکار سمجھتے ہیں کہ یہ کس کام کے ہیں۔نہ نوکری کرتے ہیں نہ تجارت۔سوائے مسجد کے کونہ کے ان کو کوئی دھندا نہیں اپاہج ہو کر بیٹھے کھاتے ہیں صاحبو! جس شخص کو بڑا کام سپرد ہو جائے وہ چھوٹے کاموں کی طرف کیوں توجہ کرے گا۔ایک شخص اگر چوکیدار ہوا اور وہ ڈپٹی کلکٹر ہو جائے پہلے تو وہ بازاروں میں کونچوں میں نظر پڑتا تھا اور اب کچہری میں یا بنگلہ اور کوٹھی میں رہے گا۔کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ وہ نکما ہو گیا پس جس کو حق تعالیٰ اپنا بنا لیویں اس کی جوتی کو غرض پڑی ہے کہ وہ یوں خوار پھرے ؎

تا بدانی ہر کہ ایزد آں بخواند　　از ہمہ کارِ جہاں بیکار ماند

(یعنی جس کو اللہ تعالیٰ اپنے کام میں لگا لیتے ہیں وہ دوسرے کام کا نہیں رہتا)

نواب رامپور اگر کسی کو بلا کر اپنے مقربین میں داخل کر لیں تو وہ تجارت زراعت نوکری سب چھوڑ دے گا اور جس کو خدا تعالیٰ بلا لیوے وہ کیوں دنیوی کاموں میں مشغول ہو گا تجارت اور زراعت اور دولت سب اس کی لونڈیاں ہیں۔غرض اس زمانہ میں کوئی شاذ و نادر ہی غریب ہے یہ ضرور ہے کہ کسی کو زیادہ ملتا ہے اور کسی کو کم۔مگر ملتا ہے سب کو۔ہاں غریب وہ لوگ تھے جن کا حال میں عرض کرتا ہوں۔حضور کے زمانہ میں مسجد میں عورتیں بھی نماز کو آیا کرتی تھیں اور بعض صحابہ ایسے تھے کہ ان کے پاس بقدر کفایت بھی کپڑا نہ تھا۔تھوڑا سا کپڑا ہوتا تھا کہ اس کو آگے لپیٹ کر گرہ لگا لیتے تھے تو حضور نے عورتوں کو حکم فرمایا تھا کہ جب تک مرد سیدھے نہ کھڑے ہو جائیں تم سجدہ سے مت اٹھا کرو تا کہ بدن پر نظر نہ پڑ جاوے۔یہ لوگ تھے غریب اور یہ تھے فقرا و مساکین۔

آجکل کے غربا کا دماغ امراء سے زیادہ چڑھا ہوا ہے

آجکل بتلایئے ایسا کون ہے الا ماشاء اللہ غرض اس زمانہ میں کوئی غریب نہیں ہے اس لئے وہ بھی ظلم کر سکتے ہیں بلکہ بعض اوقات جن کو غربا کہا جاتا ہے ان کا دماغ امراء سے بھی زیادہ بڑھا ہوا ہوتا ہے بعض انواع ظلم و ایذا کے ان سے زیادہ صادر ہوتے ہیں۔چنانچہ بعض موقع پر یہ امراء کی تحقیر کرنے کے لئے کہتے بھی ہیں کہ میاں ہم ان سے کس بات سے کم ہیں۔کوئی مال مست۔کوئی کھال مست۔تو یہ کھال مست ان سے بڑھے ہوئے ہیں اکثر تقریبات کی رسوم میں امراء تو

کچھ کمی بھی کر جاتے ہیں مگر غرباء کو یہ خیال رہتا ہے کہ اگر ہم کچھ نہ کریں گے تو بڑی بدنامی ہوگی۔

بارات کو کھانا ناموری کیلئے کھلایا جاتا ہے

چنانچہ اس بدنامی سے بچنے کے لئے یہ غریب لوگ قرض لیتے ہیں گھر رہن کرتے ہیں میرے ایک ملنے والے نے اپنی لڑکی کی شادی کی ہے، بارات بھی منگائی اور تمام برادری کو کھانا بھی کھلایا۔ ان کو جو منع کیا گیا تو یہ کہا کہ صاحب کیسے نہ کھلاؤں۔ آخر سب کا کھایا بھی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ سب کو جو کھایا ہے دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ قرض ہے یا تبرع۔ اگر قرض ہے تو قرض کا قانون تو یہ ہے **الاقراض تقضی بامثالها** تو یہ قرض کیسا ہے کہ کھایا تم نے ایک روپیہ کا کھانا اور کھلا رہے ہو چودہ آنہ یا اٹھارہ آنہ کا اس لئے کہ اپنے کھائے ہوئے کے برابر تو تول کر کھلاتے نہیں۔ اور یہ قرض کیسا ہے کہ کھایا زید کے یہاں سے اور ادا کرتے ہو عمرو بکر کو کچھ نہیں۔ قرض کیا ہے مرض ہے چنانچہ انہوں نے کھلایا پلایا۔ ہمارے یہاں بھی کھانا بھیجا۔ میں نے فوراً لوٹا دیا۔ ان کو مجھ سے ہے محبت وہ جی بُرا کرنے لگے میں نے ان سے کہا کہ تم بُرا نہ مانو۔ جب تم اس قصہ سے فارغ ہو جاؤ گے ایک روز مجھے کھانا کھلا دیجیو۔ میں تمہارے گھر آ کر کھانا کھالوں گا بات تو ذرا ہلکی سی ہے لیکن دلجوئی کیلئے کہنا ہی پڑتی ہے۔ لیکن آج تک انہوں نے مجھ کو کھانا نہیں کھلایا مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنا شیطانی قصہ انہوں نے کیا۔ اس میں تو دقت نہ تھی۔ اور میرے ایک آدمی کے کھلانے میں سہولت کے منتظر ہیں۔ وہ بات کیا ہے کہ اس کھلانے میں تو نام آوری سمجھتے ہیں اور یہ کھلانا محض محبت اور خلوص کا ہے اس کی توفیق نہیں ہے۔

بہر حال میرا مقصود اس حکایت سے یہ ہے کہ غربا میں بھی دماغ اس قدر ہوتا ہے کہ اگر ان کے پاس سامان ہو تو وہ بھی ظلم میں کسر نہ کریں گے۔ اور ایک بات یہ سمجھو کہ جس ظلم سے ممانعت ہے اس کے معنے شاید سامعین نہ سمجھتے ہوں گے کہ ظلم یہی ہے کہ کسی کو مارے کسی کو پیٹے۔ کسی کا گھاس چھین لے۔ بیشک یہ بھی ظلم ہے اور ظلم کے اعلیٰ افراد ہیں۔

صغیرہ گناہ چنگاری کے مثل ہے

لیکن ظلم اس میں منحصر نہیں چھوٹے چھوٹے ظلم بھی ظلم ہی ہیں اور اگر یہ خیال ہو کہ خیر چھوٹے ظلم کا کیا حرج ہے تو صاحبو چھوٹی چنگاری سے کیوں احتیاط کرتے ہو فرق اتنا ہی ہے کہ بڑا انگارہ جلدی پھونکے گا اور چھوٹی چنگاری دیر میں جلائے گی صاحبو! گناہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا جب اس سے

لاپروائی کی جاوے گی ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے اور گناہ فی نفسہ ہو یا بڑا اپنی حقیقت کے اعتبار سے تو بڑا ہی ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ پس کس کا چھوٹا کس کا بڑا سب ہی کو چھوڑو۔ بلکہ جتنا چھوٹا اتنا ہی کھوٹا اس لئے کہ بڑے گناہ کو تو گناہ سمجھ کر توبہ بھی کرتے ہیں اور چھوٹے سے لاپروائی کی وجہ سے توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوتی تو اس حیثیت سے چھوٹا زیادہ کھوٹا ہوا اور چونکہ یہ غلط فہمی ظلم کی حقیقت نہ جاننے سے ہوئی ہے اس لئے میں اوّل ظلم کی حقیقت بیان کئے دیتا ہوں۔

ظلم کی حقیقت

سو ہر چند کہ ظلم ہر گناہ کو عام ہے لیکن اس آیت میں چونکہ ظلم متعدی ہے۔ النّاس کی طرف اس لئے ظلم کے معنے یہاں خاص وہی ہیں جس کا تعلق لوگوں سے ہو یعنی اتلاف حقوق الغیر یعنی غیر کے حقوق کے ضائع کرنا۔ اور یہ معنی بقرینہ مقام ہیں ورنہ ظلم کے معنی لغت میں یہ ہیں وضع الشی فی غیر محلّہ جس کا ایک درجہ ایسا بھی نکلے گا کہ گناہ بھی نہیں لیکن مناسب ہے۔

فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کا مفہوم

اور یہاں سے دوسری آیت فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کے معنی حل ہو گئے۔ اس آیت سے فرقہ عشویہ نے استدلال کیا ہے کہ انبیاء سے صدور معصیت کا جائز ہے مگر اس تفسیر سے ان کا جواب ہو گیا کہ معنی یہ ہیں کہ تم دونوں یعنی آدم وحوا بے موقع کام کرنے والوں سے ہو جاؤ گے۔ جو لغت سے واقف ہے اس کو خوب ذہن نشین ہو گیا ہوگا۔ اسی واسطے عوام کو چاہیئے کہ خود قرآن شریف کا ترجمہ نہ دیکھیں بلکہ ایسا ہی شوق ہو تو کسی عالم سے پڑھ لیں ورنہ خدا جانے کیا کچھ سمجھ جائیں گے۔ غرض ظلم فی نفسہ ایک ایسا مفہوم ہے کہ نامناسب اور صغیرہ اور کبیرہ گناہ اور کفر تک کو شامل ہے مگر یہاں خاص مراد ہے غیر کا حق تلف کرنا اور وہ غیروں کے حقوق کیا ہیں سو اُن کی تفصیل شریعت میں موجود ہے۔ میں مثال کے طور پر کچھ بیان کرتا ہوں۔

بیوی پر ظلم کی مثال

مثلاً بی بی ہی کے بہت حقوق ہیں۔ بہت لوگ ان حقوق کو بھی تلف کرتے ہیں اور وہ حقوق یہ ہیں۔ وسعت کے موافق ان کو کھانے پہننے کو دینا اور دین کا راستہ سکھانا۔ بعض تو کھانے پہننے کو نہیں دیتے یا تنگی کرتے ہیں۔ گھر کی بی بی کو چھوڑ کر کسی کا کنجڑی سے تعلق ہے کسی کا بھنگن پر دل آ

گیا ہے اس پر مرتے ہیں۔ نہ یہ تمیز ہے کہ اپنی نسل خراب ہوتی ہے۔ نہ یہ خوف کہ بدنامی ہے سب سے پردہ پر گیا۔ اور ظلم پر کمر باندھ لی۔

ظلم سے بچنے کا ایک مراقبہ

میں ظلم سے بچنے کا ایک قاعدہ بلکہ اس کو مراقبہ کہنا چاہیئے بتاتا ہوں۔ جو شخص کسی پر ظلم کرنے میں مبتلا ہو وہ یہ سوچے کہ اگر میں بجائے اس کے ہوتا اور یہ بجائے میرے تو کیا میں اپنے ساتھ ایسے معاملہ کو پسند کرتا۔ پس یہ شخص جس معاملہ کی دوسروں سے اپنے لئے خواہش رکھتا ہے وہی معاملہ اس کو اپنے ماتحتوں سے کرنا چاہیئے اور اگر ماضی میں فرض محال نظر آوے تو مستقبل ہی میں سمجھ لے کہ حق تعالیٰ کو یہ قدرت ہے کہ جس منصب اور مرتبہ کی وجہ سے میں اس پر زیادتی و ظلم کرتا ہوں اس کو مجھ سے چھین لے اور ایسا واقع ہوتا بھی ہے۔

ظلم سے زوالِ سلطنت

دیکھو ہماری ریاست اور منصب تو ہے ہی کیا سلطان عبدالحمید خاں کو دیکھو جو کہ صاحب سلطنت تھے۔ اور ایک وقت وہ تھا کہ ان کی سطوت و شوکت کے سامنے کسی کو دم زدن کی مجال نہ تھی سپاہ اور امراء و وزراء و سفراء سب صف بستہ حکم کے منتظر رہتے تھے۔ یا تو یہ جاہ و جلال تھا اور یا آنکھوں کے دیکھتے دیکھتے یہ ہو گیا کہ تخت سلطنت سے اتار دیئے گئے اب اگر وہ کوئی حکم کریں بلکہ کوئی مشورہ بھی دیں تو کوئی سنتا بھی نہیں۔

درسِ عبرت

بڑی عبرت کا واقعہ ہے حق تعالیٰ جس سے چاہے جب چاہیں جو نعمت چاہیں سلب کر لیں کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ان کی شان ہے لوگ آجکل اخبار اور تاریخیں دیکھتے ہیں صرف مجلس آرائی کے لئے۔ واقعات سے عبرت حاصل نہیں کرتے خیر سلاطین اور ملوک تو پھر بھی دوسرے درجہ میں ہیں۔ مخلوق میں سب سے زیادہ درجہ انبیاء کا ہے لیکن حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ یعنی یہ لوگ جو عیسیٰ علیہ السلام کو معبود کہتے ہیں آپ ان سے کہہ دیجئے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ کون قابو رکھتا ہے۔ اللہ کے مقابلہ میں کسی شئے کا اگر اللہ تعالیٰ اس بات کا ارادہ کریں کہ

عیسیٰ ابن مریم اور ان کی ماں کو اور تمام روئے زمین والوں کو ہلاک کر ڈالیں۔

حالات بدلتے دیر نہیں لگتی

میں نے ایک شخص کا اقبال اور ادبار دونوں حالتیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں ایک وقت وہ تھا کہ وہ اپنے بیلوں کو جلیبیاں کھلاتا تھا۔ اور پھر دوسرا وقت وہ دیکھا کہ اس کی گزر مانگنے پر تھی۔ جو نوکری پیشہ لوگ وطن میں آتے تھے ان سے مانگتا تھا کسی نے چار آنے دیدیئے کسی نے آٹھ آنے۔ حالت بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ اس لئے ڈریئے اور سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے کہ میری ریاست میرا منصب میرا عہدہ سب چھین لیں اور مجھ کو ایسا ہی ذلیل بنادیں جیسے یہ شخص ہے جس پر ظلم کر رہا ہوں۔ اول تو جب زندہ نظیریں اور سینکڑوں واقعات نظروں کے سامنے ہیں تو اس کو فرض کرنا کیا مشکل ہے۔ نہ سوچ سکتا کیا معنے مگر خیر اس کو بھی جانے دیجئے آپ اس کو سمجھئے کہ خدا تعالیٰ سے تو سب چھوٹے ہیں۔ اور جتنا میرا اس پر زور ہے خدا تعالیٰ کو اس سے زیادہ مجھ پر قدرت ہے اور جتنا یہ میرا مجرم ہے اس سے زیادہ میں خدا کا مجرم ہوں جب حق تعالیٰ باوجود قدرت کاملہ اور میرے ان جرائم کے دیکھنے کے عفو فرمارہے ہیں اور درگذر کرتے ہیں اور فوری سزا نہیں دیتے ہیں تو مجھ کو بھی چاہیئے کہ کم از کم اس کی برکت سے مجھ کو بالکل ہی معاف فرمادے۔

گفت عیسیٰ رایکے ہوشیار سر   چیست درہستی ز جملہ صعب تر
گفت اے جاں صعب تر خشم خدا   کہ از دوزک ہمی لرزد چوما

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی ہوشیار نے پوچھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ دشوار کیا چیز ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے جان دنیا میں سب سے زیادہ دشوار چیز قہر خدا ہے کہ اس کے خوف سے دوزخ ہماری طرح لرزتی ہے)۔

گفت از خشم خدا چہ بود اماں   گفت ترک خشم خویش اندر زماں

(اس نے پوچھا کہ خدا کے غصہ سے امان کس طرح مل سکتی ہے جواب ملا کہ پہلے اپنے اندر کا غصہ ختم کردیا جائے)۔

حضرت امام حسین رضؓ کا اپنے غلام سے عفو و درگزر

ایک بار حضرت امام حسین علیہ السلام کھانا کھا رہے تھے اور مہمان بھی حاضر تھے۔ غلام کا پاؤں پھسلا اور شوربہ کا پیالہ حضرت امام کے اوپر گرا۔ حضرتؓ نے اس کو نظر تادیب سے دیکھا۔

غلام نے فوراً یہ آیت پڑھی وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ یعنی اللہ تعالیٰ مدح فرماتے ہیں غصہ پینے والوں کی۔ اللہ اکبر اس وقت کے غلام بھی ایسے ہوتے تھے کہ اس وقت آقا بلکہ بزرگ بھی ایسے نہیں۔ ہر بات میں قرآن و حدیث ہی ان کی زبان پر تھا۔ قرآن شریف سنتے ہی حضرت امامؒ نے فرمایا کظمت غیظی یعنی میں نے اپنا غصہ ضبط کرلیا۔ پھر غلام نے پڑھا وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاس یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدح فرماتے ہیں جو لوگوں کا قصور معاف فرمانے والے ہیں۔ فرمایا عفوت عنک یعنی میں نے تجھ کو معاف کیا۔ پھر اس نے آگے پڑھا وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ یعنی اور اللہ احسان کرنے والے بندوں کو چاہتے ہیں فرمایا اعتقتک یعنی میں نے تجھ کو آزاد کیا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کی سلطنت
حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت سے معنیً اقویٰ تھی

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی نہیں ہوا اور نہ ہوگا کہ آپ نبی ہونے کے ساتھ صاحب سلطنت بھی تھے اور سلطنت بھی آپ کی سب سے زیادہ تھی بظاہر حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت بڑھی ہوئی تھی لیکن میں ایک قصہ عرض کرتا ہوں اس سے معلوم ہوگا کہ حضور کی سلطنت معنیً سلیمان علیہ السلام سے بڑھ کر تھی۔ گو صورۃً سلیمان علیہ السلام کی سلطنت اشد تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضورؐ نماز پڑھتے تھے شیطان ایک آگ کا شعلہ لے کر اس طرف چلا۔ اللہ اکبر اس کی جسارت تو دیکھئے کہ بارگاہ نبوی میں بھی اس کی یہ ہمت ہوئی حضورؐ نے فرمایا اعوذ باللّٰہ منک (میں تجھ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں) یہ فرمانا تھا بھاگ گیا۔ بعد نماز کے حضورؐ نے یہ قصہ بیان فرمایا اور یہ فرمایا کہ اگر میں چاہتا تو اس کو پکڑ لیتا اور ستون سے باندھ دیتا کہ صبح مدینہ کے لڑکے اس سے کھیلتے۔ مگر مجھ کو اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد آگئی کہ انہوں نے یہ دعا فرمائی تھی قَالَ رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَھَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ یعنی اے رب میرے مجھ کو ایسی سلطنت بخش کہ میرے بعد کسی کے لئے مناسب نہ ہو۔ اس قصہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی سلطنت معنیً اقویٰ تھی کیونکہ کسی کو پکڑ کر وہ چھوڑ سکتا ہے جس کو پورا اطمینان ہو کہ جب چاہوں گا پھر پکڑ لوں گا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا شیطان کو قید کر دینا صورۃً تسلط عظیم ہے مگر یہ چھوڑ دینا معنیً تسلط اعظم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ

پس آپ اتنے بڑے تو صاحبِ سلطنت مگر آپ کے اخلاق تو دیکھئے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دس برس کامل خدمت کی ہے یہ بچے سے تھے اور بچپن بھی ایسا کہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضور کسی کام کو فرماتے تو میں کہہ دیتا تھا کہ میں نہیں جاتا۔ اور دل میں یہ ہوتا تھا کہ جاؤں گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے کبھی ان دس برس میں حضورؐ نے کسی کام کے متعلق یہ بھی نہیں فرمایا کہ یہ کیوں نہیں کیا۔ اور یہ کیوں کیا حالانکہ اس سے زیادہ بھی آپ معاملہ فرماتے تو ہرگز اس کو ناگوار نہ ہوتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ محبوبیت

کیونکہ آپ کی شان محبوبیت وہ تھی کہ آدمی تو آدمی جانور تک یہ چاہتے تھے کہ حضور کے ہاتھ سے قربان ہو جائیں حجۃ الوداع میں سو اونٹ کی حضورؐ نے قربانی فرمائی جن میں سے ۶۲ اونٹ اپنے دست مبارک سے نحر فرمائے تھے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اونٹوں کی یہ حالت تھی کلھن ینرولفن الیہ یعنی ان میں سے ہر ایک آپ کے قریب ہوتا تھا کہ مجھ کو نحر فرمادیں گویا وہ حالت تھی جو کسی شاعر نے کہا ہے۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف   باُمید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

(صحرا کے تمام ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا ہے اس امید میں کہ کسی دن شکار کو آئے گا)۔

پس اگر حضور کسی کے ساتھ سختی بھی فرماتے تو وہ سختی بھی ہزاروں نرمی سے لذیذ تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی

لیکن باوجود اس کے حضورؐ نے اپنی عمر کے ۶۳ رسال اس حالت سے گزار دیئے کہ کسی کو اُف تک نہیں فرمایا۔ اپنے اہل کے ساتھ حضورؐ اس قدر نرم تھے اور اسقدر دلجوئی فرماتے تھے کہ حضرت عائشہؓ نو برس کی عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں آئی تھیں۔ آپ ایک مرتبہ ان کے ساتھ دوڑے تھے، نیز آپ اپنے گھر کا خود کام بھی کر لیتے تھے بکری کا دودھ نکال لیتے تھے۔ اپنی جوتی سی لیتے تھے جھاڑو دے لیتے تھے۔

اہل خانہ سے دلجوئی کی تاکید

ہم کو بھی چاہیئے کہ اپنے اہل کے ساتھ بہت دل جوئی اور اچھے برتاؤ سے رہیں اس سے ہنستا

بولتا رہے اور کسی طرح کا اس پر ظلم نہ کرے اور خدا سے ڈرتا رہے خدا تعالیٰ کو اس پر قدرت ہے کہ کسی وبال میں مبتلا فرمادیں کوئی مقدمہ قائم کرادیں کسی سخت مرض میں مبتلا فرمادیں کسی حاکم ظالم کو اس پر مسلط کردیں اور ظلم کا اکثر وبال دنیا ہی میں پڑتا ہے امم سابقہ میں تو ہاتھ کھلم کھلا وبال آتا تھا۔

ظلم کا انجام

بنی اسرائیل میں ایک سپاہی نے ایک مچھلی والے کی مچھلی چھین لی۔ مچھلی والے نے کہا کہ اے اللہ میں اس سے یہاں ہی بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ وہ سپاہی مچھلی گھر لایا اور بیوی سے کہا کہ اس کو مسلم کوتلو۔ چنانچہ وہ تلی گئی جب سامنے آئی تو جب اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اس مچھلی نے ہاتھ میں کاٹ لیا اور اس میں شدت کا درد پیدا ہوگیا۔ اطبا کی رائے ہوئی کہ ہاتھ جب تک نہ کٹے گا آرام نہ ہوگا۔ چنانچہ ہاتھ کاٹ ڈالا گیا۔ ہاتھ کاٹنے کے بعد وہ درد آگے سرایت کرگیا۔ کسی اہل دل نے کہا کہ جب تک اس مچھلی والے سے دعا نہ کراؤ گے اس وقت تک آرام نہ ہوگا۔ اس کو تلاش کیا وہ مل گیا۔ اس نے دعا کی درد فوراً جاتا رہا اور صبح کو جب سو کر اٹھا تو ہاتھ بھی سالم پایا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے دور کا ایک مصیبت زدہ کا واقعہ

داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شخص تھا فقر وفاقہ سے تنگ آکر اس نے دعا کی کہ اے اللہ حلال روزی دے اتفاقاً ایک گائے اس کے گھر میں گھس آئی۔ یہ اس کو کاٹ کر کھا گیا جس کی وہ گائے تھی اس نے داؤد علیہ السلام کے یہاں نالش کی داؤد علیہ السلام کو وحی سے حکم ہوا کہ اس کو چھوڑ دو۔ داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ اس نے تو کھلا ظلم کیا ہے۔ یہ فیصلہ سمجھ میں نہیں آیا۔ حکم ہوا کہ فلاں درخت کے نیچے گڑھا کھدواؤ۔ چنانچہ گڑھا کھودا گیا تو اس میں سے ایک مقتول شخص کی لاش نکلی اور ایک چھری بھی نکلی اس پر اس گائے والے کا نام کندہ تھا۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ یہ مقتول اس مفلس کا باپ تھا اور یہ گائے والا اس کے یہاں نوکر تھا اور گائے بھی اسی کی تھی اس نے اس کو قتل کر کے گائے پر بھی اور اس کے تمام املاک پر قبضہ کرلیا تھا چنانچہ اس پر قتل کا مقدمہ قائم ہوا اور قصاص لیا گیا۔

مظلوم کی بددعا قبول ہوتی ہے

اس امت پر حق تعالیٰ کی یہ رحمت ہے کہ کھلم کھلا سزا نہیں ہوتی اس لئے کہ اس میں رسوائی ہے۔ ہاں در پردہ سزا ہوتی ہے جس سے ظاہر بین اہل دنیا یہ نہیں سمجھتے کہ یہ اس کے گناہوں کی سزا

ہے بلکہ اسباب ظاہرہ کی طرف اس کو مضاف کرتے ہیں لیکن واقع میں وہ اس کے ظلم کی سزا ہوتی ہے خصوصاً جبکہ وہ مظلوم بددعا بھی کرے کیونکہ مظلوم کی بددعا بہت جلدی قبول ہوتی ہے ۔

تبرس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن اجابت از و حق بہر استقبال می آید

(مظلوموں کی بددعا سے ڈرو کہ ان کے دعا کرنے کے وقت قبولیت اللہ کی طرف سے استقبال کو آتی ہے)

حتی کہ کافر پر بھی اگر کوئی ظلم کرے اس کی بھی دعا قبول ہوتی ہے۔

بیوی کے الگ رہنے کا مطالبہ اس کا حق ہے

ایک ظلم بیوی پر اور بھی ہوتا ہے جس میں دینداری کے مدعی بکثرت موجود ہیں وہ یہ کہ جو کچھ کماتے ہیں ماں باپ کی نذر کر دیتے ہیں اور بیوی کو ان کا دست نگر رکھتے ہیں اور ماں باپ بھی بعض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اس کی خبر گیری نہیں کرتے اور بیوی الگ رہنا چاہے تو الگ نہیں کرتے کہتے ہیں کہ گھر کی ہوا نکل جائے گی۔ پرانی بڑھیوں کے زیادہ تر ایسے ہی خیالات ہیں یاد رکھو حق تعالیٰ کی معصیت میں کسی کی اطاعت نہیں اگر بیوی الگ رہنا چاہے تو الگ رکھنا اس کا حق اور ضروری ہے بلکہ اس زمانہ میں تو اسی میں مصلحت ہے کہ الگ رہیں شامل رہنے میں بہت فساد ہیں یہ پرانی عورتیں اکثر بہوؤں کو بہت ستاتی ہیں اور عجیب بات ہے اگر بیٹا بیوی کی طرف ملتفت ہوتا ہے وہ اس سے بھی جلتی ہیں اور اگر ملتفت نہ ہو تو نمک پڑھواتی پھرتی ہیں۔ تعویذ کراتی ہیں الگ رہنے میں ان سب بکھیڑوں سے نجات ہے اور اگر یہ کہو کہ بہوویں آجکل نالائق ہوتی ہیں ساسوں سے لڑتی ہیں۔ دق کرتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا مقتضی بھی یہی ہے کہ ان کو الگ کر دو۔ غرض علیحدہ رہنے میں طرفین کو راحت ہے یہ تو بیوی کے حقوق کا ذکر تھا۔

والدین کے حقوق میں کوتاہی

بعض لوگ ماں باپ کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں اور بیوی کی جانبداری کرتے ہیں اس کی اصلاح بھی اوپر عرض کر چکا ہوں کہ الگ رہیں کہ ایسے معاملات ہی نہ ہوں جن میں جانبداری کی نوبت آوے۔

بعض خاص مظالم کا بیان

یہ تو بعضے مظالم عامہ کا بیان تھا بعضے خاص مظالم ہیں کہ قدرت معتد بہا پر موقوف ہیں اور یہ وہ

ظلم ہے جس میں رئیس اور زمیندار لوگ زیادہ تر مبتلا ہیں۔ایک زمیندار تھے عالم بھی مشہور ہیں انہوں نے ایک چمار سے جو کہ گھاس کھود کر لایا تھا پوچھا کہ یہ کتنے کو دیتا ہے اس نے کہا دو آنہ کی۔ فرمایا ارے تو یہ لایا کہاں سے ہماری زمینوں سے تو گھاس لایا اور ہم سے ہی بھاؤ کرتا ہے یاد رکھو مسئلہ یہ ہے کہ کھڑی گھاس کسی کی ملک نہیں جو کھود لے اور قبضہ کر لے اسی کی ہے۔اب اس کو اختیار ہے کہ جتنے کو چاہے بیچے۔نہ اس سے جبراً لینا جائز نہ اس بناء پر اس پر دباؤ ڈالنا جائز اور ایسے امور کو تو ظلم بھی نہیں سمجھتے۔بہت خفیف جانتے ہیں حالانکہ درمختار میں لکھا ہے کہ تین پیسہ کے عوض قیامت میں سات سو نمازیں مقبول دلائی جائیں گی۔حدیث شریف میں ایک قصہ وارد ہوا ہے کہ ایک شخص نے حضور کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہؐ میرے چند غلام ہیں وہ مجھ کو ستاتے ہیں نافرمانی کرتے ہیں اور میں ان کو مارتا ہوں۔کوٹتا ہوں قیامت میں میرا اور ان کا کیا معاملہ ہوگا فرمایا کہ ان کی خطائیں ایک پلہ میں رکھی جائیں گی اور تیری مارکوٹ دوسرے پلہ میں رکھی جاوے گی اگر ان کی خطائیں زیادہ ہوئیں تو ان کی نیکیاں تجھ کو ملیں گی اور اگر تمہاری مارکوٹ زیادہ ہوئی تو تمہاری نیکیاں ان کو دلائی جاویں گی۔اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے سب کو آزاد کیا۔ اس لئے کہ مجھ سے ایسا عدل نہ ہو سکے گا۔لیکن مقصود شریعت کا یہ نہیں کہ غلام نوکر مت رکھو، یہ ان صحابی کا خوف تھا اور ان امراء و زمینداروں کے یہاں یہ بھی ہوتا ہے کہ قلی کا حمال کا کاڑی بان کا کچھ مقرر نہیں کرتے جب کام لیتے ہیں تو ایک مقدار خاص دیکر کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ بس اس سے زیادہ نہ ملے گا یہ صریح ظلم ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ اول اجرت ٹھہرانا چاہیئے۔اور طرفین جس پر رضا مند ہوں وہ دینا چاہیئے گوشت اور دودھ کا ان کے لئے علیحدہ نرخ ہوتا ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ بعض ابواب زمینداری کے ابواب جہنم ہیں۔ادھر دروازہ بند ہوگا اور ادھر دوزخ کا دروازہ کھلا ہوا نظر آنے لگے گا۔اور وہاں نہ کوئی حمایتی ہوگا نہ وکیل ہوگا نہ بیرسٹر اور جبکہ گورنمنٹ کے سامنے رعایا کا زور نہیں چلتا تو خدا تعالیٰ کے سامنے تو کس کا زور چلے گا آخر یہ دن بھی تو آنے والا ہے اور بہت قریب ہے اور جب سے پلیگ صاحب آئے ہیں اس وقت سے تو وہ دن ہر وقت پیش نظر ہے گویا دنیا برزخ ہو رہی ہے چنانچہ فقہا نے اس کو سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جہاں مرض طاعون شروع ہو وہاں صحت کی حالت بھی مرض الموت ہی ہے چنانچہ مرض الموت کے جو احکام ہیں وہ اس پر مرتب فرمائے ہیں بعض امراء و زمیندار کمینوں اور ملا سمون سے بہت بے تکے کام لیتے ہیں کہ

جن کے وہ مشکل سے متحمل ہوتے ہیں یہ بھی ظلم ہے خود آدمی اپنے اوپر خیال کرے کہ یہ کام مجھ کو کس قدر ثقیل ہوتا مجھ کو اگر کبھی ریل پر ملازم کو بھیجنے کی ضرورت ہوتی ہے تو بہت ہی گراں ہوتا ہے اسی واسطے میں نے اپنے سب دوستوں کو لکھ دیا ہے کہ ریل کے ذریعہ سے میرے پاس کوئی شئے نہ بھیجیں۔

ایذا دہی سے بچنے کی تاکید

خلاصہ یہ ہے کہ کوئی کام ایسا نہ کرے جس سے کسی کو اذیت ہو۔ یا کسی کے دل پر بوجھ پڑے۔ اور اسی میں یہ بھی داخل ہے کہ بے دھڑک کسی سے فرمائش کر دینا کہ فلاں شے ہمارے واسطے لانا یا رستہ چلتے ہوئے آدمی سے یہ کہہ دینا کہ یہ اسباب یہاں رکھ دے اور فلاں کو بلا لے یا یہ کام کر دے۔ ایسے امور سے دل پر بوجھ ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ کسی کی تعظیم سے بھی دل پر گرانی ہوتی ہے بعض لوگ بعضی خدمت ایسی کرتے ہیں کہ ان سے بار ہوتا ہے میں تو ایسی تعظیم، ادب خدمت کو بھی جائز نہیں سمجھتا جس سے قلب پر بار ہو۔ ایک شخص میرے پاس آئے، اب آ کر یہ نہیں کہ بیٹھ جاتے تصویر کی طرح کھڑے ہیں مجھے بہت برا معلوم ہوا میں نے آخر لکھنا چھوڑ کر ان کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ بیٹھے کیوں نہیں، کہنے لگے کہ بلا اجازت کیسے بیٹھتا۔ میں نے کہا اچھا دو ہفتہ تک اجازت نہیں اُسی وقت بیٹھ گئے۔ میں نے کہا یہ کیا بات ہے تم تو کہتے تھے کہ بلا اجازت نہ بیٹھوں گا کچھ جواب نہیں۔ ایک شخص آئے ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کب جائیں گے۔ کہنے لگے کہ جب حکم ہو۔ میں نے کہا اچھا دو برس تک حکم نہیں کہنے لگے کہ مجھے فلاں کام فلاں کام ہے میں نے کہا بندہ خدا پہلے ہی کیوں نہ بتلا دیا۔ کچھ نہیں تکلف رہ گیا ہے محبت اور خلوص نہیں رہا۔ یہ سب امور دال ہیں اس پر کہ محبت نہیں ہے یاد رکھو یہ باتیں بھی ظلم کے افراد میں سے ہی ہیں میں نے ایک رسالہ آداب المعاشرت لکھا ہے اس میں معاشرت کے متعلق جس قدر حقوق کا استقرار ہو چکا ہے ضبط کیا ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ عنقریب طبع ہو جائے گا۔

ظلم کا اصل سبب

اور ظلم کی سب صورتیں محبت نہ ہونے کی وجہ سے ہیں۔ مسلمانوں میں باہم محبت اور الفت نہیں ہے۔ محبت پیدا کرنے کی کوشش کیجئے اور جس کے ساتھ محبت نہ ہوتی ہو اس کے ساتھ احسان کیجئے اس کو تم سے محبت ہوگی۔ پھر تم کو بھی اس سے محبت ہو جائے گی۔ اور آپس میں اس کا خیال رکھو

کہ کسی کو کسی سے کوئی نقصان کوئی تکلیف نہ ہو۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہانپوریؒ نے ایک دکاندار سے ایک سودے کی نسبت پوچھا کہ کتنے کو دو گے اس نے کہا چار روپیہ کا ہے مگر آپ کے لئے ایک روپیہ کو ہے۔ ساتھیوں سے فرمایا کہ آگے چلو اس کے یہاں سے نہ لیں گے۔ دو حال سے خالی نہیں کہ یا تو سچ بولتا ہے یا جھوٹ۔ اگر سچ بولتا ہے تو اس کا نقصان ہے ہم اپنے بھائی کا نقصان نہیں کرنا چاہتے۔ اور اگر جھوٹ بولا ہے تو یہ ہم کو الو بناتا ہے اور یاد رکھو کہ جانوروں کے بھی حقوق ہیں۔ بلاضرورت شرعیہ کسی کو تکلیف نہ دو۔

خلاصۂ وعظ

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث پر عملدرآمد ہونا چاہیئے اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ. (صحیح بخاری ۱:۹، مشکوٰۃ المصابیح:۶) مسلمان وہ ہے کہ مسلمان اس کے ہاتھ اور زبان سے سالم رہیں اور اگر اس طرح زندگی بسر کرو گے تو تمہارے بعد بھی تمام عمر تم کو لوگ یاد کر کے رویا کریں گے۔ کسی شاعر نے کیا اچھا کہا ہے ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو   ہمہ خنداں بودند تو گریاں
آنچناں زی کہ وقت مردن تو   ہمہ گریاں بودند تو خنداں

(یاد رکھو کہ جب تو پیدا ہوا سب ہنس رہے تھے اور تو رو رہا تھا اسی طرح جب تیری موت کا وقت ہو، سب رو رہے ہیں اور تو ہنس رہا ہو)۔

اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ توفیق عمل کی عطا فرماویں۔ آمین

تمّت بالخير